پیغامِ بزم
صنّف
گنجو، بھارتی سحر گاندربلی
یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

مصنّف

اوتار کرشن گنجو، بھارتی سحر گاندربلی

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

کتاب	:	پیغام بزم
مصنف	:	اوتار کرشن گنجو، بھارتی سحر گاندربلی
سن اشاعت	:	17 نومبر 2015ء
قیمت	:	₹ 263
تعداد	:	500
کمپوزنگ	:	مسعود احمد
باہتمام	:	محترم کامل، میگزین گلی چوڑی بازار جامع مسجد نئی دہلی
مطبوعہ	:	جے۔ کے۔ آفسیٹ پریس دہلی

کتاب ملنے کا پتہ

یہ تصنیف ہفتہ وار انگریزی اخبار کے مدیر (ڈیمو) کے دفتر میں بھی دستیاب ہے۔
سرکاری رہائش رولر شیڈ متصل شیڈ پیٹر سکول بی سی روڈ جنرل بس اسٹینڈ جموں توی۔

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

ہے فردی نام پیغامِ بزم
'اسدؔ' 'غالب' پی رہے جام پیغامِ بزم
شاعری کا آیا ابہام پیغامِ بزم
کرتے ہیں قلم کا احترام پیغامِ بزم

'اسدؔ' اسدو شبستان بہار
چند لوگوں نے کی مسمار
خیالاتوں کا گرما گرم اظہار
لیکن ہے نہیں، لیکن ہے شبستان بہار

میں نے کلام غالب کی تحقیق پر دسویں کتاب لکھی ہے۔اس سے پہلے بھی میں نے نویں کتاب کلام غالب کی تحقیق پر ہی مرتب کی تھی جس میں غالب کے بہت سے شعروں کو دورِ جمہوریت کی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ وابستہ کیا گیا جو کہ میری سوچ کے حساب سے ایک بہت ہی مشکل کام رہا۔کئی ادیبوں اور تنقید نگاروں نے میری نویں کتاب پڑھ کر کہا کہ غالبؔ کا تعلق جمہوری دور کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اور غالبؔ کی غزلوں کے شعروں کو مختلف پڑاؤ پر جمہوری دور کے ساتھ وابستہ کر کے ایک ادبی کام انجام دیا۔

اب میں نے دسویں کتاب مرتب کی یہ بھی غالبؔ کے شعر و شاعری کا تحقیقی جائزہ ہے لیکن غالبؔ کا احساس ہم وطن دوستوں کے ساتھ شاعری کے انداز میں بیان کیا ہے۔جس کو پڑھ کر یہ محسوس کریں گے کہ غالب میں بھی حب الوطنی کا جذبہ موجود ہے۔

غالبؔ کے بہت سے شعروں کو پیغامِ غالب کے عنوان کے تحت لکھ کر میں نے پڑھنے والوں کو سمجھایا اور اپنی سوچ سے یہ بیان کیا ہے کہ غالب کی شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں ایک ہی انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔مطلب اگر ہم مطلع اور مقطع کو پڑھتے ہیں تو معشوق

اور محبوب کے دُکھ کا بیان ہوتا ہے۔ مذکور شعروں میں شاعر اپنا تخلص تحریر کر کے غزل کو پوری کرتا ہے۔ میں نے بھی پیغام غالب میں مطلع اور مقطع کو ایک ہی انداز میں بیان کیا ہے۔ مطلع اور مقطع کا مطلب ایک ہی ہے لیکن جب آپ اس کتاب کو گہرائی سے پڑھیں گے تو آپ کو بھی معلوم ہو جائیگا کہ مطلع اور مقطع کو ایک ہی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مطلع میں اگر غالب نے معشوق کے بارے میں کچھ لکھا ہے تو مقطع میں بھی وہی بیان دوسرے انداز سے غالب نے بیان کیا ہے۔ مطلب دیوانِ غالبؔ کی تمام غزلوں کو اگر ہم بیان کریں تو میرے انداز میں ان تمام غزلوں میں ایک تسلسل ہے۔ اسی لئے میں نے مقطع اور مطلع کا بیان خاص کر اس کتاب میں بیان کیا ہے۔

غالبؔ نے مطلع اور مقطع غزلوں میں لکھا ہے لیکن میں نے اس کتاب میں مطلع اور مقطع کو الگ الگ حرفوں کو بیان کر کے افسانہ کے انداز میں بیان کیا ہے جو کہ اُردو زبان میں پہلے پہل کسی بھی ادیب نے بیانہیں کیا ہوگا۔ آپ اس کتاب میں پڑھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ مطلع اور مقطع کے الگ الگ مصرعوں کو افسانہ کے انداز میں دلیل تحریر کی ہے جن کو پڑھ کر ادیبوں اور قلم کاروں کو اپنے تاثرات بیان کرنا لازم ہیں۔

میں نے اس کتاب میں دیوانِ غالبؔ کی تحقیق کر کے خود بیان کیا ہے کہ غالبؔ کو کسی گانے یا نغمہ لکھنے والے یا نغمہ سننے والے لڑکی یا عورت کے ساتھ واسطہ ہے وہ میں نے اس کتاب میں غالب کے مختلف غزلوں کے شعروں کو پڑھ کر کے بیان کیا ہے۔ آج تک کسی ادیب نے غالبؔ کے معشوق کی شناخت ہی نہیں کی ہے لیکن میں نے اپنی سوچ اور غالب کے شعر و شاعری سے ہی تحقیق کر کے بتایا کہ غالب کی معشوقہ گانے بجانے والی یا نغمہ سننے والی یا نغمہ کو لکھنے والی عورت یا لڑکی ہوگی۔ اس بیان پر مختلف ادیب کیا کچھ کہہ سکتے ہیں اس ردعمل اور اظہار پر میں بہت ہی خوش ہونگا۔

میں نے اولاً اس کتاب کا عنوان 'پیغام ادیب' مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن تحقیق کرنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ کتاب کا عنوان 'پیغام بزم' رکھوں، تا کہ پڑھنے والے کو پڑھ کر محسوس ہو جائے کہ تخلیق کار نے اپنی توجہ غالب کے معشوق کے بارے میں صحیح انداز میں بیان کیا ہے یا کس حد تک بیان بازی ہی ہے۔

میں اس کتاب کو شائع کرنے پر 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' کے ادارے کو تہہ دلانہ شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کے شائع کرنے پر معاولی تعاون دیا۔

آپ کا

اوتار کرشن گنجو سحر گاندری بلی

میرا پیغام میرا غالبؔ

کہتے ہیں غالب نے بہت سی غزلیں تحریر کیں جو دُنیا بھر میں ''دیوانِ غالب'' کے نام سے مشہور ہیں۔ تقریباً دُنیا کے بیشتر لوگوں نے اس کلام کو پڑھا، اگرچہ بہت سے لوگ اُردو زبان سے واقف نہیں ہیں، پھر بھی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے ان تک پہنچایا گیا۔ تمام پڑھنے والوں نے ''دیوانِ غالب'' کی بہت تعریف کی، لیکن تمام پڑھنے والوں کا کہنا ہے کہ غالب نے جو غزلیں تحریر کی ہیں اس میں حب الوطنی اور قوم کے نام پر کچھ نہیں پاتے۔ اُن کا یہ کہنا درست نہیں ہے، میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت غالبؔ نے اپنی شاعری لوگوں تک پہنچائی تو اس وقت عوامی حکومت کا دائرہ ہی نہیں تھا۔ ان دنوں نواب (بادشاہی) دور رہا، لیکن غالبؔ کے مختلف اشعار عوام کے ساتھ وابستہ رہے۔

اولاً میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے غزل کو آج تک عورت کے ساتھ باتیں کرنے کے مماثل سمجھا لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ ثانیاً عام غزل گو یہ کہتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں مطلع اور مقطع کا ترجمہ ایک ہی انداز سے کیا جاتا ہے۔ کئی تنقید نگار یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر غزل کا مطلع مقطع کے ساتھ وابستہ نہیں رہا تو ہم اس شاعری کو شاعری نہیں کہیں گے۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ شاعر نے وزن ردیف اور کافیہ کو برابر کر کے غزل تحریر کی ہے۔ میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیں شاعر کا فن پارہ پڑھنا چاہئے کہ اس میں غزل کہنے کی صلاحیت

ہےلیکن عام تنقید نگاروں اور محققوں کا احترام کرتے ہوئے میں نے یہ تحقیق ''دیوان غالبؔ'' میں صحیح پائی۔ جس میں میں نے غالبؔ کے مطلع اور مقطع میں قریبی تعلق پایا۔ مطلب اگرچہ مفہوم الگ الگ ہےلیکن مفہوم ایک ساتھ مل بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں

ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق اگرچہ میں اس گلشن میں بیٹھا ہوں لیکن پھولوں کے نظارے اور انکی کشش سے میں لطف اندوز ہوا لیکن میں اس گلشن میں یہ چاہتا ہوں کہ ان پھولوں کو کاٹ کر اپنے پاس رکھوں، میرا ضمیر یہ کرنے سے منع کرتا ہے۔ میرے میں اتنی قوت نہیں کہ میں کسی کی مٹی کو اٹھا کر اپنے دامن میں رکھوں اور اس مٹی کو اپنی مٹی تصور کروں۔ میں دیکھتا ہوں کہ چمن میں کیسے کیسے پھول سجے ہوئے ہیں، اور جس نے ان کو سجا کر رکھا ہے میں اس کا گریبان پکڑ کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اتنی محنت کی ہے کہ گلشن کو سجایا ہے اور اس کی محنت پر تعریف کرنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح سے غالبؔ کا مطلب ہے جس طرح سے باغ کو مالی نے سجایا ہے اس طرح میں اپنے معشوق کو سجانا چاہتا ہوں۔ سجانے کے لئے میں اس کا گریبان بھی پکڑنا چاہتا ہوں تا کہ وہ میرے نقش قدم پر چلے۔

اگرچہ میں اس شعر کو غزل کے مفہوم کے دائرے میں نہیں کہنا چاہتے کیوں نہ ہم اس غزل کے مطلع کو یہ کہیں کہ شاعر لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ اے لوگوں اگر آپ اس ملک کے رہنے والے ہو تو کیوں اس ملک کی مٹی کو سنوارتے نہیں ہو۔ کیوں نہ اس مٹی سے ملک کو سونے کا بناتے ہو۔ جس جس میں اس مٹی کو سنوارنے کی قوت ہے غالب فرماتے ہیں میں اُس کا دامن پکڑنا چاہتا ہوں، جو ملک کے خاطر کچھ نہ کچھ کریں تا کہ لوگ اس کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اس قربانی پر غالب فرماتے ہیں کہ میں اس کا گریباں پکڑوں گا اور میں اس کو ایک حب الوطن کے طور پر تسلیم کروں گا۔

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف، ہوں وہ مشت خس کہ، گلخن میں نہیں

اب ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ نے اپنی غزل کو مطلع مقطع کے ساتھ وابستہ کیا ہے جیسا کہ خود غالبؔ فرماتے ہیں کہ وطن کی شان تب تسلیم کی جاسکتی ہے جب ہم غریبوں کو تکلیف سے مبرا کریں اور ان سے کوئی وحشت نہ رکھیں ان کے خیالات میں گلقند کی مٹھاس ان کی زبانوں تک پہنچائیں۔ مطلب غالبؔ کا یہ ہے کہ میں لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ فرماتا ہوں کہ ہمیں وطن اور لوگوں کے لئے قربانی ضرور دینی چاہئے۔

اگر غزل کے مفہوم کے تحت مطلب ڈھونڈھیں گے تو غالب فرماتے ہیں کہ میں وطن میں اگر غریب ہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ میں آپ کو امیر تصور کر کے محبت پیش کرتا ہوں، میں آپ کو محبت اس لئے پیش کرتا ہوں کہ مجھے آپ کے دیکھنے سے وحشت ختم ہوتی ہے اور میں اپنی کمزوری کو دور کر کے اپنا سب کچھ آپ کو پیش کرتا ہوں۔ اگر چہ میں اس ملک میں ایک غریب ہوں لیکن میں آپ کو امیر بھی نہیں سمجھتا، مجھے صرف وطن کے لئے آپ کی لذت پر بہت ہی احترام ہے اور میں احترام کر کے رہوں گا۔

اگر چہ ہم ان دونوں شعروں کا مفہوم پڑھیں گے اور سوچیں گے تو ہم صحیح کہیں گے کہ غالب مطلع و مقطع میں بھی لوگوں سے مخاطب ہو کر ہمیں اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ ملک کے لئے وفاداری کا کام انجام دینا چاہئے۔

اب میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب فرماتے ہیں ملک اور قوم کے لئے ہمیں ہمیشہ امن قائم کرنا چاہئے۔ امن کے نفاذ کے لئے سامان میسر ہو سکتے ہیں جس سے کہ ملک اچھا رہے۔ مطلب ہم ملک کی مٹی کو اٹھا کر دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مٹی کو برباد نہیں کرینگے۔ ہمیں اس مٹی کو سونا بنانا ہے اور سونا تب بن سکتا ہے جب ہم امن کے کام کرینگے۔ یہ نہ کہ ہم باغ میں بیٹھ کر گل کو دیکھ کر گل کو کاٹیں اور یہ کہیں کہ اس ملک میں یہ گل کیسے سجتا ہے اور سج کر گلشن کی آبیاری

کرتا ہے۔ اسی طرح سے ہمیں ایسے ایسے رہنماؤں سے محبت کرنی چاہئے جو کہ ہمیں امن کے طریقوں سے چلنے پھرنے کے لئے کہیں۔

غالب کے تصور سے ہمیں اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ خود غالب کہتے ہیں کہ ہمیں ہر ایک کام قانون کے دائرے میں کرنا چاہئے۔ ہمیں غیر قانونی حربہ استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ غالبؔ فرماتے ہیں کہ اگر میں نے مٹی اٹھائی، اس مٹی کو مجھے قانونی طور پر استعمال کرنا ہے، یہ نہ کہ میں اس مٹی کو غلط استعمال کروں۔ اسی لئے انصاف ہر ایک کو میسر ہونا چاہئے تا کہ غریب غیر قانونی جال میں نہ پھنس جائے۔

اب ہم غالب کا مقطع لفظی معنی کے لحاظ سے سمجھیں گے جیسا کہ غالب کا مطلب ہے فتح اور غالب نے یہ بھی فرمایا ہے۔

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف، ہوں وہ مشت خس کہ، گلخن میں نہیں

اوپر کے شعر میں ہم غالبؔ کا لفظ فتح کے معنی میں استعمال کریں گے مطلب اس شعر میں ایسا مطلب ہے کہ ہم وطن کو عزت وآبرو فراہم کریں گے تو ہم وحشت اور دہشت سے فتحیاب ہو کر ملک کا مستقبل اچھے طریقے سے سنوار سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ملک میں امن ہو۔ اسی لئے میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ غالبؔ نے امن اور قانون کے طریقوں سے ہی اپنے شعر فرمائے ہیں۔

نالۂ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوہ بیداد نہیں

شاعر فرماتے ہیں کہ ہم کسی کا حسن دیکھ کر تڑپتے ہیں، تڑپ کر ہم اس حسن کو دیکھ کر اپنی شکل کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں اور اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ خدا نے اسے حسن بخشا ہے لیکن ہمیں ایسا حسن نہیں بخشا اور اس حسن کو ہم وصل کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

معشوق کو حسن ہے لیکن ہم اس حسن کو دیکھ کر دل کی دھڑکنوں کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں لیکن شاعر فرماتے ہیں کہ ہمیں ایسی آہ وزاری سے نجات ملنی چاہئے یہ ایک ستم ہے۔ اگر حسن ہے تو حسن خدا نے دیا ہے جس پر ہمیں پچھتاوا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ خدا کی دین ہے کسی کے پاس حسن نہیں ہے لیکن دماغی قوت ہے تو کیا ہم دماغی قوت کو ترجیح دیں یا حسن کو۔ شاعر فرماتے ہیں کہ ہم دماغی قوت پر ہی ترجیح دیں گے ہم حسن کو ترجیح نہیں دیں گے اور یہ کہیں گے کہ خدا کی دی ہوئی چیز ہے اس میں ہم کیوں دخل انداز ہوں۔

شاعر فرماتے ہیں کہ ہمیں حسن دیکھ کر کوئی جلد بازی نہیں کرنی چاہئے ہمیں حسن کو امن کے زاویے سے دیکھنا چاہئے۔ اسکے لئے ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ امن سے ہر ایک چیز کو دیکھنا اور سمجھنا چاہئے اور تاثرات اپنے دل و دماغ کے اندر ہی رکھنے چاہئیں۔ اگر ہم جلد بازی کرنے پر تلے رہیں گے تو قانون شکنی میں پھنس سکتے ہیں اور ہمیں قانون کے تحت سزا ملنے کے امکانات ہیں۔ اسی لئے میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ غالب نے ہر ایک شعر کو امن اور قانون کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا شعر سے سمجھ آتا ہے کہ ہمیں ہر ایک چیز کو دیکھنا چاہئے اور قانونی دائرے کے تحت ہی اس کا لطف اٹھانا چاہئے۔

شاعر لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ جب ملک میں کوئی نئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو ہم اس چیز کو اپنے گھر میں رکھنے کے لئے تڑپتے ہیں لیکن معاشی حالت کو دیکھ کر ہم ایسی چیز کو نہیں لا سکتے ہیں نہ گھر میں رکھ سکتے ہیں۔ تو ہم اس چیز کے ایجاد ہونے پر واویلا کرتے ہیں جو کہ ہمیں نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں ایسی چیز کی ایجاد پر آفرین کہہ کر یہ کہنا چاہئے کہ وقت آنے پر ہمارے گھر میں بھی ایسی چیز فراہم ہو جائے گی اور معاشی حالت سدھرنے کے بعد ہم ایسی چیز کو بھی گھر میں لا سکتے ہیں۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

شاعر فرماتے ہیں کہ ہمیں غربت کی شکایت نہیں کرنی چاہئے اگر شکایت کرنی ہے تو خدا سے کرو، کیونکہ خدا سے رجوع ہونے کے بعد غربت کے متعلق شکایت ٹھیک ہو سکتی ہے۔
مطلب اگر ہمیں شکایت کرنی ہے تو وطن کے لوگوں کے ساتھ کرنی چاہئے انہیں فرمانا ہے کہ اے وطن کے لوگوں اگر میں غربت میں نہیں پلا ہوتا تو میں آپ سے کوئی شکایت نہیں کرتا۔
مطلب میں اس ملک کا مہربان ہوں جس ملک میں مجھے رہنے کا حق ہے۔ میں امن سے اپنی شکایت آپ تک پہنچاتا ہوں، میں قانون کے دائرے میں رہ کر ہی آپ سے اپنی شکایت کرتا ہوں اگر چہ غربت میں ہوں لیکن میں اپنی غربت اور خستہ معاشی حالت کو ملک کو پیش کرتا ہوں مجھے پورا یقین ہے کہ امن اور قانون کے تحت ملک کے رہنما میری مدد کریں گے۔
شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق اگر چہ میں غریب نہیں ہوتا تو میں آپ سے شکایت نہیں کرتا میری شکایت یہ ہے کہ میں کس منہ سے آپ کے پاس اپنے دل کا حال پیش کروں۔
اگر چہ میرا دل پتھر ہے لیکن اس پتھر کو موم کرنے کا علاج آپ کے پاس ہی ہے، غریب ہونے کے ناطے آپ اس پر توجہ نہیں دیتے، میں قانون کو بالائے طاق نہیں رکھ سکتا اور امن کے ماحول میں بذات خود شکایت پیش کرتا ہوں، یعنی میں دائرے امن اور قانون کے تحت ہی اپنی شکایت معشوق تک پہنچتا ہوں۔

اب ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ شاعر کا مطلع اور مقطع ایک ہی ترازو میں تولہ جاتا ہے۔ جیسا کہ مطلع میں شاعر ملک کے بارے میں اور معشوق کے بارے میں مخاطب ہوتا ہے اور مقطع میں بھی اسی طریقہ کار رجحان اپنے شعر میں بیان کرتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے مقطع اور مطلع غزل میں ایک ہی انداز میں بیان کیا ہے۔ غالب نے کبھی بھی امن کو درہم برہم کرنے کی بات نہیں چھیڑی اور قانون کے دائرے اختیار سے باہر بات بھی نہیں چھیڑی۔ شاعر ہر ایک شعر میں دائرے امن اور قانون کے تحت ہی اپنی باتیں اپنے شعروں میں بتا رہا ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ مخاطب ہو کر اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ہمیں

ملک کے حسن کے بارے میں بات کرنی چاہئے جس سے کہ غیر ملکی لوگ یہ کہیں کہ ملک کا حسن کس طریقہ سے لوگوں نے ایجاد کیا ہے اور اس حسن کو دیکھ کر غیر ملکی لوگوں کو داد دینی چاہئے۔ ہمیں اپنے ملک کے کام کاج پر کوئی بھی شکایت نہیں کرنی چاہئے اگر چہ ہم غربت میں مبتلا ہیں تو وقت پر غربت کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور ملک کی وفاداری دائرہ امن اور قانون کے اصولوں سے ہی نبھانی چاہئے۔

اگر چہ ہم مفہوم کے تحت سوچیں تو غالب کا مطلب ہے فتحیابی، اب میں مقطع کا مطلب فتحیابی کے لفظ سے جوڑنا چاہتا ہوں۔ ہم شکایت کو ختم کرنے کے لئے جنگ کرنے کا استعمال کرتے ہیں یہ نہ سمجھنا کہ جنگ لڑائی کرنے کو کہتے ہیں مطلب جدوجہد کو جنگ کے مفہوم میں سمجھنا چاہئے۔ یہ جنگ ہم باتوں سے کرتے ہیں کہ ہم میں غربت ہے اور وطن میں غربت کے بارے میں کوئی بھی نہیں سوچتا ہے۔ جب ہم غربت کو امیری میں پاتے ہیں تو ہم فتح کرتے ہیں ایسی شکایت کو ہم کہتے ہیں کہ امیر بن گئے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب بھی ہم کسی معشوق کے ساتھ اپنی محبت کو وابستہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس وقت جدوجہد کرتے ہیں اور جدوجہد میں کامیاب ہوکر دعویٰ سے کہتے کہ ہم فتحیاب ہوگئے۔ فتحیاب ہونے کے بعد ہم پرانی شکایتوں کا ازالہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم محبت میں قانونی طور پر دائرے امن کے تحت ہی کامیاب ثابت ہوئے۔

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ میں جب بھی راستے میں چلتے پھرتے باغ میں کسی بھی جگہ اپنے معشوق کو دیکھتا ہوں اور یاد کرتا ہوں تو مجھے اتنا غم محسوس ہوتا ہے کہ جتنا کہ کسی چیز دیکھ کر لوگوں کا ہجوم لگ جاتا ہے۔ ایسا بھی نہیں جب بھی کوئی عجیب وغریب چیز ہم راستے میں دیکھتے ہیں تو اس وقت ہجوم وہ دیکھنے کے لئے جمع ہوتا ہے اور اس کو نظارہ جیسا سمجھتے ہیں لیکن میں معشوق

کو یہ تاکید کرتا ہوں کہ ایسا ہجوم نہیں بنانا چاہئے جس سے غمزدگی اور شرمندگی پیدا ہو۔ایسے حالات میں میری سوچ اور میں معشوق کے ساتھ بالکل الگ ہوں۔

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچہ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ جب میں گلشن میں بیٹھتا ہوں تو پھولوں کا نظارہ کر کے مجھے سبھی پھول اچھے نہیں لگتے۔کوئی خاص پھول میرے دل میں سماتا ہے۔مطلب ہزاروں پھولوں میں کوئی ایسا پھول میرے دل میں جگہ پا کر معشوق کی صورت اختیار کرتا ہے لیکن یہ صورت اختیار کر کے میں اس گل کو دیکھتا ہی ہوں، اس کا نظارہ کر کے مجھے گلقند جیسا مزہ اپنی زبان میں محسوس ہوتا ہے۔

اگر چہ ہم شاعر کے مفہوم پر گہرائی سے سوچیں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ شاعر لوگوں کے ساتھ مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ جب بھی میں راستے میں چلتے ہوئے کوئی گڑبڑ دیکھتا ہوں تو اسے دیکھنے کے لئے لوگوں کا ہجوم لگ جاتا ہے اور اس میں ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں لیکن ہجوم میں لوگوں کو گن نہیں سکتے اور اس ہجوم کی وجہ سے نقص امن کا امکان بھی رہتا ہے اور غیر قانونی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔اسی لئے ایسے ہجوم کو ہمیں بالائے طاق رکھنا چاہئے۔ ہجوم خوشیوں میں درکار ہو سکتا ہے نہ کہ نقص امن کے وقت۔ہمیں نقص امن کو بالائے طاق رکھ کر ہی ہجوم قائم کرنا چاہئے۔ہجوم ایسا نہ ہو جس سے قانونی صلاح کار غیر قانونی انداز سے کوئی ایسا قانون اختیار کریں جس سے کہ لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔امن کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ہجوم میں امن قائم رہنا چاہئے۔ہمیں اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ غالب کے دور میں جس کی بھی سلطنت تھی اس دور میں بھی لوگوں کا ہجوم سڑکوں میں پایا جاتا تھا۔غالب نے ہجوم کو غم کے لفظ سے جوڑا ہے نا کہ خوشی سے جوڑا ہے اور ہجوم کی نظر کو غیر قانونی شکل کے دائرے میں بھی جوڑا ہے۔اسی لئے شاعر فرماتے ہیں کہ ہجوم سے ہی نقص امن اور غیر قانونی

دائرے اختیار ہوتے ہیں جسے ہمیں بالائے طاق رکھنا چاہئے۔

اگر چہ ہم غالب کے مقطع پر بحث کریں گے تو غالب فرماتے ہیں کہ ہمیں جب بھی باغ میں بیٹھنا ہوتو ہمیں پھولوں کو دیکھ کر دلی محبت کرنی چاہئے جس سے امن پیدا ہوسکتا ہے۔اس پھول کو کاٹنا نہیں چاہئے جو کہ غیر قانونی ہے۔پھول کو کاٹنے سے باغ کا جلوہ مسمار ہوسکتا ہے۔ہمیں ہر ایک چیز کو امن اور قانونی نظر سے دیکھنی چاہئے۔

غالب فرماتے ہیں کہ فتحیابی گلشن میں تب ہوسکتی ہے جب ہم گل کو محفوظ رکھنے کے لئے جد وجہد کریں۔اگر کوئی گل کو کاٹنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے سمجھانا چاہئے اور اگر نہیں سمجھتا ہے تو قانون کا سہارا لینا چاہئے تا کہ باغ مسمار نہ ہو۔باغ کی خوبصورتی کو بحال کرنے کے لئے ہمیں جد وجہد کرنی چاہئے۔اگر ہم باغ کو محفوظ رکھیں گے تو ہمیں اس بات کا احساس ہوجائے گا کہ ہم نے فتحیابی حاصل کی۔باغ کو مسمار ہونے سے محفوظ کیا۔اسی طرح غالب لوگوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں ہمیں ہر ہجوم سے ڈرنا چاہئے۔ہمیں پھولوں کی مشابہت ملک کے ان جوانوں سے کرنی ہے جو کہ ملک کے ترقی کے لئے وابستہ ہیں۔ہمیں ہر کام امن وقانون کے اندر رہتے ہوئے کرنا چاہئے۔ہمیں ہر ہجوم کا جائزہ لینا چاہئے تا کہ ملک میں کوئی غیر قانونی اور نقص امن کا ذریعہ نہ بن جائے۔

اب میں اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہوں کہ غالب نے غزل کا مطلع مقطع کے ساتھ وابستہ کیا ہے اگر چہ مفہوم الگ ہے لیکن پھر بھی مطلع اور مقطع کا مفہوم ایک جیسا ہے۔غالب نے غزلوں میں پاکیزہ محبت بیان کی ہے۔غالبؔ نے کبھی غیر قانونی انداز کی بات نہیں کہی ہے۔ وہ شعر پڑھنے اور سننے والے کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اگر کسی کے ساتھ محبت کرنی ہوتو وہ پاکیزگی کی حد میں ہونی چاہئے اور کبھی بھی کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہئے۔ہمیں اوپر کے شعروں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ اپنی حب الوطنی پر مخاطب ہوکر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہر ایک کام امن اور قانون کے دائرے میں انجام دینا چاہئے۔اسی طرح سے غالب وطن کی

بستیوں اور شہروں میں جا کر لوگوں کو اُجاگر کر کے یہ گذارش کرتے ہیں کہ انہیں ہر کام امن اور قانون کے دائرے میں انجام دینا ضروری ہے۔ جیسے کہ

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب! یہ درِ گنجینہ گوہر کھلا

شاعر فرماتے ہیں کہ ہم معشوق کی محفل میں بیٹھ کر مختلف باتیں کرتے ہیں اور مباحثہ بھی کرتے ہیں۔ ان سب مباحثوں میں اپنے معشوق کے بارے میں ہی زیادہ تر بحث ہوتی ہے لیکن یہ بحث سن کر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسا کہ کوئی عشق کا دفتر کھولا ہوا ہے۔ لیکن اس محفل میں بیٹھ کر میں خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتا ہوں کیا یہ دفتر ہے یا کسی نے سونا چاندی یا گوہر کی دوکان کھولی ہے جہاں ان چیزوں کو پانے کے لئے بہت سے گراہک آ کر ان چیزوں کو دیکھ کر اپنے اپنے تاثرات پیش کرتے ہیں لیکن میں اس بزم کو یہ نہیں کہوں گا کہ بزم کسی خاص بات پر مبنی ہے دراصل یہ بزم عشق اور حسن پر مبنی ہے جس کی تشبیہ میں سونا چاندی جیسے زیورات بیچنے والوں کے ساتھ دیتا ہوں۔

اُس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہر کے غالب گنبدے در کھلا

اب شاعر غزل کو لکھ کر مقطع میں اس مطلع کو وابستہ اس طرح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس اُمید میں بیٹھا ہوں کہ مجھے بھی ان زیوارت میں سے کوئی زیور حاصل ہو جائے۔ مطلب میں اگر معشوق سے محبت کرتا ہوں جس کی وجہ سے مجھے زیورات سے کوئی نہ کوئی زیور حاصل ہو جائے لیکن افسوس ہے اے معشوق! میں جب ان زیورات کی دکان دیکھنا چاہتا ہوں تو یہ دکان بند ہوتی ہے۔ ہر شہر میں جا کر ایسی دکان کو بند دیکھ کر یہ کہتا ہوں اے غالب میرے لئے ہر ایک شہر میں ایسی دکان کیوں بند ہو جاتی ہے۔ کیا میرے دیکھنے سے اس دکان کی رونق خراب ہو جائے گی۔ پھر بھی میں اس بند دکان کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں یہ احساس پاک محبت کے اصولوں کے تحت ظاہر کر رہا ہوں۔

غالبؔ کے دور میں بھی تمام دنیا کے شہروں کو خاص ترجیح دی جارہی تھی، اسی لئے غالبؔ شہر کے ساتھ وابستہ ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ اگر ہمیں کسی بزم سے رجوع ہونا ہے تو ایسے بزم سے رجوع ہونا چاہئے جس کا قیام شہر میں مستقل ہو کیونکہ گاؤں کی حالت ان دنوں اچھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس بات کا احساس ہمیں لفظ شہر سے ملتا ہے۔ کیونکہ شاعر خود یہ کہتا ہے کہ جب شہر میں بزم ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے شہنشاہ نے ایسا دفتر کھولا ہے جس کو دیکھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ اے خدا اس دفتر میں زیورات گوہر جیسے دیکھنے میں آتے ہیں۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ ایسے ایسے آدمیوں کو اس بزم میں شرکت کرنے کے لئے دعوت دی جارہی تھی جو کہ شہر کے آنے کے قابل ہوں اور جن کی قلم میں لکھنے کی قوت ہو اور ان کا فن پارہ ایک بہت ہی بہترین ثابت ہو اور ایسے فن پارے کو شہنشاہ گوہر سے تشبیہ دے کر محفل کو سجائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اسی شعر کے خیال میں مقطع کو وابستہ کر کے یہ شعر شاعر نے اسی جذبہ سے لکھا ہے کیونکہ شہنشاہوں کے بزم میں ہی اکثر شاعر اپنا کلام سنا کر محفل کو گوہر جیسے زیورات کی صورت میں سجاتے رہے۔ اسی لئے مقطع میں شاعر فرماتا ہے کہ میری طاقت اتنی نہیں کہ میں اس محفل کو بند کروں اور یہ کہوں کہ اس محفل کو زیادہ ترجیح شہروں میں کیوں دی گئی ہے۔ کیا گاؤں میں ایسی محفل آراستہ نہیں ہو سکتی اور ہمیشہ ایسی محفل کو شہروں میں ہی ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا کہ ایسی محفل کو بند کر سکوں اور شاعر خود فرماتا ہے کہ میں ابھی اگر اس بزم میں شریک ہوا ہوں تو مجھے شہر سے واسطہ ہے۔ میں شہنشاہ کے دور میں اس محفل میں حاضر ہو کر اپنے فن پارے کا مظاہرہ کروں کہ میرا واسطہ اپنے فن پارے سے ہے۔ میں شہنشاہ کے خلاف کچھ بھی نہیں بول سکتا۔

اگرچہ میں غالب کے الفاظ کے مطلب پر بحث و مباحثہ کروں تو یہ صاف ظاہر ہے کہ غالب نے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ اس کے دور میں شہروں کو زیادہ ترجیح دی جارہی تھی بانسبت

گاؤں کے۔ کیونکہ لفظ شہنشاہ کو مطلع کے ساتھ وابستہ کر کے شاعر اپنے مقطع میں یہ کہہ رہا ہے کہ میرے کہنے سے کوئی فتحیابی نہیں ہوگی کیونکہ میں شہنشاہ کے دور میں کوئی بھی جنگ نہیں کر سکتا کیونکہ میں کوئی شہنشاہ نہیں ہوں اگرچہ میں نواب کی صورت اختیار کرتا ہوں پھر بھی میں امن کے دائرے میں نہیں ہوں۔ بزم شہنشاہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اپنی قلم سے امن کا تصور اور امن کی باتیں کہتا ہوں لیکن میں شہنشاہ کے ساتھ کوئی بھی جنگ نہیں کر سکتا۔ صرف میں یہ کہوں گا کہ شہنشاہ نے بزم کو شہر میں ہی قائم کیا جبکہ انہیں گاؤں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ اسی لئے میں فتحیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ میں باضابطہ امن مقطع میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایسا دروازہ شہر میں ہی کھولتے ہیں اور گاؤں کو ہم بھول جاتے ہیں۔

اگرچہ میں شاعر کی اس بات پر بحث و مباحثہ کروں تو میرے خیال میں ان دنوں گاؤں کی صورت حال پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ مجھے شاعر کی ان چار سطروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو امن اور قانون کا بہت ہی احترام رہا وہ ہر ایک کام امن اور قانون کے دائرے میں ہی کرتا رہا۔ اسی لئے اس نے شہنشاہ کے خلاف کوئی بات نہیں چھیڑی البتہ تاریخ داں کے لئے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ شہنشاہ کی محفل شہروں میں ہوا کرتی تھی اسی لئے گاؤں میں زیادہ ترجیح نہیں دی جارہی تھی۔ غالب نے کہا کہ میں جس شہر میں رہتا ہوں اس شہر میں دروازہ کھول کر ہی بیٹھتا ہوں۔ میں نے گاؤں کا منظر نہیں دیکھا ہے کیونکہ شہنشاہ گاؤں کی طرف کم توجہ دیتے رہے۔ اسی لئے اس بزم سے مخاطب ہو کر غالب یہ کہہ رہا ہے کہ شہنشاہ شہروں کے لئے ہی زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ میں کوئی فوجی جوان نہیں ہوں میں ایک قلمکار ہوں، غزل گو ہوں اسی لئے میں ایسی جنگ کو فتح نہیں کر سکتا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

شاعر فرماتے ہیں کہ ہر ایک صورت کو ہم پھول کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور وابستہ

کر کے ہم اپنی پاک محبت کی تصویر کھینچ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ کیا میرا معشوق گل کی طرح کی صورت وشکل اختیار کرتا ہے یا نہیں لیکن اے معشوق میں ایسی سوچ پر رضا مند نہیں ہوں کیونکہ آخر کار ہر ایک صورت کو مٹی میں ملنا ہے اور خاک میں مل کر کونسی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم صرف مرنے کے بعد اپنے اپنے نیک کاموں کی وجہ سے ہی لوگوں کے دلوں پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ جب ہم اچھے کام انجام دیں گے تو وفات کے بعد تا عمر لوگ ہمیں یاد کریں گے اور یہ کہیں گے کہ بہت ہی اچھا اور نیک آدمی تھا۔ اسی لئے اے معشوق میں صورت کو یعنی شکل کو زیادہ ترجیح نہیں دیتا میں نیک کام اور وفاداری کو ہی زیادہ ترجیح دیتا ہوں کیونکہ ہزاروں صورتیں آخر کار مٹی میں ہی مل جاتی ہیں۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

شاعر فرماتے ہیں کہ جب میں نے لالہ وگل کی بستیاں دیکھیں، اے لوگوں میں رونے لگا کہ ایسی بستیاں دیکھ کر مجھے یہ احساس پیدا ہوا کہ آخر کار اِن بستیوں میں بھی ایسی رونق تا ابد نہیں رہنے والی۔ یہ بستیاں بھی ویراں ہوسکتی ہیں۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ اگر چہ ہم بستیوں میں جا کر بہت سی اچھی اچھی صورتیں پائیں گے تو ہمارا دل صاف نہیں رہے گا ہمارے دل میں بے ایمانی پیدا ہوسکتی ہے۔ اسی لئے میں ان بستیوں کے لوگوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ نہیں سوچنا کہ ہم ایسی بستی میں رہتے ہیں کہ جہاں لالہ وگل دیکھنے میں آتے ہیں یہ سوچ اپنے دماغوں میں کبھی نہ رکھنا۔ جب ان صورتوں کو غیر بستیوں میں دیکھے گا تو وہاں کے لوگ کچھ نہ کچھ امن میں خلل پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر آپ خود یہ کہو گے کہ غلام بستیوں میں رہ کر خوبصورتی نے ہمیں برباد کیا۔

میرے خیال میں شاعر نے یہ کہا ہے کہ جب ہم نئی بستی قائم کرتے ہیں تو اس بستی میں اچھے اچھے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ پھر جب ہم اس بستی میں گھومنے جاتے ہیں تو لوگوں پر ہماری

نظریں پڑتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی بستی کو دیکھ کر خوش رہتے ہیں۔ یہ سوچتے ہیں کہ ہماری نئی بستی بہت ہی بہترین ہے۔ مکان بھی اچھے طریقے سے تعمیر کئے گئے ہیں لوگ بھی اچھے ہیں۔ میرے خیال میں شاعر فرماتا ہے کہ جب ان بستیوں کو کوئی غیر آدمی دیکھنے کے لئے آتا تو وہ ایسی بستی کو اپنے محلے کی بستی سے تشبیہ دے کر یہ کہتا ہے کہ میری بستی میں ایسے اخراجات دیکھنے میں نہیں آتے ہیں جیسے کہ اس بستی میں دیکھتا ہوں۔ تو یہ دیکھ کر وہ یہ اندازہ لگا کر ان لوگوں سے کہنا چاہتا ہے کہ آخر یہ بستی ملیا میٹ ہو جائے گی اور اپنے محلے کی بستی سے تشبیہ دے کر اسے بہت ہی دکھ ہوتا ہے لیکن جب تاریخ کے پس منظر میں ان چار مصروں کا مطالعہ کریں گے تو یہ کہیں گے کہ دور شہنشاہ یا دور غالب میں بھی کئی محلوں اور گاؤں کو آباد کرنے کے لئے اقدام اٹھائے جاتے تھے۔ اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر غالب شعر کو لکھتا ہے تو اس بات کا احساس بھی دلاتا ہے کہ کوئی وابستگی حکمرانوں کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے کئی بستیاں نئے سرے سے آباد نہیں ہوئیں۔ جس سے کہ ان لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لئے غالب امن کو ترجیح دیتے ہوئے یہ کہہ رہا ہے کہ میں ایسے شعر کو تاریخ داں کے لئے تحریر کرتا ہوں تاکہ اسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ ان دنوں کے لوگ امن کے ماحول میں ہی رہا کرتے تھے اور وہ قانون کے دائرے میں ہی اپنا کام انجام دیتے تھے۔

اگر چہ ہم غالبؔ کے مقطع کے مفہوم کو سمجھیں گے تو خود غالبؔ ان نئی بستیوں کو دیکھ کر کہہ رہا ہے ہمیں افسوس ہے کہ ہم ایسی بستیوں کو آباد نہیں کر سکے جہاں لوگوں کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے ہے۔ میں ان لوگوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ امن کے ماحول میں اور قانون کے دائرے میں رہ کر بستیوں کو ٹھیک کیا جائے۔ میں ان لوگوں سے بھی مخاطب ہوتا ہوں جن لوگوں کی بستیاں بالکل ویران ہیں اور جنہیں دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اب اس بات کا صحیح اندازہ ہونا چاہئے کہ غالب خود فرماتے ہیں کہ امن میں ہی کام انجام دینا چاہئے۔ فتحیابی ان لوگوں کو تب ہو سکتی ہے جب وہ صبر و تحمل سے کام لیں۔ گلہ شکوہ نہ کریں کہ ان کی بستیوں میں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ ان کا بھی خیال رکھے۔امن کے ماحول اور دائرے قانون میں ہی ہمیشہ ہر کام ہونا چاہیئے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ ''تو کیا ہے؟''
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق آپ میرے ہر ایک کام پر دعویٰ کرتے ہو کہ آپ کون صاحب؟ اے معشوق کیا یہ بات کرنے کا سلیقہ ہے۔ ہر بات پر تم ہمیشہ مجھ پر سوالوں کی بوچھار کرتی ہو لیکن سوالوں کا جواب دینے پر بھی آپ کبھی باہمی گفتگو کرنے میں رضامند نہیں ہوتی ہو۔ میں پاک محبت کے اصولوں پر چلنے والا معشوق ہوں، میں ہر ایک بات لڑائی کے ذریعہ حل نہیں کرتا۔ میں ہر ایک بات امن کے دائرے میں ہی کرتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی کسی کے ساتھ جنگ نہیں کی کیونکہ میں جنگجو نہیں ہوں۔ میں اپنی شرارت کو جلا کر ندامت قائم ودائم رکھتا ہوں۔

ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگر نہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

غالب فرماتے ہیں کہ میں نہ کسی بات پر بھی سوال و جواب کرتا ہوں اور نہ کیا ہے تو اس مقطع میں میں نے ہر ایک بات باہمی گفتگو کر کے ہی ہر ایک کام ہر ایک کے ساتھ انجام دیا ہے مطلب صلاح و سمجھوتہ سے ہی کام کرنے والا شاعر ہوں۔ پھر یہ نہیں کہنا کہ شہر کا رہنے والا ہوں یا لڑائی کرنے والا ہوں۔ شہر میں خواندگی کا دور ہونے کے ناطے ہم کبھی بھی لڑائی جھگڑے میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اے معشوق مجھے یہ شک ہے کہ آپ شہر کی رہنے والی نہیں ہو تبھی تو آپ ایسے سوالات کرتی ہو جس سے تناؤ پیدا ہوتا ہے۔

اب میں ان چاروں مصروں کی مشابہت اس طریقے سے کرتا ہوں کہ ان دنوں شہر اور گاؤں میں دو قسم کے تناؤ ہوا کرتے تھے جس سے کہ شاعر کو مطلع میں یہ کہنا پڑا کہ ہر کسی بات پر

نقطہ چینی ہوتی ہے اور اس کو ختم کرنے کے لئے باہمی گفتگو کا رجحان پیدا کیا جاتا۔ اسی طرح سے مقطع میں شاعر فرماتا ہے کہ شہر کے رہنے والے زیادہ تر نقطہ چینی نہیں کرتے وہ ہر ایک کام صلاح و سمجھوتہ سے ہی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں غالبؔ شہر اور گاؤں کی مماثلت دو حصوں میں بیان کرتا ہے۔ میرے خیال میں معشوق کو شہر کے ساتھ نہ جوڑ کر معشوق کو گاؤں سے جوڑ رہا ہے۔ تاریخ داں کیلئے یہ ایک اہم نقطہ ہے کہ غالبؔ کے دور میں شہر کے لوگ بہت ہی بہترین سمجھے جاتے رہے۔ اگرچہ ہم غالبؔ کے مقطع میں لفظ غالب پر ہی بحث ومباحثہ کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فتحیابی امن کے ماحول اور قانون کے دائرے میں ہی ہوسکتی ہے ورنہ لڑائی جھگڑے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

اسی لئے میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب جنگ کے بغیر یا گستاخی کئے بغیر اپنی فتحیابی نرمی سے حاصل کرنا چاہتا ہے اور قانون کے دائرۂ اختیار میں ہی ہر کام انجام دینا چاہتا ہے۔ اب ہمیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہئے کہ ہر ایک کام امن کے ماحول اور دائرے قانون کے تحت ہی انجام دینا چاہئے۔

غالب نے ہر ایک شہری اور بستی والے سے یہ درخواست کی ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں اپنی زندگی کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کو امن کے ماحول میں ہی کام کرنا چاہئے۔ آج کے دور میں بستیوں اور شہروں کو ٹھیک کرنے کیلئے جمہوری طرز کے نمائندے کام انجام دیتے ہیں اور لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں اور وہ کام امن کے ماحول اور دائرے قانون کے تحت ہی انجام دیتے ہیں۔ اگرچہ غالب کے دور میں جمہوری طرز کا نظام نہیں پایا جاتا تھا لیکن آج کے دور میں جمہوری طرز کا نظام پا کر ہمیں اپنے وطن کے شہروں اور کئی بستیوں کا نظام امن کے ماحول اور دائرے قانون کے تحت قائم کرنا چاہئے۔

وطن سے مخاطب ہوتے ہوئے شہروں اور بستیوں کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کئی باغوں پر بھی ہماری نظریں پڑتی ہیں اور ان کے حالات دیکھ کر اپنے اپنے خیالات بیان کرتے

ہیں۔اسی طرح سے غالب نے اپنے تاثرات اپنے شعروں میں بیان کیے ہیں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

شاعر فرماتے ہیں جب ہم اپنے معشوق سے ناامید ہوتے ہیں اس ناامیدی سے غم محسوس ہوتا ہے۔آپس میں جدائی کی باتیں کرنے سے ہی تناؤ پیدا ہوتا ہے۔یعنی کسی بھی ٹکراؤ سے یا پاک محبت میں دور رہنے سے عیش وعشرت کے سامان میسر نہیں ہوتے ہیں۔عیش و عشرت کے سامان میسر ہونے کے لئے ہمیں جدائی کے دور میں رونا پڑتا ہے۔ایسا رونا پڑتا ہے کہ ان آنسوؤں کا دریا بہہ جائے اور جسے دیکھ کر درد ایسا محسوس ہو کہ لوگ کہیں کہ معشوق کی جدائی سے دریا نمودار ہوا اور اب دریا کو کم کرنے کے لئے مطلب آنسو کم کرنے کے لئے کوئی ایسی دوائی میسر ہونی چاہئے کہ جس سے ہمیں یہ محسوس ہو جائے کہ ہم نے اس دوائی سے درد کو قابو میں رکھ کر وصل بھی حاصل کیا۔اے معشوق پاک محبت میں مَیں نے کوئی بھی وصل حاصل نہیں کیا میں نے دریا ہی حاصل کیا۔ان آنسوؤں سے میں کبھی بھی جدا نہیں رہا۔

اب شاعر مقطع میں اس مطلع کا وابستہ اس طرح کرتا ہے

بخشے ہے جلوہ گل، ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غالبؔ فرماتے ہیں اے معشوق پاک محبت میں جب دریا رونما ہوا تو دریا کے ساتھ ساتھ پھول بھی ابھرنے لگے اور ان پھولوں کو دیکھنے کے لئے لوگوں میں ذوق اور شوق پیدا ہونے لگا کہ ہم ایسے پھولوں کو دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ ہمیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ ایک چشمہ ایسا پیدا ہوا ہے کہ جس چشمے کو معشوق نے جدائی سے نمودار کیا ہے اور اس میں رنگ برنگے پھول پیدا ہوئے ہیں اور ان پھولوں کو دیکھ کر لوگ کتنے خوش ہوئے ہیں۔

جب میں ان چار مصرعوں کا مفہوم لکھتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ شاعر غالبؔ نے کشمیر کا

بھی دورہ کیا ہوگا۔ جہاں ڈل جھیل میں کنول ابھرتے ہیں۔ غالب فرماتے ہیں کہ ان پھولوں کو دیکھنے کے لئے لوگ ترستے ہیں اور کیسے چشمے کے ساتھ پھول ابھرے ہیں۔ اب میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ دراصل غالب نے اس بات کا بھی احساس دلایا ہے کہ پاک محبت میں میں نے کبھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ میں نے اپنے معشوق کو دور سے دیکھ کر صرف اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں روبرو ملوں۔ میں نے جدائی میں رونا اختیار کیا لیکن کبھی بھی روبرو ملنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بہت سے اشعار اور غزلیں لکھیں جن سے میری شہرت ہوئی اور ان غزلوں کو پڑھ کر لوگوں میں احساس پیدا ہوا اور یہ کہنے لگے کہ غالب کو معشوق کی جدائی پر خدا نے اسے قلم بخشا اور جب بھی میں اس دنیا سے رخصت پذیر ہوؤنگا تو میری قبر پر لوگ میری قلم کے ہنر پر پھول برسائیں گے اور اس کا جلوہ دیکھنے کے لئے زار زار روئیں گے اور میری اس جدائی پر خوش بھی رہیں گے اور وا کا لفظ بھی استعمال کریں گے۔ اب میں مقطع کے الفاظ کے تحت یہ بیان کرتا ہوں کہ میں نے پاک محبت کی لیکن میں نے کوئی لڑائی جھگڑا مول نہیں لیا۔ میں نے امن کے ماحول میں اور قانون کے تحت اپنی قلم سے بیان بازی شروع کی اور یہ بیان کیا کہ مجھے جدائی سے ایسے ایسے پھول نمودار ہوئے جن کو دیکھنے کے لئے لوگ تڑپیں گے اور میرے رخصت پذیر ہونے کے بعد وہ میری قبر میں تا ابد پھولوں کا گلدستہ پیش کریں گے اور تاریخ میرے لئے سنہرے الفاظ سے میرے واقعات کا ذکر کریگی۔ اب ہم اس بات پر پورا یقین کریں گے کہ غالب نے کبھی بھی غلط کام نہیں کیا۔ اس نے امن کے ماحول میں اور قانون کے دائرے میں ہی کام کیا ہے۔ اگرچہ ہم ان چار سطروں کا مطلب پڑھ کر سوچیں گے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب بھی ہم کسی باغ میں داخل ہو جائیں گے یا کسی گلستان میں داخل ہو جائیں گے تو مناظر دیکھیں گے تو مناظر دیکھ کر ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ہمیں باغ میں صرف گلوں کو دیکھنا ہے، ہمیں چشمہ دیکھنا ہے اور ہمیں ہاتھ سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی تا کہ اس کا حسن اچھی طرح رہے۔

خطر ہے رشتہ اُلفت رگِ گردن نہ ہوجاوے
غرور دوستی آفت ہے تو دُشمن نہ ہوجاوے

غالب فرماتے ہیں کہ زیادہ دوستانہ تعلقات رکھنے سے ہمیں کسی وقت اپنا سر جھکانا پڑتا ہے لیکن شاعر سر جھکانے کے خلاف ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ سر جھکانے سے بہتر ہے کہ خطرہ ہی مول لے لیا جائے کیونکہ اگر معشوق کے اصولوں میں الفت ہے تو گردن کیوں جھکائی۔ ہمیں گردن جھکانے سے بہتر یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمیں ایسی دوستی سے وابستگی نہیں رکھنی چاہئے۔ اس سے بہتر ہے کہ دوستی ہی نہ رہے اور دشمنی ہوجائے لیکن اپنی گردن کبھی نہیں جھکانی چاہئے۔ اسی لئے شاعر فرماتا ہے کہ اگرچہ مجھے پاک محبت ہے لیکن میں پاک محبت میں معشوق کے سامنے گردن نہیں جھکاتا۔ میں کئی اصولوں پر کاربند ہوں اور مجھے اپنے اصولوں پر فخر ہے اور اپنے اصولوں کو دوستانہ تعلقات سے ہی نبھاتا ہوں۔ کبھی دوستی میں بگاڑ بھی ہوتا ہے لیکن آپسی باہمی تعلقات سے دوستی قائم ودائم رکھنی چاہئے۔ دوستانہ تعلقات سے ہی اچھے اور برے کا فرق معلوم ہوتا ہے جس سے کہ ہمیں امن کے ماحول میں ہی اپنے تعلقات ٹھیک رکھنے چاہئے۔

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

شاعر اپنے مقطع میں فرماتے ہیں میں شکر کرتا ہوں اگرچہ کسی کام میں مجھے دیر ہوتی ہے، دیر اس طرح جس طرح گل کا وقت اختتام پذیر ہوتا ہے۔ مطلب جب گل سوکھ جاتا ہے تو اس کی خوبصورتی کم ہونے لگتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کسی غلطی کو برداشت کرتے کرتے سوکھ نہ جاؤں اور اسی طرح کسی کے پاؤں تلے نہیں روندا جاؤں۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ ابھی تک آپ نے برداشت قوت دی جس کے باعث میں نے صبر وتحمل سے ہر کام کو بخوبی انجام دیا۔ اے معشوق میں یہ نہیں جانتا کہ اگر آپ کی شکل گل جیسی ہے لیکن میں آپ کی قیامت اس طرح سے نہیں دیکھنا چاہتا مطلب میں آپ کی صورت اس طرح کی نہیں دیکھنا

چاہتا جسے لوگ سوکھی ہوئی کہیں ۔سوکھنے کے بعد وصل کا اب کیا فائد۔اے معشوق میں ایسا وصل چاہتا ہوں کہ اتنی کوتاہی نہ ہو جائے کہ آپ کا بچپنا برباد ہو جائے۔ خیر میں پھر بھی آپ سے یہ باتیں دوبارہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے پاؤں کے نیچے نہ روندا جاؤں۔عزت اور احترام سے آپسی گفتگو اور وصل ہو جائے۔

جب میں ان چار سطروں کا مطلب سوچنے بیٹھتا ہوں تو میں کہتا ہوں کہ میں نے غالبؔ کے مقطع پر ہی یہ کتاب تحریر کی ہے اور یہ تحقیق بھی پڑھنے والے کے سامنے رکھتا ہوں کہ وہ دیکھیں اور پڑھیں کہ غالب کی ہر ایک غزل میں مطلع کا تعلق مقطع کے ساتھ ضرور ملتا ہے اگر چہ مفہوم ایک جیسا نہیں ہے پھر بھی باتیں اور اشارے ایک جیسی سمت میں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ غالب فرماتا ہے کہ میں نے معشوق کے ساتھ الفت کا رشتہ کیا ہے لیکن میں نے دوستی کے ساتھ ساتھ دشمنی نہیں کی ہے۔نہ میں دشمن بننا چاہتا ہوں اگر میں نے معشوق کے بہت سے عیب دیکھے لیکن میں ان عیبوں کو سرعام کہنے والا نہیں ہوں۔غالبؔ مقطع میں اسی طرح کا طرز بیان کرتا ہے جیسے کہ غالبؔ فرماتے ہیں کہ میں نے اگر معشوق سے دوستی میں الفت کی لیکن میں نے وصل کے لئے برداشت کیا۔اور ایسا برداشت کیا کہ میری پاک محبت آج تک نمودار ہی نہیں ہوئی، میں ایسی پاک محبت اس طرح سے تاعمر رکھنا چاہتا ہوں جیسے کہ ایک سبزہ گل سوکھنے کے بعد گر جاتا ہے۔کیونکہ موسم کے اثرات سے سوکھنے کے بعد گر جاتا ہے اور کئی پیروں کے نیچے دب جاتا ہے لیکن میں اپنا راز اس طرح سے نہیں بتانا چاہتا ہوں اگر چہ میں پھول کی طرح سوکھ بھی جاؤں لیکن معلوم نہیں ہوگا کہ کس بات پر سوکھ گیا ہوں اور اگر چہ میرا چہرہ لوگوں کے سامنے گر بھی جائے پھر میں بات کہنے والا نہیں ہوں۔

میں نے یہ بات ان چار شعروں میں وضاحت کر کے بتائی کہ ایک غزل کے مطابق شعر کا مفہوم، دوسرا مقطع کے مطابق مفہوم اس طرح ہے:

غالبؔ کے دور میں عام طور پر نوابوں میں آپس میں لڑائیاں، جھگڑے ہوتے تھے

مطلب شخصی راج میں مختلف بادشاہ، فتنہ وفساد کرا کر ملک میں جنگی حالات پیدا کرتے تھے۔
میرے خیال میں غالبؔ نے اس مقطع میں ایسا ہی اشارہ دیا ہوگا اور یہ کہا ہے کہ میں اسی چیز کو
فتحیابی مانتا ہوں جو چیز امن سے حاصل ہو جائے۔ مطلب لڑائی اور جھگڑا نہیں ہونا چاہئے۔
اسی لئے غالب کے معنی فتحیابی ہے۔اس کا مطلب جب بھی کوئی فتحیابی ہمیں حاصل ہو وہ اس
صورت میں ہونی چاہئے کہ کوئی آدمی موت کا شکار نہ ہو جائے۔ ہم امن وامان سے ہر ایک
مسئلے کو حل کریں جیسے کہ غالبؔ فرماتا ہے کہ فتحیابی کے لئے ہمارے اندر قوت برداشت ہونی
چاہئے۔جس طرح ایک گل اپنی شکل دکھا کر خود بخود سوکھ جاتا ہے لیکن سوکھنے کے بعد بھی اسے
مالی نہیں کاٹتا اور لوگوں کو دکھانے کے لئے باغ میں اسے رکھ کر یہ نصیحت دیتا ہے کہ گل کاٹنے
سے نقصان ہوتا ہے۔ اگرچہ سوکھ جائے گا پھر بھی لوگوں کو نصیحت حاصل ہوگی کہ یہ سوکھا گل
پیروں کے نیچے آرہا ہے۔سوکھ کر پیروں کے نیچے آنا مالی بہتر سمجھتا ہے بہ نسبت گل کو کاٹنے
کے۔اسی طرح سے شاعر فرماتا ہے کہ فتحیابی قوت برداشت اور امن سے حاصل ہوسکتی ہے نہ
کہ کسی کو دکھ دیکھنے سے یا کسی پر ظلم وستم کرنے سے۔غالبؔ امن کا پیغام دے کر ہمیں یہ کہہ رہا
ہے کہ ہر ایک کام امن کے ماحول میں اور دائرے قانون کے اندر انجام دینا چاہئے۔
مجھے یہ کہنا ہے کہ پیغام غالب ہمیں اپنی غزلوں میں بہت سی نصیحتیں فراہم کرتا ہے۔
جیسا کہ ناگہانی میں ہم لوگ کسی چیز کا شکار ہوتے ہیں۔کبھی آگ نمودار ہوتی ہے تو کبھی طوفان
یا سیلاب آتا ہے۔غالب نے اپنے مقطع میں ناگہانی کا لفظ بہت ہی اہم بات کہنے کے لئے
استعمال کیا ہے۔غالبؔ کے مطابق اگر ہم امن کو یا قانون کو برباد کرتے ہیں تو ہمیں بہت
نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسی لئے پیغام غالب میں ہر ایک انسان کے لئے نصیحت ہے
کہ اگر وہ امن کو درہم برہم کرنے لگتا ہے تو وہ سیلاب کا یا کسی ناگہانی آفت کا شکار ہوتا ہے۔
کیا اس وقت قدرت نے اپنے مناظر دکھا کر ناگہانی آفت نہیں دکھائی۔ ناگہانی آفت اسی
لئے دکھائی تاکہ انسان کو نصیحت حاصل ہو جائے کہ اگر ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو لازم نہیں

کہ وہ چیز فراہم ہو جائے۔ ہمیں شہنشاہوں اور نوابوں سے صرف امن کی ہی فریاد کرنی ہے نہ کہ فساد کی۔ اسی طرح موجودہ جمہوری دور میں ہمیں اپنے رہنماؤں کو مسائل سے واقف کرانا ہے۔ نا کہ ہم فساد یا قانون شکنی کریں جس سے ملک کی اقتصادی حالت برباد ہو۔

کوئی دین گر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

شاعر فرماتا ہے کہ اگرچہ مجھے معشوق کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا تو وصل بھی نہیں ہوا اور گفتگو بھی نہیں ہوئی، لیکن کیا معشوق کو معلوم ہے کہ اس کا محبوب اسے ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں وہ نہیں جانتے یا اگر وہ جانتے بھی ہوں گے تو کئی وجوہات سے وہ نہیں ملیں گے، لیکن میں پاک محبت کے اصول پر چلنے والا شخص ہوں۔ میں اس دین کا بندہ نہیں جس کو لادین کہیں۔ میرے دین میں اصول ہے۔ انہیں اصولوں کے تحت میں پاک محبت کے اصول پر چلتا ہوں اور اسی دین کے تحت میری زندگی بہت ہی خوشحال رہے گی اور عمر دراز ہوگی۔ میں دل سے یہ کہتا ہوں کہ معشوق مجھے بھی چاہتا ہے اور میں بھی اس کو چاہتا ہوں اور اسی سوچ کی وجہ سے میری عمر دراز ہوگی اور یہ بات دعویٰ سے کہتا ہوں کہ کسی نہ کسی بہانے معشوق سے ملاقات ضرور ہوگی۔

مقطع میں شاعر فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں نے مطلع میں یہ کہا کہ میری زندگی بہت لمبی ہے جو ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ اگر کسی انسان کو غم نہ ہو تو وہ لمبی عمر جیتا ہے لیکن اب مقطع میں فرماتے ہیں کہ اگر عمر دراز بھی ہوگی لیکن بہت ہی خطرناک چیزوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑ سکتا ہے جیسا کہ اگر کبھی ناگہانی آفت آجائے تو میں بھی اس میں ملوث ہو سکتا ہوں۔ تو عمر درازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اگر کوئی آدمی راستے میں کسی گاڑی سے حادثہ کا شکار ہوتا ہے تو اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں مرحوم کہلایا جاتا ہے۔

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام
اک مرگ ناگہانی اور ہے

اب میں مقطع کے بارے میں یہ کہوں کہ غالب کے معنی فتحیاب ہے اگر اس لحاظ سے مقطع کی تشبیہ کریں تو اس طرح ہے:

جب ہم کسی چیز پر فتحیابی حاصل کرتے ہیں، فتح کرنے کے بعد ہم یہ نہیں سوچتے کہ کس چیز سے مقابلہ کرنا ہے۔ ہم گھمنڈ میں رہتے ہیں لیکن جب ناگہانی آفت آتی ہے تو یہ فتحیابی بربادی بن جاتی ہے اور گھمنڈ بھی دماغ سے ختم ہوجاتا ہے۔ اسی لئے مقطع میں غالب لفظ کے معنی کے لحاظ سے مفہوم کچھ اس طرح ہے:

فتح کرنے کے بعد ہمیں کسی بات کا شکوہ نہیں ہوتا ہے۔ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ناگہانی آفتوں سے دور رہنا چاہئے اور کسی بھی ناگہانی آفت کو دیکھ کر مرگ کی صورت اختیار نہیں کرنی چاہئے۔

جب میں ان چار سطروں کا مطلب پیغام غالب کے لحاظ سے سوچتا ہوں تو یہ کہوں گا کہ جب بھی ہم زندگی کو خوشحال دیکھتے ہیں اور ہم اپنی زندگی کو لم دراز عمر میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ لم دراز عمر ہونے کے وقت یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں کسی ناگہانی آفت کا مقابلہ نہیں کرنا۔ اگر لم دراز عمر میں ناگہانی آفت آہی جاتی ہے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ کسی بھی طرح مرگ شکار نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ اگر حادثہ میں موت ہوجائے یا لنگڑا پن جسکی وجہ سے چلنے پھرنے کی قوت ہی نہ رہے۔ ایسی لم دراز عمر سے کسی کو بھی فائدہ نہیں ہے۔

میں اب پیغام غالب کا انداز بیان امن اور قانون کے ساتھ وابستہ کر کے یہ کہہ رہا ہوں کہ غالب کے ان چار سطروں سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں کبھی بھی ایسی بات نہیں کرنی چاہئے جو امن کو ختم کرے اور قانون کی حد میں ہر ایک کام کرنا چاہئے۔ ہم اس بات سے بھی واقف ہیں کہ حکومت کے سربراہ ہماری مانگیں پوری نہیں کرتے لیکن اس وقت

ہمیں بات چیت کے ذریعہ دروازے کھولنے چاہئیں اور امن کے ماحول میں کام انجام دینا چاہئے۔تا کہ اقتصادی بحران نہ ہو سکے اور کئی جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ایک ملک کو دوسرے ملک سے جنگ کرنے سے باز آنا چاہئے۔ہمیں جنگ سے پہلے یا فتح ہونے سے پہلے نصیحت لینی چاہئے کہ فتحیابی ہو یا ہار ہو کسی نہ کسی وقت نا گہانی آفت کا مقابلہ کرنا ہے۔جس سے ہمیں نصیحت ملتی ہے کہ فساد کرنا اور قانون کے خلاف کام کرنا بہت ہی غلط ہے۔

جب میں نے غالب کے شعروں پر لفظ نا گہانی پر بحث کی تو میں نے پیغام غالب پر یہ سوچا کہ غالب نے اپنی غزلوں کے مقطع میں نا گہانی کا لفظ ایک ہی مقطع میں بیان کیا ہے اور میں نے سوچا کہ پیغام غالب کے لئے بہت ہی بہترین لفظ رہے گا۔اس کے بعد میں نے غالب کی غزلوں میں لفظ پڑھا جسے غالب نے دو غزلوں کے مقطع میں بیان کیا ہے۔مطلب دیوانِ غالب میں غالب نے لفظ آتش دو مختلف غزلوں کے مقطع میں بیان کیا ہے۔اب میں پیغام غالب کے زیر اہتمام یہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوانِ غالب میں آتش کا لفظ غزلوں میں دو ہی بار استعمال کیا گیا ہے لیکن ہم پیغام غالب کا تعلق امن اور قانون کے طرز میں بھی بیان کرتے ہیں اسی لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے امن اور قانون کے لحاظ سے یہ کہا ہے کہ ہمیں نقص امن کے ساتھ آتش کا استعمال کم کرنا چاہئے۔آتشزدگی، آگ زنی ایسی چیزوں سے ہمیں دور رہنا چاہئے۔نظام چاہے شخصی راج ہو یا جمہوری ہو ہمیں لفظ آتش سے دور رہنا چاہئے اور نا گہانی آفتوں میں ملوث نہ ہو کر باہمی امداد لوگوں کو پہنچانی چاہئے اور لوٹ کھسوٹ سے بچنا چاہئے۔نظام امن میں ہی چلنا چاہئے۔غیر قانونی طریقوں سے بھی بچنا چاہئے۔جیسا کہ غالب فرما رہے ہیں۔

نکتہ چیں ہے غم دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

شاعر فرماتے ہیں کہ جب میں نے معشوق کے ساتھ اپنی پاک محبت کا باہمی اشتراک کیا

تو اس اشتراک پر اکثر لوگوں نے نقطہ چینی کی لیکن جو جو مجھے اور میرے معشوق کو مخالفت سناتا رہا دونوں نے مخالفت سنی اور سن کر یہ کہنے لگے کہ اس دنیا میں نقطہ چینی کرنے والے زیادہ ہیں اور محبت کو جوڑنے والے کم ہیں۔ لیکن میں نے پاک محبت میں کسی بھی نقطہ چینی کو تسلیم نہیں کیا نہ میرے معشوق نے نقطہ چینی کو تسلیم کیا۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

غالب فرماتے ہیں کہ اپنے مقطع میں جب میں نے مطلع میں بیان کیا کہ لوگوں نے میری پاک محبت پر نقطہ چینی کی نہ میں نے توجہ دی اور نہ میرے معشوق نے توجہ دی، ہم یہ سنتے اور کہتے رہے کہ ہمیشہ سے اس دنیا میں نقطہ چینوں کی اکثریت زیادہ ہے اور محبت جوڑنے والوں کی اقلیت ہے۔ تو پھر مقطع میں غالب نے فرمایا کہ ہم پاک محبت میں نقطہ چینی نہیں کرنے والے ہیں کیونکہ ہمارے دل میں محبت ابھری ہے اور اس ابھرنے سے ہمارے میں باہمی آگ ظاہر ہوئی ہے اور اس آگ کو کوئی بھی شخص خواہ وہ نقطہ چیں ہو یا کوئی فتنہ باز ہو ایسی آگ کو نہیں بجھا سکتا ہے اور نہ ایسی آگ بجھ سکتی ہے۔

غالبؔ کے معنی ہیں فتح کرنا اس لحاظ سے اگر ہم مقطع کا مفہوم سمجھیں گے تو اس صورت میں شاعر فرماتے ہیں کہ میں جب بھی عشق کی آگ میں جلتا ہوں فتح کرنے کے بعد اس آگ کو کوئی بھی میرے بغیر نہیں بجھا سکتا ہے کیوں کہ میں نے فتحیابی پاک محبت میں معشوق کے ساتھ کی ہے۔ اب اس کو کوئی ایسے دشمن آگ لگانا چاہتے ہیں لیکن میں نے ایسی فتحیابی حاصل کی ہے کہ آگ نہیں لگا سکتے۔ جیسے کہ سمجھو میں نے فتح کیا ہے اور آگ لگائی ہے میرے بغیر اس آگ کو کوئی بھی بجھا نہیں سکتا ہے۔ مطلب میں نے عشق اور حسن کی لڑائی میں فتح حاصل کی ہے۔

اب میں پیغام غالب کے حوالے سے ان چار سطروں کو اس انداز سے بیان کرتا ہوں کہ غالب نے یہ کہا ہے کہ نقطہ چینوں کے ساتھ وابستگی نہیں رکھنی چاہیئے لیکن نقطہ چینی سننی چاہیئے

سن کر داد دینی چاہئے اور جو بھی کام انسان کو نبھانا ہو وہ نبھانا چاہئے۔ جب بھی ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو کئی ایسے کام ظاہر ہوتے ہیں جس سے محبت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں اس بگاڑ سے دور رہنا چاہئے اور بگاڑ کرنے والے کو یہ نصیحت کرنی چاہئے کہ ایسی آگ کو ہم نہیں بجھا سکتے ہیں۔

پیغام غالب کا انداز امن اور قانون کے دائرے میں اگر لائیں گے تو ہم کہیں گے کہ امن کو بگاڑنے کے لئے اور قانون کے خلاف بہت سے عناصر مختلف مما لک میں کام کرتے ہیں۔ ان کا کام ہی یہی ہے کہ نقص امن ہو جائے لاقانونیت پیدا ہو جائے لیکن نقطہ چیں کرنے والوں سے ہمیں پرہیز کرنا چاہئے، ہمیں نکتہ چینی سننی چاہئے لیکن اس پر عمل اگر کرنا بھی ہو تو امن سے، امن کو بگاڑنا نہیں، ہمیں قانون کے ہی زد میں ہر ایک کام کرنا چاہئے۔ جمہوری دور ہو یا نواب کا دور یا بادشاہی دور، ہمیں کسی بھی دور میں نقطہ چینوں سے باز رہنا چاہئے۔ ہمیں قانون کو اور امن کو بگاڑنا نہیں چاہئے۔ مانتے ہیں ہر ایک دور میں مخالف بھی ہوتے ہیں ان کی سرگرمیاں یہی ہوتی ہے کہ حکمران طبقے کو کمزور کریں اور نقص امن لوگوں کے ذریعہ پیدا ہو جائے لیکن پیغام غالب کے دائرے میں اگر سوچیں گے تو غالب امن اور قانون کا احترام کرنے والا شاعر دنیا میں تسلیم کیا گیا ہے۔

بہت سہی غم گیتی ، شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

غالب فرماتے ہیں کہ میں نے غم کو تہس نہس کرنے کے لئے شراب کا استعمال کیا ہے۔ میں شراب کا غلام بنا۔ ساقی کا مجھے اس غلامی پر یہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ ایک غم ہے، یہ غم کیسے ابھرا اس کی وجہ ہے کہ میں نے پاک محبت کی لیکن دھوکہ بھی ہوا، جس دھوکے کو بھولنے کے لئے میں ساقی کا غلام رہا کیونکہ جب میں اس شراب میں مست ہوتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے یہ ایک دوائی ہے جس طرح شربت لوگ پیتے ہیں اور انہیں حکیم بیماری کو دور

کرنے کے لئے پینے کو کہتے ہیں۔اسی طرح میں پاک محبت میں دھوکہ کھا کر غم کو دور کرنے اس سے دور رہنے کے لئے شراب کا استعمال کرتا ہوں۔ میں معشوق سے کہہ رہا ہوں کہ میں شراب کا استعمال نہیں کرتا اور میں ساقی کا غلام بھی نہیں رہتا۔لیکن افسوس ہے کہ مجھے اسی لئے شراب کا استعمال کرنا پڑا کہ مجھے پاک محبت میں ستم دیکھنے پڑے۔

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی

یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

غالب مقطع میں فرماتے ہیں کہ جب میں نے شراب کا استعمال کیا تو میں نے شراب کو استعمال کرنے سے پہلے یہ سوچا کہ اس سے خانہ ویرانی ہوسکتی ہے اور اپنے کنبے کو میں آگ لگا رہا ہوں لیکن کیا کروں پاک محبت میں دھوکہ کھانے پر مجھے شراب کا استعمال کرنا پڑا اور گھر کی ویرانی بھی ہوئی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب بھی میں پاک محبت کو حاصل کروں گا تو میں شراب کو چھوڑ کر یہ کہوں گا کہ اس دور کا دم تھا مطلب میں پیتا تھا لیکن اب میں پاک محبت کو حاصل کرنے کے بعد پیتا نہیں اور پرانی باتیں یاد کر کے میں یہ کہوں گا کہ وہ دم تھا مطلب اس وقت کا دور تھا۔

غالب کا معنی ہے فتحیاب اب اس مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ میں نے شراب پینے سے کوئی فتحیابی نہیں حاصل کی بلکہ میں نے خانہ ویرانی کی اور اس کو فتحیابی نہیں کہتا بلکہ جب میں ایسے برے نشے سے چھٹکارا پاؤں تو میں یہ کہوں گا کہ فتحیابی مجھے ہوئی ہے میں نے نشہ آور چیز سے پرہیز کیا جب بھی مجھے اس نشہ آور چیز کی دعوت دے گا تو میں اس سے یہ کہوں گا کہ میں نے اب اس سے جدائی اختیار کی اور اس سے دور ہونے میں فتحیابی حاصل کی ہے ورنہ میں اس فتحیابی کو فتحیابی نہیں کہوں گا بلکہ خانہ ویرانی کہوں گا۔

جب میں ان چار سطروں کا مطلب ایک ساتھ جوڑنا چاہتا ہوں تو پیغام غالب میں غالب فرماتے ہیں کہ شراب پینے والا غلط کام کرنے والا ہے لیکن مجبوری کی وجہ سے شراب کا

استعمال کرتا ہے۔ جب بھی انسان ایسے نشے سے نجات حاصل کرے گا تو اس وقت یہ کہے گا کہ ایسی چیز کو استعمال نہیں کرتا ہوں وہ اس وقت کا دور رہا۔ اسی لئے پیغام غالب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ غالب بھی شراب کے نشے کے حق میں نہیں رہا ہے۔

پیغام غالب میں اگر میں ذکر کروں تو یہ کہیں گے کہ شراب بہت ہی غلط چیز ہے اور اس سے بہت سی ویرانی کنبے والوں کو بھی اور ماحول میں بھی ہوتی ہے لیکن جن دنوں غالب نے غزل تحریر کی ہے ان دنوں بادشاہ لوگ شراب کا استعمال اسی لئے کرتے تھے تا کہ ادب نواز دوست ایسی جلد بازی نہ کریں کہ جس سے شخصی راج کے خلاف آواز اُجاگر ہو جائے۔ اسی لئے شاہی محلوں میں بادشاہ شراب کا استعمال کیا کرتے تھے اور دانشوروں کا شراب سے احترام کیا جاتا تھا۔

پیغام غالب کے دائرے میں اگر میں ان چار سطروں کا مطلب آج کے دور کے ساتھ جوڑوں تو میں یہ کہوں گا کہ کئی عناصر غنڈہ گردی کے لئے اور کئی غریب لوگوں کو شراب پلانے پر مجبور کرتے ہیں یا کئی ایسے عناصر بھی ہیں جو ملک کے امن کو درہم برہم کرنے کے لئے بہت لوگوں کو شراب پلاتے ہیں اور امن کو سپرد آتش کرتے ہیں، مطلب نقص امن پیدا ہوتا ہے اور قانون کو ضرب لگتی ہے۔ اسی لئے پیغام غالب میں بھی ہمیں اس بات کا احترام ان چار سطروں پر کرنا چاہئے کہ غالب خود فرماتے ہیں کہ شراب اچھی نہیں ہے اسی لئے شراب کو میں مجبوراً استعمال کرتا ہوں۔

اگر چہ ہم پیغام غالب کے شعروں پر لفظ دل پر بحث و مباحثہ کریں گے تو اس میں بھی ہمیں مختلف نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ نصیحت تب ہم قبول کرتے ہیں یہ غالب نے مقطع میں ہی لفظ دل کا استعمال کیا ہے اسی لئے پیغام غالب کے نام سے ہی میں ان مندرجہ ذیل شعروں کی تشبیہ کر کے یہ کہوں کہ غالب کا خیال پیغام غالب میں دل کے تاثرات سے کیا ہے:

غالب نے پیغام غالب میں حرف دل پر بہت سے شعر لکھے۔ یہ شعر اس نے غزلوں کے

مختلف مقطع میں بیان کئے ہیں۔ جس سے دل کا پیغام غالب ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اپنے مقطع میں دل کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں جس کو کہ ہم پیغام غالب کے تحت تسلیم کریں گے۔ اسی لئے ان مختلف شعروں کو بیان کرتا ہوں۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

اے معشوق میں آپ کی سوچ میں ہمیشہ بہت ہی پریشان ہونے لگا گویا میں آپ کے ساتھ پاک محبت کا اصول اپناتا ہوں لیکن آپ اس پاک محبت کے اصول کو ٹھکرا کر آپ اس کو آتش لفظ کے ذریعے استعمال کرتے ہو۔ مطلب میں جو بھی سچائی یا اصلیت کہتا ہوں آپ اس پر الٹا بیان بازی کرتے ہو۔ جس سے میرے دل میں آگ نمودار ہوتی ہے اور اس آگ کو بجھانے کے لئے میں کبھی دوررہ کر اپنے کو سوز میں مبتلاء کرنا چاہتا ہوں۔ میں جب بھی خاموشی میں بیٹھتا ہوں تو آپ کی آگ کو میں سوزسن کر بجھاتا ہوں۔ اے معشوق مجھ میں یہ قوت نہیں ہے کہ میں خاموشی سے بیٹھوں لیکن خاموشی اسی لئے اختیار کرتا ہوں تاکہ آگ یا آتش ظاہر نہ ہو جائے جس سے کہ عوام کو معلوم ہو جائیگا کہ پاک محبت میں آتش کا ذکر بھی آیا ہے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

غالبؔ کے مقطع اور مطلع کے ساتھ بہت ہی وابستگی پائی جاتی ہے مطلب مطلع میں غالب فرماتے ہیں کہ وہ پاک محبت میں آتش کا نظارہ نہیں دیکھنا چاہتا وہ آگ کو بجھانا چاہتا ہے اور باہمی سمجھوتہ میں اعتقاد رکھتا ہے لیکن اس کا جواب مقطع میں غالب کہہ رہے ہیں کہ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ میں ایک بڑے عہدے میں کام کرتا ہوں اور میرے حکم نامے سے لوگ ڈرتے ہیں اور میری آگ کو دیکھ کر وہ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر آتشزدگی بھی دیکھتے ہیں وہ اس دنیا سے یہ کہہ رہے ہیں کہ غالب کی آرزو جو تھی وہ پوری نہیں ہوئی ہے اسی لئے اس آتش کا نظارہ

دیکھتے ہیں، مطلب پاک محبت میں دراڑ دیکھتے ہیں تب تو مقطع میں کہتے ہیں کہ اگر آتش بازی میں نہیں کرتا ہوں پھر بھی لوگوں کو سمجھ آتا ہے کہ آپسی دراڑ ہونے کی وجہ سے آتش بازی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ آتش بازی کا استعمال خوشیوں کے دن کرتے ہیں لیکن میرے کہنے کا مطلب ہے کہ آتش کا جلوہ لوگ تماش بین بن کر دیکھتے ہیں مطلب جو آگ جلتی ہے اس کو آتش بین کے نظارہ سے دیکھتے ہیں اور مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ میں کوئی بڑا رکن نہیں ہوں، صرف میں اپنا دل پاک محبت میں کسی کو پیش کرتا ہوں۔ تب ہی پیش کرتا ہوں جب میرے معشوق کو بھی دل دینے پر رضامندی ہو۔

اب میں مقطع کے لفظ پر بحث کرر ہا ہوں، غالب کا مطلب ہے فتحیابی، دل کو فتح کیا ہے لیکن لوگوں کی نظر میں یہ فتح نہیں ہے بلکہ یہ ایک آگ ہے۔ جس آگ کو نمودار ہونے کے بعد تماشہ کی صورت میں دیکھتے ہیں اب ہمیں ماننا پڑے گا کہ غالب نے پاک محبت میں فتحیابی اس مقطع کے واقعات سے نہیں پائی ہے بلکہ ایک آگ کی صورت میں اسے ظاہر کی ہے۔

جب میں پیغام غالب میں ان چار سطروں کو لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ دل میں ہمیشہ پاکیزگی ہونی چاہئے۔ مطلب پاک محبت ہی ایک اچھی محبت عالمی سطح میں تسلیم کی جاتی ہے۔ غالب نے یہی بیان کیا ہے کہ اگر پاک محبت میں انہیں دراڑ پیدا ہوئی ہے لیکن پھر بھی وہ پاک محبت کے اصولوں پر چلتا ہے۔ خواہ اس پاک محبت میں آگ بھی ظاہر ہوئی ہے۔ غالب اسے بجھانے کی کوشش کرے گا اور پاک محبت کے اصولوں پر کاربند رہے گا۔

اگر چہ میں پیغام غالب کی ان چار سطور کو آج کل کے ماحول کے مد نظر مباحثہ کروں تو میں یہ کہوں گا کہ دنیا میں بہت ہی غلط کام عشق کے حوالے سے ہو رہا ہے، اور جس سے ہر دن بہت سی لاقانونیت پیدا ہوتی ہے اور لوگ ایسے کام سے نجات پانا چاہتے ہیں۔ کئی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جس سے کہ لوگوں کو نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ہم غالب کا تصور لوگوں کو سمجھانے کے لئے رکھیں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ غالب نے ایسی دلیل نہیں دی ہے کہ کسی کا

دل لوٹا جائے اس نے پاک محبت کے اصولوں پر اپنے تاثرات لکھے اور کوئی غلط کام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔

اب ہمیں پیغام غالب کی ان چار سطور سے یہ نصیحت فراہم ہو جائے گی کہ امن اور قانون کے دائرے میں دل کی باتوں کا استعمال کرنا چاہئے ہمیں غیر قانونی اصولوں سے دل کے جذبات کا غلط استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں پاک محبت کے اصولوں پر ہی کاربند رہنا چاہئے۔ اسی لئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں غلط کام کرنے سے نقص امن پیدا ہوتا ہے اور لاقانونیت کا تصور دیکھنے میں آتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے ہمیں پاک محبت پر ہی کاربند رہنا چاہئے۔

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپش شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا

غالب فرماتے ہیں کہ جب میں راستے پر چلتا ہوں میں کسی غیر کو دیکھتا ہوں تو میں تصور اپنے دل میں نہیں رکھتا۔ میں پاک محبت کے اصولوں پر چل کر کسی دوسرے کو معشوق نہیں کہتا میں ایک ہی تصور اپنے دل میں ہمیشہ رکھتا ہوں اور دل کو قابو میں رکھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے اگر اپنا دل دیا ہے وہ ایک ہی کو دیا ہے نہ کہ ہزاروں کو، اسی لئے میں راستے میں چلتے ہوئے یا سفر کرتے ہوئے کسی بھی معشوق کو بری نظر سے نہیں دیکھتا۔ اگر مجھے ایسا کچھ دل میں محسوس ہوتا ہے تو میں اسی وقت اس تپش کو یاد کرتا ہوں جس کے لئے مجھے بار بار یاد آتی ہے مطلب اگر میں نے دل پیش کیا ہے تو ایک ہی سے اپنا دل باندھا ہے۔

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضمون غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مقطع میں غالب مطلع کا تصور ہی رکھ کر ہمیں بتاتے ہیں کہ میں اپنا دل ایک ہی کے ساتھ باندھ کر رکھتا ہوں اور ایک ہی کو دل دے کر بندگی کرتا ہوں اگرچہ میں دل دینے پر اور اس کا

دل جیتنے پر مجھے کچھ دشواریاں پیدا ہوئی بھی ہیں لیکن میں دل کھول کر ان کی دشواریوں کو دریا کی صورت میں دکھا کر ان کا ہی ساحل باندھتا ہوں۔ غرض اگر چہ پاکِ محبت میں مجھے معشوق کے ساتھ کوئی خلش ہے لیکن میں اس خلش کو دریا کی صورت میں پا کر ساحل باندھتا ہوں میرا ذوق یہی ہے کہ میں ایک دل پر مضمون نگاری کروں نہ کہ ہزاروں پر۔ مطلب ایک ہی پر تعریف تسلیم کی جاتی ہے ہزاروں پر نہیں۔ اگر چہ ہمیں کسی چیز پر مضمون لکھنا ہو تو ہم بہت سی باتیں کہیں گے لیکن ایک ہی تصور پر۔

اگر میں اس مقطع کا مفہوم غالب کے مطلب سے بحث کروں تو غالب کا مطلب ہے فتحیابی، تو ہم مطلع کو پھر اس کے ساتھ جوڑ کر یہ کہیں گے کہ مجھے فتحیابی اس مضمون پر ہوئی ہے جس مضمون کو میں نے ایک تصور میں باندھا ہے اگر چہ اس تصور پر بہت سی مشکلات دیکھیں پھر بھی میں نے ایک ہی تصور پر مضمون لکھ کر فتحیابی حاصل کی اور ان مشکلات سے ایک دریا رونما ہوا جب میں اس دریا کو فتح کرتا ہوں تو مجھے ساحل یاد آتا ہے اور ساحل پر دیکھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے فتح ایک ہی تصور کیا۔

اب میں پیغام غالب کے دائرے میں ان چار سطوروں کا مفہوم یہ کہتا ہوں کہ غالب نے کبھی بھی اپنے دل کو کسی غیر کے حوالے نہیں کیا ہے۔ اس نے بندگی ایک ہی دل پر اور ایک ہی کو اپنا دل پیش کیا ہے۔ اگر چہ وہ راستے میں چلتا ہے یا کسی سفر میں چلتا ہے تو پھر وہ کسی غیر کو اپنا دل پیش نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اپنا دل اس کو پیش کرتا ہے جس کو اپنا دل پیش کیا ہے۔ اسی پر خود فرماتے ہیں کہ انہیں ایسے طریقے سے فتحیابی حاصل ہوئی ہے اگر بہت سی مشکلات رونما بھی ہوئی ہیں لیکن دل کو قابو میں رکھ کر فتحیابی حاصل ہوئی ہے۔

اب میں پیغام غالب کا رجحان ان چار سطوروں کو یہ کہہ کر کہوں کہ آج کے دور میں یہ ایک نصیحت ہے کہ ہمیں اپنے دل کو قابو میں رکھنا چاہئے۔ چیز دیکھنے کے لئے ہے لیکن دل کو خراب کرنے کے لئے نہیں۔ دل کو قابو رکھنے کے لئے، اگر ہم اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھیں

گے تو ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس سے انسان کے امن میں خلل پیدا ہوتا ہے اور غیر قانونیت کے اصول پائے جاتے ہیں۔ دل کو قابو میں رکھنے سے ہی قانون کا اور امن کا احترام رہتا ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

غالب کے اس شعر سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شخصی راج میں کئی لوگ احتجاج بھی کرتے رہے لفظ ہائے ہائے جو پڑھنے میں آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غالب نے یہ غزل لکھی ہے ان ہی دنوں میں کسی کے خلاف احتجاج ہوا ہوگا، کیونکہ ہائے ہائے کا لکھنا ہمیں اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ غالب نے اس غزل کو عشق کے صورت میں مرتب کیا ہے لیکن اس میں کوئی نہ کوئی اشارہ کسی پر کیا ہے۔ کیونکہ اس شعر میں غالب نے ظالم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور اس سے پورا یقین ہوتا ہے کہ ان دنوں کوئی احتجاج بھی رونما ہوا ہوگا۔ جس سے کہ ہائے ہائے کا لفظ بھی غزل میں استعمال ہوا ہے۔ اگر چہ ہم دیوان غالب میں تمام غزلوں کو پڑھیں گے تو ہم ہائے ہائے کا لفظ ایک ہی بار پڑھیں گے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غالب نے جب یہ غزل مرتب کی ہوگی تو ان دنوں کسی نہ کسی چیز پر شخصی راج میں احتجاج ہوا ہوگا۔ خیر ہم اس شعر کا مفہوم کہیں گے وہ یہ کہ شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق مجھے پاک محبت کے اصول معلوم ہیں اور میں ان اصولوں پر کاربند رہا ہوں۔ میں نے کبھی ان اصولوں کو ترک نہیں کیا ہے جب آپ مجھے چاہتی ہیں میں آپ کو چاہتا ہوں تو آپ اندر ہی سے اپنا درد محسوس کرتی ہو۔ اے معشوق میری پاک محبت پر تجھ کو بے قراری محسوس ہوتی ہوگی تو اسی لئے اپنے دل سے واویلا کرنے بیٹھی ہو۔ اور میرے خلاف بھی اپنے دل سے یہ کہتے ہوں گے کہ اے معشوق تو ظالم ہے تو نے اس ظلم کو خاتمہ کرنے کے لئے کیا کیا ہے۔ اسی لئے میں واویلا کرتا رہوں گا مطلب احتجاج کرتا رہوں گا۔ اسی لئے پاک محبت میں آپ ہی احتجاج کرتی ہو

میں احتجاج کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ میں نے کب کا دل پیش کیا ہے۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

غالب فرماتے ہیں کہ میں نے مطلع کے حساب سے مقطع مرتب کیا ہے جو میں نے غزل کے ابتداء میں کہا کہ مجھے احتجاج نہیں کرنا۔ میں احتجاج کرنے والوں میں نہیں ہوں کیونکہ میں نے پہلے ہی اپنا دل پیش کیا ہے، غالب فرماتے ہیں یہ جو عشق ہے ایسی چیز ہے جس سے پاک محبت کے اصول برباد بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے دل کو قابو میں رکھنا لازم ہے۔ اگر چہ دل کو قابو میں نہیں رکھیں گے تو وحشت کا ڈر ہے اور وحشت کے بعد لوگوں میں تجُل زدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ پاک محبت میں جو ذوق ایک ہی محبوب کے حوالے کیا ہے تو تجُل زدگی کے دوران مجھ پر ہی ہائے ہائے کے نعروں سے بوچھاڑ کی جا سکتی ہے۔ مطلب مجھ پر ہی احتجاج کیا جائے گا اسی لئے میں اس وحشت کو بالائے طاق رکھ کر پاک محبتؔ کے اصولوں میں اپنا دل قابو میں رکھتا ہوں۔

اب ہم مقطع کو غالب کے مطلب سے یوں بیان کریں گے غالب کا مطلب ہے ''فتحیابی'' فتحیابی عشق میں تب ہو سکتی ہے جب ہم دل کو قابو میں رکھیں گے اور فتحیابی کا انداز اپنے دل میں ایک ہی کو پیش کریں۔ دوسرے کو پیش کرنے سے تجُل زدگی ہو سکتی ہے جس سے فتحیابی نہیں ہوگی بلکہ احتجاج کے بہت سے طور طریقے لوگوں کے دائرے میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے غالب اپنے معنی لفظ میں یہ کہتے ہیں فتح اس طریقے کی ہونی چاہئے جس سے لوگ بھی خوش رہیں اور اپنی عزت واحترام بھی لوگوں کے سامنے رہے۔

پیغام غالب میں اگر چہ ان چار سطوروں کا مطلب میں کہوں کہ ہمیں ہمیشہ اپنا دل قابو میں رکھنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ دل کو غلط ڈھنگ میں استعمال کریں جس سے ہجوم پر مشتمل احتجاج کے مناظر دیکھنے میں آئیں۔

اگر چہ میں پیغام غالب کا ذکر آج کے دور کے ساتھ وابستہ کروں تو ہم سب یہ کہیں گے کہ جو کچھ آج کل دنیا میں دیکھنے میں آتا ہے زیادہ تر عشق اور حسن کے غلط رنگ استعمال کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔اگر چہ ہمیں امن اور قانون کو ٹھیک ڈھنگ سے استعمال کرنا ہے تو ہمیں ایسی باتوں پر چلنا چاہئے جن سے لوگوں میں بدامنی نہ پھیلے۔

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ ہمیشہ میں اپنی سادگی میں رہتا ہوں لیکن میری سادگی دیکھنے پر معشوق کو حیرانگی دل میں پیدا ہوتی ہے۔تو اس سادگی کو دیکھ کر وہ مجھ پر حسد کرتی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنی سادگی محبوب میں نہیں ہونی چاہئے جتنی سادگی دیکھنے میں آتی ہے لیکن معشوق جب اس سادگی پر بحث و مباحثہ اپنے دل سے سوچتی ہے تو پھر اس سے میری سادگی پر حیرانگی پیدا ہوتی ہے۔اس کا مطلب میں سادہ ہوں اور معشوق سادگی پر نہیں چلنا چاہتی۔اگر پاک محبت کے اصول اپناتا ہوں تو وہ سادگی کے اصولوں پر ہی اپنے دل کو پیش کرتا ہوں۔میں نے کبھی کسی کو کسی کی سادگی پر چھرا نہیں مارا ہے اگر چہ کسی نے کسی کی سادگی پر چھرا مارا ہے وہ قاتل تصور کیا جاتا ہے۔جس طرح سے جو کوئی بھی چلتا ہے ہمیں اس پر کیوں اڑچن نہیں ڈالنی ہے۔ہمیں کوئی دباؤ نہیں اور نہ کسی کو کسی چیز پر متاثر کرنا یہ قتل کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

ہے دل شوریدہ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

غالب نے مطلع میں یہ بیان کیا ہے کہ سادہ پن رکھنے والے کو لوگوں کے سامنے عزت نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ شخصی راج میں بھی ایسا مناظر دیکھنے میں آئے ہیں اگر چہ تاریخ دان کہتے ہیں کہ شخصی راج میں سادگی پن کو ہی پسند کرتے تھے لیکن غالب کے تصور سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ دانوں کا حوالہ بالکل غلط ہے لوگ سادگی کو بھی پسند نہیں کرتے

تھے مانتے ہیں کہ مطلع میں غالب کہتے ہیں کہ میرے میں سادگی ہے اگر میری سادگی پر کوئی مشکل پیدا کرتا ہے تو میں مشکل پیدا کرنے والے کو قاتل تصور کرتا ہوں اسی لئے مقطع میں غالب اسی شعر کو جوڑ کر کہتا ہے کہ ہمیں سادگی پر یہ نہیں محسوس ہونا چاہئے کہ ہم غلطی سے سادگی کا استعمال کریں۔ ہمیں آزوردہ نہیں ہونا چاہئے اپنی سادگی پر۔ ہمیں اپنی سادگی سے ہی برداشت قوت پیدا کرنی چاہئے۔ لیکن اگر کوئی سادگی پر ہمارے لئے دشواریاں پیدا کرے تو ان دشواریوں کو ہمیں ترک کرنا چاہئے۔ خود بخود دشواری پیدا کرنے والے کو رحم آئے گا اور اسی کو پھر کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تاریخ داں کہتے ہیں کہ شخصی راج میں اگر کوئی کسی غلط چیز پر آواز اٹھاتا تھا تو اس صورت میں آواز اٹھانے والے کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آج کل کی طرح ہم مانتے ہیں کہ اگر کوئی آواز اٹھاتا ہے تو آواز دبانے کے لئے کئی حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے غالب کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی راج میں ایسے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔

اب میں غالب کے مقطع کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فتحیابی نہیں ہو سکتی ہے اگر کوئی اچھے خیالات رکھنے والے کے لئے دشواریاں پیدا کرے تو وہ ان دشواریوں کی وجہ سے کبھی بھی فتحیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے سچائی کبھی بھی جھوٹ میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ فتحیابی سچائی پر ہی ہوتی ہے اور دل شوریدہ تب ہو سکتا ہے جب ہم کوئی غلط کام کریں اور لوگوں کے سامنے بدزنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے غالب اپنے شعروں میں فرماتے ہیں کہ مجھے سادگی پر ہی پورا یقین ہے اور سادگی کو قائم ودائم رکھنے سے مجھے پاک امن کے اصول کارآمد ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ میں پیغام غالب کے منظر میں ان چار سطوروں کو بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ کبھی بھی کسی کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے لیکن ایسا کام جو کہ فائدہ مند ہو۔ جس سے بربادی کے مناظر دیکھنے میں آئے اگرچہ اچھا کام ہو اس پر کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے اور رکاوٹ اس صورت میں ڈالنی چاہئے جس سے بربادی کے مناظر دیکھنے میں آئیں۔

اگر چہ میں پیغام غالب کے ان شعروں کو آج کے دور سے وابستہ کروں تو یہ کہوں گا کہ ہمیں کسی چیز پر رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے بشرطیکہ کام یا کوئی چیز فائدہ مند ہو اور اس فائدہ مندی سے ہمارے لئے قانون کے اصول اور امن کا ماحول اچھا رہے گا۔ اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ کسی اچھے کام میں روکاٹ ڈالنے والا ہی نقص امن کا بندہ سمجھنا چاہئے۔

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
اُس سے میرا مہ خرشید جمال اچھا ہے

غالب فرمارہے ہیں کہ اے معشوق جب میں راستے میں چلتا ہوں تو لوگ ہر ایک کا حسن دیکھتے ہیں، حسن کی تشبیہ کسی کے ساتھ کر کے ہنگامہ آرائی ہوتی ہے مطلب حسن کی باتوں پر تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ کئی حسن کو دیکھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کا معشوق ہی اس حسن سے بہت بہترین ہے کئی اپنے خیالات اور اپنے معشوق کے حسن کی مشابہت جمال خورشید کے برابر کرنے کا دعویٰ کررہے ہیں۔ لیکن میں ایسے ہنگامے پر اعتبار نہیں رکھتا ہوں۔ جو کوئی بھی حسن ہم دیکھتے ہیں ہمیں پاک محبت کے حسن پر ہی بحث و مباحثہ کرنا چاہئے۔ ہمیں ایسا حسن دیکھنا چاہئے جس حسن میں باتیں کرنے اور انہیں سلجھانے کا اخلاق ہو۔ اس حسن سے ہمیں کیا فائدہ جس حسن سے تناؤ پیدا ہو جائے۔ جیسے کہ ہم کسی کا حسن بازار میں دیکھ کر تناؤ میں آجاتے ہیں اس سے نقص امن پیدا ہوتا ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

گو غالب نے مطلع میں شعر فرمایا ہے کہ حسن پر ہی دنیا میں تناؤ پیدا ہوتا ہے کئی لوگ اپنے معشوق کے حسن کو خورشید کے برابر تسلیم کرتے ہیں اسی لئے مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جنت کی داستان کیا ہے، حسن ہی جنت نہیں ہے، حسن ایسی چیز ہے کہ جس سے دل خوش ہو۔ ہر ایک کو خوشحال رکھنا اور اسکے درد میں شریک ہونا ہر ایک کو مالی امداد

سے تعاون کرنا ہی حسن ہے۔ حسن جسے ہم کسی کو امداد دیں وہی حسن کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اگران خیالات پر ہر ایک چلتا ہے تو یہی ایک جنت کی حقیقت ہے۔

اگر چہ میں غالب کے مقطع پر ہی بحث کروں تو مطلب فتحیابی وہ چیز ہے جب ہم کئی اصولوں کے پابند ہو کر اصول پرست بنیں۔ ہم فتحیاب تب ہو سکتے ہیں جب ہم حاجت مند کی حاجت پوری کر کے اسے خوش کریں اور جب وہ خوش رہے گا تو وہی ایک حقیقت جنت کی ہے جو کہ جنت کے برابر تسلیم کیا جائے گا اور جب وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں گے تو وہ بھی ایک فتحیابی سمجھی جائے گی۔ اسی سے فتحیاب ہوتے ہیں، نہ کہ ہمیں حسن کی وجہ سے تناؤ پیدا کرنا چاہئے اور کسی کے حسن پر بحث ومباحثہ کرنا ہے۔ ہمیں اخلاق اور حاجت کے حسن پر ہی بحث ومباحثہ کرنا چاہئے اور بحث ومباحثہ کرنے کے بعد ہمیں اصولوں پر چلنا چاہئے اور اسی سے فتحیاب ہو سکتے ہیں۔

پیغام غالب کے دائرے میں ان چار سطوروں کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں کبھی بھی حسن پر بحث ومباحثہ نہیں کرنا چاہئے ہمیں اگر بحث ومباحثہ کرنا چاہئے تو اخلاق کے دائرے میں رہ کر کرنا چاہئے اور ہر شہری کے اصولوں پر بحث ومباحثہ کرنا چاہئے وہی حسن ہے نہ کہ راستے میں لوگوں کے چہروں کو دیکھ کر ہنگامے کرنے چاہئے۔ اس بات سے پیغام غالب میں اپنے خیالات نہیں مانتے ہیں۔

پیغام غالب میں غالبؔ حسن اسی چیز کو کہہ کر پکارتے ہیں جس کے اخلاق اچھے ہوں اور ہنگامہ آرائی نہ ہو۔

اگر چہ میں آج کے دور میں پیغام غالب کے ان چار سطوروں کا مباحثہ کروں تو میں یہ کہوں گا کہ دنیا میں حسن پر بحث ہی نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں کسی عورت کے حسن پر بحث ومباحثہ نہیں کرنا چاہئے جو کہ قانون کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ قانون اور امن میں خلل حسن پر بھی رونما ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلامی قانون کے تحت پردہ اہم ہے اور ہمیں پردہ کا بھی احترام

کرنا چاہئے۔ لیکن ہمیں ساتھ ساتھ حسن پر بحث و مباحثہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہمیں اپنے دلوں کو قابو کرنا چاہئے۔ ہمیں حسن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اخلاق زبان اور آپسی بھائی چارہ وہی حسن ہے، حسن پر تناؤ نہیں ہونا چاہئے۔ امن اور قانون حسن سے نہیں بگاڑنا چاہئے۔

تپش سے میری وقف کشمکش ہر تار بستر ہے

مرا سر رنج بالیں ہے امرا تن بار بستر ہے

غالب کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں بھی بیماریاں مختلف قسم کی پائی جاتی تھیں۔ میں یہ بھی اس شعر کا مفہوم پڑھ کر کہتا ہوں کہ غالب نے کسی معمولی بیماری میں مبتلا ہو کر یہ شعر مرتب کیا ہوگا یا اس شعر کو کسی کی مزاج پرسی پر تحریر کیا ہوگا۔ اسی لئے شاعر نے لفظ تپش، رنج اور بستر جیسے الفاظ شعر میں استعمال کئے ہیں۔ اس شعر کو پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے کسی کی مزاج پرسی کا یہ شعر غزل کی صورت میں تحریر کیا ہوگا۔ غالب فرماتے ہیں کہ میں معشوق کو بیماری میں پاتا ہوں اس سے میری کشش پر بیماری کا سامنا کرنا پڑا۔ یا پاک محبت سے معشوق مجھ سے ملنا چاہتی تھی نہ مل سکی، پھر اس سوچ میں اس سے در بستر کا سامنا کرنا پڑا یا جب وہ دور رہی تو اسے سر کے درد کا سامنا کرنا پڑا اور جس کی وجہ سے بستر پر ہی رہی۔ یہ دیکھ کر میں معشوق سے کہہ رہا ہوں کہ اے معشوق پاک محبت میں آپ کو بیماری کا سامنا کرنا پڑا اور میں ایسے حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں اور میں آپ کو در بسر نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ پاک محبت ہے تو ایسی بیماری نہیں پیدا ہونی چاہئے اس سے دور ہی رہنا چاہئے۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالبؔ

کہ بے تابی سے ہر یک تار بستر خار بستر ہے

غالب کے مطلع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے بیماری پر ہی یہ شعر تحریر کیا ہے کیونکہ بیماری کے بعد اپنے تاثرات اپنے مقطع میں اس طرح بیان کئے ہیں کہ اگر مجھے معشوق کے ساتھ

وصل نہیں ہوا تو ہجر میں رہے تو پھر دل کی حالت میں بے قابو اور بے تاب رہ کر معشوق کو بستر میں پڑے رہنا لازم رہا۔ اگر وصل کا دور ہوتا تو ایسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے اور ہمیشہ بے تاب رہنے سے بھی انسان بیماری کا شکار ہوتا ہے۔

اگر میں مقطع کے غالب کے حرف سے اس شعر کا مفہوم لکھوں تو میں کہوں کہ بیماری سے کوئی بھی فتحیابی حاصل نہیں ہوتی، ہمیں صحتیابی سے فتحیابی حاصل ہوسکتی ہے اسی لئے ہمیں بستر میں نہیں رہنا چاہئے۔ ہمیں اگر صحت مند رہنا ہے تو ہمیں ہر بری چیز سے پرہیز کرنا چاہئے جس سے کسی جسمانی یا اخلاقی بیماری کا شکار نہ ہوسکیں۔

اگرچہ میں پیغام غالب کے دائرے میں ان چار سطور کا مطلب کروں تو کہوں گا کہ غالب بیماری کے خلاف یہ کہہ رہا ہے کہ جدائی میں بیماری کا شکار ہوتے ہیں مطلب خوشحال رہنے سے کوئی بھی بیمار نہیں ہوسکتا اور دل کو خوش رکھنے کیلئے ہر بیماری کا تدارک کرنا چاہئے جس سے کہ کوئی بھی بندہ بیماری کا شکار نہ ہوجائے اور بستر کا استعمال اس وقت کیا جائے جس وقت انسان کو بستر کی ضرورت ہو۔

اگرچہ میں پیغام غالب کے حوالے میں ان چار سطور کا مفہوم آج کے دور کو وابستہ کر کے لکھوں تو یہ کہوں کہ ہمیں ہر ایک بیماری کو دور کرنے کے لئے صحتیابی کے اصول اپنانے چاہئے۔ آج کے دور میں بیماری کو قابو کرنے کیلئے بہت سے طریقے معلوم ہیں۔ جس سے ہزاروں بیماریوں کی روک تھام ہوتی ہے۔ بیماری میں مبتلا ہونے سے نقص امن اور لاقانونیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے بیماری کی روک تھام کرنے کے لئے ہمیں قانون کا استعمال کرنا چاہئے اور ہمیں امن کا ماحول قائم رکھنا چاہئے تاکہ کسی مریض کو کوئی بھی مشکلات بیماری کے دوران نہ دیکھنی پڑے۔

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے
سبحہ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

شاعر غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے جب شادی میں ہنگامہ ہوا میں خدا سے رجوع ہوا اور کہا کہ اے خدا مجھے یاد ہے کہ جب شادی پر ایسا ہنگامہ ہوا کہ مجھے ہونٹوں سے تولا گیا میرے ہونٹوں سے نشہ آور چیز یعنی شراب کی بدبو محسوس ہوئی جس سے شادی میں بہت ہنگامہ ہوا لیکن اے خدا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب انہوں نے شادی قبول کی تو اس سے پہلے انہوں نے کیوں نہ معلوم کیا کہ میں ایک شرابی ہوں۔

اس شعر سے تاریخ دانوں کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میں بھی شادی میں ہنگامے ہوتے تھے جس کی وجہ سے طلاق بھی ہوا کرتی تھی اور یہ بھی تاریخ دانوں کے ذریعے معلوم ہوا کہ ان دنوں دلہا دلہن کا چال چلن بھی معلوم کیا جاتا تھا اور بہت لوگوں کو برے خیالات بری رسمیں اور برے نشے کو پناہ دینے پر شادی نہیں ہوتی تھی۔ مطلب چال چلن سے اچھا ہونا چاہئے جسکی وجہ سے شادی کا چکر ٹھیک ڈھنگ سے تسلیم کیا جاتا تھا لیکن ہمیں اس شعر سے یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ غالب نے یہ مطلع اسی لئے بیان کیا کہ میں ایک شرابی ہوں اس لئے سسرال والوں کو لڑکی دینے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ غالب بادہ خوار ہے اور کیسے ہم لڑکی کو پیش کریں۔ یہ بھی اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے معشوق پر شکوہ کیا ہوگا کہ میں آپ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے میرے بادہ خوار پر شادی ٹھکرائی اور جس سے آپ میرے دل میں ایک معشوق بن کر ابھر کر آئی اور وصل کے بغیر اس دنیا میں آپسی تعلقات رہے۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے
عشق سے آتے تھے مانع مرزا صاحب مجھے

مقطع میں شاعر فرماتا ہے کہ اے معشوق اگرچہ میں نے دل لگایا اور آپ نے یہ معلومات حاصل کئے کہ میں بادہ خوار ہوں تو پھر آپ نے کیسے میرے ساتھ دل لگایا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ عشق با عشق [illegible] کو ان باتوں سے دور رہنا چاہئے۔ آپ کو یہ

کہنا چاہئے کہ اگر چہ مرزا شرابی اور بد سلوک بھی ہے لیکن مجھے نکاح ان کے ساتھ قبول ہے۔

اس سے مطلع اور مقطع کی وابستگی سے مجھے پورا یقین ہے کہ غالب نے معشوق کے ساتھ شادی نہیں کی ہے کیونکہ ان چاروں سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں معشوق کے ساتھ لگاؤ رہا لیکن کسی ایسے ماحول میں شادی کو ٹھکرایا گیا۔ غالب کے مقطع سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر غالب کے ساتھ معشوق کو لگاؤ بھی رہا ہوگا وہ یہ معشوق کو عشقیہ حالات کے مطابق مرزا کے ساتھ اچھی وابستگی رہی ہوگی اسی لئے غالب فرما رہے ہیں کہ مطلع میں مجھے جب شادی کا دور یاد آتا ہے تو اس وقت بہت سے ہنگامے ہوئے۔ ہنگامہ اس بات پر ہوا کہ لوگوں نے کہا کہ دولہا نشہ آور چیز استعمال کرتا ہے یعنی شراب پیتا ہے جس سے انہیں یہ شادی منظور نہیں ہے۔ لیکن مقطع کے مطابق مطلع کو ٹھکرایا جا سکتا ہے۔ معشوق عشق کے لحاظ سے غالب کو چاہتا رہا اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ مقطع میں انہیں دل کا لگاؤ رہا اور عشق کرتے رہے لیکن جب یہ عشق بڑھاپے کے دور میں پہنچنے لگا تو غالب کو طعنے بھی برداشت کرنے پڑیں گے۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ اگر مجھے شرابی کہا گیا پھر کیوں لڑکی والوں نے شادی قبول کی یا ان کی ہی لڑکی پیار محبت کی وجہ سے مجھے مرزا کے نام سے پکارنے لگی۔

اب میں غالب کے مقطع کو لفظی معنی کے حوالے سے یہ کہتا ہوں کہ غالب نے تناؤ میں اگر عشق کیا لیکن تناؤ کے باوجود فتحیاب ہوا۔ فتحیاب ہوتے ہی عشق کی کہانی میں کامیاب ہوا۔ فتحیابی کے بعد معشوق نے ہی کہا کہ مرزا صاحب یعنی فتحیابی کے لقب سے مرزا کا نام دیا گیا ہے۔

اب میں پیغام غالب کے حوالے سے ان چار سطور کا یہ مطلب نکالتا ہوں کہ غالب نے ان شعروں میں اس زمانے کے رواج کا بھی ذکر کیا ہے اور تاریخ داں کے لئے تاریخ کا ورقہ موجود رکھا۔ ان دنوں بھی شخصی راج میں شادی آسان طریقے سے لوگ منظور نہیں کرتے تھے۔ مطلب لوگ لڑکے کا چال چلن پہلے پرکھتے تھے۔ ان شعروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرابی یا

بری عادات رکھنے والے شخص کی شادی نہیں ہوتی تھی۔اسی طرح سے غالب نے اپنے عشقیہ ماحول میں بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اگر چہ انہوں نے عشق کیا معشوق نے اس عشقیہ دور میں یہ نہیں سوچا کہ محبوب شراب پینے والا ہے وہ صرف مجھ کو پسند کر کے اقرار کرنے لگی اور بڑھاپے میں یہ کہنے لگی کہ یہ شادی دباؤ سے عمل میں لائی گئی ہے۔اس کا مطلب پیغام غالب میں غالب فرماتے ہیں کہ اگر کوئی چیز پسند آتی ہے تو اس پسند کا فائدہ اٹھا کر پھر نفرت قدرتی طور پر آہی جاتی ہے اسی طرح سے پیغام غالب میں غالب فرماتے ہیں کہ ہر کسی چیز میں مزہ تا عمر نہیں رہتا ہے نہ رہے گا۔

اگر میں ان چار شعروں کا نچوڑ پیغام امن کے حوالے سے پیش کروں تو ہم یہ کہیں گے کہ کسی کے ساتھ اگر محبت ہو یا کوئی واسطہ ہو تو ہمیں غلط حربے استعمال نہیں کرنے چاہئے۔ہمیں ایسے حربے استعمال کرنے چاہئے جن سے کہ لڑائی جھگڑے کا تناؤ نہ پیدا ہو۔اگر کچھ حاصل کرنا تو امن سے حاصل کیا جائے۔نہیں تو عوام میں خلیج زدگی ہو جائے گی جس سے کہ شرم ساز حالات پیدا ہونے سے سماج کو منھ بھی نہیں دکھا سکتے ۔ اسی لئے پیغام غالب میں غالب فرماتے ہیں کہ ہر ایک عمل امن کے ماحول میں ہی تعمیل ہونا چاہئے۔

میں نے مقطع غالب کا بیان اس صورت میں کیا جس میں غالب نے حرف ’دل‘ استعمال کیا ہے۔مطلب غالب نے مقطع میں حرف ’دل‘ کو استعمال کر کے اپنے خیالات بیان کئے ہیں۔ جب میں حرف دل کا بیان لکھتا ہوں۔تو مجھے اور پڑھنے والے کو اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ دیوان غالب میں غالب نے زیادہ حرف دل کے بارے میں ہی مقطع میں استعمال کیے ہیں۔اب اگر میں یہ بحث ادب نواز دوستوں کے حوالے سے کروں تو میں یہ کہوں کہ غالب نے دیوان غالب میں زیادہ تر حسن اور عشق کو بیان کیا ہے۔مطلب حرف ’دل‘ کو دیوان غالب میں مقطع میں استعمال کیا گیا ہے۔لیکن اگر میں گہرے انداز سے اس دل کے حرف پر سوچوں جو کہ غالب نے مقطع میں استعمال کیا ہے اس سے یہ نصیحت ملتی ہے۔

ہمیں ہر چیز کو دل کی کشش سے نہیں تسلیم کرنی چاہئے ہمیں کشش کو بالائے طاق رکھ کر قانون کے دائرے میں رہ کر سوچنا چاہئے ۔ وہ یہ کہ اگر کسی عورت کے لئے برائی سوچیں گے تو اس صورت میں قانونی زد میں آ کر انسان خجلزدگی میں آ کر سماج میں گراوٹ آ جاتی ہے مطلب غالب نے بیان دل میں صحیح بتایا ہے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے ۔صرف دیکھ کر ہی لکھا ہے اور لوگوں کے سامنے اپنے خیالات غزل کی صورت میں بیان کیے ہیں ۔ دیوان غالب میں کسی بھی جگہ مقطع میں دل کے لفظ کو بداخلاق نہیں پڑھتے ہیں ۔ پیغام غالب کے حوالے سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور آج کے دور میں اگر پیغام غالب کا ذکر کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ جو کچھ ملک میں یا غیر ملک میں آج کل ہو رہا ہے وہ پیغام غالب کے حرف دل کے بیان کے مطابق ہو رہا ہے ۔مطلب اگر ہم مقطع کے حساب سے اس حرف دل کو دائرے قانون کے تحت لائیں گے تو قوت برداشت کا طور طریقہ ہر ایک شہری میں پیدا ہونا چاہئے ۔جس سے کہ کوئی بھی برائی کا ماحول ملک یا غیر ملک میں نہیں دیکھیں گے ۔ ان ہی باتوں پر بہت سے واقعات رونما ہوتے ہیں ۔اس لئے پیغام غالب میں حرف دل کے بارے میں اپنے مقطع میں بیان کیا ہے کہ ہمیں صرف کہنا چاہئے اور ہاتھوں سے حربہ استعمال نہیں کرنا چاہئے ۔

خیر اگر پیغام غالب کے الفاظ سے سوچیں گے تو بہت سی نصیحتیں پڑھنے والے کو فراہم ہونگی جیسے کہ غالب نے بیان کیا ہے کہ عشق اور حسن کے ماحول سے دل کا اثر بہت برا ہوتا ہے ۔جن سے کئی واقعات رونما ہوتے ہیں اسی لئے غالب نے پیغام غالب میں لفظ پردہ کا استعمال کر کے ان مندرجہ ذیل چار شعروں میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

پھر کچھ ایک دل کی بیقراری ہے
سینہ جو یائے زخم کاری ہے

شاعر فرماتے ہیں اگر چہ میں نے دل کو پیش کیا پیش کرنے کے بعد مجھے بے قراری سی پیدا ہونے لگی ۔ مطلب جب میں اپنے دوست کو ملا ہی نہیں لیکن ہجر میں رہ کر مجھے بہت سے

غموں کا سامنا کرنا پڑا۔جس سے کہ مجھے زخم دیکھنے پڑے لیکن ان زخموں کو دیکھ کر میں ہائے ہائے کا لفظ استعمال کرتا ہوں ہائے ہائے اسی لئے کہتا ہوں کہ مجھ میں ایسی قوت نہیں آئی کہ میں معشوق سے ملوں یا وہ مجھ سے ملے اور بے قراری کا جنون ہی ختم ہو جاتا لیکن میں نے بہت بار کوشش کی لیکن کوشش کارآمد نہیں ہوئی۔

اگرچہ میں غالب کے اس مطلع کو غور سے پڑھوں اور سوچوں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے یہ کہا ہے کہ غم سے دل کا مرض ابھرتا ہے اور جس کے ابھرنے سے زخم پیدا ہوتا ہے۔اس وقت بہت سے حکیم ڈاکٹر یہ کہہ رہے ہیں کہ دل پر کوئی دباؤ نہ رکھنا چاہئے اور ایسی بات غالب نے اپنے دیوان غالب میں مطلع میں ہی بیان کی ہے۔اسی لئے میں غالب کے اس شعر سے یہ بھی کہوں کہ ایک حکیم کے حوالے سے ایسا مطلع غزل میں بیان کیا ہے۔

بیخودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مطلع کا ذکر بیان کرنے کے بعد اگر میں مقطع کے اس شعر پر سوچوں تو غالب نے مطلع کے ساتھ مقطع کو وابستہ کیا ہے۔دل میں زخم پیدا نہیں ہو سکتے جب ہم اپنے راز کسی کو بتائیں گے۔مطلب ایک دوسرے کو دکھ اور سکھ کا سہارا بنانے سے دل میں تراوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔جس طرح غالب نے مطلع میں بیان کیا ہے کہ ہجر سے دل میں بیماری پیدا ہوتی ہے یعنی زخم پیدا ہوتے ہیں۔اس کا علاج مقطع میں فرمایا ہے کہ اگر میں خوددار نہیں ہوتا تو میں نے خودداری کو بالائے طاق رکھ کر اپنی سب باتیں کسی کو دوستی میں بتائی ہوتی تو پردے میں کوئی بھی چیز نہیں ہوتی۔تو میرے دل میں زخم دیکھنے میں نہیں آتے۔لیکن میری سنجیدگی ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے اسی لئے سب کچھ حالات وواقعات پردے میں رکھ کر میں نے کسی کو اپنا دل کا حال بیان نہیں کیا ہے۔جس سے کہ مجھے بہت سی بیماریوں کا شکار ہونا پڑا۔

اگرچہ میں پیغام غالب کے حوالے سے سوچوں تو میں یہ صاف کہوں گا کہ دیوان غالب

میں مقطع میں غالب نے ایک ہی بار حرف پردہ استعمال کیا ہے اور استعمال اس طریقے سے کیا ہے کہ ہمیں بتایا ہے کہ ہر ایک بات پردے میں ہی رکھنی چاہئے۔ اگر چہ پردے میں رکھ کر کئی بیماریوں کا سامنا بھی کرنا پڑے لیکن پردے میں رہنے سے کسی دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ اگر کسی دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچتی ہے تو کیوں نہ میں خود بیماری میں مبتلا ہو جاؤں اور دوسرے کو خوشحال دیکھوں۔ غالب نے لفظ پردہ اسی لئے استعمال کیا ہے کہ اگر چہ دل کا صدمہ کسی کو پہنچتا ہے یا حسن پر عشق پر یا کسی حالات میں اس سے پردہ میں ہی رکھنا چاہئے تا کہ کسی کو ایسی واقفیت نہ ہو جائے جس سے کہ بدامنی پھیلتی ہے۔ پیغام غالب میں غالب حرف پردے کے بارے میں مقطع میں یہی بیان کرتا ہے اسی لئے کہہ رہا ہے کہ ہر ایک چیز اپنی قسمت کے ہی مطابق ملتی ہے اور قسمت کو بنانے والا بگاڑنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

اگر میں پیغام غالب کا ذکر امن اور قانون کے حوالے سے بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے ہر ایک بات اپنے دیوان غالب میں پردے کے حوالے میں ہی کہی ہے۔ وہ دل ہو آنکھ یا کوئی بھی بات ہو وہ پردے کے حوالے میں کہی ہے اگر پردہ فاش ہو جاتا ہے تو ضرور نقص امن اور قانون کا مذاق بن جاتا ہے۔ اسی لئے امن کو قائم کرنے کے لئے پردے میں ہی ہر ایک عمل کرنا ضروری ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ کسی وقت کسی شہر یا گاؤں یا محلے میں بدامنی پیدا ہوتی ہے لیکن ہمیں اس بدامنی کو وہیں دبانا ہے جہاں یہ ظاہر ہوا اور ان باتوں کو پردہ میں رکھ کر امن کے ماحول کو سنبھالنا ہے جس سے کہ لوگوں میں کوئی تناؤ نہ پیدا ہو جائے۔ اور قانون کا احترام ہو سکے۔

اب میں یہ بات ظاہر کروں گا کہ غالب نے قسمت کے بارے میں بھی کہا ہے کہ جو کچھ بھی ہم کام کرتے ہیں اگر وہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا ہے اس میں ناکامیاب ہوتا ہے تو ہمیں واویلا نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں افسوس نہیں کرنا چاہئے ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ قسمت کی بات ہے اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا۔

جیسے کہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب مطلع میں فرماتے ہیں کہ ہر کام کو آسان سمجھنا اور آسان طریقے سے کام کو نبھانا چاہئے انسان کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ میں دشوار کام نہیں نبھا سکتا۔ انسان کو ہر ایک کام نبھاتے نبھاتے آسان کو دشوار کہنا اور دشوار کو بھی آسان کہنا۔ اسی لئے میں معشوق سے یہ شکوہ کر رہا ہوں کہ اگر انہیں میرے ساتھ محبت کا واسطہ ہے تو وہ مجھے چاہتے ہیں تو انہیں صاف دل سے یہ کہنا چاہئے کہ میں آپ کو چاہتا ہوں اگر اس میں انہیں کچھ دشواریاں محسوس ہوئی تو ان دشواریوں کو آسان طریقے سے حل کرنا چاہئے تا کہ دشواریاں دور ہو جائیں اور دشوار کے لفظ سے ہی ہر ایک قدم کو آگے بڑھانے سے انسان ہمیشہ ناکامیاب رہتا ہے۔ اس لئے اے معشوق ان دشواریوں کو ترک کر کے صحیح کہئے کہ میں پاک محبت میں کس کے ساتھ اپنے تعلقات نبھانا چاہتا ہوں۔

اگر چہ میں اس شعر کو آج کے دور کے ساتھ جوڑوں تو ہر ایک کام میں انسان کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ان دشواریوں کو وہ کن کن طریقوں سے ترک کرتا ہے وہ آج کل کا انسان ہی جانتا ہے کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو لفظ دشوار کو استعمال نہیں کرتے وہ دشوار کو ہی آسان سمجھ کر اپنے مستقبل کو آگے لے جاتے ہیں۔

حیف اُس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ!
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اب غالب مطلع کو مقطع کے ساتھ وابستہ کر کے معشوق کو یہ کہہ رہا ہے کہ اے معشوق ہم نے مان لیا کئی دشواریوں کا سامنا کرتے کرتے دشواری کو مٹا نہیں سکتے۔ جس دشواری سے روکاوٹیں آ گئیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنا مستقبل آگے کے لئے نہیں چلائیں گے ہمیں

اپنے مستقبل کو آگے لے جانا ہے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے اب دشواریوں کو ترک کرتے کرتے یہ لفظ بھی کہنا چاہئے کہ قسمت میں نہیں ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ کے لین دین سے قسمت کو برباد کیا اور دشواریاں پیدا کیں جس سے رکاوٹیں پیدا ہو گئیں یہ نہ کہنا کہ قسمت میں دشواریاں آئیں ہر ایک چیز میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں یہ اپنی اپنی قسمت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بخشا ہے۔ جس کے لئے ہمیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر چہ ہم غالب کے مقطع کے مطلب کو غور سے اس شعر کا مفہوم سمجھیں گے اور لکھیں گے تو میں یہ کہوں کہ غالب کا لفظ فتحیابی اور وہ یہ کہ انسان کو جب کسی کام میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے یا دشواریاں پیدا ہوتیں ہیں اگر ان دشواریوں کو دور کرتا ہے تو انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور کامیابی حاصل ہوتے ہوتے وہ خود بخود یہ کہہ رہا ہے کہ دشواریوں کو نیست و نابود کر کے فتحیابی حاصل ہوئی۔ اور کسی وقت دشواریوں کا علاج کر کے اس سے فتحیابی حاصل ہوتی ہے اسی لئے ہر ایک دشواری کا سامنا کرنے کے لئے انسان دشواریوں کا سامنا کرنے پر خدا سے رجوع ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ میری قسمت میں دشواری کا سامنا کرنا ہے اے خدا ان دشواریوں کو آسان بنا کر مجھے فتحیابی کا مستقبل سامنے آنا چاہئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مطلع اور مقطع کا مفہوم غالب نے یہ کہہ کر لکھا ہے تا کہ مطلع اور مقطع کا مفہوم ایک ہی ترازو کے میں تول کر پڑھ سکیں۔ اگر چہ غالب کی غزلوں میں مطلع کا مطلب مقطع کے برابر نہیں ہے لیکن میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ مطلع کا مفہوم آہ وزاری اور مقطع کا مفہوم اسی آہ وزاری کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے تا کہ آہ وزاری کا جواب دعویٰ پڑھنے والے کو شعر پڑھتے پڑھتے محسوس ہو جائے۔

اگر چہ میں پیغام غالب کے ان چار شعروں کا مطلب بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے دیوان غالب میں اس غزل میں یہ پیغام ہم تک پہنچایا ہے کہ انسان کو کبھی بھی دشواریوں کا سامنا کرتے وقت کمزور نہیں سمجھنا ہر ایک دشواری کا سامنا کرتے وقت انسان کو

بہادر سمجھنا چاہئے اور اپنی بہادری سے دشواریوں کا سامنا کرتے کرتے فتحیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ مانتے ہیں کہ کئی ایسی دشواریاں انسان کی اپنی زندگی میں آتی ہیں تو کئی دشواریاں ختم ہوتی ہیں اور کئی دشواریاں ختم نہیں ہوسکتی ۔ جن سے انسان معیوب ہوتا ہے لیکن انسان کو ہر وقت کامیابی پر زور دینا چاہئے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے رجوع ہو کر یہ کہنا کہ اجل میں تھا اور تو دشواریاں آ گئیں۔ یہ نہ کہنا کہ میں دشواری آنے کے بعد کوئی کام نہیں کروں گا کسی بات پر دشواری آتی ہے اور کسی بات پر نہیں آتی لیکن اپنا اپنا نظام اپنے طور طریقے سے انسان کو چلانا چاہئے۔

اگرچہ میں پیغام غالب کا نچوڑ آج کے زمانے کے ساتھ وابستہ کروں تو میں یہ کہوں کہ انسان کو ہر ایک دشواری کا سامنا امن سے اور اپنے اخلاق سے نبھانا چاہئے انسان کو دشواری کا سامنا کرتے ہوئے لڑائی جھگڑے کو الگ رکھنا چاہئے۔ انسان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمیں جنگ کرنی ہے اور دشمن کو مار گرانا ہے، ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہمیں غالب کے پیغام کے مطابق ہر ایک کام ہر ایک مشکلات کا سامنا امن اور قانون کے دائرے میں کرنا چاہئے ، ہر ایک ملک کو اپنے مستقبل کی دشواریوں کو ختم کر کے کام کرنا چاہئے اور حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے ہم سایہ مما لک کے ساتھ ہر ایک دشواری کا مقابلہ امن اور قانون کے ربط وضبط کے دائرے میں ہی ہونا چاہئے۔

غالب نے دیوان غالب میں لفظ قسمت کے بارے میں جو اوپر چار شعر بیان کئے ہیں یہ قسمت بگاڑنے اور بنانے کے چکر میں اپنا پیغام اپنے دیوان غالب میں ہی بیان کیا ہے۔ قسمت کو دشواریوں کا سامنا اور دشواریوں کا ایک حربہ کہہ کر یہ بیان کیا ہے کہ ہر ایک کو اپنی قسمت بنانے کے لئے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اب میں غالب کے غزل میں حرف ''قسمت'' جو کہ مقطع میں دیوان غالب میں بیان کیا ہے وہ دوسری غزل میں ایسے انداز میں بیان کیا ہے جسے پڑھ کر میں نے یہ تحقیق کی ہے کہ

دیوان غالب میں حرف قسمت مقطع میں دو ہی بار استعمال کیا گیا ہے جیسے کہ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

شاعر غزل کے مقطع میں فرماتا ہے کہ معشوق کو میری جدائی سے بہت ہی اچھا دن محسوس ہوتا ہے لیکن میں یہ کہنے سے اتفاق نہیں رکھتا ہوں اگر چہ معشوق مجھ پر اعتبار رکھتے ہیں تو انہیں میرے ستم کے بارے میں سوچنا چاہئے کہ ستم کس بات کا ہے کہ معشوق کو میرے ساتھ چلنا چاہئے اور ہر ایک دن اس کو وصل کی صورت میں میرے ساتھ دن گزارنا چاہئے۔ اب اس سے یہ بھی محسوس ہونا چاہئے محبوب کیوں تنہائی میں اپنے دن گزارے گا۔ میں مانتا ہوں کہ معشوق کو اس بات کا احساس نہیں ہے لیکن مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تنہائی میں دن گزارنا اچھا نہیں ہے اسی لئے انہیں یہ احساس ہونا چاہئے کہ محبوب کے ساتھ وصل ایک لازم چیز ہے۔ میں ہر ایک محبوب اور معشوق کا احوال دیکھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں ہی ایک فرد ہوں جس کو تنہائی میں معشوق نے رکھا ہے۔

اگر چہ میں اس شعر کو گہرے انداز سے سوچوں اور یہ کہوں کہ غالب تنہائی کے خلاف آواز اٹھا کر ہر ایک کو یہ نصیحت دے رہا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ہمیشہ دوسرا بندہ ہونا چاہئے ایک ہی آدمی کوئی کام دن بھر نہیں کر سکتا ہے۔ اگر ہم کام کریں گے تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ ضرور پیدا ہوگی اور اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے ہمیں دوسرے کا مشورہ لینا ضروری ہے تاکہ رکاوٹ سے مبرا ہو جائیں۔ ہمیں یہ بات نہیں سوچنی چاہئے کہ معشوق کے ہی حوالے سے غالب نے اپنی غزل میں یہ بات کہی ہے۔

ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غالب مطلع کا جوڑ مقطع کے ساتھ وابستہ کر کے دیوان غالب کی اس غزل میں کہتے ہیں

کہ جب انسان دن بھر تنہائی میں اپنا کام کریگا تو وہ کام نہیں کرسکتا۔کوئی نہ کوئی اس کے مشورہ کے لئے ضرور موجود رہنا چاہئے۔اسی طرح سے غالب اس مقطع میں فرماتے ہیں کہ اگر معشوق لازماً نہیں سمجھتا کہ محبوب کے ساتھ وصل ہونا چاہئے تو انہیں یہ پکار کر کہنا چاہئے کہ اگر چہ قسمت میں وصل نہیں ہے تو ایسی قسمت بنانی چاہئے جس سے کہ دشواری پیدا نہ ہوسکے اور وصل ہو کر یہ کہیں گے کہ وصل سے ہی دن اچھے گزار سکتے ہیں۔اگر چہ ہم تنہائی میں کام کرینگے خدانہ خواستہ کبھی موت آئے گی تو کوئی دوسرا آدمی ضرور مرتے وقت موجود رہنا چاہئے تا کہ وہ ہر ایک کو یہ کہے کہ وفات ہوگئی۔اسی لئے میں مطلع کو جوڑ کر مقطع کا طرز بیان کہہ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ غالب فرماتے ہیں کہ کبھی بھی معشوق کو تنہائی میں نہیں رہنا چاہئے اور وصل میں ہی اپنے دن گزارنے چاہئیں۔جو وصل میں دن نہیں گزارتے تو انہیں نادان پکارا جائے گا۔ اور خدانہ خواستہ وصل نہیں ہوا تو ہمیں یہ بھی کہنا چاہئے کہ قسمت میں وصل تھا ہی نہیں اسی لئے تنہائی میں معلوم ہی نہیں کہ کن کن حالات میں موت آئی۔مطلب غالب کا یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ جب انسان کو موت کا سامنا کرنا پڑے تو اس وقت کوئی نہ کوئی حاضر ہونا چاہئے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ موت آئی ہے۔جب ہم تنہائی میں اپنی زندگی گزاریں گے تو ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔اسی لئے مقطع اور مطلع کا جوڑ دے کر غالب کا طرز بیان یہ کہہ کر کہتا ہوں کہ انہوں نے معشوق کو لازماً وصل کا لفظ کہا ہے۔

میں حرف قسمت کو مقطع کے انداز میں اس طرح بیان کروں گا۔اولاً ہم غالب کے حرف کا مفہوم کہیں گے فتح، مطلب غالب اس مقطع میں یہ کہتے ہیں کہ جب ہم اپنی قسمت کے لئے کوئی نیا کام شروع کرتے ہیں اگر وہ کام نہیں ہوتا تو اس وقت ہم کہیں گے کہ قسمت میں نہیں تھا اور کام نہ کرنے کی وجہ سے فتحیاب نہیں ہوئے۔اگر چہ ہم دوسرے انداز میں یہ کہیں گے کہ ہم نے ایسا کام ہاتھ میں لیا ہے جو کہ ناداں پن جیسا کام تھا اور ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے فتحیاب نہیں ہوئے۔میں دوسرے انداز میں یہ کہوں کہ شاعر نے یہ کہا ہے اگر ہمیں

کوئی چیز فتح کرنی ہو تو ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ کیا ہم فتح کر سکتے ہیں؟ ہمیں نادانی میں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم فتح کرنے کے دعوی دار ہیں۔ کام کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہئے۔

اگرچہ پیغام غالب کے حوالے سے دیوان غالب کی اس غزل پر بحث و مباحثہ کریں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے مقطع اور مطلع کو جوڑ کر یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو اکیلے پن میں اپنی زندگی نہیں گزارنی چاہئے انسان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بندہ رہنا چاہئے۔ وہ یہ کہ شادی کے بغیر انسان کی زندگی پوری نہیں ہے گو کہ غالب نے حرف قسمت کو مقطع میں استعمال کیا ہے اور اس انداز میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کئی حالات کے مدنظر اگر انسان کو شادی نہیں ہوئی پھر بھی ایسے انسان کو دوسرے کسی بندے کے ساتھ وابستگی رکھنی لازمی ہے۔ ہم جب اس کی شادی کے بارے میں باتیں کریں گے تو ہم کہیں گے کہ قسمت میں تھا ہی نہیں۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر چہ کوئی کام کروں گا تو کام کرنا لازم ہے لیکن اگر کام نہیں کر سکا تو سب لوگ یہ کہیں گے کہ کام ادھورا چھوڑنے پر قسمت پر زار زار رو رہا ہے۔ یعنی قسمت میں تھا ہی نہیں۔

پیغام غالب کو اگر اس دور کے ساتھ جوڑیں گے تو میں یہ کہوں کہ ہر ایک کام کو لازم سمجھ کر ہی کرنا چاہئے اگر چہ کسی کام میں دشواری پیدا ہو جائے گی تو ان دشواریوں کو ٹھیک نہیں کر سکتے ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ اسی کام کو کرنا چاہئے۔ ہر ایک کام اپنے مقدر کے حساب سے ہی کر سکتے ہیں۔ اگر چہ ہماری قسمت میں دشواریوں کو دور کرنے کا ڈھنگ بھی ہو گا تو اس ڈھنگ کو نبھا سکتے ہیں۔ اسی لئے پیغام غالب میں غالب فرماتے ہیں کہ قسمت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہمیں روزی دی ہے اور اس روزی کو کبھی نہیں ٹھکرانا چاہئے ہر ایک کام امن اور قانون کے دائرے میں کرنا چاہئے۔ ہمیں اپنی قسمت بنانے کے لئے جنگ اور غیر قانون حربے استعمال نہیں کرنے چاہئے۔ ہمیں امن کے ماحول میں کام کر کے یہ کہنا چاہئے کہ جو خدا نے مقدر میں لکھ دیا وہی ہونا ضروری ہے۔

اگر چہ پیغام غالب کے ساتھ جوڑ کر دیوان غالب پر بحث ومباحثہ کریں گے تو غالب کے ہر حرف میں یہ بیان پڑھیں گے کہ غالب نے اپنی غزلوں میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ کسی بھی وقت انسان کو دوست اور دشمن اپنی زندگی میں دیکھنے لازمی ہے۔ پیغام غالب کے مطابق دوست بھی دشمن بن سکتے ہیں اور دشمن بھی دوست بن سکتے ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ دوست کون ہے اور دشمن کون ہے۔ ان کا اندرونی تذکرہ کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ حرف 'دوست' اور 'دشمن' کے بارے میں مقطع میں دیوان غالب نے کئی شعر بیان کئے ہیں جو کہ مختلف غزلیں دیوان غالب میں پڑھتے ہیں۔ میں نے دیوان غالب میں مقطع غزلوں میں ردیف اور کافیہ میں دوست اور دشمن کا ذکر پڑھا لیکن میں نے ان کا نچوڑ نہیں بیان کیا میں نے صرف حرف دوست اور دشمن مقطع میں پڑھ کر ہی بیان کیا ہے جو کہ غزلوں میں میں نے پڑھا اور اس طرح بیان کرتا ہو:

کل کے لئے کر آج نہ خشت شراب میں
یہ سوء ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ محبوب شراب کا استعمال کرتا ہے اور جب نشے میں ہوتا ہے تو یہ اپنے کئی صیغہ راز بتاتا ہے۔ لیکن اے معشوق اس خدشہ کو دور رکھو۔ اسی لئے آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ کل کا واقعہ یہ شراب پی کے ہی دیکھا وہ آج بتائے گا اور بتانے کے بعد میں اُن کے طریقے سے واقف ہو جاؤں۔ مطلب کہانی بناؤں لیکن یہ بھی غلط ہے میں کل اور آج کا ماحول دیکھتا ہوں جسے دیکھ کر مجھے نشہ محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک شرابی کو نشہ شراب پینے کے بعد چڑھتا ہے میں یہ بات ساقی کو بتانا چاہتا ہوں کہ کیا نشہ آور چیزیں استعمال کرنے کے بعد ہی کوئی اپنا راز بتاتا ہے۔ میں شراب پینے والا ہوں لیکن شراب پینے کے بعد میں کوئی راز بتانے والا نہیں ہوں۔ میں ہر ایک راز کو نشے میں اور غیر نشے میں نہیں بتاتا ہوں۔ میں اب یہ کہہ رہا ہوں کہ جب میں آپ کا تصور کرتا ہوں اور آپ کا لین

دین دیکھتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کل آپ نے کیا بتایا اور آج کیا بتا رہی ہو۔ یہ سن کر
میں آپ کو ہی شرابی کا چال چلن بیان کرتا ہوں۔ ایسے ہی انداز میں شراب پی کر لوگ اپنا کام
کرتے ہیں۔ کئی نشے میں کل کی بات کہتے ہیں اور کئی آج کی بات کل تک بتاتے ہیں۔ اسی
لئے میں ایسی نشہ آور چیز استعمال نہیں کرتا۔ میرے خیال میں اے معشوق آپ کے رجحان
سے مجھے یہ سمجھ آتا ہے کہ آپ کل ایک بات بتا رہی تھیں اور آج دوسری بات بتا رہی ہو۔ اب
خدشات محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نے کوئی نشہ استعمال کیا ہے یا ساقی نے کوئی نشہ آور دوائی دی
ہے۔ جس سے کہ آپ کا انداز بیان ایسا محسوس ہوتا ہے۔

غالبؔ ندیم دوست ہے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

مقطع میں غالب مطلع کے طرز بیان کو جوڑ کر ہی بیان کرتا ہے وہ یہ کہ غالب فرماتے ہیں
کہ میں ایک آدمی ندامت رکھنے والا اور میری دوستی میں ندامت ہے مجھ میں سے شراب کی
بدبو نہیں آتی ہے۔ جیسے کہ مطلع میں، میں نے طرز بیان کیا ہے کہ میرے معشوق کو شراب جیسے
نشہ آور عادت میں دیکھا ہے۔ وہ کل ایک بات بتا رہی تھی اور آج دوسری بات بتا رہی ہے۔ یہ
نشہ آور چیز استعمال کرنے والے لوگ بتاتے ہیں۔ میں ایسی دوستی میں مشغول ہوں جس دوستی
میں ندامت ایسی ہو کہ ہمیشہ وہ دوست بندگی اور ندامت میں رہ کر سلام کرے لیکن باوجود اس
کے میں نے ایسا طرز بیان معشوق میں نہیں دیکھا جیسا کہ میں اپنے اصول ندامت کے
دائرے میں رکھتا ہوں۔ میں حق کسی کا دبانا نہیں چاہتا ہوں اگر چہ کوئی نشے میں ہو یا غیر نشے
میں یہ اس کا اپنا حق ہے جس حق میں وہ رہنا چاہتے ہیں۔ میں اس بات میں کبھی بھی دشواریاں
نہیں پیدا کرتا ہوں اسی لئے اے معشوق آپ نادم نہیں ہو کیسے آپ مجھے یہ کہہ رہی ہو۔ آپ
نشے میں ہوں۔ کیونکہ آپ مقطع میں یہ کہہ رہی ہو کہ کل میں نے ایسی بات بیان کی اور آج اس
بات سے انکار کر کے مجھے شک میں ڈال کر مجھے مایوس کرتی ہو۔ خیر اے معشوق میں ان باتوں

کا بھی احترام کرتا ہوں۔

اگر چہ میں دیوان غالب کی غزل کے مقطع کو حرف غالب کے مطابق بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ ندامت میں فتحیابی حاصل ہوتی ہے لفظ ندامت سے ہی دوستی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتی ہے اور لڑائی جھگڑے سے دوستی بگڑتی ہے، جب دوست کو حاصل کرنا ہو تو اس وقت ہمیں ندامت سے کام کرنا چاہئے اور آپسی تعلقات سے اچھائی اور برائی کا اندازہ بھی بات چیت کر کے ہی کرنا چاہئے۔ جب ہم اس طرز کی دوستی قائم و دائم رکھیں گے تو ہمیں دوستانہ ماحول میں فتحیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ لڑائی جھگڑے سے دوستی میں تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم فتحیابی کے لئے دوستی کے اصول اپنا کر دوستی کو پائے تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

اگر میں پیغام غالب کے حوالے سے ان چار شعروں کا مفہوم بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ ایسی دوستی سے ہمیں دور رہنا چاہئے۔ جس دوستی میں شرابی انداز کا طرز بیان ہو جیسے کہ کل ایک بات اور آج دوسری بات دونوں صورتوں میں متضاد پایا جائے۔ دوستی کا وزن برابر نہیں رہ سکتا ہے۔ ایسے نشہ آور چیزوں سے دور رہیں گے جن سے کہ دوستی میں تناؤ پیدا ہو جائے گا، غالب پیغام غالب میں یہ پکارتے ہیں کہ ہمیں ندامت سے کام لینا چاہئے۔ ہمیں ہمیشہ اپنے دوستوں کے ساتھ اچھی طرح سے بندگی نبھانی چاہئے اور دوست سے بھی اچھے طریقے سے بندگی نبھانی چاہئے۔ ہمیں اپنے نصب العین پر کاربند رہنا چاہئے۔

پیغام غالب کو اس دور کے ساتھ جوڑیں گے تو میں یہ کہوں گا کہ ہر ملک، ریاست اور دنیا کے کونے کونے میں دوستی کا ہی پرچم لہرانا چاہئے تا کہ امن اور قانون کا احترام ہو سکے۔ ہمیں جنگ یا لڑائی سے باز رہنا چاہئے۔ دوستانہ تعلقات میں اگر دشواریاں پیدا ہوتی ہیں تو ان دشواریوں کو بات چیت سے ہی دور کرنا چاہئے تا کہ امن اور قانون میں خلل پیدا نہ ہو سکے۔

غالب نے اپنے شعروں میں جو دیوان غالب میں چھاپے گئے ہیں مختلف غزلوں میں

مختلف حروف پر مختلف مختلف تاثرات بیان کئے ہیں جس کو میں پیغام غالب کے حوالے سے بیان کرتا ہوں۔غالب نے مقطع میں بہت سے ایسے حروف استعمال کیے ہیں جن سے میں پیغام کے مدنظر پڑھنے والوں کے لئے بیان کرتا ہوں۔مقطع میں غالب نے دوست کے بارے میں ایک ہی حرف لکھا ہے اگر چہ غالب نے ردیف اور کافیہ میں دوست استعمال کیا ہے لیکن میں نے ان حروف کو مبرا رکھا ہے۔ میں نے صرف شعر میں کچھ ایسے حروف دیکھے اور پڑھے جو کہ مقطع میں ظاہر کیے گئے ہیں ۔اسی لئے میں نے دیوانِ غالب میں صرف دوست لفظ کے بارے میں ایک ہی لفظ پڑھا۔اسی طرح دشمن کے بارے میں مقطع میں ایک ہی لفظ پڑھا لیکن غالب نے اپنے پیغام میں دوست اور دشمن کو ایک ہی ترازو میں تول کر اپنا رد عمل ظاہر کیا ہے۔ پڑھنے والوں کو خود ہی محسوس ہوسکتا ہے کہ غالب نے پیغام غالب میں یہ ذکر کیا ہے کہ دوستی کبھی دشمنی کی شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی دشمنی دوستی کی شکل اختیار کرتی ہے۔

ذکر اُس پری وش کا ، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

غالب مطلع میں فرماتے ہیں کہ میں اُس خوبصورت چیز کا تذکرہ کیسے کروں جس کے بارے میں دن بھر لوگ اپنا اپنا ردعمل پیش کرتے ہیں ، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایسی خوبی کیا ہے کہ لوگ اس خوبی کو پری کی صورت میں مختلف باتوں میں اظہار کرتے ہیں۔لیکن اس شکل سے یہ بھی ممکن ہے اگر کسی کی شکل پری جیسی ہے تو اس میں نقصان بھی ہے اور نفع بھی ہے نقصان اس بات کا ہے کہ اس کے حسن پر بہت سے لوگ اپنا تذکرہ بیان کریں گے جس سے حسن والے کی بدنامی ہوسکتی ہے۔مطلب اس حسن کو چاہنے والے دشمن کی صورت میں کام انجام دیں گے وہ دوستی کا کام نہیں انجام دیں گے بلکہ وہ اس حسن کو چاہنے کے بعد اپنا کام نبھانے کے بعد دشمن کی صورت اختیار کریں گے لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ شکل وصورت اپنے کام کاج میں ہونی چاہئے۔اگر شکل وصورت اپنے کام کاج میں ہو تو کوئی بھی رقیب پیدا نہیں

ہوسکتا ہے لیکن کیا کریں اے معشوق آپ کی صورت پریوں سے بھی اوپر ہے جسکی وجہ سے جادوگری کشش پیدا ہوتی ہے۔اس جادوی گری کشش سے بہت سے چاہنے والے آپ کے راز دار پیدا ہوتے ہیں۔کئی راز داروں کے آپسی جھگڑا ہونے کی وجہ سے بہت سارے دشمن بھی پیدا ہوتے ہیں۔اے معشوق اگر چہ آپ اپنی صورت کو پردہ میں پوشیدہ رکھتیں تو مجھے پورا یقین تھا کہ کوئی بھی آپ کے چاہنے والوں میں رقیب نہیں ہوتا یعنی راز دار تناؤ میں رہتے۔ مانتا ہوں اے معشوق آپ کی صورت پریوں جیسی ہے لیکن بہت سے دشمن بھی ہیں۔میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ اپنی اس صورت کو پردہ میں ہی چھپا کر رکھیں۔

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے

بے سبب ہوا غالبؔ، دشمن آسماں اپنا

غالب نے مطلع میں بیان کیا ہے کہ دوستی میں دشمن کیوں پیدا ہوتے ہیں۔یہ دشمن معشوق کے حسن سے پیدا ہوتے ہیں جس سے کہ دوستی میں دشمنی کا تناؤ دیکھنے میں آتا ہے۔ بہت سے معشوق کو چاہتے ہیں لیکن اپنی چاہت اپنے دوستوں کو نہیں بتاتے۔جس سے کہ بہت سے چاہنے والے اپنی بات کو راز میں رکھ کر دوسرے چاہنے والے کو دشمن سمجھتے ہیں۔یہ بھی ہمیں ماننا پڑے گا کہ دوست کا مخالف دشمن ہوتا ہے اور اسی لئے مطلع میں دوست کا تذکرہ کرکے مقطع میں دشمن کا تذکرہ کیا ہے، اسی لئے مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ ہم کیسے مان سکتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں دانا ہیں یا دانا تھے لیکن دانائی میں ہی بہت سے دشمن دشمنی کا کام انجام دیتے ہیں۔اگر چہ ہم دانائی میں دوستی اختیار کرتے ہیں لیکن اس سے دگنی دانائی دشمن کا ہوتا ہے مطلب دشمن دوست کی طرح اپنا کام انجام دیتا ہے۔ہمیں دشمنی کی دانائی سے معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ دوستی میں ہی دشمنی کا کام نبھاتا ہے۔مطلب شاعر کے مقطع میں یہ ہے کہ غالب اگر چہ دانشور تسلیم کیا جاتا ہے لیکن معشوق کے ردعمل سے دشمن ہی تصور کیا جاتا ہے۔ اگر چہ کوئی راز معشوق کے بارے میں سنتا ہے تو اسے اپنے دوست ہی بتاتے ہیں جب تک نہ

وہ دوست معشوق سے ملتے ہیں اور معشوق سے راز فاش ہو کر ہی مجھے وہ راز بتاتے ہیں جب میں یہ سنتا ہوں میں حیران ہوتا ہوں کہ ان دوستوں کے ساتھ مجھے دوستی نہیں لیکن معشوق کا راز سننے سے یہ دوست بن گئے ہیں اور میرا بھی کچھ ذکر وہ معشوق کو بتاتے ہوں گے جس سے کہ معشوق کی نظروں میں میں بھی ایک دشمن تصور کیا جاتا ہوں۔

غالب کے مقطع کو جب میں حرف کے انداز سے بیان کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ جب بھی کوئی دوست یا دشمن کسی کے ساتھ تناؤ پیدا کرتا ہے تو اس تناؤ کو نبھانے کیلئے اور تناؤ میں یہ فطرت الگ الگ نکال کر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دشمن اور دوست کا انداز کیا ہے۔ اسی لئے شاعر اپنے مقطع میں اپنے حساب سے یہ بتا رہا ہے کہ انسان کو فتحیابی تبھی ہو سکتی ہے جب وہ دشمن کو قابو کر سکے اور اس طرح سے قابو کرے کہ دشمنی کے ہتھیار دوستی میں پانی چاہیے۔ جس سے کہ فتحیابی کا منظر سامنے آ سکتا ہے اور فتح ہونے کے بعد ہم یہ کہیں گے کہ دشمن کو فتح کیا کسی لڑائی اور جھگڑے کے بغیر۔

ان چار شعروں کو پیغام غالب کے حوالے سے اب میں یہ بیان کروں گا کہ غالب نے یہ کہا ہے کہ جو بھی ہمیں کسی بات سے واقف کرائے گا اس سے میں دوستی زیادہ نہیں نبھاؤں گا واقف کار ہی دوستی میں دشمن کا کام انجام دیتا ہے۔ اسی لئے اپنے راز کو اپنے دل میں رکھ کر کسی کو بتانے سے بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اگر چہ اپنا افسوس اپنا غم اپنا حال کسی کو سنانا ہو تو سنانے سے پہلے ہمیں اس آدمی کو پرکھنا چاہیے پرکھ کر ہی اپنے دلائل بتانے چاہیے ورنہ کئی دلائل سننے کے لئے دوستی کا کام انجام دے کر دشمنی کا تصور اختیار کرتے ہیں۔ جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دوست نہیں یہ دشمن ہے تو ہمیں بہت سے صدمے دل میں محسوس ہوتے ہیں اسی لئے پیغام غالب میں غالب فرما رہا ہے کہ دوستوں کو بھی پرکھنا بہت مشکل ہے اور دشمن کو پرکھنا بہت مشکل ہے اس کا مطلب دنیا میں کئی طرح کے انسانوں کو پرکھنے میں بہت سا وقت لگتا ہے۔

پیغام غالب کے حوالے سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہونا چاہئے کہ ہمیں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا مول نہیں لینا چاہئے ہمیں امن سے ہی ہر ایک کام انجام دینا چاہئے اور قانون کے دائرے میں ہی ہر ایک کام انجام دینے سے ہی فتحیابی ہوسکتی ہے۔ مانتے ہیں کہ ملکوں، ریاستوں اور محلہ والوں میں دشمنی کا جال دیکھنے میں آتا ہے۔انہیں پیغام غالب کے دائرے میں رہ کر یہ کام امن اور قانون کے دائرے میں انجام دے کر دوستی کا ماحول اپنانا چاہئے۔فتنہ بازی، لڑائی جھگڑا اور کئی ایسے حربے استعمال نہیں کرنے چاہئے جس سے بدامنی کا ماحول قائم ہو۔اس ماحول کو ختم کرنے کیلئے ہمیں دشمنوں کے ساتھ دوستی کا ہاتھ ملانا چاہئے۔جس سے کہ امن اور قانون کا احترام ہوسکے۔

گو غالب کے مقطع کو میں پیغام غالب کے حوالے سے یہ بتاتا ہوں کہ غالب نے اپنے مقطع جو دیوان غالب میں لکھے ہیں ان میں کئی ایسے الفاظ کا وابستہ رکھ کے میں یہ بتارہا ہوں کہ غالب نے دیوان غالب میں لفظ عشق کے بارے میں بہت سی باتیں لکھی ہیں اور ان باتوں سے میں پیغام غالب کے حوالے سے یہ بیان کرتا ہوں کہ عشق میں بھی صبر و تحمل کا کام پیغام غالب میں غالب نے ہمیں بتایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ میں لفظ 'ہاتھ' کے بارے میں بھی اپنے مقطع میں عشق کے بارے میں کچھ باتیں دیوان غالب میں بیان کی ہیں۔ جس کو میں نے پیغام غالب کے حوالے سے لکھ کر اس طرح بیان کرتا ہوں۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟\
آخر اس درد کی دو کیا ہے؟

غالب فرمارہے ہیں کہ اے معشوق مجھے آپ کی محبت میں نادانی محسوس ہورہی ہے کہ آپ سے دور رہنے پر اور آپ کے نزدیک آنے پر بھی نادانی محسوس ہوتی ہے۔ جب ناداں پن محسوس ہوتا ہے تو مجھے درد میں یہ ناداں پن مبتلا کردیتا ہے۔ مطلب میں آپ کے حسن سے عشق کرتا ہوں جس سے میں درد محسوس کرتا ہوں۔ غالب یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں آپ کی

جدائی سے ناداں بن گیا تھا اگر آپ کے ساتھ وصل ہوتا تو نادانی ختم ہو جاتی اسی ہجر کے میں رہ کر مجھے دل کی نادانی سے درد محسوس ہوتا ہے، جب آپ سے ملاقات ہوتی تو مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی بھی درد محسوس نہیں ہوگا، مطلب آپ سے ملاقات درد کی دوائی بن سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جب آپ مجھ سے ملوگی تو میرا درد ختم ہو جائے گا۔ شاعر کا کہنا ہے کہ حسن کے عشق میں ہر ایک عاشق اور محبوب کو درد محسوس ہوتا ہے۔ وہ درد اسی لئے ہوتا ہے کیونکہ اس سے جدائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی درد سے دل میں نادان پن کی صورت اختیار ہوتی ہے۔ جسے ہم ایک بیماری کے رنگ میں تسلیم کر سکتے ہیں۔ بہت لوگوں کو پاک محبت میں کئی قسم کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص کر دل کی بیماری۔ اسی لئے شاعر فرما رہا ہے کہ اس بیماری کا علاج ہے معشوق سے میل ملاپ اور اسی سے ہی درد کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

جبکہ مطلع میں غالب فرمارہے ہیں کہ ملنساری یا وصل سے ہی آپسی تناؤ دور ہو سکتا ہے اور عشق میں جدائی سے بیماری محسوس ہوتی ہے خاص کر دل کی بیماری۔ اس دل کی بیماری کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک ہی علاج ہے معشوق کی ساتھ میل ملاپ ہو۔ اب اس مطلع کو مقطع کے ساتھ جوڑ کر شاعر فرما رہا ہے کہ جب معشوق کو احساس ہی نہیں ہوتا ہے کہ محبوب ہجر کے حالات سے بیماری کا شکار ہوا ہے تو اس کے خیال سے وہ یہ کہہ رہی ہے کہ اگر بیماری میں بھی مبتلا ہے لیکن ہونے دو انسان مفت آتا ہے اور مفت جاتا ہے۔ مطلب خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ جاتا ہے۔ اگر چہ میں معشوق کے ساتھ نہیں وابستہ رہا تو اگر وہ اس دنیا سے جدا بھی ہو جائے تو کیا پرواہ ہے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ وہ مفت ہاتھ آیا اور مفت ہاتھ جانا ہے۔ یعنی کچھ بھی چیز ساتھ نہیں جانی ہے اور نہ کوئی چیز ساتھ لایا ہے۔ اسی لئے شاعر مقطع میں فرما رہا ہے کہ میں نے اب مان لیا کہ معشوق میرے وصل کی بھی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس

کرتا ہے کہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ آخر کار اس دنیا سے رخصت پذیر ہونا ہے۔ جب ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو کوئی چیز ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم مفت ہاتھ آئے اور مفت ہاتھ جانا ہے۔

اب میں غالب کے ان شعروں کا مختصر نچوڑ دے کر یہ ثابت کر رہا ہوں کہ غالب نے ہر ایک مقطع غزل کے مطلع کے مطابق بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ غالب نے مطلع میں یہ بیان کیا ہے کہ دل نادان ہوتا ہے اور نادانی سے ہمیں عشق میں مبتلا ہونے سے کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایسی حالت دیکھ کر معشوق کو کوئی بھی پرواہ نہیں محسوس ہوتی۔ ہے۔ اسی لئے مقطع میں غالب مطلع کو جوڑ کر یہ کہہ رہا ہے کہ جب کہ معشوق کو ان باتوں کی پرواہ نہیں ہوتی تو میں یہ بیان کرتا ہوں کہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ہر کوئی اس دنیا میں خالی ہاتھ جاتا ہے اور خالی ہاتھ آتا ہے۔ اسی لئے مطلع کو مقطع کے شعر کے ساتھ وابستہ کر کے بیان کیا ہے۔ اب پڑھنے والوں کو ثابت کرتا ہوں کہ غالب نے دیوان غالب میں ہر ایک غزل کا مطلع مقطع کے ساتھ دیوان غالب میں بیان کیا ہے۔

اب میں یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کا مقطع لفظ کے لحاظ سے بھی شعر ملتے جلتے ہیں وہ یہ کہ غالب کے معنی فتحیاب جسے اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس دنیا میں بہت سے بادشاہ آئے اور چل بسے۔ لیکن ان کی تواریخ پڑھ کر ہمیں یہ سبق لینا چاہئے کہ اگرچہ انہوں نے بہت سے ملک فتح کئے اور فتح کرنے کے بعد جب وہ اس دنیا سے رخصت پذیر ہوئے کیا وہ ان ملکوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مطلب خالی ہاتھ اس دنیا سے چل بسے اور خالی ہاتھ اس دنیا میں آئے۔ اسی لئے غالب فرماتا ہے کہ میں فتحیابی میں بھروسہ نہیں کرتا اور نہ ہی تسلیم کرتا ہوں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت پذیر ہونا ہے اور ہم یہاں خالی آئے ہیں۔ اسی لئے فتحیابی سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

اگرچہ میں اس دیوان غالب کے ان شعروں کو پیغام غالب کے حوالے سے بیان کروں

تو غالب فرماتا ہے کہ اس دنیا میں کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ ہر ایک لالچ کرتا ہے۔ جس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہر ایک چیز ہماری ہے۔ یہ غلط سوچ ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی چیز اپنی نہیں ہے نہ رہے گی۔ جب ہمیں خدا یہاں بھیجتا ہے تو ہم کوئی بھی چیز ساتھ نہیں لاتے اور جب ہمیں خدا رخصت پذیر کرتا ہے تو کسی بھی چیز کو ساتھ نہیں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ یعنی خالی ہاتھ آئے اور خالی ہاتھ ہی جانا ہے۔ اسی لئے غالب پیغام غالب میں فرماتے ہیں کہ سب کچھ غلط ہے اور لالچ سے دور رہنا چاہئے۔ ہمارا یہ غلط خیال ہے کہ معشوق کے ساتھ عشق کرنے سے ہمیں کچھ فائدہ ہوگا۔ ہمیں اس چیز سے فائدہ ملے گا جن ہاتھوں سے ہم کسی کو امداد کسی طریقے سے کریں۔ اسی امداد سے ہم دنیا میں یاد کئے جائیں گے۔

اب میں پیغام غالب کو اس دور کے ساتھ وابستہ کر کے یہ کہوں گا کہ جنگ، لڑائی، فتنہ بہت غلط چیزیں ہیں کیونکہ اس دنیا میں مفت ہاتھ آنا ہے اور مفت ہاتھ جانا ہے کیوں نہ ہم سب امن کے پرچم کو لہرائیں اور قانون کے دائرے میں ہی ہر ایک کام انجام دے کر ایک ذی عزت شہری بنیں۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

غالب اپنے شعر میں جو کی مقطع میں بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ جب ہمیں کوئی جلوہ دیکھنے سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کشش کو پانے کیلئے ہمارے ذہن میں حسن کے خیالات ابھرنے سے غمزدگی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے پاس اتنا حسن نہیں ہے جتنا کہ میرے مخالف کے پاس ہے۔ اور اسی لئے غمزدہ رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے حسن کے مطابق کوئی کشش محسوس نہیں کرتا۔ اب میں یہ واقعہ اپنے معشوق کا تصور کر کے کہہ رہا ہوں کہ اے معشوق آپ کا حسن دیکھ کر ہمارے ذہن میں کشش پیدا ہوتی ہے۔ کشش پیدا ہونے سے میں غمزدگی میں مبتلا ہوتا ہوں کیونکہ ہمیں آپ کو چاہنے کی وجہ سے آرام ہی محسوس نہیں ہوتا کیونکہ

آپ کے ساتھ ہمارا کوئی وصل ہی نہیں ہوتا۔ ہم یہ کہہ رہے کہ آپ کے ساتھ جفا کے حالات دیکھنے میں آتے ہیں لیکن اے معشوق جب آپ ہمیں دیکھتے ہو کیا آپ کو بھی ہمیں دیکھنے سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم آپ کو دیکھتے ہیں کیا ہمارے دیکھنے کے بعد آپ کے تاثرات ہمارے حسن کے بارے میں کیا ہیں۔ اس کی جانکاری ہمیں نہیں ہے۔ اگر ہمیں اس سے واقف کراتے تو ہمیں آرام محسوس ہوتا۔

غالب نے غزل کے مقطع میں یہ بیان کیا ہے کہ انسان کسی کے بھی حسن کو دیکھ کر غمگین رہتا ہے۔ اسی لئے وہ خود ایسے حسن کو چاہتا تھا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اے خدا مجھے بھی ایسا ہی حسن عطا کر۔ اب ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے ضروری طور پر عشقیہ حسن کے بارے میں بیان نہیں لکھا بلکہ اس نے حسن کا نام لے کر یہ ذکر کیا کہ خدا نے کسی کے خیالات میں ایسی قوت دی ہے جس سے کہ لوگوں کو وہ مشورہ دے اور لوگ اس مشورہ پر چلیں۔ اس کے مشورے سے لوگوں کے بہت سارے کام حل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں غالب نے اس کام کو اور اس برتاؤ کو حسن سے تشبیہ دی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس نے خود دعوئے شعر کے جواب میں یہ بیان کیا ہے۔ لفظ آرام سے انسان کا جب ہر ایک کام اچھی طرح انجام پاتا ہے تو لوگ خوش ہوتے ہیں۔ جب کسی کا کوئی کام بغیر مشورہ انجام نہیں پاتا تو وہ کسی نہ کسی سے مشورہ لے کر کام کو انجام دیتا ہے۔ شاعر نے میرے خیال میں یہ کہا ہوگا کہ اس سے ایسے کام کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کام کو انجام دینے کے لئے کسی سے مشورہ لینا لازمی ہے۔ جب مشہورہ دینے والا ملتا ہی نہیں تو اسے تب تک آرام ہی محسوس نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مشورہ دینے والا کام انجام دینے کے لئے مشورہ نہ دیدے۔ اسی لئے میرے خیال میں غالب نے لفظ جفا کا استعمال اسی لئے کیا ہے کہ جب اس سے مشورہ دینے والا ملا ہی نہیں تب تو وہ کہتا ہے کہ میں دور ہوں۔ مجھے کوئی وصل ہی نہیں ہے اس مشورہ داں کے ساتھ اسی لئے میں ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتا ہوں تا کہ وہ مجھے کئی مسئلوں پر مشورہ دے۔ خیر مقطع میں اپنی اپنی رائے کئی محقق دیتے ہی

رہتے ہیں۔

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد؟

غالب کی غزل جو دیوان غالب میں پڑھی ہے اولاً میں نے غزل کا مقطع بیان کیا اب اسی مطلع کو مقطع کے ساتھ وابستہ کر کے یہ بیان کرتا ہوں کہ غالب نے میرے خیال میں یہ کہا ہے کہ مجھے اس مشورہ داں سے اتنا عشق ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کے گھر جاؤں اور مشورہ لوں۔لیکن خوف زدہ ہوں کہ اسے غصہ نہ آئے۔ کیونکہ مجھے اس کے گھر کے ماحول کی کوئی خبر ہی نہیں۔ خیر میں کوشش کروں گا تا کہ میں اس کے پاس جاؤں۔ کیونکہ مجھے اتنا لگاؤ اور عشق ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس سے ملوں اور اگر میرے ملنے سے کوئی شکایت نہ کرے۔ جب اس کے گھر سے نکل جاؤں تو ممکن ہے کہ میرے بعد وہ یہ افسوس کا اظہار ضرور کریگا کہ ایسا آدمی کیوں میرے گھر میں آیا اور میرے گھر سے واقف ہوا۔ اگر چہ میں اس کے گھر کا ماحول اچھا نہیں دیکھوں پھر بھی وہ دروازے پر روئے گا کیونکہ جب کوئی آدمی کسی کے گھر جاتا ہے تو ماحول کا اندازہ کرسکتا ہے۔اسی لئے غالب نے میرے خیال میں اس غزل کا مطلع مقطع کے ساتھ جوڑ کر یہ بیان کیا ہے کہ حسن کے مطابق عشق کی کشش ضرور رونما ہوتی ہے۔اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں مطلع میں حسن لفظ بیان کیا ہے۔اسی طرح مقطع میں عشق کا لفظ بھی بیان کیا ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ حسن کا تعلق عشق کے ساتھ لازم ہے۔ میں اب یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ غالب نے ہر ایک غزل میں مطلع کا جوڑ مقطع کے ساتھ دیوانِ غالب میں بیان کیا ہے۔

اب اگر مقطع کا مطلب ادبی طور پر بیان کریں تو غالب فرماتے ہیں کہ اے معشوق مجھے آپ کا حسن دیکھ کر عشق کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ جب مجھے آپ سے ملاقات نہیں ہوتی تو مجھے رونا بھی آتا ہے کیونکہ جدائی کی حالت میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے آنسو کا سیلاب جاری ہوا ہے۔ جب میں اپنے گھر جاتا ہوں تو سیلاب دیکھ کر بیان کرتا ہوں کہ میں کیسے آپ کے

گھر جا سکتا ہوں کیونکہ آپ کی جدائی سے سیلاب جاری ہوا ہے۔ جب آپ یہ سیلاب دیکھو گی تو مجھے ضرور یاد کرو گی لیکن دوسرے انداز میں شاعر کہتے ہیں کہ جب یہ سیلاب دوسرے آدمی دیکھیں گے تو انہیں رونا آئے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ ہم کیسے اس غالب کے گھر جائیں گے جس غالب کو معشوق نے جدائی میں چھوڑ کر آنسوؤ بہانے کو کہا اور جو سیلاب کی صورت میں جاری ہوئے۔ تب شاعر فرماتا ہے کہ اے معشوق کیا آپ کے حسن میں اتنا تناؤ ہے کہ اس عشق نے میری آنکھوں میں سیلاب جاری کر دیا۔

اب میں غالب کے لفظ کے مطابق یہ کہوں کہ غالب نے یہ کہا ہے کہ جب بھی ہم کسی کے حسن کا شکار ہوتے ہیں تو ہم اس سے وصل کی کوشش کرتے کرتے ہمیں بہت سے صدمے محسوس کرنے پڑتے ہیں اور ان صدموں کا مقابلہ کرتے کرتے ہم تب اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ جب ہمیں اس حسن اور عشق میں فتحیابی حاصل ہوتی ہے۔ فتحیابی سے پہلے ہم روتے بھی ہیں زار زار رونے کے باوجود ہمارے میں آنسوؤں کا سیلاب بھی جاری ہوتا ہے پھر بھی ہم فتحیابی کرنے کے بعد ان آنسوؤں کا یاد کرتے ہیں اور سیلاب کو بھی دیکھتے ہیں۔ آخر کار فتحیابی کے بعد آنسوؤں کا سیلاب جذب ہو کر ایک میدان کی صورت اختیار کرتا ہے۔

جبکہ میں نے مقطع اور مطلع کا مفہوم بیان کیا ہے کیوں نہ ہم پیغام غالب کے حوالے سے یہ بیان کریں کہ غالب نے اس غزل کے چار شعروں میں یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو کبھی بھی کم ہمت نہیں ہونا چاہئے۔ اور نہ ہی حسن کو دیکھ کر کمزور ہونا چاہئے اور نہ ہی حسن کو دباؤ میں دیکھ کر عشق کا جائزہ لینا چاہئے۔ مطلب حسن اور عشق اس لحاظ سے بیان کرنا چاہئے ہر ایک انسان اپنے کام کاج اور اپنے چال چلن اور اپنے طور طریقے کا جائزہ لے کر ان باتوں پر ہی حسن کا بیان کرے۔ اسی حسن کی بیان بازی سے عشق کو ظاہر کرنا لازمی ہے۔ انسان کی محنت ہی حسن ہے اور انسان کو اسی حسن سے اجرت وصول کر کے عشق کو سمجھنا چاہئے۔ اجرت سے ہی عشق محسوس ہو سکتا ہے۔

میں نے دیوان غالب کی کئی غزلوں کے مطلع اور مقطع پر تذکرہ کیا لیکن لفظ 'شراب' پر کوئی بھی بیان بازی نہیں کی۔ جب میں نے غالب اکیڈمی میں حاضری دی جو کہ دہلی میں قائم ہے وہاں پر ایک نوجوان غالب کی کئی کتابوں پر تبصرہ لکھنا چاہتا تھا اور اُردو اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل صاحب بھی اس وقت موجود تھے۔ اس نوجوان نے یہ کہا کہ غالب نے شراب کا استعمال اپنی غزلوں میں بہت بار لکھا ہے میں بھی سن رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ یہ صیحہ ے کہ شراب ایک بری چیز ہے اور شراب کا استعمال چال چلن کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔ جب یہ پیغام غالب لکھنا شروع کیا تو میں نے بھی مقطع میں لفظ 'شراب' کا ذکر غالب کی غزلوں میں پڑھا اور اسی کا بیان سن کر یہ کہہ رہا ہوں کہ ان دنوں نواب شراب کا استعمال کرتے تھے لیکن میں دیوان غالب کی ہر ایک غزل کا مقطع پڑھ کر دعویٰ سے کہہ رہا ہوں کہ غالب نے شراب کی تعریف نہیں کی ہے، لیکن شراب استعمال کی ہے۔ پیغام غالب کے اس مضمون میں میں نے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ غالب نے شادی کے بارے میں شعر میں یہ کہا ہے کہ اگر چہ لوگوں کو معلوم ہے کہ میں شرابی ہوں تو انہوں نے مجھے لڑکی نکاح میں کیوں دی لیکن اس کا مطلب پڑھنے والے کو یہ سوچنا چاہئے کہ شراب کی تعریف مقطع شعر میں غالب نے نہیں کی ہے بلکہ شراب کی تاثیر اپنی قلم سے لکھ کر بیان کی ہے اور یہ کہا ہے کہ شراب سماج کے لئے ایک بری چیز ہے۔

اب میں غالب کے مقطع میں جو لفظ 'شراب' بیان ہوا ہے اس کا ذکر اس طرح کرتا ہوں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے ، یہی انتظار ہوتا

شاعر فرماتے ہیں کہ میری قسمت میں کبھی بھی معشوق سے ملاقات کرنا نہیں ہے لیکن اس ملاقات پر میں اظہار افسوس ہی کرتا ہوں۔ کہتا ہوں کہ اب کتنی عمر رہی کہ میں اپنے معشوق

سے ملاقات کرسکوں اور ایسا سوچتے ہوئے کتنا انتظار کروں کہ میری قسمت میں معشوق سے ملاقات ممکن ہو۔ یہ سوچتے اور کہتے ہوئے مجھے اپنے معشوق کا وصل نہیں ہوا۔صرف میں انتظار میں رہا۔

اگر چہ میں اس شعر کا دوسرے انداز سے بیان کروں کہ جب کوئی دوست اپنے خدا کی عبادت میں مصروف رہتا ہے تو وہ خدا کو دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ خدا کو نہیں دیکھ پاتا۔ اپنی قسمت اور عبادت پر زار زار روتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ کونسی غلطی کی ہے کہ مجھے خدا کا دیدار ہی نہیں ہوتا۔لیکن اگر میں یہ بیان کروں کہ انتظار کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرتے ہوئے خدا کا دیدار کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کو اپنی عبادت کے دوران ہی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کئی ایسی غلطیاں بھی کیں ہونگی جن سے عبادت صحیح نہیں ہوتی ۔اگر وہ سوچتے سوچتے انتظار کر رہا ہے اس کو انتظار کرتے کرتے یہ بھی سوچنا چاہئے کہ کئی ایسے واقعات بھی ہیں جن سے عبادت کرنے میں کئی غلطیاں کی ہونگی۔ان غلطیوں کی اگر اصلاح کرتا تو ممکن ہے اس کو اپنے طور طریقے سے ہی کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوسکتا ہے۔اسی طرح سے غالب نے بات صحیح کہی ہے کہ میں نے وصل نہیں کیا بلکہ انتظار میں رہا۔ہمیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہئے کہ غالب نے عشق اور حسن پر یہ اشارہ نہیں دیا ہے یا تو روحانی جذبات پر یا تو کسی لہجے پر یہ مطلع غزل کا بیان کیا ہے۔

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے ، جو نہ بادہ خوار ہوتا

غزل کے مطلع میں شاعر پہلے ہی بیان کر چکا ہے کہ اس نے معشوق کے لئے انتظار کیا لیکن انتظار کرتے کرتے اسے کوئی وصل حاصل نہیں ہوا یعنی معشوق سے ملاقات نہیں کی۔ صرف انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ جب کہ مقطع میں یہ بیان کرتا ہے کہ میں نے انتظار کرتے کرتے کوئی بھی مقام حاصل نہیں کیا۔ اور اسی لئے میں نے اس دوران ایسے نشے کا

استعمال کیا جس سے کہ میری زندگی برباد ہوئی اور مجھے سماج میں گری ہوئی نظروں سے لوگ دیکھنے لگے کہ میں نے شراب کا استعمال کیا ہے۔ اگر میں نے شراب کا استعمال نہیں کیا ہوتا تو مجھے لوگ ولی خدا کہتے اور مجھے ایسے الفاظ سے نوازتے کہ مجھے ولی کے برابر لوگ سمجھتے یعنی خدا کا دوست سمجھتے۔ کیونکہ انتظار کرتے کرتے میرا دماغ منتشر ہونے لگا اور میں ڈرنے لگا کہ میں دماغی توازن نہ کھودوں۔ اسی لئے میں نے شراب کا استعمال کیا۔ اور اپنا اعزاز لوگوں کے دلوں میں کھوکر اب میں ولی کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔

اب میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ غالب نے مطلع مقطع کے مطابق بیان کیا ہے اور یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے مقطع میں شراب پینے سے انکار کیا ہے۔ میں یہ دعویٰ سے اس طرح بیان کرتا ہوں:

اولاً غالب نے مطلع میں بیان کیا ہے کہ انکی قسمت میں معشوق سے وصل ہوا ہی نہیں۔ اسی لئے اس کے انتظار میں رہ کر وہ کتنی دیر تک انتظار کرے گا۔ یہ ایک مسئلہ ایسا بنا کہ خود غالب کہتا ہے کہ انتظار کرتے کرتے ہر کوئی تھک جاتا ہے اور جس کی وجہ سے مختلف خیالات ابھرتے ہیں۔ کئی خیالات اچھے بھی ابھرتے ہیں۔ ان مسائل کے پیش نظر اب خود غالب بیان کرتا ہے اگر وہ ایسا انتظار خدا کی عبادت میں کرنے بیٹھتا تو ضرور ولی جیسی عزت سماج میں پاتا لیکن ان مسائل میں گرفتار ہوکر شراب پینے پر مجبور ہوا لیکن میں یہ نہیں مان سکتا ہوں کیونکہ مقطع میں شاعر نے یہ کہا ہے کہ ''جو نہ وعدہ خوار ہوتا'' اس کا مطلب ہے کہ میں نے انتظار میں شراب نہیں پی۔ صرف انتظار کرتے کرتے برے خیالوں میں ڈوب کر شراب استعمال کرنے پر مجبور ہوں، میں یہ نہیں مان سکتا کہ غالب نے شراب پی ہے۔ اس نے مثال دی ہے کہ اگر میں معشوق کا انتظار کرتا ہوں۔ کئی لوگ انتظار کے دوران اور غم کے دوران اور کئی مسائل ابھرنے کے دوران نشے کا استعمال کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں غالب تسلیم نہیں کرتا کہ اس نے شراب کا استعمال کیا ہے۔

غالب نے جملہ ''تجھ ہم ولی سمجھتے ہیں''جس کا مطلب یہ ہے کہ غالب نے کہا کہ اے معشوق تم اگر اس طریقے سے انتظار کرتے تو آپ کو ولی کا رتبہ دیا جاتا لیکن آپ کو یہ رتبہ نہیں مل سکتا ہے کیونکہ آپ نے کسی کو انتظار میں رکھ کر شراب پینے کے لئے مجبور کیا اور ممکن ہے کہ ان دونوں لفظوں میں میرے خیال میں شراب پینا مبرا ہے۔ یہ ایک مثال ہے کیونکہ شاعر کہہ رہا ہے جبکہ معشوق کو ولی سمجھتے لیکن انتظار میں دوسرے کو رکھ کر اس سے بادہ خوار بنانا چاہتا ہے۔ یہ ایک گناہ ہے اسی لئے میں یہ تسلیم نہیں کرتا ہوں کہ غالب نے شراب استعمال کی ہے۔ یا اس نے شراب پیا ہے یہ ایک مثال مقطع میں معشوق کو دی ہے۔

اگرچہ مقطع کا مطلب غالب کے مفہوم کے برابر ہے مطلب غالب کو اُردو زبان میں کہتے ہیں فتحیاب، اسی لفظ سے اگر ہم مقطع کا ترجمہ بیان کریں گے تو میں یہ کہوں گا شاعر نے مقطع میں یہ کہا ہے کہ بہت سے مسائل ابھرنے کے باوجود ہم نے کسی نشے کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اور استعمال نہ کرنے کی وجہ سے ہمیں سماج میں ولی بھی کہہ سکتے ہیں اور ہم نے شراب نہ استعمال کرنے کی وجہ سے سماج میں فتحیابی حاصل کی ہے کیونکہ سماج میں شراب پینا ایک غلط چیز ہے جس سے سماج شرابی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ شراب نہ پینے کی وجہ سے میں ''غالب'' ولی کی صورت اختیار کر کے فتحیاب ہوا۔

اگرچہ میں پیغام غالب کے حوالے سے ان چار شعروں کا مفہوم لکھوں تو میں یہ لکھوں گا کہ اگر قسمت میں بہت سی رکاوٹیں آئیں گی تو ہمیں برے کاموں سے دور رہنا چاہئے۔ ہمیں اگر انتظار بھی کرنا پڑے تو ہمیں انتظار میں خدا سے رجوع ہونا چاہئے تا کہ ہمیں ولی کا خطاب لوگوں سے ہی حاصل ہو جائے۔ ہمیں شراب سے یا کسی بھی نشہ آور چیز سے دور رہنا چاہئے۔

اگرچہ پیغام غالب کا نظریہ اس دور کے حوالے سے بیان کریں گے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے شراب کو برا بھلا کہہ کر اس سے دور رہنے کی درخواست کی تا کہ لوگوں سے ہم

ولی کا خطاب حاصل کر سکیں۔ نشہ آور چیزیں استعمال کرنے سے امن میں خلل پیدا ہوتا ہے اور لاقانونیت کی تصویر دیکھنے میں آتی ہے۔ اسی لئے ہمیں نشہ آور چیزوں سے دور رہنا چاہئے۔

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

غالب کی غزل جو کہ دیوان غالب میں بیان کی گئی ہے غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ کسی بھی دشمن کو دشمن کہہ کر نہیں پکارنا چاہئے اور دشمن سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ جب کوئی آفت یا ناگہانی ماحول دیکھ کر انسان گھبراتا ہے تو وہ خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتا ہے کہ اے خدا میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر آپ سے رجوع ہو کر یہ کہتا ہوں کہ میری عمر کا خیال رکھنا۔ اسی طرح سے غالب معشوق کو یہ کہہ رہا ہے کہ میں دشمنوں سے نہیں ڈرنے والا اگر چہ دشمنوں کے کارنامے کو مسترد کرنے کیلئے یا ان سے لڑائی میں فتحیابی کیلئے کئی خانقاہوں میں جا کر نیاز کرتے ہیں۔ میں نیاز رکھنے والا نہیں ہوں۔ صرف میں خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتا ہوں کہ میری دعا قبول کرنا اور میری عمر دراز کرنا۔ جب میں معشوق آپ کا ماحول دیکھتا ہوں کہ مجھے دشمنوں کے گرفت میں دینا چاہتی ہو میں دشمنوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں، میں صرف خدا سے ڈرتا اور خدا سے ہی رجوع ہوتا ہوں۔ اگر آپ حریف کہہ کر پکارتی ہو اور دشمن کے ماحول میں دیکھنا چاہتی ہو لیکن اس کے برعکس میں دوستی کے لئے اپنا دروازہ کھول کر رکھتا ہوں۔ میں کبھی بھی کوئی غلط کام اپنے دروازے کو کھول کر نہیں دیکھتا۔ میرا دروازہ نیکی اور اچھائی کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔

میرے خیال میں حریف کا لفظ غالب نے معشوق کے لئے نہیں بیان کیا ہے بلکہ حریف کا لفظ عام لوگوں کو نصیحت کرنے کیلئے اس مقطع میں بیان کیا ہے۔ مطلع میں شاعر نے معشوق کو حوالہ دے کر بیان کیا ہے۔ میں یہ کہہ سکتا :وں کہ یہ عام لوگوں کو نصیحت کرنے کیلئے مطلع بیان کیا ہوگا۔ اگر چہ میں غزل کا مفہوم معشوق اور محبوب کے طور طریقے سے ہی کہوں لیکن میں اس

غزل کا مطلب معشوق اور محبوب کے طرز بیان پر ہی نہیں بتاتا ہوں بلکہ ایک عام آدمی کیلئے ہی بتا رہا ہوں۔

نہ پوچھ وسعت میخانہ جنوں غالبؔ

جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز

غالب مطلع میں کہہ چکے ہیں کہ دشمن سے نہیں ڈرنا چاہئے اگرچہ دشمن کو دیکھ کر ہمیں ڈر لگتا ہے اور ڈر کے ہم خدا سے رجوع ہوتے ہیں اس سے یہ مؤدبانہ درخواست کرتے ہیں کہ اے خدا ہمیں دشمن کے چنگل سے بچا اور ہماری عمر کا خیال رکھ۔ مقطع میں اسی جوڑ کو کہہ کر غالب کہہ رہا ہے کہ اگر آپ یہ سوچ اپنے دماغ میں رکھو گے تو آپ پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے اور پریشانی میں مبتلا ہونے سے آپ کا دماغی توازن برقرار نہیں رہے گا۔ اسی لئے ایسے حالات میں آپ میخانے کی طرف رجوع ہو جاؤ۔ جس کے بعد آپ وہاں پر دشمن کا نظریہ نہیں دیکھو گے۔ آپ میخانے میں مے کے نشے میں دشمن سے دور ہو کر دشمن کو خاک میں ملا دو گے۔ کیونکہ جب آپ کو ساقی شراب کے نشے میں مصروف رکھے گا تو آپ دشمن کے بارے میں کبھی بھی کچھ نہیں پوچھو گے نہ دشمن کی حرکتوں کے بارے میں کچھ سوچو گے۔

اگرچہ میں مقطع کا مفہوم لفظ غالب کے انداز بیان سے کروں تو میں کہوں گا کہ غالب نے مقطع میں یہ کہا اگرچہ آپ دشمنوں کو دیکھ کر ڈرتے ہو اور ڈر کر خدا سے رجوع ہوتے ہو اور خدا سے اپنی عمر کے بچاؤ کے لئے یہ کہہ رہے ہو اے خدا ہمیں دشمنوں سے نجات ملے۔ لیکن کئی ایسے اشخاص بھی ہیں جو شراب کے نشے میں رہ کر دشمن کو نشے میں خاک میں ڈالیں گے۔ میں ایسا کرنے سے باز رہوں گا اور میں ایسی جنگ دشمنوں کے ساتھ چھیڑ کر فتحیابی حاصل کر کے یہ کہوں گا کہ دشمنوں کو میں نے خاک میں دفن کیا۔ مطلب دشمنوں کو دیکھ کر بھی میں کبھی نہیں میخانے کی طرف دوڑوں گا۔ میں میخانے کی طرف نہ دوڑ کر، اور میخانے سے غیر حاضر رہ کر دشمنوں کے ساتھ لڑ کر فتحیابی حاصل کروں گا۔ مطلب میں نشے کے بغیر ہی دشمنوں کے ساتھ

لڑ کر فتحیابی حاصل کروں گا۔

اب کئی پڑھنے والے اور کئی محقق یہ کہہ رہے ہوں گے کہ غالب نے شراب کا استعمال شعر میں کیا ہے۔ میں ان محققین سے یہ کہتا ہوں:

''نہ پوچھ وسعت میخانہ جنوں'' غالب نے اس سطر میں یہ کہا ہے کہ دشمنوں کا ردعمل بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ وہ ردعمل ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح میخانے میں پینے والے کو پینے کے وقت نشے کا جنون آتا ہے۔ اور اسی جنون کی وجہ سے اس کو نشے کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح سے دشمن کو دیکھ کر انسان دشمنی کے جنون میں دیکھ کر گھبرانے لگتا ہے۔ یہ غالب نے دشمن کا انداز بیان اور اس کا ذکر اس کی تشبیہ ان الفاظ کے برابر بیان کی ہے۔ اور آگے یہ بیان کیا ہے کہ اگر میں دنیا میں دشمن سے ڈرتا ہوں لیکن میں دشمن کو خاک میں دفن کرسکتا ہوں۔ جس طرح **''جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک''** مطلب ہے جس طرح شراب کے نشے میں رہ کر ایک شرابی کسی بھی انسان کی وقعت نہیں کرتا ہے اسی طرح سے ہم دشمن کی وقعت کرتے ہیں۔ اگر اس وقعت کو ختم کرنا ہے تو ہمیں اس انداز سے ختم کرنا۔ ہے کہ یہ کاسہ گردوں سے ایک خاک ہو جائے۔ مطلب ہمیں دشمن کو ملیامیٹ اس انداز سے کرنا ہے جس سے کہ ہم شراب پینے سے پرہیز کرنے لگیں۔ ہمیں شراب پیئے بغیر ہی دشمن کے ساتھ لڑنا چاہئے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ غالب نے کبھی بھی تصدیق نہیں کی ہے کہ اس نے شراب پینے کو کہا۔ یا شراب پی ہے جیسے کہ غالب کی حرکت کے سبب ہم یہ کہیں۔

اگر میں یہ کہوں کہ شاعر کہتا ہے کہ جب بھی ہم کسی دشمن کے ساتھ لڑائی یا جھگڑا کریں تو ہمیں ایسی لڑائی لڑنی ہے جس میں ہمیں شراب کا استعمال نہ کرنا پڑے جیسا کہ **''نہ پوچھ''** اور **''جہاں یہ کاسہ''** ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے شراب سے پرہیز کیا ہے اور شراب کے بغیر دشمن کے ساتھ لڑائی کی ہے اور فتحیاب ہوا ہے بغیر نشے کے۔

اب ہمیں ان چار سطروں کا مطلب یہ سمجھ میں آیا کہ غالب نے شراب کا استعمال نہیں کیا

بلکہ شراب کو دشمن سے دور رہنے کا ذکر کیا ہے۔ اگر چہ تاریخ داں شاعر کا طرز بیان کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں کہ غالب نے شراب کا استعمال کیا ہے لیکن میں تاریخ دانوں سے یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ ان دنوں دنیا کے نوابوں اور بادشاہوں نے اپنی حکومت کے قیام کے دوران مطلب شخصی راج کے دوران شراب کا استعمال عام طور پر کیا۔ ممکن ہے غالب نے شراب کا استعمال کیا ہوگا لیکن شراب کو کبھی اعلیٰ درجے کے دائرے میں اپنی قلم سے نہیں لکھا۔ شراب کے برے اثرات شعروں میں بیان کیے ہیں۔ جیسے کہ پہلے میں نے یہ بیان کیا ہے کہ تجھ ہم ولی کہتے ہیں۔ مطلب اگر شراب نہیں پیئے گیں تو لوگوں کی نظر میں ہمیں ولی کا عہدہ ضرور ملے گا۔ اسی لئے ان چار سطروں کو پڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ غالب نے مقطع اور مطلع کو ایک ہی انداز میں بیان کیا ہے۔ مطلب مقطع اور مطلع کو جواب دعویٰ کے ضمن میں لکھ کر یہ غزل کا ہنر دیوان غالب میں بیان کیا ہے۔ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا ہوں کہ غالب نے شراب کے بارے میں تعریف کی ہے۔ بلکہ اس کی برائی ہی شعروں میں بیان کی ہے۔

پیغام غالب کے طرز بیان میں اگر میں سوچوں گا تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے یہ پیغام دیا ہے کہ دشمن کو کبھی دشمن کہہ کر نہیں پکارنا چاہئے بلکہ دوست کہہ کر پکارنا چاہئے۔ دشمن سے نہیں ڈرنا چاہئے ہمیں خدا سے ہی ڈرنا چاہئے اسی لئے خدا سے رجوع ہو کر ہمیں دعا کرنی ہے کہ ہمیں اپنی عمر میں دشمن سے نجات ملے اور اس طرح نجات ملے کہ ہمیں کسی بھی نشہ آور چیز کا استعمال نہ کرنا پڑے۔ اور کبھی بھی میخانے میں حاضر نہ ہونا پڑے۔ دشمن کی حرکتوں سے ہم تنگ آ کر شراب استعمال نہیں کریں۔

پیغام غالب کا رجحان اس دور میں صحیح ہے وہ یہ کہ دنیا کے بہت سے مما لک نشہ آور چیزوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور انکے کے خلاف قانون بھی بنائے گئے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ نشہ آور چیزوں سے دور رہنا چاہئے اور امن کے ماحول میں رہ کر قانون کا احترام کرنا ہے۔ جس سے کہ نشہ آور چیزوں سے پرہیز ہو۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

شاعر فرماتے ہیں کہ میں کوئی کافر نہیں ہوں میں ایک مسلمان ہوں اسلام کے اصولوں پر چلنے والا ہوں، لیکن میں پاک محبت و عشق پاک دائرے میں ہی کرتا ہوں اور عشق سے ہی حسن کا جامہ پہن کر اس پر عمل درآمد کرنے والا ہوں۔ لیکن مجھے یار کی تلاش پر اور اس سے دور ہونے پر بہت صدمے محسوس ہوئے۔ ان صدموں سے مجھے کوئی راحت محسوس نہیں ہوئی۔ میں اپنے معشوق سے یہ کہتا ہوں کہ اگرچہ آپ میرے ساتھ پاک محبت کے اصول قائم رکھتے ہیں تو میں آپ کو بت بنا کے ہی جھکوں ایک مسلمان ہونے کے ناطے میں حکم کافر نہیں ماننے والا ہوں۔ میں ایسا ظالم نہیں ہوں کہ میں غیر اسلامی اصولوں پر چلوں اور آپ کے مجسمے کو معشوق کی صورت سمجھ کر بت پرستی اختیار کروں۔ اسی لئے اے معشوق میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی طریقے سے آپ مجھ سے ملاقات کر کے کوئی راحت موصول کریں۔ جس سے کہ مجھے آپ کی جدائی سے کوئی عذاب نہ محسوس کرنا پڑے۔

غالبؔ چھٹی شراب ، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابروشبِ ماہ تاب میں

مطلع کا مفہوم پڑھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے اسلامی اصولوں کے تحت پاک محبت کو عملی جامہ پہنایا اور پاک محبت کے اصولوں پر قائم ودائم رہ کر مطلع میں یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر مجھے اپنے دوست یا یار سے کوئی بھی ملاقات نہیں ہوئی پھر بھی میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس طرح نہیں کہ میں اسکی پوجا کروں یا اس کی شکل کو مجسمے کی طرح دل میں رکھوں۔ اگر مجھے پاک محبت میں وصل نہیں حاصل ہوا مجھے آداب ہجر کے اصولوں سے ملا اور کوئی بھی راحت محسوس نہیں ہوئی، چاروں طرف عذاب ہی عذاب محسوس ہوا لیکن مقطع میں میں اس مطلع کو وابستہ کر کے یہ کہہ رہا ہوں کہ غالب کہتے ہیں کہ مجھے شراب کے ساتھ واستہ نہیں ہے اگرچہ

میں عذاب میں ہوں ۔اس عذاب کو دور کرنے کے لئے میں شراب پیوں تو مجھے ہجر محسوس نہیں ہوگا۔ مطلب مجھے یار کی جدائی محسوس نہیں ہوگی۔ تو میں کافر نہیں ہوں ، کافر کے اصول نہ اپنانے کی وجہ سے میں شراب سے دور رہ کر کبھی بھی اس کا استعمال نہیں کروں گا۔ اگر چہ مجھے معشوق ابر کے وقت یا آفتاب کی روشنی کے وقت یاد آئے گا تو اس وقت مجھے عذاب بھی محسوس ہوگا۔ لیکن میں آسمان پر بادلوں کے سائے میں بیٹھ کر شب کے وقت شراب نہیں پیؤں گا اور نہ میں آفتاب کی روشنی کے دوران ایسا کام انجام دوں گا گو کہ میں ایک ایسا فرد ہوں کہ اسلامی قوانین کے تحت چلنے والا ہوں ، میں کوئی کافر نہیں ہوں اور نہ ہونے کی وجہ سے شراب سے دور رہوں گا۔ اے معشوق میں شراب پینے کے حق میں نہیں ہوں ۔

ان چار سطروں کے مطلب سے ہمیں یہ نصیحت ملتی ہے کہ غالب نے شراب کا استعمال نہیں کیا ہے۔ تو غالب مقطع میں یہ بیان نہیں کرتے کہ ''**غالب چھٹی شراب**'' اگر چہ بہت سے پینے والے یہ بیان کرتے ہیں کہ بادلوں کے دوران یا آفتاب کی روشنی میں شرابی کو شراب پینے میں بہت لطف آتا ہے لیکن غالب نے ایسی بات کا ذکر کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں غالب نے اس سے دور رہ کر خود تسلیم کیا ہے کہ میں کافر نہیں ہوں ۔ اسی لئے میں شراب ترک کر کے اس سے دور رہتا ہوں۔ اب ہمیں پوری توقع ہے کہ محقق لوگ تسلیم کریں گے کہ غالب نے شراب کی تعریف کی ہے لیکن خود پینے والا نہیں ہے۔ تو غالب لفظ چھٹی شراب مقطع میں استعمال نہیں کرتے اور پینے کے واقعات کا ذکر مطلع میں لفظ کافر کا ذکر کر کے یہ کہا ہے کہ '' کافر ہوں'' مطلب کوئی کافر نہیں ہوں ۔ اگر چہ معشوق میرے ملنے سے ظلم محسوس کرے یا میں اس کے ملنے پر ظلم کروں میں ایسا کافر نہیں ہوں ۔ اور میں ایسا کافر بھی نہیں ہوں کہ ان کے ہجر پر شراب کا استعمال کروں ۔ نہ میں شراب استعمال کروں گا اور نہ میں ان سے کافر کے طور طریقے سے پیش آؤں گا۔

مقطع کے لحاظ سے اگر میں غالب کا نظریہ بیان کروں تو غالب کا مطلب ہے فتحیاب ۔

اسی لئے شراب کو ترک کر کے اور اسے استعمال نہ کر کے فتحیابی حاصل ہوسکتی ہے۔یعنی ایک غریب یا امیر اس کا استعمال کرتا ہے اس کا انجام بہت ہی برا حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے اس سے دور رہنے اور نہ پینے سے ہی فتحیابی حاصل ہوتی ہے۔ اگر چہ بادلوں کے وقت یا چاندنی رات میں کئی شرابی شراب پی کر خوشی محسوس کرتے ہیں جو خوشی چند منٹوں کی ہے۔ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ ان چند منٹوں کے عیش وعشرت سے دور رہ کر ہی فتحیابی حاصل ہوسکتی ہے۔اپنی عزت اور احترام ہوسکتا ہے۔فتحیابی محسوس ہوسکتی ہے۔

جبکہ میں پیغام غالب کا ذکر کروں تو میں یہ کہوں کہ مطلع اور مقطع میں صاف طور پر شاعر نے یہ نہیں تسلیم کیا ہے کہ میں کوئی شرابی ہوں۔تو یہ بیان کرنے کا ذکر ہی شعر میں نہیں کرتا بلکہ پیغام غالب میں شاعر یہ کہتے ہیں کہ شرابی کو بادلوں کے وقت یا چاند کی روشنی میں پینے سے لطف محسوس ہوتا ہے۔لیکن میں ایسا لطف تسلیم نہیں کرتا۔ میں اسے ترک کر کے دور رہتا ہوں۔

اگر چہ میں پیغام غالب کو آج کل کے دور کے ساتھ وابستہ کروں تو میں یہ کہوں گا کہ بہت سے غریب محنت کر کے گھر کو سنبھالتے ہیں لیکن ان میں بری عادت پیدا نہیں ہونی چاہئے ۔یعنی شراب سے دور رہنا چاہئے اگر وہ شراب سے دور رہیں گے تو وہ اپنے گھر کے ماحول میں سکون وامن سے رہیں گے اور سکون وامن میں رہ کر ہی قانون عملدرآمد ہوسکتا ہے۔ اسی لئے آج کل کے دور میں پیغام غالب سے ہمیں نصیحت حاصل ہوتی ہے کہ کسی چیز میں مزہ یا عیش وعشرت کے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئے ۔ہمیں ایسی چیز کا استعمال کرنا چاہئے جس سے ہمارا گھر خوشحال رہے اور قانون کے دائرے میں خوشحالی حاصل ہوسکے۔

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

غالب دیوان غالب کی غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ مجھے پاؤں دھوکر پینے کا احساس ہی نہیں ہوا ہے کہ میں کسی شراب سے معشوق کے پاؤں دھوؤں۔ میں ایسے طریقے

سے پاؤں کو دھونا چاہتا ہوں جس سے کہ کوئی غلط یا ناجائز استعمال نہ ہو جائے۔ مطلب پاؤں جو ہے یہ ایک پردہ ہے اگرچہ ہم ہزاروں لوگوں کے پاؤں راستے میں دیکھتے ہیں لیکن وہ اس وقت چلنے پھرنے کے کام آتے ہیں۔ جب ہم عشق یا حسن کے دائرے میں پاؤں کا استعمال کرتے ہیں تو ہمیں ایسے پاؤں کا احترام کرتے ہوئے استعمال کرنا چاہئے۔ مطلب عشق یا محبت کی وجہ سے پاؤں کا احترام کرنا چاہئے۔ لیکن پاؤں کا احترام اس طریقے سے کرنا جس سے مجھے اور میرے معشوق کو کوئی صدمہ نہ پہنچے اور سماج میں دونوں کی عزت اور احترام رہے۔ کسی بھی وقت ہم کسی کا پاؤں کھینچ کر اپنی عزت اور احترام نہیں کرا سکتے۔ جس سے ہماری بے عزتی ہوتی ہو۔ اسی لئے اپنی عزت کو بحال رکھنے کے لئے میں معشوق سے پاک محبت کے دائرے میں یہ کہتا ہوں کہ میں پاؤں کھینچنے والا نہیں، میں پاؤں دھونے والا نہیں، میں پاؤں کا احترام کرتا ہوں لیکن پاکِ محبت کے دائرے میں اپنے آپ کے اور اپنے پاؤں ایک سمجھ کر اسے عزت و احترام بخش کر آپ کے ساتھ پاک محبت کے اصول پر چلنے والا ہوں۔ لیکن اب کئی اشخاص مجھے یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ جب معشوق کے پاؤں دیکھتے ہو تو اسے کیوں نہ کھینچتے ہو۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں جب مجھے اپنے معشوق کے ساتھ وصل ہی نہیں ہوا تو کیسے میں ایسی بات سوچ سکتا ہوں۔ میرے اور اس کے پاؤں ان خیالات سے الگ ہیں۔ اب آپ انکشاف ڈالنے کے لئے مجھ سے ایسی باتیں کہتے ہو جس سے کہ مجھے پاک محبت میں معشوق کے ساتھ تناؤ ابھرے۔

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

مطلع میں غالب صاف طور پر اس غزل میں فرماتے ہیں کہ میں ہر ایک کے پاؤں کا احترام کرتا ہوں کیونکہ میں احسان فراموش نہیں ہوں، خواہ وہ پاؤں ہوں، آنکھ ہو، دل ہو، میں ایسے اعضاء کا احترام کر کے برے خیالات میں مبتلا نہیں ہوتا ہوں۔ اب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ

میں شراب پینے والا نہیں ہوں لیکن میرے کلام میں شراب جیسا مزہ ہے۔ مطلب لذت ہے مقطع میں شاعر تصور میں یہ کہہ رہا ہے کہ میرے کلام میں مزہ ہے۔ ایسا مزہ ہے کہ جس طرح ایک شرابی کو شراب پینے میں مزہ آتا ہے۔ اس مزے کے لذت سے کہتے ہیں کہ معشوق کے پاؤں دھونے چاہئیں۔ لیکن میں اس لذت سے معشوق کے پاؤں نہیں دھوتا ہوں۔ میرے خیال میں غالب شراب سے نفرت کرتا ہے اور خود فرماتا ہے کہ میں شراب کے بجائے اپنے میٹھے کلام سے ان کے پاؤں کو دھولوں گا نہ کہ شراب کے پانی سے۔ ایسی بات کا احساس مجھے اس طرح ہوتا ہے کہ غالب خود فرماتے ہیں مقطع میں "**دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو**" یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر چہ میرے کلام میں کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کا کلام نشے کے برابر ہے۔ مطلب شراب کے مزے کے برابر ہے۔ یہ بات انہیں پاک محبت کے ساتھ وابستہ نہیں کرنی چاہئے۔ انہیں یہ کہنا چاہئے کہ میرے کلام میں مٹھاس ہے اسی مٹھاس سے میں اپنے معشوق کے پاؤں دھولوں گا نہ کہ میں شراب سے ان کے پاؤں دھولوں گا۔ میرے کلام میں مٹھاس ہے اسی لئے میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ غالب نے شراب کا استعمال اپنے پینے کے لئے کیا ہوگا۔ غالب نے لفظ شراب کا استعمال نصیحت کیلئے استعمال کیا ہے۔

میں اس بات سے متفق ہوں کہ مقطع میں غالب لفظ کے معنی ہیں فتحیابی۔ وہ بھی اس مقطع میں وابستہ ہوسکتا ہے جیسے کہ اس مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ ہمیں پاؤں کا احترام کرنا چاہئے۔ ہمیں پاؤں کو چھیڑنا نہیں چاہئے ہمیں ان پاؤں کا اثر معشوق کے ساتھ اس انداز میں استعمال کرنا چاہئے جیسے کہ ہم ان کے ساتھ جب ہم کلام ہو جائیں تو انہیں ہمارے کلام پر احترام محسوس ہونا چاہئے اور ہمارا کلام شیریں جیسا سخن ور محسوس ہونا چاہئے۔ ان نظریات سے ہی خود بخود پاک محبت میں معشوق یہ بیان کرے گا کہ ایسے کلام سے محبوب معشوق کو فتحیاب کر سکتا ہے۔ ہم دھونے سے یا ہاتھ لگانے سے یا کسی ناجائز طریقے سے ان پاؤں کو استعمال نہیں کریں۔ ہمیں ایسے طریقے سے پاؤں کو محفوظ رکھنا ہے جس سے کہ لاقانونیت محسوس نہ

ہو جائے۔انہیں طور طریقوں سے فتحیابی پاک محبت میں ہو سکتی ہے۔

اب میں یہ ثابت کرتا ہوں کہ غالب نے مقطع میں غالب کے لفظ کے معنی کے مطابق صاف لکھا ہے کہ تب ہی ہمیں فتحیابی حاصل ہو سکتی ہے جب ہم معشوق کے کسی عضو کو بری حرکتوں کے دائرے میں نہیں لائیں گے بلکہ ان اعضاء کو ہم باتوں سے ہی ایسا تناؤ پیدا کریں گے جو کہ خود بخود نظروں میں محسوس ہو سکے اور ایسے طریقے سے ہی پاک محبت میں فتحیابی ہو سکتی ہے۔

میں ان چار سطروں کا مفہوم اس طرح سے کہوں گا کہ غالب نے مطلع اور مقطع کو جوڑ کر غزل لکھی ہے۔تبھی تو ان چار سطور میں مطلع اور مقطع کو وابستہ کر کے لفظ 'دھوتا اور دھونے کا مزہ، دھونے سے کوئی ضد نہ ہو جائے ،ضد کا لفظ بھی استعمال کیا اور ایسا لفظ پیتا بھی لکھا ہے۔شراب کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ شیریں سخن کا استعمال کیا ہے۔اب میں یہ بات واضح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ غالب کا شعر مقطع اور مطلع کے ساتھ وابستہ ہمیشہ رہتا ہے۔

پیغام غالب میں غالب فرماتے ہیں کہ اگر ہمیں کسی کے ساتھ ایسے تعلقات رکھنے ہیں جس سے کہ کوئی تناؤ نہ پیدا ہو اور پاک محبت کے اصول پر چلتے ہوں۔تو ہمیں ہر ایک کے ساتھ محبت سے پیش آنا چاہئے اور ہمیں کسی کو ذلیل نہیں کرنا چاہئے۔نہ ایسی چیز کا استعمال کرنا چاہئے جس سے کہ تناؤ پیدا ہو سکے۔ہمیں اپنے کلام سے ہی سب کچھ حاصل کرنا چاہئے۔جب ہم شیریں کلام سے ہی سب کچھ حاصل کریں گے تب ہی ہم غالب کے پیغام کو روشن کر سکتے ہیں اور غالب نے کبھی بھی کسی کے ساتھ بدسلوکی کرنے کو اپنے شعروں میں بیان نہیں کیا۔

اگر چہ میں غالب کے پیغام کو اس دور کے ساتھ وابستہ کروں تو میں ان چار شعروں کو پڑھ کر ہی یہ محسوس کروں گا کہ جیسا کہ غالب زندہ ہے اور آج کل کے حالات و واقعات کے مطابق یہ چار شعر لکھیں ہیں۔اور ہمیں نصیحت حاصل ہوتی ہے کہ ہمیشہ امن کے ماحول میں ہی

کام انجام دینا چاہئے۔ اور کبھی بھی غیر قانونی طریقے سے کسی کام پر عملدرآمد نہیں ہونا چاہئے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

شاعر دیوان غالب میں اس غزل کے شعر کو مقطع میں بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ انسان اِس دُنیا میں بہت سی خواہشوں کے ساتھ جیتا ہے لیکن ان خواہشوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ یعنی ان پر عملدرآمد کم ہوتا ہے۔ اگر انسان چاہتا ہے کہ میں بادشاہ بنوں لیکن نہیں بن سکتا ہے۔ انسان کو امیری کے خیالات ابھرتے ہیں لیکن امیر نہیں بن سکتا ہے۔ کئی چیزوں کو دیکھ کر سوچتا ہے کہ مجھے بھی ایسی چیز حاصل ہونی چاہئے لیکن نہیں حاصل ہوسکتی۔ کسی وقت اور موقع پر سَو میں سے ایک چیز کو حاصل کرسکتا ہے۔ وہ خواہش جب پوری ہوتی ہے تو خود محسوس کرتا ہے کہ تمام کی تمام خواہشات پوری نہیں ہوئیں۔ ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے خدا سے بھی رجوع ہوتا ہے لیکن پوری نہیں ہوتیں۔ اسی لئے شاعر فرماتا ہے اگرچہ مجھے معشوق کے ساتھ پاک محبت ہے لیکن میں نے سوچا کہ مجھے ان کی ہزاروں خواہشوں کو پورا کرنا ہے باوجود اس کے کہ اس سے ملاقات ہو کہ خواہشیں پوری نہیں ہوتی ہیں۔ ادھوری رہتی ہیں۔ ہاں ایک خواہش پوری ہوتی ہے وہ ہے معشوق کے ساتھ ملاقات۔ وہ بھی اگر ہوسکے۔ اسی لئے شاعر فرماتے ہیں کہ بہت سی خواہشوں سے دور رہنا چاہئے۔ ایسی خواہش دل میں رکھنی چاہئے جس سے انسان کو یہ محسوس نہ ہوجائے کہ پوری خواہش نہیں ہوئی۔ اے معشوق اگرچہ ہزاروں خواہشوں کو دل میں رکھیں گے اور اگر پوری نہیں ہوئیں تو انسان نادان کہا جاسکتا ہے۔ اسی لئے ان ہزاروں خواہشوں سے دور رہ کر ہمیں وصل کی خواہش کرنی چاہئے۔

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مطلع میں شاعر فرماتے ہیں کہ انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی ہے جب پوری نہیں ہوتی ہے تو ہر ایک انسان خواہش کے پورا ہونے پر ہی ایسی دوائی ڈھونڈتا ہے جس سے کہ خواہش کا ذکر ہی دل میں نہ اُبھرے۔اسی لئے غالب فرماتا ہے کہ کئی لوگ ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے خدا سے رجوع ہو کر خواہش پوری ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ پھر بھی عبادت کر کے پوری نہیں ہوتی۔کئی لوگ ان کو بھولنے کے لئے میخانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔اس مقطع کے شعر سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے شراب کا استعمال نہیں کیا ہے۔تب غالب واعظ کا لفظ شعر میں نہیں استعمال کرتا کیونکہ ان دنوں اسلامی دور تھا اور اسلامی نواب حکمران تھے۔اسی لئے میں یہ بات نہیں تسلیم کرت کہ اس نے اس شعر میں شراب کا استعمال نصیحت و واقعات کے لئے کیا ہے۔مطلب لفظ میخانہ کی جب میں وضاحت کروں تو میں کہوں کہ کئی لوگ خواہشات کے پورا نہ ہونے پر میخانے کا دروازہ کھٹکھٹا کے شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ کئی گھنٹوں کیلئے وہ اپنی خواہشات بھول جاتے ہیں۔اسی لئے میں وضاحت سے کہتا ہوں کہ غالب نے صاف کہا ہے کہ کیوں آپ لوگ اپنی خواہشوں کے لئے میخانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہو کیوں نہ آپ ان خواہشوں کے لئے مسجد میں بیٹھ کر واعظ کی باتیں سن کر ان پر غور کرو اور جب وہ ان خواہشوں پر وضاحت بیان کرے گا تو آپ خود بخود کسی خواہش کو نہیں چاہو گے۔آپ ہمیشہ خدا سے رجوع ہو اور میخانے کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاؤ گے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے شراب کا استعمال نہیں کیا ہے۔اب کئی لوگ یہ فرماتے ہیں کہ اس نے شعر میں شراب کا ذکر کیا ہے تب دور اسلام میں اس شعر پر اعتراض ہوتا ہے۔اس نے اس شعر کی محفل میں وضاحت کی ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وضاحت کر کے ہی اس مقطع پر انہیں اعتراض نہیں ہوا ہوگا۔دوسری بات میخانے کے ساتھ کبھی بھی مقطع میں غالب واعظ کا لفظ نہیں بیان کرتا۔ غالب نے میخانہ ایک نصیحت اور دوسرا واعظ کا لفظ دوسری نصیحت اس مقطع میں بیان کی ہے۔اب مجھے پورا یقین ہے کہ محقق لوگ میرے اس نظریہ بیان کو تسلیم کریں گے۔

اب میں اس بات کی وضاحت کرتا ہوں کہ غالب نے اپنے لفظ کے لحاظ سے یہ مقطع مطلع کے انداز میں بیان کیا ہے۔ مطلب انسان کو کئی خواہشوں کو پُرا کرنے کے لئے جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جدو جہد کے باوجود بھی کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ بری چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ اگر بری چیزوں کے بجائے وہ مسجد میں یا کسی مذہبی مقامات میں جا کر واعظ یا مذہبی رہنماؤں کے خیالات سنے تو اسے ان خواہشوں کو حاصل نہ ہونے پر افسوس نہیں ہوگا۔ وہ صرف اپنی محنت پر اپنا دل و دماغ لگا کر ہی بیٹھے گا۔ اسی لئے لفظ کے مطابق فتحیابی انسان کو تب حاصل ہوسکتی ہے جب وہ اپنے کام میں محنت کرتے ہوئے خواہشوں کا ذکر ہی نہ کرے۔ صرف اپنے کام میں خواہش دکھا کر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر یہ محسوس کرے کہ فتحیابی اپنی محنت ہی سے حاصل ہوئی ہے۔ اور وہی محنت ایک خواہش ہے۔ اسی لئے میں یہ ذکر کرتا ہوں کہ غالب کے لفظ کے معنی کے مطابق بھی مقطع صحیح ہے اور مطلع کے ساتھ بھی وابستہ ہوتا ہے۔

اگر چہ میں پیغام غالب کے حوالے سے یہ بات کہوں کہ غالب نے اپنے دور میں ایسے اشخاص دیکھیں ہوں گے اور انہیں کو دیکھ کر یہ غزل تحریر کی ہوگی۔ جس سے کہ غالب نے خود اس بات کا احساس دلایا ہے کہ انسان کی خواہشیں پوری نہیں ہوتی ہیں اور ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے جدو جہد کرتا ہے گو کہ جدو جہد کر کے بھی کئی خواہشیں پوری ہوتی ہیں اور کئی خواہشیں پوری نہیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی ہمیں ان خواہشوں پر اتنا دباؤ نہیں ڈالنا چاہئے۔ ہمیں ہر ایک خواہش کی کامیابی خدا پر ہی چھوڑنی چاہئے۔ خواہ کامیاب ہوں یا نا ہوں۔ اسی لئے پیغام غالب میں غالب فرماتے ہیں کہ ہمیں خدا سے رجوع ہونا چاہئے۔ ہمیں اپنے اپنے مذہب کے مطابق خدا سے رجوع ہو کر یہ بات کہنی چاہئے کہ اگر میری ایسی خواہش ہے تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ اور اس کی کامیابی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پیغام غالب کا ذکر اگر ہم اس دور کے ساتھ وابستہ کریں گے تو ہم کہیں گے کہ کئی لوگ

خواہشوں کے لئے ہی امن میں خلل پیدا کرتے ہیں جو کہ ایک گناہ ہے۔ ہمیں ایسی خواہش کرنی چاہیئے کہ جس سے قوم ، ملک اور دُنیا میں امن کا ماحول قائم ہو جائے ۔ ہمیں ایسی خواہش اپنے دلوں میں رکھنی چاہئے جس سے امن اور قانون کا دائرہ مضبوط رہے۔

اگر چہ میں اس بات کی وضاحت بھی کروں شراب کے بارے میں کشمیری شاعروں نے بھی کئی شعروں میں اپنے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں لیکن ہم کشمیری یہ نہیں کہتے ہیں کہ شاعروں نے شراب کا استعمال کیا ہے، کشمیری زبان میں ہم شاعر کی شراب کو کوثر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جنت کا شراب۔ جو کہ جنت میں پیش کی جاتی ہے اور شراب کو کشمیری شاعروں نے استعمال کیا ہے لیکن انہوں نے اس کو پینے کے لئے استعمال نہیں کی ہے۔ نہ ہی پینے کی وجہ سے لوگوں کی بدنامی ہوئی ہے۔ اسی لئے کشمیری لوگ کہتے ہیں شراب کا تعلق جنت سے ہے۔

اب ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ پیغام غالب ایک اہم کلام ہونے کے ساتھ ایک اہم نصیحت بھی ہے۔ جسکے شعروں کو روزمرہ کے طور طریقوں سے وابستگی ہوسکتی ہے۔ انسان کو کبھی بھی پریشان نہیں رہنا چاہئے، پیغام غالب میں پریشانی کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں گو میں نے لفظ 'پریشان' مقطع میں نہیں دیکھا لیکن میں نے یہ ردیف وکافیہ کے لفظ میں پڑھا مطلب غالب نے پریشان لفظ مقطع میں نہیں بیان کیا ہے انہوں نے ردیف وکافیہ میں استعمال کیا ہے۔

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

شاعر فرماتے ہیں کہ جب میں باغ میں بیٹھتا ہوں بہت سے گلوں پر میری نظر پڑھتی ہے۔ معشوق پر بھی میری نظر پڑتی ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے روبرو ہوتے ہیں لیکن میں ان گلوں کو دیکھ کر تنگ آجاتا ہوں وہ اس لئے کہ میرے ساتھ معشوق اس باغ میں نہیں بیٹھتی ہے

نہ ہی کبھی میرے ساتھ اس باغ میں موجود رہی ۔ اگر میں ان پھولوں کو کاٹوں اور گلدستہ بناؤں تو یہ گلدستہ کیسے میں اس کو پیش کروں ۔ جس کے لئے میں اس باغ میں سوچتا ہوں دوسری بات اگرچہ میں ان پھولوں کو کاٹوں تو یہ ایک گناہ ہے ۔ کیوں اس باغ کی رونق کو خراب کروں ۔ پھول کاٹنا بہت ہی برا عمل ہے ۔ اسی لئے میری طبیعت چاہتی ہے جب معشوق میرے ساتھ اس باغ میں حاضر ہو جائے گی تو میں ان گلوں کا نظارہ دکھاؤں گا اور دکھا کر یہ کہوں گا کہ پھول ایک گلدستے کے برابر آپ کے سکون کے لئے پیش کرتا ہوں ۔ لیکن مجھے یہی پھول کہہ رہے ہیں کہ آپ کا معشوق آپ کے ساتھ کیوں نہیں اس باغ میں آتا ہے تا کہ ہمارے دیکھنے سے آپ کے معشوق کو تھوڑا سا سکون محسوس ہو جائے لیکن افسوس ہے کہ میں کیسے اپنی شکایت یا اپنا اظہار غم اس تک پہنچاؤں میں ایسا پیغام معشوق تک نہیں پہنچا سکتا ہوں ۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب!

کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

جب میں مطلع کے بارے میں بحث کرتا ہوں تو میں یہ کہتا ہوں کہ غالب گلوں کے کاٹنے کے خلاف ہے ۔ وہ ان گلوں کا نظارہ دیکھنا چاہتا ہے ۔ انہی گلوں کے نظارے سے اپنی وابستگی گلدستے کے برابر تسلیم کرتا ہے ۔ مطلب باغ میں بیٹھنے پر یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے یہی پھول اپنا نظارہ دکھانے کے لئے گلدستہ پیش کرتے ہیں ۔ مطلب میں پھولوں کو کاٹنا نہیں چاہتا ۔ میں رونق بدستور باغ میں لوگوں کے لئے رکھنا چاہتا ہوں اور اس رونق کو برباد نہیں دیکھنا چاہتا ۔ اسی لئے مقطع میں مطلع کی وابستگی رکھ کر یہ کہہ رہا ہے کہ اگر کوئی راہ گیر اس باغ میں داخل ہو کر ان پھولوں کو کاٹے گا تو باغ کی رونق برباد ہو سکتی ہے ۔ مطلب اگر میری غیر حاضری میں معشوق اس باغ میں داخل ہو جائے گا تو وہ میرے حاضری کے لئے پھول کو کاٹ کر یہ ثابت کریگا کہ میں باغ میں حاضر ہوا تھا لیکن معشوق نہیں حاضر تھا ۔ (مطلب باغ میں میں حاضر نہیں تھا) لیکن میرے گل باغ میں میری حاضری پر پھول ہی شہادت دے سکتے ہیں ۔ پھولوں

کو پتہ ہے کہ میں آیا تھا لیکن معشوق غیر حاضر تھا۔ میں اب یہ دل سے سوچتا ہوں کہ کوئی ان پھولوں کو نہ کاٹے جس سے باغ کی رونق برباد ہو۔ میں ہمیشہ پریشان رہوں گا کہ کوئی ان پھولوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے جس کی وجہ سے ان کی رونق برباد ہو جائے۔ ان کی رونق تا ابد باغ میں قائم و دائم رہنی چاہیئے۔

اب میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے دیوان غالب میں اس غزل کو مطلع اور مقطع کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ جس سے غزل میں مطلع کا دعویٰ مقطع کے ساتھ مل سکتا ہے۔

جب میں مقطع میں لفظ غالب کے بارے میں سوچتا ہوں اور لکھتا ہوں تو میرا تذکرہ بیان ہے شاعر فرماتے ہیں کہ جب ہم کسی باغ میں کوئی بھی رونق دیکھتے ہیں وہ رونق پھولوں سے آتی ہے۔ ہمیں ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس سے کہ پھولوں کو کاٹیں اور پھر پھولوں کا گلدستہ بنائیں۔ یہ ایک غلط بات ہے۔ جس کسی کو بھی گلدستہ پیش کرنا ہو ان کو حاضر باغ میں ہی کرنا چاہیئے۔ یا ان کی باغ میں ہی عزت افزائی کرنی چاہیئے اور باغ میں پھولوں کی رونق دیکھ کر ہی انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ یہی ایک گلدستہ ہے جسے انہیں تسلیم کرنا چاہیئے۔ ہمیں تب فتحیابی ملے گی جب ہم اس دنیا میں کسی پھول کو کاٹنے سے باز رہیں گے۔ اسی لئے غالب نے اس شعر میں مقطع کا مطلع کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ فتحیابی تب ہو سکتی ہے جب ہم کسی کا شیرازہ نہیں بکھریں گے اور نہ ہی کسی کا نظارہ برائی میں تبدیل کریں گے۔

اب اگر میں ان چار شعروں کا مطلب بیان کروں تو میں دعویٰ سے یہ کہوں گا کہ ان دنوں بھی باغ میں کئی لوگ پھولوں کو کاٹتے ہیں۔ جس سے باغ کی رونق خراب ہوتی ہے۔ دوسری بات غالب نے یہ بھی بیان کی ہے کہ جب میں کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہوں تو وہی پریشانی ہمارے دل کو ستاتی ہے، اسی لئے لفظ پریشان کا استعمال کیا ہے۔ دوسرا پھولوں کا نظارہ گلدستہ کے برابر کہا ہے اور غالب نے پھولوں کے دیکھنے کو ہی مقطع میں ایک گلدستہ کا رجحان کہا ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ اگرچہ ہم کسی کو برباد کریں گے یا کسی کو کوئی غلطی کرنے پر مجبور کریں

گے تو اس صورت میں شیرازہ بکھر جائیگا اور دنیا میں بدنامی ہوگی۔اسی لئے ایسی چیزوں کو دور کرنے کے لئے شاعر فرماتے ہیں کہ میں نے غزل میں یہ بیان کیا ہے کہ کسی کو کسی کا شیرازہ نہیں بکھیرنا چاہئے۔اس دنیا میں ہر ایک کو پریشانی سے دور کرنا چاہئے۔

اگرچہ میں غالب کے ادبی بیان کا ذکر بطور پیغام غالب کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے پھولوں اور پریشانی کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔انہوں نے پریشانی کو ختم کرنے کے لئے اور پریشانی سے دور رہنے کے لئے انسان کو باغ میں بیٹھنے کی تاکید کی ہے۔اگر کسی انسان کو کسی بات پر پریشانی ہو تو اسے باغ میں بیٹھنا چاہئے۔تاکہ پھولوں کے نظارے سے پریشانی تھوڑے وقت کے لئے دور ہو جائے۔اسی لئے غالب نے ادبی بیان میں یہ نصیحت کی ہے کہ ہر ایک انسان کو اس دنیا میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اگر پریشانی میں تھوڑا سا سکون نہ ملے تو نادان بننے کا بھی امکان ہے۔اسی لئے پریشانی کو دور کرنے کے لئے ہمیں کسی باغ میں بیٹھ کر پھولوں کا نظارہ کرنا چاہئے۔

اگرچہ پیغام غالب کا تذکرہ اس دور کے ساتھ بیان کیا جائے تو ہمیں اس بات کی نصیحت ملتی ہے کہ اس دور میں ہر ایک آدمی کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔خواہ وہ اقتصادی ہو یا سماجی ہو۔مطلب کسی بھی طریقے کی پریشانی سے توجہ ہٹانے کے لئے ہمیں باغ میں بیٹھنا چاہئے یا کسی دوست کے ساتھ کئی ایسی باتیں کرنی چاہئیں جن سے پریشانی دور ہو جائے اور کچھ دیر کے لئے آرام و سکون مل جائے۔کیونکہ آج کل کی دنیا میں ہر ایک انسان کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسی لئے شاعر فرماتے ہیں کہ امن و سکون تب ممکن ہے جب ہم پریشانی سے دور رہیں۔اسی لئے ہم کو سکون باغ میں ہی محسوس ہو سکتا ہے اور قانون کا بھی احترام کرنا چاہئے کہ پھولوں کو کاٹنے سے لاقانونیت نمودار ہو سکتی ہے۔

اگرچہ میں غالب کے ادبی پیغام پر بحث و مباحثہ کروں تو میں کہوں گا کہ ادبی لحاظ سے غالب نے دشمنوں کے ساتھ لڑائی سے دور رہنے کے لئے دیوار کا استعمال کیا ہے یا اگر کوئی بھی

رازنمودار ہوتا ہےتو وہ دیوار کے بغیر بھی ہوسکتا ہے لیکن شاعر کے مطابق دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مگرادبی پیغام میں شاعر نے کہا ہے کہ دیوار بھی پردے کے برابر تسلیم کی جاتی ہے۔ دنیا میں عام طور پر زمین اور زر کے نام پر ہی فتنے برپا ہوتے ہیں۔ اِن فتنوں کو ابھرنے کے لئے ہمیں دیوار کا استعمال کرنا چاہئے۔ اسی لئے غالب نے اپنے ادبی پیغام میں اس بات کا تذکرہ شعروں میں کیا ہے کہ جب بھی کوئی بات کرنی ہوتو حد میں کرنی چاہئے۔ حد سے باہر ہمیں نہیں جانا چاہئے۔ ہمیں کسی غیر ملک کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ اسی لئے سرحد پر دیوار مضبوط رکھنے سے آپسی تناؤ نہیں ہوسکتا۔ عموماً ہر ایک ملک دوسرے ملکوں کے ساتھ دیوار پر ہی فتنہ اٹھاتے ہیں۔ مطلب سرحد پر ہی فتنہ برپا ہوتا ہے۔ لفظ دیوار غالب نے مقطع میں نہیں استعمال کیا ہے۔ میں نے دیوار کو ردیف اور کافیہ میں ہی پڑھا اور اس کا ذکر کیا۔

مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس

شاعر فرماتے ہیں کہ جب مجھے شوق ہوا کہ میں اپنے معشوق کی نظر کسی طرح سے دیکھوں لیکن مجھے ایسا ماحول دیکھنے میں نہیں آیا جس سے کہ میں نے معشوق پر نظر ہی نہیں ڈالی۔ اب میں اس نظر کے بارے میں بہت سی کوشش کرتا رہا اور کوشش کرتے کرتے مجھے اتنا شوق دل میں پیدا ہونے لگا کہ کس طرح سے معشوق مجھ پر نظر ڈالے۔ یا میں اس پر نظر ڈالوں۔ اس بار میں نے سوچا نظر ڈالنے کے لئے بھی ایسی قیمت، ایسا دام معشوق کے دل میں ہے جس سے میں یہ کہوں کہ معشوق میں اتنی اہمیت ہے جس سے کہ مجھے نظر ڈالنے کے لئے قیمت چکانا پڑے گی اور نظر ڈالنے کے لئے جیسے کہ میں چاہتا ہوں وہ مجھے اپنی نظر سے دیکھے اور میں اس کو اپنی نظر سے دیکھوں اس دیکھنے کے لئے اتنی قیمت ہے کہ میں ہر ایک سے گذارش کرتا ہوں کہ کس طرح سے معشوق مجھ پر نظر ڈالے اور میں اس کو گھور گھور کر دیکھوں لیکن دیکھنے کے لئے میں گرفتار ہوا ہوں۔ مطلب میری آنکھیں قفس میں رکھی ہیں۔ مطلب گرفتار کی گئی ہیں۔

گرفتاری اس بات کی ہے کہ میں کب اپنی آنکھوں سے اپنے معشوق کو دیکھوں۔ پھر بھی میں بہت لوگوں کو تاکید کرتا ہوں کہ معشوق کی نظر کے لئے ایسی تجویز مرتب کرنا تا کہ میں معشوق کو دیکھوں۔ لیکن اس کی قیمت ہے ہی نہیں مطلب دل دینے اور دل خریدنے کے لئے کوئی دکان نہیں بلکہ یہ آنکھوں کے لگاؤ سے ہی دل دینا اور دل حاصل کرنا اس کے لئے میں نے کوئی دکان نہیں دیکھی اور نہ خرید وفروخت ہوسکتی ہے۔ مطلب ان باتوں کا کوئی دام ہی نہیں صرف معشوق اور محبوب کے دلوں کے توازن کے دائرے میں ہی دام موجود ہے۔ اسی لئے محبت کی کوئی دکان ہی نہیں اس عالم میں موجود ہے۔

مرگیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے

بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

اب شاعر غزل کے اس مقطع میں کہہ رہا ہے کہ مطلع میں میں نے صاف بیان کیا ہے کہ دل دینے اور دل کے ساتھ وابستہ کرنے کے لئے کوئی دکان نہیں۔ مطلب محبت میں خرید وفروخت نہیں ہے اسی لئے میں کیسے کسی کو اس کا دام بتا سکتا ہوں کہ کس دام پر میں معشوق کی محبت خریدوں اور وہ اپنے دل کو بیچے۔ اس پر کوئی بھی خریداری نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں محبت کی دکان ہے۔ اسی لئے مقطع میں شاعر فرماتا ہے کہ جب مجھے معشوق کے ساتھ وابستگی ہوئی مطلب میں نے دل دیا اس کو۔ میں اس کے دل پر مرچکا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ میرے دل کے بارے میں کیا کچھ کہتے ہیں لیکن اس بات کا انکشاف نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ یہ بات پردے ہی میں ہے۔ مطلب ان باتوں پر دیوار کھڑی ہے جس دیوار کو نہیں گرا سکتے اور نہ ہی یہ دیوار گر سکتی ہے۔ دیوار اس پر ہے کہ بدنامی نہ ہوجائے۔ دوسرے طریقے سے شاعر فرماتے ہیں کہ میں بھی ان باتوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا ہوں۔ میرے پاس بھی پوشیدہ راز ہے مطلب میرے پاس بھی دیوار کھڑی ہے جس کو میں گرا نہیں سکتا تبھی تو مقطع میں غالب فرمار ہے ہیں کہ اگر میں پاک محبت میں قائم ودائم ہوں لیکن میں اپنا راز کسی کو نہیں بتا سکتا

ہوں۔ اگرچہ میں مر بھی جاؤں پھر بھی میں اس راز سے واقفیت کسی کو نہیں کرا سکتا ہوں۔

میں مطلع کا تذکرہ بیان کرنے کے بعد یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے اپنے مقطع میں اپنے قلمی نام غالب کا تبصرہ دیوان میں بیان کیا ہے:

وہ یہ کہ مقطع میں فرماتے ہیں کہ کوئی بھی دل لگی ہو کوئی بھی غلط فہمی ہو یا اچھائی ہو یا برائی ہو وہ ہمیں کسی کو نہیں بتانی چاہئے یا جو کہ بتانے کے قابل نہ ہو۔ اگر ہم ان باتوں سے دور رہیں گے تو ایک امتحان کی گھڑی میں پھنس سکتے ہیں۔ امتحان اسی لئے ہے جبکہ ہم کسی معشوق کے بارے میں اپنے دل کا لگاؤ نہیں بتائیں اور نہ بتانے سے کوئی جھگڑا یا فتنہ برپا نہیں ہو۔ اور راز کو پوشیدہ رکھنے سے فتحیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ میں اب دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے مقطع کو اپنے قلمی نام کے مطلب کے طور پر ہی بیان کیا ہے اور مطلع اور مقطع کا جوڑ بدستور ایک ہی طریقے سے بیان کیا ہے۔

اب میں ان چار سطروں کا مطلب اس طرح بیان کرتا ہوں کہ غالب نے دیوار کے بارے میں اہم باتیں بتائی ہیں جیسے کہ اگر ہم محلّہ میں رہتے ہیں تو ہمیں اپنے صحن کی دیوار کا خیال رکھنا چاہئے۔ جو بات ہم اپنے مکان کے دائرے میں کرتے ہیں تو اس بات کا راز دوسرے مکان تک نہیں پہنچنا چاہئے۔ مطلب ہمیں اپنی دیوار قائم و دائم رکھنی چاہئے۔ اسی طرح سے اپنے ملک کی عزت و احترام دوسرے ملک میں قائم رکھنی چاہئے۔

اگرچہ شاعر کے ادبی پیغام پر بحث و مباحثہ کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ غالب نے دیوار کا استعمال حالات کے مطابق بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہر ایک ادیب کو اپنے پیغام میں لکھنا چاہئے خواہ وہ غزل لکھے یا غزل بیان کریں تو اس صورت میں اسے اشارہ ہی دینا چاہئے اور اس کا انکشاف نہیں کرنا چاہئے کہ غزل کس کے بارے میں لکھی ہے۔ اگر اس بات کا انکشاف ہو جائے گا تو ادبی ماحول میں خلل بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اپنی قلم سے جو بھی لکھے وہ دائرے راز میں ہی رکھنا چاہئے۔ اسی لئے غالب ہر ایک شاعر سے یہ کہہ رہا ہے کہ غزل کا مطلب عورتوں

کے ساتھ باتیں کرنا ہے۔تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کسی عورت پر کوئی شعر بیان کریں تو ہم انکشاف کریں گے کہ یہ کس عورت پر بیان کیا گیا ہے۔ایسی بیان بازی ادبی دائرے کے لحاظ سے بہت غیر قانونی اور غیر اخلاقی سمجھی جاتی ہے۔اسی لئے غالب نے اپنی غزل میں بیان کیا ہے کہ ہر ایک چیز پوشیدہ رکھنی چاہیئے تاکہ ادبی میدان میں کوئی تناؤ پیدا نہ ہو جائے۔

اگر چہ میں ادبی پیغام آج کل کے دور کے ساتھ جوڑوں تو میں یہ کہوں کہ محبت ہو یا نفرت ہو ہمیں اس بات کا انکشاف نہیں کرنا چاہیئے کہ ہمیں کس خاص آدمی کے ساتھ ایسا تناؤ ہے جس سے کہ امن میں خلل پیدا ہو جائے اور ہمیں ہر ایک بات امن کے ماحول میں ہی اور قانون کے دائرے میں ہی عمل میں لانی چاہیئے۔

غالب نے دیوان غالب میں ان الفاظ کو مقطع میں استعمال نہیں کیا ہے۔جو کہ غالب نے ردیف اور کافیہ میں بیان کئے ہوں گے لیکن مقطع میں یہ الفاظ نہیں ملتے جیسے کہ آسماں، آنکھ اور دماغ۔

غالب کے ادبی پیغام میں لفظ 'رات اور دن' کے بارے میں بیان کیا ہے کیونکہ ہر ایک پیغام میں بہت سی باتوں کے بارے میں نصیحت حاصل ہونی چاہیئے اسی لئے ادبی پیغام میں دیوان غالب میں لفظ رات اور دن کے بارے میں غالب نے پیغام دیا ہے۔یہ نہیں سمجھنا کہ اس نے پیغام دیا ہے مطلب مقطع میں الفاظ رات اور دن کے بارے میں بھی بیان کیا ہے۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غالب کے مقطع پر بحث کرنے کے لئے میں غزل کا مراسلہ بیان کرتا ہوں۔جس کو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی پیغام بھی ہے اور نصیحت بھی۔

نالۂ دل میں، شب، اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر، گو بے تاب تھا

اے معشوق میں نے دل کی آہ وزاری شب بھر محسوس کی۔میں رات کے وقت اکیلا سویا رہا اور میرے ساتھ کوئی بھی نہیں۔اسی لئے میں اپنے دل سے آہ وزاری بیان کرنے لگا اور

میں محسوس کرنے لگا اے معشوق اگرچہ میرے پاس کوئی نہیں ہے میں یہ رات اکیلے ہی گذارتا ہوں کیا آپ مجھے خواب میں اپنا دیدار کراؤ گی۔ اگر دیدار کراؤ گی تو میں اسے وصل کے برابر سمجھوں گا اور میں یہ بھی کہوں گا کہ مجھے آپ کے ساتھ ایک بزم میں حاضری ملی ہے۔ لیکن شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے دل میں اس آہ وزاری سے پریشانی رہی۔ شب بھر سوچتے ہوئے مجھے کبھی بھی وصل کا امکان دیکھنے میں نہیں آیا اور بے تابی میں رات گزاری۔ جب مجھے نیند ہی نہیں آئی تب میں نے اپنے خیالات اس طرح بیان کئے اے خدا کیا میں معشوق کی بزم میں شریک ہوسکتا ہوں اگر میں معشوق کی بزم میں شریک نہیں ہوسکتا ہوں تو مجھے آپ معشوق کو خواب میں دکھاؤ جس سے وصل بھی ہوجائے گا اور بزم میں شریک ہونے کی خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔ شاعر مطلع میں ہی فرماتا ہے کہ یہ صرف سوچ ہے نہ کہ حقیقت۔ اسی سوچ میں رات گزارتا ہوں۔

میں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیل گریہ میں، گردوں، کفِ سیلاب تھا

مطلع میں شاعر فرماتا ہے کہ جب میں رات کو سوتا ہوں تو معشوق کی یاد آتی ہے۔ جب وہ میرے پاس نہیں ہوتی تو میں سوچتے ہوئے سوتا ہوں اور سپنے میں بھی نہیں دیکھتا ہوں بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کیا وہ کسی رات کو خواب میں آئے گی اور میں خواب دیکھ کر اس کے بزم میں شریک ہوجاؤں۔ ایسا بیان کرتے ہوئے شاعر مقطع میں فرماتے ہیں کہ میں نے ایسی رات کو روکا کہ وہ خواب میں نہ آئے کیونکہ جب میں اس کے ساتھ ہم بزم ہوجاؤں تو مجھے اسے جدائی کے واقعات دکھاؤں گا جسے دیکھ کر وہ جدائی کا سیلاب دیکھے گا۔ جس سے وہ پریشانی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اسی لئے میں اب یہ کہہ رہا ہوں کہ رات بھر اکیلے دل سے آہ وزاری کرتے ہوئے سوجاؤں اور ایسا نہ ہو کہ وہ خواب میں ملے۔ خواب میں مل کر وہ میری جدائی پر سیلاب دیکھ کر پریشان ہوجائے گا جس سے کہ سکون دل نہیں رہے گا۔ سکون دل کے رہنے کے لئے میں ہی

دل سے آہ وزاری کروں لیکن وہ بالکل ٹھیک ٹھاک احترام کرے۔

غالب نے مقطع کو اپنے قلمی بیان کے طور طریقے سے بھی بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ میں اگر جدائی میں اپنی زندگی کی راتیں بسر کرتا ہوں لیکن میں ایسی باتوں سے کسی کو واقف نہیں کراتا ہوں۔ مجھے جدائی سے آنسو آرہے ہیں اور آنسوؤں کا سیلاب جاری ہے۔ ایسا سیلاب میں خود دیکھتا ہوں اور کسی کو اس سیلاب سے واقف نہیں کراتا۔ واقف نہ کرانے کی وجہ سے اور رات بھر دور رہنے کی وجہ سے مجھے فتحیابی ہوئی ہے۔ فتح اس بات پر کہ اپنے غم سے کسی کو واقف نہیں کرایا اور معشوق کے بارے میں بھی کوئی راز فاش نہیں کیا۔ میں نے دل کا غم برداشت کیا۔ برداشت کرنا ہی میرے لئے ایک فتحیابی ہے اور یہ فتحیابی مجھے رات کے دکھ کی وجہ سے ہے اور اس جدائی سے کسی کو واقف نہ کرنے کی وجہ سے فتحیاب ہوا ہوں۔

اب میں ان چار سطور کا نچوڑ یہ کہہ کر لکھ رہا ہوں کہ غالب نے مقطع کو مطلع کے مطابق لکھا ہے۔ اولاً مطلع میں بیان کیا ہے کہ میں رات بھر نہیں سویا۔ اس کے بعد یہ بیان کیا ہے کہ وہ خواب میں آئے اور خواب میں دیکھ کر مجھے ایک بزم میں ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن اسی کا وابستہ مقطع میں کہہ کر یہ کہہ رہا ہے کیوں نہ میں ہی دل سے آہ وزاری کروں اور وہ خواب میں نہ ملے۔ کیونکہ جب وہ خواب میں آئے گا تو وہ میری جدائی کا سیلاب دیکھے گا۔ جس سیلاب کے دیکھنے سے انہیں صدمہ ہو سکتا ہے اور اسی لئے وہ خوش رہے اس کی خوشی کے لئے میں ہی آہ وزاری کروں اور غمگین رہوں۔ میرے لئے غمگین رہنا ہی بہتر ہے اور اس کے لئے خوشحال رہنا۔

غالب کے ادبی پیغام سے یہ واقفیت اور نصیحت ملتی ہے کہ ہمیں ہر مصیبت کا مقابلہ خود کرنا چاہئے۔ ادب نواز دوستوں کو یہ کہہ کر درخواست کی ہے کہ انہیں کبھی بھی اپنی قلم سے کمزور نہیں ہونا چاہئے اور اپنی قوت اور اپنے اصول کی بنیاد پر ہی دنیا میں فتحیاب ہو سکتے ہیں۔ انہیں فتحیابی تب ہو سکتی ہے جب وہ کئی مشکلات کا سامنا کریں۔ اگر چہ غالب کے پیغام کو ہم اس

دور کے ساتھ وابستہ کریں گے تو ہمیں یہ نصیحت ملتی ہے کہ انسان کو کبھی بھی مصیبت سے بھاگنا نہیں چاہئے۔ انسان کو مصیبت کا مقابلہ ہمیشہ کرنا چاہئے۔ مطلب اگر وہ رات کو بہت سی مشکلات دیکھیں تو وہ دن میں ان مشکلات کا خاتمہ کر کے فتحیاب ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ رات کا مقابلہ دن کے تصور سے ہی انجام دینا ہے۔

غالب نے اپنے دیوان غالب میں لفظ دن کو مقطع میں اس طرح بیان کیا ہے۔ جس کو میں پہلے مطلع اور بعد میں مقطع کے ساتھ بیان کرتا ہوں لیکن غالب نے ادبی پیغام میں بہت سی باتوں کا ذکر کیا ہے خاص کر انسان کو اپنی قلم سے نصیحت کی ہے کہ ہمیں کئی رات مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے اور مقابلہ کرتے ہوئے ان مشکلات کے ساتھ دن میں داخل ہونا ہے۔ مطلب رات کو دن کی شکل میں بدلنا ہے۔ وہی مشکلات کا سامنا سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے ، جو مے پیے ہوتے

شاعر فرماتے ہیں کہ میں نے دُنیا میں محبت کی ہے لیکن پوشیدہ۔ میں نے اپنی محبت کا انکشاف نہیں کیا کہ مجھے کس کے ساتھ دل کا لگاؤ ہے۔ اسی لئے میں اب دل میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب وہ مجھے راستے میں ملیں گے تو میں انہیں چھیڑوں گا۔ اس صورت میں مجھے مجرم تصور کیا جائے گا لیکن کیوں نہ میں شراب پی کر ہی چلتے چلتے چھیڑ چھاڑ کروں اور جب مجھے پکڑیں گے تو سب لوگ راستے میں کہیں گے کہ آدمی نشے میں ہے۔ اس کے ہوش وحواس قائم نہیں ہیں۔

اس مطلع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں بھی لوگ شراب کا استعمال کرتے تھے۔ جس سے کہ قانونی جرم سمجھا جاتا تھا۔ مطلب رات کو نہ پی کر دن دہاڑے لوگ شراب کا استعمال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اس مقطع سے تاریخ داں حوالہ بھی دے سکتا ہے کہ غالب نے دیوان غالب میں بیان کیا ہے کہ ان کے دور میں بھی لوگ شراب کا استعمال غیر قانونی طور پر بھی کرتے تھے۔ مطلب وہ چھیڑ چھاڑ کرنے کے لئے شراب پیتے تھے اور یہ چھیڑ چھاڑ

قانونی جرم نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔اسی لئے مقطع میں تاریخ کا بھی ذکر ہو سکتا ہے۔

آہی جایا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

جب میں مطلع کو یہ بیان کر کے لکھتا ہوں کہ غالب نے اپنے مقطع میں بیان کیا ہے جب معشوق میرے پاس آتی نہیں اور جدائی میں رہتے ہیں کیوں نہ میں شراب پی کر انہیں راستے میں چھیڑوں۔اگرچہ مجھے کوئی راستے میں پکڑے گا تو وہ بھی مجھے پکڑنے سے باز رہے گا کیونکہ وہ یہ کہے گا کہ ایسے بندے سے دور رہو کیونکہ یہ شراب کے نشے میں ہے۔اسی لئے یہ چھیڑ چھاڑ نہیں سمجھی جائے گی جو کہ ایک قسم کی دیوانگی ہے۔اسی لئے غالب مقطع میں مطلع کو وابستہ کرتا ہے۔وہ یہ بہت سے لوگ چھیڑ چھاڑ کے بعد آہ وزاری کریں گے اور پھر یہ کہیں گے کہ غالب نے دن کو پی کر چھیڑ چھاڑ کی ہے کیونکہ معشوق اس کا کبھی احترام نہیں کرتی۔لیکن لوگ میرا حال دیکھ کر افسوس کریں گے کہ غالب راستے میں غلط بات کہہ رہا تھا جو کہ ایک بہت دانشور تسلیم کیا جاتا ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی انکشاف کریں گے کہ غالب نے دن میں ہی شراب استعمال کی ہے۔اسی لئے پی کر ایسی بات کر سکتے ہیں کیونکہ ہر ایک کو پینے کے بعد ہوش وحواس نہیں رہتا۔اب میں یہ بیان کرتا ہوں کہ غالب کی شاعری میں مطلع اور مقطع کا گہرا تعلق ہے۔

اگرچہ میں نے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ غالب شراب استعمال نہیں کرتے ہیں لیکن میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک مثال دی ہوگی اور یہ کہہ کر شعر تحریر کئے ہوں گے تا کہ لوگوں کو یہ پتا چل سکے کہ پینے سے ہوش وحواس کھو جاتے ہیں اور یہ بھی بیان کروں کہ دن میں پینے سے سماج میں انسان ذلیل ہوتا ہے۔اور نشے کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرنا چاہئے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے مقطع میں ان دنوں کے واقعات بھی بیان کئے ہیں اور یہ بھی بیان کیا ہوگا کہ ان دنوں کیا کیا حالات لوگ پیدا کرتے رہے۔اور کس طریقے کے واقعات ظاہر

ہوتے ہوں گے۔ اسی لئے ان شعروں کو بھی پیغام کے انداز سے بیان کر سکتے ہیں۔

اب میں مقطع کے بارے میں یہ کہوں کہ قلمی نام سے غالب نے اس شعر کو اس طرح بیان کیا ہے وہ یہ کہ دن کو جو کوئی بھی شراب استعمال کرتا ہے اسے بہت ہی برا بھلا کہتے ہیں کیونکہ راستے میں شراب پی کر اس کے ہوش وحواس اڑ جاتے ہیں اور جو کوئی دن میں ایسی حالت میں نظر آتا ہے اسے فتحیاب نہیں کہتے بلکہ اسے کمزور کہہ کر پکارتے ہیں۔ کوئی بھی اسے فتحیاب نہیں کہے گا مطلب اگر اس نے ناجائز طریقہ استعمال کیا اور ہوش وحواس اڑ گئے یہ کوئی فتحیابی نہیں ہے۔ اسے شکست کہہ سکتے ہیں۔ کوئی بھی راہ گیر یہ نہیں کہے گا کہ یہ کوئی فتحیابی ہے۔ اسے شکست خوار پکاریں گے۔

اب میں ان چار شعروں کا مطلب یہ کہہ کر بیان کروں گا کہ اگر میں رات کو اپنے معشوق کی جدائی پر ترستا ہوں اور رات آہ وزاری میں ہی کاٹتا ہوں۔ اسی طرح دن میں بھی کئی واقعات ظاہر ہوتے ہیں جن سے بہت ہی پریشانی ہوتی ہے۔ مطلب پیغام غالب میں رات اور دن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ لوگ مختلف قسم کی مشکلات دیکھتے ہیں اور ان کا سامنا بھی کرتے ہیں۔ بہت لوگوں کو اچھا برا لگتا ہے اور بہت کو برا اچھا بھی لگتا ہے۔

اگر چہ میں غالب کے ادبی پیغام کا ذکر ان شعروں کو پڑھ کر کروں تو ہمیں یہ نصیحت ملتی ہے کہ ہمیں کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہئے اور ہمیں ہمیشہ قانون کی حدود میں رہ کر ہی کام کرنا چاہئے اور کبھی بھی کسی سے غیر قانونی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

اگر چہ آج کل کے دور میں غالب کے پیغام کو پڑھیں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ جو واقعات چھیڑ چھاڑ کے ہوتے ہیں وہ واقعات غالب کے دور میں بھی ہوا کرتے تھے۔ اسی لئے ہمیں وقتاً فوقتاً قانون کے طور طریقے استعمال کرنے چاہئے جس سے کہ غیر قانونی سلسلہ کار آمد نہ ہو جائے اور امن میں خلل بھی پیدا نہ ہو سکے۔

پیغام غالب میں اگر چہ میں نے کئی لفظوں کا نچوڑ دیوان غالب کے ساتھ جوڑا لیکن جوڑ

کر میں نے سلسلہ وار نہ لفظ پیغام غالب پر لکھا۔ مطلب غالب نے لفظ ''استاذ'' کے بارے میں بھی اپنی غزل میں اور مقطع میں کچھ بتایا ہے جو کہ دیوان غالب میں واضح طور پر چھاپا گیا ہے۔ جیسے کہ

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

اولاً میں قاعدۂ غزل کے مطابق مطلع کا مفہوم بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ غالب فرماتے ہیں کہ اے معشوق تجھے بہت ہی دیر ہوئی اور اس دیر کے باعث میں آپ کے ساتھ کام نبھاتا ہوں لیکن اگر آپ کسی بھی وجہ سے تاخیر کرتی ہو تو اس کا نتیجہ مجھے اچھا حاصل ہوتا ہے لیکن تاخیر سے پابندیاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے میری پاک محبت کے دوران تاخیر کا ذکر بیان کیا لیکن وہ تاخیر مجھے محسوس ہی نہیں ہوئی۔ اس تاخیر سے میں نے اپنے دل کو ہمیشہ آپ کے لئے حاضر رکھا اور اس تاخیر سے میں پاک محبت کے اصولوں پر کاربند رہ کر گرفتار رہا۔

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں ''اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا''

مطلع میں شاعر فرماتا ہے کہ تاخیر سے بھی کچھ نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح جلد بازی میں نقصان دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس تاخیر سے نقصان نہیں ہوتا ہے بلکہ اس سے نفع ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک استاد جب لڑکے کو پڑھانے میں مصروف رہتا ہے اور دیر تک اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے آخرکار بہت تاخیر کر کے طالب علم کی سوچ بہت ہی بلند پایہ ثابت ہوتی ہے۔ کوئی بھی استاد کسی شاگرد کو جلد بازی میں کسی بھی کام کو کرنے کے لئے نہیں کہے گا بلکہ ایک استاد طالب علم کو آہستہ آہستہ ہوشیار اور ذہین بنائے گا۔ اسی طرح سے غالب فرماتے ہیں کہ اے معشوق آپ کی تاخیر سے میں ایک شاگرد آپ کا بنا۔ شاگرد آپسی پاک محبت کے ذکر میں ہی بن گیا۔ آپ میرے استاد بن گئے لیکن میں اس شاعر کا بھی بہت ہی

احترام کرتا ہوں جس نے میری تاخیر پر بہت کچھ لکھا اور بتایا۔ وہ یہ غالب کو میر تقی میرؔ نے کسی شاعری محفل میں یہ بتایا کہ غالب کے لئے استاد کا ہونا لازمی ہے۔ جب غالب کے پاس اپنی شاعری کے لئے کوئی استاد ہی حاصل نہیں ہوا ہے تو اس کی شاعری درست قرار نہیں دی جاسکتی۔ لیکن غالب نے اس کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ میں سیکھتا ہوں، میں کوئی بلند پایہ کا غزل گو نہیں ہوں۔ میں اپنے آپ کو استاد نہیں کہتا بلکہ میں مانتا ہوں کہ 'میرؔ' ایک بڑا شاعر ہے جسے میری وفات کے بعد لوگ کہیں گے کہ میرؔ بھی کوئی بلند شاعر اُردو زبان میں رہا ہے لیکن اس زمانے میں مجھے ماہر استاد کے نام سے پکاریں گے لیکن افسوس اس وقت تک میں موجود نہیں ہوں گا مطلب میں زندہ نہیں ہوں گا بلکہ میرا ہنر اور قلم موجود رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سے رجوع ہو کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میرؔ میں بھی ایک اچھی صنف ہے جس سے میں اپنے مقطع میں میرؔ کو ایک بڑا رتبہ دے رہا ہوں اگرچہ وہ میری شاعری میں استاد نہیں رہے بلکہ میں اسے استاد کا رتبہ دے رہا ہوں۔

اب صاف ظاہر ہے کہ مطلع اور مقطع کا واسطہ قریبی پڑھنے میں آتا ہے جیسے کہ غالب خود بخود مطلع میں کہتے ہیں کہ مجھے غزل کا ہنر سیکھنے اور کہنے میں تاخیر ہوئی ہے لیکن پھر بھی میرا ہنر گہرے انداز میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ بہ نسبت میرؔ کے جو کہ مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ غالب نے شاعری کسی استاذ سے نہیں سیکھی۔ اسی لئے میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ مقطع اور مطلع اظہار کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ غالب مطلع کا نچوڑ اپنے مقطع میں بیان کرتا ہے جو کہ ہر ایک غزل میں پڑھنے والوں کے سامنے ہے۔

اب میں غالب کے لفظ کے انداز میں اس مقطع کا بیان اس طرح کہہ کر لکھتا ہوں کہ غالب کہتے ہیں کہ استاد سے ہی سب کچھ سیکھتے ہیں۔ ہر ایک انسان کو استاد رکھنا لازمی ہے۔ لیکن کسی کو خدا کے فضل سے استاد رکھنا لازمی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذہنیت سے پڑھائی میں کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن ۱۰۰ میں سے ایک فیصدی ہی ایسے ہوتے ہیں۔ بقیہ کو استاد رکھنا لازمی

ہوتا ہے۔اسی لئے غالب کے لفظ کے لحاظ سے یہ بیان کرتا ہوں کہ جس طالب علم یا جس شاگرد کو استاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود بخود فتحیابی حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ ذہین ہو۔اسی وجہ سے وہ فتحیاب ہوتا ہے۔اگر چہ مجھے میرؔ صاحب فرمارہے ہیں کہ فتحیاب نہیں ہوسکتے کیونکہ فتحیابی کے لئے ماہر استاد کا ہونا لازم ہے۔پھر بھی میں اپنی ہنر بہادری کی وجہ سے فتحیاب ہو کر ہی لوگوں کے سامنے نظر آتا ہوں۔

اگر چہ میں ایسے پیغام کو ادبی پیغام کے انداز میں بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب فرمارہے ہیں کہ ہنر کو سیکھنے کیلئے استاد رکھنا لازمی ہے۔تاکہ استاد کے مشورے سے قوت اور شہرت بہتر انداز میں قائم ودائم رہ سکتی ہے۔

اگر چہ اس دور کے لحاظ سے میں غالب کا پیغام سناؤں تو میں کہوں گا کہ اس دنیا میں ہر ایک کو ہنر یا دوسری کئی باتوں کا ڈھنگ سیکھنے کے لئے استاد کا سجھاؤ بہت ہی اچھا ثابت ہوتا ہے۔

پیغام غالب میں لفظ استاد کا ذکر غالب نے میرؔ کے حوالے سے بیان کیا ہے مطلب یہ کہا ہے کہ ہمیں استاد سے مشورہ لینا ضروری ہے تاکہ کسی غلطی کا شکار نہ ہوجائیں۔اسی لئے غالب نے مقطع میں میرؔ کا حوالہ دیا ہے۔ممکن ہے کہ اس زمانے میں میرؔ نے غالب کو رتبہ کم دیا ہوگا اسی لئے غالب کو میر کا شکوہ بیان کرنا پڑا۔لیکن مقطع میں شکوہ بیان نہ کرکے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ اگلے زمانے میں جب ہم دونوں اس دنیا میں نہیں ہوں گے تو ادبی محفلوں میں میر کا ذکر لوگ ضرور کریں گے۔اسی طرح سے پیغام غالب میں لفظ ''خبر'' کے بارے میں غالب نے کچھ بیان کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ روزمرہ کے زندگی میں انسان بہت سی خبریں سنتا اور بہت سی خبروں سے اپنے کو غافل رکھتا ہے۔

درخورِ قہر وغضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

غالب فرماتے ہیں کہ جب لوگ کسی کے تاثرات بیان کرتے ہیں وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آدمی بہت ہی اچھا ہے، لیکن جب وہ آدمی کسی غلطی میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت اس کی غیر موجودگی میں برا بھلا ہی کہا کرتے ہیں۔ اسی طرح سے غالب نے ایسی بات کو معشوق کا حوالہ دے کر یہ بات کہی ہے کہ اے معشوق اگر آپ مجھے غصہ میں رکھتے ہو تو مجھے کوئی غلطی محسوس نہیں ہوتی اور نہ آپ کے ایسے الفاظ کہنے پر صدمہ ہوتا ہے صرف میں یہ کہنا چاہتا ہوں آخر کونسی غلطی ایسی ہے کہ جس سے آپس میں تناؤ پیدا ہوا اور آپسی سمجھوتہ میں گڑبڑ پیدا ہوئی ہے۔ ایسی باتوں سے مجھے واقف کیا جائے۔ ورنہ میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھ سے اچھا کوئی بھی دنیا میں نہیں ہے اور میں نے کونسی ایسی غلطی کی ہے جس سے کہ معشوق کی سوچ میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

غالب مطلع کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے ہیں کہ لوگ اس بات کا ذکر کر رہے تھے کہ غالب اور محبوب کے ساتھ کونسا ٹکراؤ ہے جس سے کہ ان میں آپسی تناؤ پیدا ہوا ہے لیکن اس بات پر کوئی صفائی نہیں آتی۔ صرف بازار میں گرم افواہ ہے کہ غالب نے جو غلطیاں پاک محبت میں کی ہیں اس کے بارے میں اس کے پرزے معشوق اڑائیں گے۔ مطلب ہر ایک چیز پر بات صاف طور سے بتائی جائے گی کہ کن حالات میں غالب نے معشوق کے ساتھ غلط فہمی پیدا کی ہے۔ صرف ایسی خبر سن کر لوگوں میں یہ جوش رہا ہے کہ ہم سننا چاہتے ہیں، کہ غالب میں کونسی غلطی ہے لیکن اے معشوق ابھی تک ایسی خبر نمودار ہی نہیں ہوئی۔ نمودار نہ ہونے کی وجہ سے اور ایسی خبر نہ سننے کی وجہ سے لوگوں میں اب ایسا جوش پیدا ہوا وہ کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تماشہ جیسا بنایا گیا ہے اور لوگوں کو تماش بین کا درجہ دیا گیا ہے۔

اگر میں اس بات کی وضاحت کروں کہ غالب کی غزل کا مطلع اور مقطع ایک ہی جیسا ہے

جیسے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کونسی غلطی کی ہے جس سے معشوق کے ساتھ تناؤ کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔اب لوگوں نے اس تناؤ کو دور کرنے کے لئے خبر سنی تھی کہ اس کا پردہ فاش ہونا ضرور سننے میں آئے گا لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ایسا پردہ فاش ہی نہیں ہوا نہ کوئی خبر سننے میں آئی۔اسی لئے اب لوگ کہنے لگے کہ یہ تماشہ جیسا منظر لوگوں کے سامنے تصور کیا گیا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ مطلع اور مقطع کا نچوڑ ملتا ہے۔

اگرچہ اُردو زبان کے دائرے میں غالب کا مطلب ہے فتحیابی اس انداز میں بھی مقطع غالب کے طرز بیان سے شعر کا مفہوم صحیح ہے۔جیسے کہ غالب فرماتے ہیں کہ ہمیں جب کوئی خبر سناتا ہے تو ہمیں عجیب وغریب خبر سننے سے پرزے اڑ جاتے ہیں۔اسی طرح سے جب بھی کوئی خبر شاعر سنتا ہے اس کے کان بہادر ہے اور وہ کانوں سے سن کر بہادری کے لہجہ میں ڈرتا نہیں ہے بلکہ فتحیابی اس میں اس قسم کی دیکھنے میں آئی ہے جیسے کہ اس نے یہ خبر سن کر کوئی جنگ جیتی ہے۔اسی لئے جو شکست خور عنصر ہوتا ہے اس کو شناخت کے بعد اپنے پرزے اڑ جاتے ہیں۔مطلب عزت فراموش ہوتا ہے اور لوگوں کے سامنے غدار تصور کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ان چار شعروں کا مفہوم ادبی یا غیر ادبی لحاظ سے سوچیں گے تو میں پیغام غالب میں یہ بیان کروں گا کہ کوئی بھی خبر سن کر ہوش وحواس نہیں کھونے چاہئے بلکہ ہر ایک خبر کو سن کر خوش رہنا چاہئے خواہ وہ بری ہو یا خوشی کی خبر ہو۔دونوں صورتوں میں خبر کو سن کر گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ سن کر دل میں قوت رکھنی چاہئے۔اسی لئے غالب پیغام غالب میں فرماتے ہیں کہ کسی بھی خبر کو تول کر ردعمل ظاہر کرنا چاہئے۔

ہمیں پیغام غالب کے حوالے سے موجودہ دور میں انسانیت کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ایسی خبروں کا ذکر کرنا لازم ہے جس سے کہ کوئی تناؤ پیدا نہ ہو۔یہ تناؤ ملکی، عالمی یا ریاستی سطح پر نہیں رہنا چاہئے بلکہ ہر ایک خبر پر سکون اور امن قائم ودائم رہنا چاہئے۔اسی لئے پیغام غالب میں غالب خود فرما رہے ہیں کہ خبر کو توڑ مروڑ کر نہیں سننا چاہئے۔

ہر کوئی پیغام سن کر اپنے تاثرات بیان کرتا ہے خواہ اس پیغام کا ذکر فقیروں کے بارے میں یا کسی خاص بات پر توجہ مرکوز کی گئی ہو لیکن پیغام سنتے یا پڑھتے ہوئے ہمیں نصیحت ضرور ملتی ہے۔ اسی طرح غالب نے دیوان غالب میں لفظ فقیروں پر بہت سے ایسے تاثرات بیان کئے ہیں جن سے ہم بھی حیران ہوتے ہیں جیسے:

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

اے معشوق میں آپ کے قدم دیکھتا ہوں اور وہاں پر آپ کے ہی تاثرات بیان کئے جاتے ہیں۔ اتنا ولولہ اور جوش آپ کے قدموں میں کہ جہاں جہاں آپ اپنا قدم رکھتے ہو وہاں پر تاثرات ہر کوئی بیان کرتا ہے اسی لئے میں ان قدموں کو ایک بلند پایہ کی حیثیت سے اپنے شعروں میں رتبہ دیتا ہوں کہ اے معشوق تیرے قدم دیکھ کر مجھ میں بھی ایسا لہجہ پیدا ہو جائے کہ دنیا میں میں یہ کہوں کہ آپ کے ہی قدم مجھ پر میرے حوصلہ افزائی کے لئے برقرار رہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب نے مطلع میں یہ بیان کیا ہے کہ معشوق کے قدموں پر بہت سارے تاثرات اچھے لکھتے ہیں اور اچھا ہی کہتے ہیں لیکن میں ان قدموں کو دیکھ کر اب دل سے سوچتا ہوں کہ ایسے ہی قدم مجھ میں بھی نمودار ہو جائیں لیکن ان قدموں کے بارے میں کیوں نہ میں فقیروں کا بھیس بنا کر معشوق کے پاس جاؤں اور اس سے یہ کہوں کہ آپ کی تعریف دنیا بھر میں لوگ کرتے ہیں مجھے بھی ایسا تعویذ عطا کریں کہ جس سے لوگ آپ کے برابر تعریف کرتے رہیں اور میرے قدموں کو دیکھ کر تماشہ دیکھیں جس طرح آپ کے قدموں کو بہت ساری آنکھوں دیکھتی ہیں اور لگتا ہے کہ یہ کوئی خاص کھلونہ ہے جس سے ہر کوئی دیکھ کر ہنستا بھی اور

روتا بھی ہے۔اسی لئے مطلع کو مقطع کے ساتھ جوڑ کر غالب فرماتے ہے کہ میں نے بہت سے فقیروں کے پاس جاکر تاکید کی کہ مجھے بھی ایسا احترام ملنا چاہئے جتنا کہ پاکِ محبت میں میرے معشوق کو حاصل ہوا ہے لیکن فقیروں کا بھیس بنا کر بھی لوگ میرا تماشہ دیکھیں گے کیونکہ میں اصلاً فقیر نہیں ہوں میں کوئی راز پانے کیلئے فقیر کا بھیس اختیار کرتا ہوں ۔ اے معشوق اگر چہ پاک محبت میں ایسا تناؤ نہیں پیدا ہوتا تو مجھے فقیروں کے بارے میں ایسی بات کیوں کہنی پڑے۔ دراصل آپ کی جدائی سے ایسا تصور کر رہا ہوں۔

مقطع کا مفہوم حرف غالب کے حوالے سے یہ کہہ کر غالب سنا رہا ہے کہ اگر میں فقیری کے پوشاک میں کوئی راز حاصل کرنے کے لئے نکلوں تو مجھے اسُی سے ہی فتحیابی حاصل ہوسکتی ہے بشرطیکہ کوئی بھی میرے بھیس کو دیکھ کر میرا تماشہ نہ بنائے۔اس لئے مجھے فتحیابی صرف فقیری بھیس میں آ کر پوشیدہ رہنی چاہیے۔تاکہ اس بھیس کا راز فاش نہ ہوجائے۔

اب ان چار سطور کا مطلب اس طرح سے نچوڑیں گے کہ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے مقطع اور مطلع کو ایک ہی معنی سے جوڑ کر یہ نصیحت کی ہے کہ ہمیں ہر وقت، راز کا بھی احترام کرنا چاہئے اور راز دار کا ہمیں احترام کرنا چاہئے جس سے کہ ہمیں اصلیت معلوم ہوجائے۔

اگر میں غالب کے تصور کو پیغام غالب کے حوالے سے بیان کروں تو کہوں گا کہ کسی وقت کسی راز پوشی کے لئے انسان کو بھیس بھی بدلنا پڑتا ہے جس سے کہ راز حاصل ہوتا ہے۔ راز دار کبھی بھی راز سے واقف نہیں کراتا ہے۔اگر چہ فقیری کے بھیس میں بھی راز کو پانے کے لئے انسان جدوجہد کرتا ہے لیکن کہیں کامیابی ملتی ہے اور کہیں ناکامیابی ملتی ہے۔اسی لئے پیغام غالب میں غالب اپنی غزل میں یہ کہہ رہا ہے کہ بھیس بدل کر بھی راز فاش نہیں ہوتا ہے۔ مختلف طریقوں سے کسی وقت راز فاش ہوتا ہے۔اگر چہ پیغام غالب کا ذکر اس دور کے ماحول میں بیان کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ امن اور قانون کو برقرار رکھنے کے لئے کسی وقت راز کو

بھی تحقیق کرنا پڑتا ہے تا کہ عوام میں نقص امن اور لاقانونیت پیدا نہ ہو۔

غالب نے پیغام غالب میں بہت سے حروف پر مختلف بیان بازی کر کے ہمیں اس بات کا احساس دیا ہے کہ ہر کسی کو اپنا پیغام گلی کوچوں اور شہروں میں بھی پہنچانا چاہئے خواہ وہ پیغام اچھا ہو یا برا ہو لیکن ایسا پیغام لوگوں تک پہنچنا چاہئے تا کہ امن اور قانون برقرار رہے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

اے معشوق میں کئی بار کوشش کرتا رہا ہوں کہ آپ کی نظر دیکھوں لیکن میں آپ کی نظر نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ کئی کہتے ہیں کہ آپ بہت ہی خوبصورت ہو۔ کئی کہتے ہیں کہ آپ پری جیسی دکھائی دیتی ہو لیکن میں اسے بالائے طاق رکھتا ہوں۔ جب میں نے آپ کی صورت دیکھی ہی نہیں مجھے کیسے تسکین ہوگی کہ آپ کی ایسی صورت ہے اے معشوق اس سے میں دور ہوں۔ نہ مجھے آپ کے ساتھ وصل ہوا نہ کوئی رابطہ قائم کیا ہے۔

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

معشوق کے متعلق مطلع میں شاعر فرماتے ہیں کہ میں نے جب معشوق کی صورت دیکھی ہی نہیں تو اب مجھے کئی لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ اس کے کوچہ میں آوارہ گردی کا رُخ اختیار کرو گے تو ممکن ہے اس کا دیدار ہو جائے۔ ممکن ہے اس کے راز سے واقفیت ہوگی اور آپ دیدار سے واقف ہو جاؤ گے لیکن شاعر مطلع میں یہ کہہ رہا ہے کہ جب میں نے صورت نہیں دیکھی تو مقطع میں خود فرما رہے ہیں کہ اس صورت کو دیکھنے کے لئے آپ کو اس کے کوچہ میں حاضر رہنا ہے تا کہ راز کے دیدار سے واقف ہو جاؤ۔ جو مجھے ایسا مشورہ دے رہیں وہ کوئی بہادری نہیں ہے۔ اس طریقے سے دیدار کرنا اچھا نہیں ہے جو کہ قانوناً اچھا نہیں ہے۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو معشوق کا دلدار نہیں سمجھتا ہوں اگرچہ وہ مجھے دلدار سمجھتے ہیں تو انہیں کسی نہ

کسی طریقے سے خواہ وہ کوچہ ہو یا غیر کوچہ ہو اپنے دیدار سے واقف کرانا ہے۔

اب ان چا سطور کو پڑھ کر پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو جائے گا کہ غالب نے مقطع اور مطلع کا ذکر ایک ہی طریقہ سے کیا ہے۔ مانتے ہیں کہ مطلع میں وہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے معشوق کا دیدار ہی حاصل نہیں ہوا پھر اس کا نچوڑ مقطع میں یہ کہہ رہے ہیں کہ جب میں اس کے کوچہ میں جاؤں تو مجھے اس کا راز نظر آئے گا وہ بھی دیدار کے برابر تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن دوسرے انداز میں یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس طریقے کا دیدار کوئی بھی معشوق نہیں کرتا ہے اور ایسے دیدار سے دلدار نہیں کہا کرتے ہیں۔

اگر چہ میں غالب کے مقطع میں حرف کے لحاظ سے بیان کروں تو میں یہ کہوں کہ کوچہ میں دیدار کرنا دلبری نہیں اور کوچہ میں دیدار کرنے سے کوئی بھی فتحیابی نہیں ملتی ہے اور فتحیاب اس سے نہیں قرار دیا جاتا ہے۔ ہاں اگر کسی کو دلبری دکھانی ہو تو آمنے سامنے دیکھنے سے فتحیابی حاصل ہوتی ہے۔

اگر چہ ایسے رجحان کو پیغام غالب کے حوالے سے بیان کریں گے تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے یہ بیان کیا ہے کہ قانون اور امن کے دائرے میں ہی ہر کام کرنا چاہئے۔ کوچہ یا سڑک پر کوئی بے حرمتی نہیں کرنی چاہئے اور پاک محبت میں دل میں برداشت قوت رکھ کر سکون رکھنا چاہئے۔ اگر چہ میں پیغام غالب کا ذکر اس دور کے ساتھ بیان کروں تو میں کہوں گا کہ غالب نے صحیح فرمایا ہے کہ راستے یا کوچہ میں یا کسی بھی سڑک پر غلط کام انجام نہیں دینا چاہئے۔ انسان میں قوت برداشت ہونی چاہئے اور امن کے طریقے استعمال کرنا چاہئے تا کہ قانون کا غلط استعمال نہ ہو۔

پیغام غالب لفظ 'ہم' بغیر ہمیں اور ہمارے

غالب نے بہت سی غزلیں لکھیں ہیں لیکن ایک ہی مجموعہ دیوانِ غالب کے نام سے پڑھتے ہیں۔غالب کی شاعری دُنیا بھر میں مشہور ہے۔سب سے پہلے میں نے اس بات کی وضاحت کی کہ غالب کا مطلع مقطع کے ساتھ ملتا ہے، اگر دوسرے شعر بھی غزلوں میں پڑھیں گے تو ہمیں اس بات کا بھی احساس ہوجائے گا کہ مطلع کے ساتھ غالب کے باقی شعر بھی مل سکتے ہیں۔مفہوم کے لحاظ سے الگ الگ لیکن مقطع کے ساتھ جوڑ کر سکتے ہیں۔اسی طرح۔سے میں یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آج تک ہم نے اُردو ادب میں غزل کا مفہوم نکالا ہے تو ہم عام طور پر عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے کو غزل کہتے ہیں لیکن اگر ہم غور سے غالب کی شاعری پڑھیں گے تو ہمیں نصیحت ہی نصیحت فراہم ہوجائے گی جس سے ہم یہ کہیں کہ یہ عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے اور ان کے ساتھ تشبیہ دینے کے برابر نہیں بلکہ ان شعروں سے ہمیں نصیحت ملتی ہے۔نصیحت پیغام کے طور پر ملتی ہے، اگر ہم غالب کے مفہوم پر بحث کریں گے تو اس کا مطلب فتحیاب کرنا ہے۔جب بھی ہم کوئی جنگ کرتے ہیں تو فتحیابی کے بعد ہم پوچھتے ہیں کہ فتحیابی کیسے ہوئی، کن حالات میں فتح کیا گیا۔تو اس وقت فتح کرنے والا ہمیں ان طریقوں سے واقفیت کراتا ہے جن سے اس کو فتح ملتی ہے۔اسی طرح سے میں نے مطلع اور

مقطع کو بیان کر کے وضاحت کی کہ کس طرح سے مختلف طریقوں سے ہمیں فتحیابی ملتی ہے، فتحیابی ہی نہیں بلکہ نصیحت ملتی ہے۔ جس نصیحت کو میں نے پیغام کے طرز میں بیان کیا ہے۔

اگر ہم غالب کی شاعری پر بحث و مباحثہ کریں گے تو ہم اس بات پر پہنچیں گے کہ غالب نے بہت ہی بہترین شاعری اُردو زبان میں بیان کی ہے، لیکن میں اس بات سے متفق نہیں ہوں اگر ہم اُردو زبان کے الفاظ پر بحث و مباحثہ کریں گے تو میں اس بات پر توجہ پڑھنے والے کی مرکوز کروں گا کہ غالب نے شاعری میں بہت سی غلطیاں بھی کیں ہیں اور صحیح انداز میں بھی شعر بیان کیا ہے۔

غالب کے دور میں زیادہ تر توجہ شعر و شاعری اور ادب پر بھی کیا جاتا تھا۔ جس طرح سے دورِ حاضر میں ادب کو زیادہ توجہ نہیں دی جاتی ہے، اس دور میں سائنس کی طرف توجہ مرکوز کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ادبی بیان بازی ادبی حلقوں میں کم محسوس ہوتی ہے۔ غالب کے دور میں شاعر بہت سے ممالک کی ریاستوں میں جاتے تھے اور جیسے کہ ہند پاک اور بنگلہ دیش کی ریاستوں میں جا کر، مختلف ادبی محفلوں میں شرکت کرتے تھے، لیکن زبان کے طور پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ مطلب اگر کوئی شاعر شعر بیان کرتا رہا تو اس کی غلطیوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ بلکہ وہ ہر ایک کی شاعری پر آفرین کرتے تھے۔ اسی لئے اگر چہ ہم غالب یا میر کا شعر پڑھتے ہیں تو ہم بھی آفرین کرتے ہیں۔

غالب نے بہت سی غزلوں میں لفظ 'ہم' استعمال کیا ہے لیکن پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ ہم جمع ہے یا واحد میں ہے۔ اگر ہم اُردو زبان بولنے والوں کے علاقوں میں گشت کریں اور ان سے اُردو زبان میں بات چیت کریں تو وہ لفظ 'ہم' کو واحد کی صورت میں بھی اور جمع کے صورت میں بھی بیان کرتے ہیں۔ اگر چہ ہم کسی سے بات کرتے ہیں تو اس سے یہ کہتے ہیں کہ آپ نے بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ جواب میں وہ ہمیں کہتا ہے کہ 'ہم ایسی غلطیاں نہیں کرتے' مطلب وہ 'ہم' کا لفظ واحد میں ہی استعمال کرتا ہے اسی طرح سے اگر ہم دوسری

توجہ اس لفظ پر مرکوز کریں گے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہم جمع ہے جیسے 'ہم کسی کو یہ کہتے ہیں کہ دیکھو انہوں نے تنظیم میں بہت سی غلطیاں کیں ہیں'۔ جواب میں وہ کہتے ہیں کہ 'ہم ان غلطیوں سے ہوشیار رہتے ہیں' مطلب انہوں نے 'ہم' کو جمع میں استعمال کر کے اس بات کی وضاحت کی کہ ہم جمع میں بھی استعمال کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح سے غالب نے 'ہم' لفظ مقطع میں بہت بار استعمال کیا ہے۔ پڑھنے والے کو احساس ہی نہیں کہ شاعر نے ہم کو جمع کی صورت میں یا واحد کی صورت میں استعمال کیا ہے۔ اسی لئے میں اس بات کی وضاحت کرتا ہوں۔

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

اولاً میں اس مصرعے کی تشبیہ کرتا ہوں، شاعر فرماتا ہے کہ میں جب کسی وقت کسی محفل میں یا کسی جگہ بیٹھتا ہوں تو میرے بیٹھنے سے سب خوش رہتے ہیں لیکن جس وقت یا جس دن میں اپنی مستی میں نہیں ہوتا ہوں۔ مطلب پیئے کے بغیر ہوتا ہوں تو میرے ساتھ محفل میں بیٹھنا باقیوں کو دشواری محسوس ہوتی ہے۔ لیکن لوگ اس طریقے سے بھی حاضر ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اے شاعر آپ اس وقت اپنی مستی میں نہیں ہو۔ جب آپ مستی میں نہیں ہو تو ہم ایسے دن میں آپ کے ساتھ کونسی باتیں چھیڑیں گے۔ مطلب غالب جب محفل میں بیٹھتا ہے کہتا ہے کہ اے معشوق جب دن میں اپنی مستی میں نہیں ہوتا ہوں اس دن مجھے آپ کی یاد ستاتی ہے۔ جس دن میں اپنی مستی میں ہوتا ہوں اس دن میں آپ کو یاد نہیں کرتا ہوں اور نہ آپ کی بات چھیڑتا ہوں۔ مطلب اے معشوق مستی میں رہنے سے میری یادداشت زیادہ کام نہیں کرتی، مست رہنے سے انسان یادداشت کھوتا ہے۔

اگر ''ہم'' لفظ کو اس شعر کے اس طرح سے بیان کریں گے بہت سے لوگ غالب کو یہ کہتے ہیں کہ اے غالب آپ نے بہترین شعر و شاعری کی ہے ہمیں آپ کی غزلیں بہت پسند آتی ہیں، لیکن ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس دن ہم کسی مستی میں ہوتے ہیں تو ہماری یادداشت

کمزور ہو جاتی ہے۔ جس دن ہم مستی کے بغیر ہوتے ہیں تو ہماری یادداشت صحیح ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب لوگ شاعر کو کہتے ہیں کہ آپ جب اپنی مستی میں ہوتے ہو تو اس دن آپ ہماری کسی بات پر توجہ نہیں دیتے ہو جس دن آپ اپنی مستی میں نہیں ہوتے ہو تو اس دن آپ ہمیں کسی چیز کی یاددہانی کراتے ہو۔ مطلب لوگ شاعر کو کہتے ہیں کہ جب آپ اپنی شراب میں مست ہوتے ہو تو اس وقت آپ ہمیں بھول جاتے ہو۔ جس وقت شراب پیئے بغیر ہوتے ہو تو اس وقت ہمارے ساتھ اچھے طریقے سے بات چیت کرتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر نے جب لوگوں سے ایسی باتیں سنی تو اس نے اسی غزل پر مقطع یوں بیان کیا ہے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کہ بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

غالب مقطع میں اس کا جواب ان دوستوں کو دیتا ہے جنہوں نے مطلع میں کہا تھا کہ مستی میں رہ کر آپ ہمیں بھول جاتے ہو۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں اے دوست میں ان اصولوں سے دور ہوں، میں مستی میں ہوں یا نہیں ہوں میں آپ کے ساتھ ہمیشہ بیٹھتا ہوں اور اپنی کمزوری اور اپنی بہادری آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ کسی دن آپ نے مجھے ناراض دیکھا ہوگا تو میں نے اس دن آپ کے ساتھ ٹھیک ڈھنگ سے ملاقات نہیں کی ہوگی۔ مطلب پرانے طریقے سے پیش نہیں آیا ہوگا تب بھی تو آپ مجھ سے ایسا شکوہ کرتے ہو۔ اس شکوہ کو دور کرنا چاہئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی دن انسان کسی سوچ میں ڈوب کر پرانے والے انداز سے پیش نہیں آتا ہے۔ اس لئے میرے دوست مجھے ایسا نہیں سمجھنا چاہئے جیسا کہ آپ مجھے سمجھتے ہو۔

اب میں اس مقطع کو اس طرح سے تشبیہ کرتا ہوں۔

اے معشوق میں آپ کو کبھی بھی بھولتا نہیں۔ چاہے میں مستی میں ہوں یا مستی کے بغیر تو بھی میں آپ کو ہمیشہ یاد کرتا ہوں اور آپ کے ساتھ پیش در پیش حاضر رہتا ہوں اگر چہ آپ

میرے دل سے باہر ہو لیکن میں آپ کے دل کے ساتھ ساتھ ہوں۔ اگر چہ ہم غالب کے مفہوم کے طرز سے بیان کریں تو ہم یہ کہیں گے کہ جب بھی کوئی چیز فتح کرنی ہو تو ہمیں مستی اور غیر مستی کو بالائے طاق رکھ کر ہر ایک چیز کو فتح کرنا چاہئے اور ہر ایک کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہئے۔ اسی سے ہماری فتحیابی ممکن ہے، اگر میں مطلع اور مقطع کو اس طرح سے بیان کروں کہ لفظ 'ہم' کو واحد کے طریقے سے اس طرح کہوں۔ مطلب 'ہم' کو 'میں' سمجھ کر بیان کروں۔

میں اے معشوق جب بھی کسی دن اپنی مستی میں ہوتا ہوں، میں آپ کی باتیں آپ کے لئے چھیڑتا ہوں لیکن کسی وقت کسی محفل میں مجھے مستی میں رہ کر آپ کی بات نہیں چھیڑتا ہوں کیونکہ میں یہ سوچتا ہوں کہ چھیڑنے سے بدنامی ہو سکتی ہے اور میری عزت و احترام نہیں رہے گا اسی لئے میں کسی دن کسی وقت مستی میں یا غیر مستی میں آپ کی توجہ قانونی طریقہ سے دل میں سنبھال کر عزت اور احترام کا پرچم لہراتا ہوں۔

اب میں مقطع کا بھی مطلب واحد کے طریقے سے یوں بیان کروں:۔

اے معشوق مجھے اس بات کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی میرا ضمیر اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ میں کسی کو یہ بتاؤں کہ معشوق کس دن میرے ساتھ بیٹھا اور کس دن میں آپ کے ساتھ پیش پیش رہا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے 'ہم' کو جمع کے صورت میں بھی اور واحد کے صورت میں بھی شعروں میں استعمال کیا ہے۔

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
ایک چھیڑ ہے وگر نہ مراد امتحان نہیں

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق مجھے آپ کی جفا سے وفا ترک نہیں کرتا ہوں لیکن لفظ 'جفا' سے ہی یہ سوچنا چاہئے کہ آپ اور مجھ میں کچھ نہ کچھ دل کا معاملہ ہے۔ اب دل کے

معاملے کو وفا میں پیش نہیں کر سکتے لیکن دل میں چھیڑ خوانی ہے۔جس چھیڑ خوانی کے وجہ سے آپ میرا امتحان لی رہی ہو۔لیکن میں اس امتحان میں کامیاب رہوں گا آپ یہ سمجھنا کہ میں جفا میں رہوں۔ میں ہمیشہ جفا کو ترک کر کے وفا میں ہی پیش پیش رہوں گا کیونکہ اگر آپ جفا کرتے میں دل کی دھڑکن کی وجہ سے وفا میں تبدیل کرتا ہوں۔اگر میں اس شعر پر یہ کہوں کہ غالب کسی وقت محفل میں بیٹھا ہوگا یا کسی دوست کے پاس بیٹھا ہوگا یا بازار میں لوگوں کے ساتھ باتیں کرتا رہتا ہوگا۔تبھی تو غالب نے لفظ 'ہم' کا استعمال کیا ہے۔اسی 'ہم' کو تشبیہ اس طرح کروں۔اے غالب ہمیں آپ کی شاعری پر ناز ہے آپ نے بہت سی غزلیں ہمیں کئی محفلوں میں سنائی ہیں جس کی وجہ سے ہم لوگ آپ کے معشوق کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ جفا نہیں کرتے لیکن اگر وہ آپ کے ساتھ جفا نہیں کرتے پھر بھی آپ اپنے شعروں میں یہ بیان کرتے ہو کہ میں ان کے ساتھ وفا کرتا ہوں اور یہ بھی بیان کرتے ہو کہ جفا تب محسوس ہوئی جب تک نہ آپ کے معشوق کو کچھ نہ کچھ آپ کے دل میں خیال ابھر رہا ہے۔اسی وجہ سے آپ جفا کو وفا میں مرکوز کرتے ہو۔ہم لوگ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اے غالب کیا آپ جفا کے امتحان میں کامیاب ہو کر وفا میں کامیاب ہو جائیں گے۔جفا آپ کے لئے معشوق نے امتحان کی صورت میں پیش کی ہے۔لیکن آپ وفا کے صورت میں کامیاب ہونا چاہتے ہو غالب صاحب اس کا جواب ضرور فرمانا۔

جاں ہے بہاے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

غالب فرماتے ہیں کہ میں اپنے دل کو کیوں غلط انداز سے پیش کروں۔نہ میں نے ابھی تک دل کو غلط انداز سے پیش کیا ہے۔میں کوئی نادان نہیں ہوں۔جب تک نہ میرے معشوق میں میرے متعلق کچھ نہ کچھ خیالات دل میں ابھریں تبھی تو وہ جفا کے طرز سے مجھے پیش آکر وفا کی صورت میں مجھے دل کو پیش کرنے کیلئے انتظار کر رہی ہے۔میں کوئی نادان نہیں ہوں

میں نیم نہیں ہوں میں ایک دانشور کی حیثیت سے دعویٰ سے یہ کہتا ہوں کہ اے معشوق مجھے نادان نہیں سمجھنا چاہئے، میں آپ کو نادان اسی لئے سمجھتا ہوں کہ آپ جفا کے طریقے سے مجھے پیش آکر وفا کے حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہو۔

مقطع غالب کے لفظ کے طرز سے مطلب اسی کو فتحیابی حاصل ہوتی ہے جو نادان کے طور طریقے سے کسی کو پیش نہ آئے۔ نادان کبھی بھی کسی چیز میں فتحیابی حاصل نہیں کرتا ہے اگر فتحیابی حاصل کرنی ہو تو ہمیں دانشور کے طور طریقے سے فتحیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ جس طرح غالب فرماتے ہیں کہ میں کوئی نادان نہیں ہوں میں ایک دانشور ہوں اور مجھ میں دانائی ہے معشوق مجھے نادان سمجھ کر نیم کے طور طریقے سے تسلیم کرتی ہے لیکن میں اس نیم کو دور کر کے نادانی کے طرز سے فتحیابی حاصل کروں گا۔

جب لوگوں نے شاعر کو ایسی باتیں فرمائی جو کہ میں نے پہلے بیان کیا کہ لفظ 'ہم' کیوں غالب نے مطلع میں استعمال کیا ہے اور مقطع کے شعر سے غالب 'ہم' کا جواب اس طرح فرماتے ہیں کہ ان دوستوں اور لوگوں کو یہ کہہ رہا ہے کہ آپ نے مجھے شکوہ کیا ہے کہ آپ جفا کی صورت میں معشوق پر اپنا دل نچھاور کرتے ہو لیکن میں جفا کے خیال سے نہیں بلکہ وفا کے خیال سے اپنا دل پیش کرتا ہوں۔ اسی لئے میں ان لوگوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے کبھی اپنا دل جفا کے لفظ سے نادان نہیں قرار دیا ہے بلکہ میں نے یہ سمجھا ہے کہ جفا تب پیدا ہوئی جب دل میں کوئی نہ کوئی بات چھیڑی ہوگی تب لفظ جفا پیدا ہوا۔ اسی لئے جفا کو اب میں وفا کے صورت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تب تو ان لوگوں سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سمجھنا کہ غالب کوئی نادان ہے یا مجھے میری شاعری پر تعریف لکھ کر مجھے نادان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں صحیح کہتا ہوں کہ جب بھی جفا کا استعمال ہوا تو کچھ نہ کچھ دل کا چکر صحیح ہے اور اس جفا کو اپنی دانائی سے وفا میں پیش کرنا چاہتا ہوں تبھی تو

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کو ہوا باندھتے ہیں

شاعر فرماتے ہیں اے معشوق جب بھی آپ اپنا غم وغصہ یا کوئی اپنا اظہار کسی سے کرتے ہوتو وہ یہ سن کر کہانی لکھتا ہے یا اس پر مضمون لکھتا ہے جس سے کہ آپ کا احترام ہی نہیں رہتا ہے، آپ کو سنتے ہیں لیکن جب آپ دن کو اپنا احوال سناتے ہو تو سننے والے صبح کے وقت آپ کے احوال پر سوچ کر مضمون نگاری مرتب کرتے ہیں۔ مطلب وہ آپ کے طور طریقے کو سن کر تانے بانے کرتے ہیں اور ہوا کی صورت میں لوگوں تک باندھتے ہیں۔ مطلب ایسی باتیں چھیڑنا اچھا نہیں ہے اے معشوق تیرے تو لوگ سنتے ہیں لیکن سُن کر وہ لوگ اس میں بہت سے باتیں ملا کر غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں یہ پاک محبت میں اچھا نہیں ہے۔

جب میں یہ مطلع پڑھتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ غالب کو کئی دانشور مل کر اس سے بات کہتے ہیں کہ اے غالب آپ کا شعر ہم نے صبح سویرے پڑھا۔ پڑھ کر ہمیں بہت ہی مسرت ہوئی۔ مطلب شعر کو پڑھ کر ہم بہت متاثر رہے اور اس شعر کو جب ہم نے صبح پڑھا تو ہم نے اس کو ہوا کی طرح نہیں باندھا بلکہ اس شعر کو پڑھ کر مضمون نگاری کرنے لگے۔ مطلب اس پر کئی مقالات لکھنے کے خیالات ابھرے۔ ابھرے ہوئے ان خیالات کو دل میں باندھا۔ اے غالب تیری ایسی شاعری ہے کہ جس سے ہم اتنا متاثر رہے خاص کر صبح کے وقت اور صبح کے وقت اتنی ہوا اچھی تھی کہ ہم نے اس شعر کو ہوا میں باندھ کر مضمون کی شکل میں دماغ میں ایسا تصور رکھ کر متاثر رہے۔

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

اے معشوق میں آپ کے ان خیالات سے بہت ہی متاثر رہا ہوں کہ جب بھی میرے ساتھ وفا کرتی ہو تو میں بہت ہی متاثر ہوتا ہوں لیکن میرے پاس وفا کے پیمانے ہیں اور انہی

وفا کے پیمانے کو باندھ کر سادگی سے پیش آنا چاہتا ہوں۔ لیکن اے معشوق میں نے کبھی بھی ایسی سادگی آپ میں نہیں دیکھی کہ آپ اپنے سب احوال کسی کو سناتے ہیں کہ وہ ایک کہانی کار بن کر اس راز کو لوگوں تک فراہم کرتا ہے۔ اے معشوق میں ایسا آدمی نہیں ہوں نہ میں آپ کے بارے میں کوئی رائے بیان کر کے کسی کو بتا کر آپ کی بدنامی سماج میں پھیلاؤں۔ اسی لئے اے معشوق میں آپ کی اس سادگی کی عزت بھی کرتا ہوں اور ناراض بھی ہوں۔ میں آپ کا احترام وفا کے طور طریقے سے باندھ کر آپ کے دل میں بیٹھا ہوں۔

جب غالب نے لوگوں کے تاثرات سنے کہ لوگ بہت ہی متاثر رہے ہیں میر کی قلم پر تب مطلع میں بیان کر کے مقطع کے ساتھ وابستہ کر کے اس طرح بیان کیا ہوگا میرے خیال میں۔ اے داد دینے والے میرے دوستوں میں آپ کی بات سے بہت ہی خوش ہوا کہ میرے شعر لکھنے پر لوگ متاثر رہے ہیں اور وہ اتنے متاثر رہے ہیں کہ اب وہ میری شاعری پر مضمون لکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے میں ان لوگوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کا بہت ہی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میرے شعر و شاعری سے متاثر ہوئے اور اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ اب آپ لوگ ان شعروں پر مضمون لکھنا چاہتے ہو۔ میں آپ کے ایسے طرز بیان سے آپ کو وفاداری پیش کر کے اپنی سادگی آپ کے ساتھ بیان کر کے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے ہی ہر ایک کو اپنا سلوک پیش کیا ہے۔ مانتے ہیں کہ غالب نے یہاں پر مقطع میں ہم پیش کیا ہے اور اس ہم کو جمع کی صورت میں نہیں بلکہ واحد سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مقطع میں ہم جمع کے صورت میں بھی اور واحد کے صورت میں بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔

غالب کے مطلب کے لحاظ سے مقطع میں یہ بیان ہے کہ اے معشوق میں نے ہمیشہ آپ کے دل اور عشق پر اور پاک محبت پر بہت مضمون تحریر کئے ہیں، شعر و شاعری بھی لکھی لیکن میں ایسا سادہ آدمی نہیں ہوں کہ میں کسی کو اپنے راز سے واقف کروں، میں ہمیشہ وفاداری راز میں رکھتا ہوں۔ جس سے کہ میں فتحیاب ہوسکتا ہوں کہ کسی سے کسی کی چغلی نہ کر کے فتحیابی حاصل کی

ہے۔

وا ں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

صدر رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

اے معشوق جب کبھی ہم آپ کے نزدیک بیٹھتے ہیں ہمیں کچھ نہ کچھ محسوس ہوتا ہے۔ احساس ہونے پر ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ زمین میں بیٹھ کر اتنی وحشت یا عشق پیدا نہیں ہوتا ہے جتنے کہ آپ کے پاؤں زمین پر رکھ کر ہم کو آپ کو دیکھ کر غش پیدا ہوتا ہے۔ اے معشوق اتنی قدر آپ کو قدرت نے بخشی ہے کہ جب بھی ہم آپ کے پاس پہنچتے ہیں تو ہمیں کشش پیدا ہوتی ہے۔ جس سے ہم یہ بتا رہے ہیں کہ جب بھی آپ زمین پر پاؤں رکھتے ہو تو ہمیں اسی طرح غش محسوس ہوتا ہے مطلب کشش محسوس ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی عروج پر پہنچتا ہے تو اس سے بہت سی فکریں ہوتی ہیں وہ فکروں میں مبتلا رہتا ہے اور جو کوئی عروج پر نہیں پہنچتا ہے اس کے قدم زمین پر دیکھ کر ہم کو ہمارے مطابق اور ہمارے طور طریقے کے دائرے میں محسوس ہوتا ہے۔ اس کا مطلب معشوق کا رجحان عروج پر ہے اور محبوب کا رجحان زمین پر ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں کی متضاد رائے پیدا ہوتی ہے۔ اس رائے کو بالائے طاق رکھ کر ہمیں ایسے طور طریقے پاک محبت میں اپنانے چاہئے جس سے کہ ایک ہی طریقے سے پاک محبت میں قدر رہے۔ اے معشوق جتنا آپ کا دیکھتے ہیں وہ عروج کے برابر ہے لیکن میری قدر زمین کے برابر ہے۔ اسی لئے اے معشوق پھر بھی آپ کے عروج کی وجہ سے میں بہت ہی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میری قدر بھی زمین پر ٹھہرنے کی وجہ سے کرنی چاہئے۔

اب میں لفظ ہم کے متعلق بحث کر کے یہ کہتا ہوں کہ

جب لوگوں نے غالب کی شاعری پڑھی تو وہ بہت ہی متاثر ہوئے اور وہ غالب کو کہنے لگے کہ اے غالب صاحب آپ کی شاعری سے ہم اتنا متاثر رہے کہ آپ کی قلم عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ جس سے کہ آپ کا رتبہ ہم صدر شاعری کا دیتے ہیں اور صدارت داں بھی مانتے

ہیں کہ باقی شاعروں کے ساتھ آپ صدارت کرتے ہوں۔ ہمیں آپ کی شاعری سے بہت ہی لگاؤ رہا۔ اسی لئے ہم لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ صدر ہو۔ ہم زمین پر بیٹھیں ہیں اور آپ کی شاعری سن کر متاثر رہے۔ مطلب آپ شاعروں کی محفل میں صدارت کرتے ہو۔ ہم لوگ سامعین کے طور پر آپ کی صدارت کو داد دیتے ہیں داد دے کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم زمین پر بیٹھنے والے بندے ہیں۔ داد آپ کی شاعری پر دے کر یہ کہہ رہے کہ ہم آپکی قلم کے ساتھ کبھی بھی وابستہ نہیں رہ سکتے۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادہ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

غالب فرماتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ اے معشوق آپ میرے ساتھ ہمیشہ محبت سے پیش آ ؤ گے، لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے دل میں پاک محبت کا تصور ہے یا نہیں مگر میں اپنے طریقے سے اس تصور کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں رکھتا ہوں اور مجھے پوری توقع ہے کہ آپ میں میرے لئے کشش کی محبت موجود ہے۔ خیر میں ہمیشہ اپنی وفائی بے وفائی میں نہیں پیش کرتا ہوں۔

غالب کے لفظ کے مطابق یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب ہم اسی کے ساتھ پاکِ محبت کے اصول اپنائیں گے تو اپناتے ہوئے معشوق سے کشش کا انداز بھی وہیں ہوگا اگر کشش کا انداز ہی نہیں ہوگا تو فتحیابی محبت میں ناممکن ہے۔ فتحیابی جب ہو سکتی ہے جب ہمیں پوری توقع ہو کہ معشوق کو آپسی کشش ہے پھر بھی میں کشش کو پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ معشوق کے ساتھ پاک محبت کے اصول اپناتا ہوں۔

لفظ ہم کی میں نے وضاحت کی مطلع میں اور یہ بیان کیا کہ غالب کے دوست ہی غالب کو کہتے ہیں کہ ہم آپ کی شاعری سے بہت ہی متاثر رہے اور آپ کو صدارتی کا خطبہ پیش کیا۔ اور ہم آپ کے سامعین ہیں۔ اس پر غالب نے جو مقطع میں بیان کیا ہے کہ میری شاعری میں

ہر ایک کے لئے کشش ہے مطلب میرا قلم اتنا اچھا اور بہترین ہے کہ ہر ایک میری شاعری پر توقع رکھتا ہے۔ میں جادوگری آواز کی صورت میں یا جادوگری لفظوں کی صورت میں اپنی شاعری کو پیش کر کے پڑھنے والے کے لئے کشش پیدا کرتا ہوں۔

خیر اب ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ غالب نے لفظ 'ہم' کو جمع کے طریقے سے بھی اور واحد کے طریقے سے بھی استعمال کیا ہے۔ اسی لئے میں ہر ایک شعر میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہاں ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق میں نے پاکِ محبت میں بہت اُتار چڑھاؤ دیکھے جس سے کہ میں اس دنیا میں ایک محتاج آدمی بنا۔ مطلب میں کسی مصیبت کے زد میں آ کر زدگان بنا۔ کہنے کا مطلب شاعر کا یہ ہے کہ پاکِ محبت میں معشوق نے مجھے صدمہ دے کر ستم زدوں میں بند کر کے ستم میں پھنسایا۔ جس سے کہ میں ایک بہت ہی تنگ دست آدمی دنیا میں بن بیٹھا۔ اے معشوق اس ستم سے میں اب آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ وہ اس طرح کہ میں پاکِ محبت میں الگ ہونے کے لئے مور کی شکل کی طرح آسمان میں اُڑنا چاہتا ہوں اور دوسری جگہ پر اپنا کام کاج کرنا چاہتا ہوں جب مجھے وہاں لوگ دیکھیں گے تب میں ان کو یہ کہوں کہ پاکِ محبت میں میں ایک ستم زدہ بنا جس سے کہ میری صورت زدگان کے طور طریقے سے دیکھنے میں آئی ہے۔ یہ حال دیکھ کر مجھے پورا یقین ہے کہ لوگ میرے شکوے کو دور کریں گے۔ اے معشوق اسی لئے میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے پاک محبت میں زدگان کی ہیئت مت بنایئے مجھے مور کی صورت میں اڑنے کی قوت مت دینا۔ اے معشوق میں التماس کرتا ہوں کہ مجھے پاکِ محبت کے چکر میں امداد دے کر ہم عصر رہنے دینا۔

جب میں لفظ 'ہم' کے طور پر اس شعر کا مفہوم لکھوں تو میں یہ کہوں کہ غالب کو لوگ کہتے

ہیں کہ ہمیں اب وہ قوت ہی نہیں کہ جس سے ہم ایک اچھے شہری کے فرائض انجام دے سکیں۔ مطلب ہم اس دور میں مصیبت ہی مصیبت دیکھ کر زدگان کی حالات میں بیٹھیں ہیں۔ ہمیں کسی قسم کی امداد میسر نہیں ہوتی ہے۔ جس سے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم مور کی طرح آسمان پر اڑیں اور اڑتے اڑتے ہم کسی اور جگہ پر قیام کریں۔ تا کہ ہماری حالت درست رہے یا وہاں بیٹھ کر ہمیں وہاں کے حاکموں کے ذریعہ کوئی امداد حاصل ہو جائے۔ میرے خیال میں یہ خیالات لوگوں نے غالب کو بیان کئے ہوں گے جس سے کہ اس نے لوگوں کے کہنے پر مطلع کی صورت میں غزل میں بیان کیا ہے۔

کہوں کیا خوبیِ اوضاع ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

شاعر فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں بہت سی خوبیاں اور بدیاں ہیں۔ بہت سے نیک آدمی بھی ہیں اور برے آدمی بھی ہیں۔ اے معشوق آپ کو میری نیکی اور بدی کے طور طریقے دیکھنے چاہئیں جس سے کہ آپ کو یہ محسوس ہو جائے کہ مجھے آپ کے ساتھ کتنا لگاؤ ہے۔ مانتا ہوں کہ اس دنیا میں جس کسی آدمی کو ہم آزماتے ہیں اور آزمانے کے بعد پھر آزماتے ہیں وہ اچھا نہیں ہے۔ بار بار کسی کی نیکی پر شک کرنا اچھا نہیں ہے۔ اے معشوق آپ میری اور اپنی خوبی کا وزن دیکھ کر آپ کو محسوس ہونا چاہئے کہ پاکِ محبت میں تعلقات میرے آپ کے ساتھ کتنے ہیں۔

اب میں مقطع کے لحاظ سے غالب کے مفہوم پر یہ لکھوں وہی آدمی بہادر تصور کیا جاتا ہے جس کو ہر کام میں فتحیابی حاصل ہوتی ہے۔ جس میں فتحیابی کے خوبیاں پائیں گے۔ خوبیوں میں نیکی اور بدی کا وزن بھی کیا جاتا ہے۔ وزن کے لحاظ سے بھی انسان کو فتحیابی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح غالب فرماتے ہیں کہ حرف غالب کے حوالے سے اگر اس مقطع کا مفہوم لکھیں تو میں یہ کہوں کہ جو کوئی بھی خوبیاں کسی انسان میں پائی جاتی ہیں ان خوبیوں کو دوسرا استعمال میں لانا چاہتا ہے۔ اسی لئے اچھی خوبیوں سے ہی بار بار نہیں ہارتے ہیں بلکہ نیکی سے ہی فتحیابی حاصل

ہوتی ہے۔

جب میں نے پہلے پہل اس مقطع کا یہ مفہوم کہا کہ لوگ غالب سے یہ فرماتے ہیں کہ وہ اس دنیا سے تنگ آ چکے ہیں۔ یا اس وقت کے دَور سے (جو غالب کا دور رہا) جس سے لوگ تنگ آ چکے ہیں۔ اب وہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مور بن کے آسمان پر اڑنا چاہتے ہیں اپنی اڑان کے بعد کسی اور دنیا میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ جہاں پر وہ یہ کہیں کہ ہم بہت ہی تنگ آ چکے تھے اور وہاں پر لوگوں کا تبصرہ یہ رہے گا کہ یہ جہاں سے آئیں گے زدگان بن کر آئے ہیں۔ مطلب مصیبت دیکھ ہی آئے ہیں اور امداد مانگتے ہیں۔ اسی پر غالب نے مطلع لکھا ہوگا۔ جس سے کہ مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ ہر ایک خوبی انسان میں یا حکومت میں نہیں پائی جاتی ہے۔ کبھی غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور کبھی اچھے حالات بھی ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم اس دنیا میں بڑے حالات دیکھ کر ہار چکے ہیں۔ ہمیں برائی کا بھی مقابلہ کرنا چاہئے اور ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم اس دنیا سے دوسری دنیا میں مور کی طرح اڑان بھر کر بھاگنا چاہتے ہیں۔ ہمارے میں قوت ایسی ہونی چاہئے جس سے کہ ہم ہر ایک چیز کا مقابلہ کر سکیں۔ ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم زدگان ہیں۔ ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ اپنے طور طریقے سے نیکی اور بدی کا رجحان رکھتے ہیں۔

کہتے تو تم سب کہ ''بت غالیہ مو آئے''
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ ''دُو آئے''

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق آپ کی شکل کو پاک محبت کے دائرے میں رکھ کر بت تصور کر کے میں سامنے رکھتا ہوں اور آپ کے بالوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ بالوں پر ہی نہیں بلکہ آپ کے چہرے کا تصور بھی اپنے دل میں رکھتا ہوں، لیکن اے معشوق ایسا تصور دل میں رکھ کر مجھے گھبراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے، گھبراہٹ اس طریقے سے رونما ہوتی ہے کہ میں کہتا ہوں کہ دو آئے۔ مطلب ہم دو بن گئے، اتنی خوبیاں کہہ کر بھی میں اس گھبراہٹ کو کتنی بار اپنے دل

میں قابو میں رکھوں۔اے معشوق مجھ میں پاک محبت کے اصول ہیں اور میں اپنی بات کسی سے بھی نہیں کہنا چاہتا ہوں اسی لئے میں ''بت غالیہ مو آئے'' اسی لئے میں آپ کی تصویر کو دل میں رکھ کر بت کی طرح سنبھال کے ہمیشہ رکھتا ہوں۔

اگر میں غالب کے اس مطلع پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ یہ تصور اس جواب پر لکھا ہوگا کہ جب ان کو لوگوں نے یہ فرمایا ہوگا کہ آپ اپنے محبوب کا تصور کیسے دل میں رکھتے ہو۔ کیونکہ آپ ہم سے اس معشوق کا ذکر ہی نہیں کرتے ،جس کے ساتھ آپ کو پاکِ محبت ہے۔ اس لئے غالب ان کا جواب دے کر کہہ رہا ہے کہ میں ایک بت کی طرح اس کا تصور دل میں رکھتا ہوں اور مرتے دم تک رکھوں گا چاہے میرے دل میں گھبراہٹ ہی محسوس ہو جائے اور خطرناک سے خطرناک حالات دیکھنے میں آئے میں ان کا مقابلہ کرنے کے باوجود اس کا تصور لوگوں سے یا آپ سے نہیں کہوں گا میں پاکِ محبت میں ان کا تصور مرتے دم تک خفیہ رکھوں گا۔

اس انجمن نازکی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

غالب فرماتے ہیں کہ اے معشوق جب میں کسی انجمن میں بیٹھتا ہوں ہر کوئی مجھے نازک طریقے سے دیکھتا ہے،وہ میرا احترام کرتے ہیں لیکن احترام کرتے ہوئے وہ مجھ سے ڈرتے بھی ہیں کیونکہ میں ان کو آپکا تصور آپ کی تصویر سے کہتا ہوں۔اسی لئے وہ مجھے نازک سمجھتے ہیں، اس منظر میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تیری قدر تب کرتے جب آپ اس کے روبرو تصویر دکھاتے لیکن اے معشوق میں تصویر بنانے والا نہیں۔اسی لئے اُس انجمن میں بیٹھ کر مجھے یہ کہہ کر نازکی کے نام سے پکارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تو نے پاکِ محبت میں معشوق کی تصویر ہی نہیں بتائی،جس سے کہ تیری تقدیر رُو پڑی ہے۔اگر آپ اس کی تصویر ہم کو دکھاتے تو آپ کی تقدیر میں رونا نہ ہوتا۔کیونکہ ہم آپ کے معشوق کو روبرو ملانے کی کوشش کرتے۔اسی لئے

اے معشوق مجھے ہر انجمن میں نازکی کہہ کر پکارتے ہیں نہ کہ غالب کہہ کر کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ان کے شعروں میں معشوق کے ساتھ وصل ہی نہیں ہوا ہے اور اسی تقدیر پر زار زار رو رہا ہے اور شاعر اپنی تقدیر پر رو رہا ہے۔

لفظ حرف غالب کے مفہوم کے دائرے میں میں یہ کہوں کہ ہر ایک انجمن میں ہر ایک آدمی کو بہت چیزوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہر ایک کو ہر کسی بات پر جائزہ لینا پڑتا ہے اور اسی لئے انجمن میں بیٹھ کر ہر ایک چیز پر معلومات ہونی چاہئے۔ تا کہ انسان شرمندہ نہ ہو۔ اسی لئے شاعر کہتا ہے کہ انجمن میں بیٹھ کر شرمندہ ہونے کی وجہ سے تقدیر پر نہیں رونا چاہئے۔ ہمیں انجمن میں بہادری سے بیٹھ کر اپنے خیالات بیان کرکے یہ تصور کرنا چاہئے کہ ہم جنگی بن کر انجمن کو فتحیاب کر کے ہی آئیں گے اور فتحیابی کی نیت سے انجمن میں شامل ہونا چاہئے۔

اگر چہ میں اس مقطع کو ہم کے حرف دائرے میں مفہوم لکھوں تو میں نے پہلے ہی مقطع میں یہ کہا کہ لوگ غالب کو یہ کہہ رہیں کہ آپ کی غزلیں ہم نے بہت ساری پڑھیں۔ پڑھ کر ہم متاثر ہوئے۔ اب ہم یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ کس کے ساتھ آپ کو پاکِ محبت ہے لیکن ان سے غالب ایسی بات نہیں کہتے کہ ان کو کس سے پاکِ محبت ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں ان کا تصور اور ان کا رُخ ہی لوگوں کو نہیں کہوں، اسی لئے میں ان کے رُخ کو دل میں بت کی صورت میں سنبھالتا ہوں۔ مرتے دم تک میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اس لئے مقطع میں غالبؔ نے فرمایا ہے کہ اگر چہ مجھے انجمن میں بیٹھ کر لوگ کہتے ہیں کہ شاعر یا مصنف غالب کی غزلوں میں رونے کا احساس ہوتا ہے اور تقدیر پر ہمیشہ روتے ہیں، اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ مجھے ہر کسی انجمن میں نازکی کہہ کر پکارتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں کہ ان کی تقدیر میں ہمیشہ رونا ہی رونا ہے لیکن میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ میں غالب ہوں میں بہادر ہوں میں فتحیاب کرنے والا آدمی ہوں۔ کسی بھی تناؤ میں میں فتحیاب ہو سکتا ہوں۔ اسی لئے غالب نے مقطع میں پہلے ہی ایسے طریقے کا شعر لکھا ہے، جس سے کہ لفظ ہم کا استعمال مقطع میں کیا ہے۔ مانتے ہیں کہ

لفظ 'ہم' واحد کے مفہوم میں لکھ سکتے ہیں لیکن اگر میں گہرائی سے اس مطلع کو پڑھتا ہوں تو میں یہ کہوں کہ یہ ان لوگوں کو جواب دے رہا ہے جو غالب کو فرماتے ہیں کہ آپ کے معشوق کا خدوخال معلوم ہے۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

شاعر فرماتے ہیں کہ جب بھی میں محفل میں بیٹھتا ہوں تو میں محفل میں بیٹھ کر شراب کی بُو کو محسوس کرتا ہوں۔ شراب کی بُو سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پینے کے بعد محفل والے سننا چاہتے ہیں کہ معشوق کے ساتھ کیا کیا واقعات گزر رہے ہیں کیونکہ پینے کے بعد ہوش وحواس کھو جاتا ہے۔ اس لئے محفل میں جو لوگ حاضر ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ غالب صاحب یا محترم غالب آپ کے لئے ہم تشنہ لب کے پیغام پر انتظار کرتے ہیں مطلب ہم آپ کو شراب کے نشے میں دیکھ کر یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اپنے معشوق کے بارے میں کیا کیا باتیں ہمیں فرمائیں گے لیکن اس پیغام کا انتظار اور آپ اس محفل میں ہمیں معشوق سے دور ہونے پر واقف کرو گے۔

اولاً میں اس مطلع کو ان لوگوں کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتا ہوں جن کے لئے 'ہم' کا لفظ مقطع میں شاعر نے استعمال کیا ہے وہ یہ کہ لوگ غالب کا انتظار کر رہے ہیں اور محفل میں سب لوگ تب تک شراب استعمال نہیں کریں گے جب تک غالب حاضر نہ ہو جاتے۔ کیونکہ ہم کے لفظ سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ غالب کو کہہ رہیں کہ ہم آپ کو شرابی کی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کیا کیا باتیں معشوق کے بارے میں کہو گے۔ اسی لئے محفل میں جو لوگ حاضر ہیں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ''ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے'' اسی لئے وہ غالب کو حاضر دیکھ کر پینے کے بعد ان کا پیغام سننا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں شاعرؔ نے غزل کا مطلع اس پر لکھا ہے۔

اے معشوق میں محفل میں بیٹھا ہوں لیکن شراب کی بُو سے مجھے شراب پینے کی کشش محسوس ہوتی ہے۔اے معشوق میں یہ چاہتا ہوں کہ میں بھی شراب نوش کروں اور آپ کے دور ہونے پر کوئی پیغام لکھوں لیکن پیغام لکھنے سے میں یہ آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ مجھے غیر نہیں سمجھتے تو مجھے کیوں اس محفل میں آنا تھا یا کیوں اس محفل میں حاضر ہونا تھا۔ مجھے آپ کے ساتھ وصل ہونے کے بعد اس محفل میں نہیں آنا چاہیئے تھا لیکن آپ کے دور ہونے سے آپ کے دائرے ہجر میں ایسا کام کرنا پڑتا ہے۔اے معشوق کیا آپ میرے لئے پاک محبت میں تشنہ لب کا پیغام مجھ تک نہیں پہنچاؤ گے۔

عشق نے غالبؔ نکمّا کردیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق آج تک آپ کا پیغام ہی نہیں پہنچا جس کیلئے میں تشنہ لب ہوں۔اسی لئے پاک محبت کی وجہ سے میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں مطلب میری حالت نکمی ہوتی جا رہی ہے۔اگر آپ نے مجھے ایسی حالت میں نہیں رکھا ہوتا تو میں بھی کمزور نہیں ہوتا۔ اے معشوق آپ میری نکمی حالت یا کمزوری کی حالت دیکھ کر یہ کہنا کہ آخر میں بھی ایک آدمی ہوں اور ایسا آدمی ہوں جو کہ کام بھی کر سکتا ہوں اور کام نبھا بھی سکتا ہے لیکن اے معشوق آپ میں آدمی ہونے کے لوازمات نہیں ہیں۔جس سے کہ میں پاک محبت میں نکمی کی حالت میں پڑا ہوں۔

حرف غالب کے مطابق اگر میں اس شعر کا مفہوم کہوں تو میں کہوں کہ شاعر عشق میں یا پاک محبت میں ناکام ہونے پر کمزور ہونے لگا، اگر اس کمزوری پر معشوق جانچ کرتے تو شاعر کو نکما نہیں دیکھتے۔شاعر یہ بھی کہتے ہیں کہ آدمی ہونے کے ناطے اور آدمی کے اصول ہونے کے ناطے معشوق کو سوچنا چاہیئے کہ عشق میں یا پاک محبت میں دھوکہ نہیں دینا چاہیئے۔جس دھوکے سے انسان کمزور ہو سکتا ہے اب خود شاعر کہتا ہے کہ میں ایک ایسا آدمی ہوں میں جو نکمی حالت

سے دور رہ کر فتحیابی کے طور طریقے سے آدمی کی صورت میں معشوق کیساتھ وابستہ رہوں گا اور میں اپنے عشق میں فتحیابی حاصل کروں گا۔

جب مین نے مطلع میں یہ بیان کیا کہ لوگ ترس رہے ہیں کہ محفل میں ہم غالب کے الفاظ پیغام کے طور طریقے سے پینے کے بعد سننا چاہتے ہیں کہ پاک محبت میں کیسے حالات اس وقت معشوق کے ساتھ غالب کے ہیں۔ اسی لئے مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ لوگوں نے مجھے اگر شراب کی عادت ڈالی ہے تو اس معشوق نے جس نے مجھے دور رکھا اور اس کمزوری کے وجہ سے لوگ میرا پیغام سننا چاہتے ہیں۔ اگر چہ میں نے عشق نہیں کیا ہوتا تو میں ایک آدمی کے طور طریقے سے زندگی بسر کرتا۔ عشق میں ٹھوکریں کھانے کی وجہ سے میں نکما ہوگیا۔ نکما اس بات پر بھی ہوگیا کہ لوگوں نے مجھے محفل میں پیغام سننے کے لئے شراب پلائی تاکہ وہ پاک محبت کا راز سنے، اگر چہ میں ایسی غلطی نہیں کرتا تو میرے لئے پیغام کا انتظار لوگ نہیں کرتے۔ اسی لئے اے معشوق میں التماس کرتا ہوں کہ مجھے ایسی حالت سے نجات دلانا اور پاک محبت کے اصولوں کے تحت مجھے اپنانا۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

شاعر فرماتے ہیں کہ بہت سال گزرے، بہت وقت گزرا اور بہت دن گزرے، بہت مہینے گزرے باوجود اس کے میں نے اپنے معشوق کو نہیں دیکھا۔ میں ان کو دیکھنے کے لئے ترستا ہوں جس طرح ایک آدمی کسی مہمان کی مہمان نوازی کے لئے ترستا ہے۔ اسی طرح میں کافی عرصہ سے یار، دوست اور معشوق سے ملنے کے لئے ترس رہا ہوں۔ اگر وہ معشوق مجھے مدت کے بعد ملے تو میں اسی وقت چراغاں کروں گا اور بزم بھی منعقد کروں گا لیکن اے معشوق پاک محبت میں آپ کو احساس ہی نہیں کہ کیا اتنے دنوں تک اور اتنے مہینوں تک وصل کے دائرے میں نہیں آنا ہے۔ معشوق میں آپ کے وصل کے لئے بزم اور چراغاں کروں۔

میرے خیال میں غزل کا مطلع شاعر نے اسی لئے تحریر کیا ہے کہ کئی دوستوں نے اس سے یہ کہا کہ اے غالب آپ کو ہم نے بہت دنوں تک بہت مہینوں تک اور بہت سالوں تک نہیں دیکھا۔ جب ہم آپ کو دیکھتے ہیں ہم آپ کا احترام کرتے ہیں اور ہم آپ کی مہمان نوازی بھی کرتے ہیں جب آپ ہماری محفل میں حاضر ہوتے ہیں تو ہم بزم کا اہتمام کرتے ہیں اور بزم میں آپ کی حاضری سے بزم کو چراغاں کیا جاتا ہے۔اس کا مطلب آپ کی شاعری سے ہم سب متاثر ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم چراغاں کرتے ہیں۔آپ کی قلم کا تصور بہت مدت تک ہمارے دل میں چسپاں رہتا ہے۔ اسی لئے اے غالب ہم آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ کب بزم میں شرکت کرو گے تا کہ ہم چراغاں کا اہتمام کریں۔ میں اسی لئے یہ کہہ کر مطلب کہتا ہوں کہ کیوں کہ الفاظ مدت، بزم، چراغ اور مہمان بھی ہے۔اتنی بیان بازی غالب مقطع میں نہیں لکھتے کیونکہ یہ لوگوں کے ردعمل پر ہی مقطع تحریر کیا ہے۔جس سے کہ شاعر نے مقطع میں جواب دے کر بیان کیا ہے۔

غالبؔ ہمیں چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

اے معشوق مجھے اتنا رونا محسوس ہوتا ہے جب آپ میرے ساتھ نہیں بیٹھتے ہو۔ میں چھیڑ چھاڑ کرنے والا بندہ نہیں ہوں، میں پاک محبت کے اصول پر چلنے والا آدمی ہوں۔ مجھے آپ کے تصور سے جوش اشک محسوس ہوتا ہے۔ جب بھی میں بیٹھتا ہوں تو میں جوش اشک طوفان جیسا محسوس کرتا ہوں۔اس لئے اے معشوق میری باتوں پر غور کرنا اور احساس دلانا احساس رکھنا یہ آپ کے توجہ کے دائرے میں ہے۔ مجھے اس جوش اشک سے اور طوفان سے بچا کے اپنے پاک محبت کے دائرے میں لاکر محبت کے اصول اپنانا۔

مقطع میں حرف غالب کے حوالے سے میں یہ کہوں کہ اگر چہ ہم مصیبت کی گھڑی دیکھتے ہیں اور بہت سی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں تو ان مشکلات کا سامنا کرتے کرتے ہمیں آخر

کا رفتحیابی حاصل ہوتی ہے۔ مطلب پہلے انسان کو مشکلات کا سامنا کرنا لازم ہے۔ پھر اسکے بعد سہولیت کا دور بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ تب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ فتحیابی ہوئی ہے۔ اسی طرح سے غالب فرماتے ہیں کہ اگر عشق میں مشکلات پیدا ہوئیں لیکن قدرتی طور پر مشکلات نیست و نابود ہو سکتی ہیں اور فتحیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

میں نے پہلے یہ بیان کیا کہ غزل کا مطلع غالب نے اسی لئے لکھا ہے کہ لوگوں نے اس کی شاعری پڑھ کر یہ محسوس کیا کہ غالب فنی لحاظ سے ایک قلمکار ہے اور غزل کو بیان کرنے والا ماہر ہے۔ مطلب غزل گو ہے اسی لئے میرے خیال میں بہت دن تک لوگوں کے پاس نہ بیٹھ کر اور بزم میں نہ شامل ہونے کی وجہ سے لوگ ترسنے لگے اور آپسی رجحان کی باتیں کرتے کرتے یہ کہنے لگے کہ بہت مدت ہوئی ہے غالب کو انجمن میں حاضر نہیں دیکھا۔ اسی پر غزل کا مطلع لکھ کر مقطع میں شاعر بیان کرتے ہیں کہ جب بھی مجھے مدت کے بعد انجمن میں لوگوں نے دیکھا تو انہیں جوش اشک محسوس ہونے لگا یہ عام فہم بات ہے کہ جب ہم کسی آدمی کو یا کسی دوست کو طویل مدت کے بعد دیکھتے ہیں تو اس دوست کے ساتھ محبت کے آثار ہوتے ہیں تو اس کو دیکھ کر ہمیں آنسوں آنے لگتے ہیں مطلب خوش ہوتے ہیں اور خوشی کی وجہ سے آنسوں آنے لگتے ہیں۔ اسی لئے غالب نے مقطع میں جوش اشک کا حرف استعمال کیا ہے۔ مطلب جب غالب محفل میں بیٹھے تو لوگوں کو شادمانی محسوس ہوئی کہ غالب آ گئے۔ اور یہ اظہار کرنے لگے کہ طویل مدت کے بعد غالب کو انجمن میں حاضر دیکھا۔ مطلب لوگ خوش ہونے لگے اور خوشی کا طوفان مچلنے لگا۔ اسی لئے غالب نے غزل کے مطلع میں ایسا شعر بیان کیا ہے۔

جناب میر صاحب جو ایک اُردو زبان کے مشہور و معروف غزل گو تسلیم کئے جاتے ہیں انہوں نے لفظ 'ہم' پر کس طرح سے اشعار غزلوں میں لکھے ہیں اور انہی پر مباحثہ غالب کے لفظ 'ہم' کرتے ہیں۔ ویسے تو میرؔ کے تخلص پر بحث کریں گے تو پہلے ہم یہ کہیں گے کہ میر معنی ہے دو تین آدمیوں کا بڑا۔ مطلب دو تین آدمیوں کو مشورہ دینے والا ہو یا دو تین آدمی کسی آدمی کو

اپنا رکن سمجھ کر اس سے مشورہ لیتے ہیں خود دو تین آدمیوں کی سربراہی کرتا ہو لیکن دو تین آدمیوں کی سربراہی کرنے والا چنا ہوا آدمی نہیں ہوتا ہے بلکہ دو تین آدمی اسے احترام کے طور پر بڑا سمجھ کر میرؔ کے نام سے پکارتے ہیں۔ جس طرح غالب نے تخلص غالبؔ لکھا اور غالبؔ کے لفظی معنی ہیں فتح کرنا یا فتحیابی حاصل کرنا لیکن جنگ کے الفاظ سے نہیں بلکہ کئی واقعات اور کئی باتوں میں فتحیابی یا کامیابی کرنا غالب کا مفہوم ہے۔

'ہم' کے لفظ پر میرؔ نے اپنے شعروں میں کیا بتایا ہے

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

شاعر فرماتے ہیں کہ میں نے جب معشوق کا حسن دیکھا تو حسن دیکھ کر میں گھبرانے لگا کیونکہ اس حسن کے مبادلہ کوئی حسن آج تک نہیں دیکھا۔ جسے دیکھ کر میں حیران ہوا اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ معشوق کے مدمقابل دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اسی لئے اس کی تعریف لکھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ خورشید کے نور میں بھی اتنا حسن نہیں دیکھا جتنا کہ میں نے معشوق کا حسن دکھا۔ مطلب اے معشوق میں آپ کے حسن سے اتنا متاثر ہوں کہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس حسن کا مقابلہ کسی دوسرے سے نہیں کر سکتا ہوں۔

اگر چہ میں اس مطلع کو پڑھتا ہوں تو میں حیران ہوتا ہوں کہ حرف 'تھا' میرؔ نے کئی مرتبہ استعمال کیا ہے۔ شاعران دنوں غزل گو رہے۔ غزل میں گزری ہوئی بات زیادہ شاعروں نے اپنی شاعری میں بیان کی ہے۔ مطلب میرؔ کہتے ہیں جب بھی میں نے معشوق کا حسن دیکھا وہ دیکھ کر متاثر رہا۔ مطلب زمانہ حال کی بات نہیں کہتا بلکہ گزرے ہوئے زمانے کی بات کہتا

حرف ''تھا'' سے ۔ مطلب اس نے حسن دیکھا تھا جس کے مدمقابلہ کوئی دوسرا حسن نہیں دیکھا۔غزل میں یہ قصہ بیان کرتا ہے۔نہ کہ زمانہ حال کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ پھر بھی ہم مطلع کا مفہوم زمانۂ حال میں ہی بیان کرتے ہیں۔

غالب نے حرف 'تھا' دیوان غالب میں بہت ہی کم استعمال کیا ویسے تو ردیف اور کافیہ میں تھا کا نام ونشان ہے ہی نہیں۔اسی لئے غالب کی شاعری کو ہر ایک زمانہ حال کے ساتھ وابستہ کر سکتے ہیں کیونکہ تھا سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گزرے ہوئے زمانے کی بات ہے۔ جب تھا ہی نہیں ردیف میں استعمال کیا گیا ہے۔ہم کہتے ہیں کسی شاعر نے ابھی بات کہی ہے۔مطلب میر نے غزل کے حسن کا واقعہ سنا کر یہ کہا ہے کہ یہ گزری ہوئی بات ہے میں نے دیکھا تھا اور میں نے کام کیا تھا اور ابھی بھی کام کر رہا ہوں۔جس طرح میرؔ کے ردیف اور کافیہ سے معلوم ہوتا ہے۔

اب میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تخلصؔ کے حساب سے میرؔ اپنے ہمعصروں کو جو کہ میر کو اپنا بڑا یار ہنما یا چار آدمیوں کا بزرگ سمجھ کر بتا رہا ہے اور ایسے دوستوں میں یہ کہہ رہا ہے کہ دوستوں میں نے بھی غزل تحریر کی ہے جس میں میں نے ایک حسین شکل دیکھی ہے اور اس حسین شکل کا مدمقابل آج تک مجھے کوئی نہیں نظر آیا۔اگر چہ میں اس وقت آپ کے سامنے کسی دوسرے حسین کو دیکھتا ہوں اور آپ مجھے یہ کہتے ہو کہ اس حسین کو دیکھ کر آپ کی رائے کیا ہے۔میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے پہلے ایک حسین کو دیکھا ہے جس کا مقابلہ ایسے حسین کے ساتھ نہیں ہے جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہو۔میں یہ بھی کہہ رہا ہوں جس کا حسن پہلے دیکھا وہ خورشید کے حسن سے بھی بہت اوپر ہے۔مطلب خورشید کے حسن کے برابر نہیں جس کو عالمی سطح پر حسنِ قدرت مانا جاتا ہے۔

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق مجھے رشک ہوا کیونکہ ابھی تک میں نے ایسی حسین شکل پہلے کبھی نہیں دیکھی، لیکن اے معشوق میرا قصور یہ ہے کہ میں نے آپ جیسی حسین حور کے ساتھ کوئی ملاقات نہیں کی، نہ میں نے ایسی حسین حور کو اپنی باتیں بتائیں، مجھے شک ہوا کہ میں کیسے حسین کے ساتھ بات کر سکتا ہوں اور کیوں کر غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔ مطلب مجھے راستے میں مشکوک نظروں سے دوسرے دیکھیں گے۔ اسی لئے اے معشوق میں آپ کے ساتھ ہی ہوں لیکن اپنا دل بھی پیش کرتا ہوں، آپ سے اپنے خیالات روبرو نہیں کہنے والا۔

میؔر کے مفہوم کے لحاظ سے اگر اس مقطع کو لکھوں تو میں یہ کہوں کہ دو تین آدمیوں کی سربراہی کرنے والا میر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے آج تک کوئی حسین ایسا نہیں دیکھا جو میں نے پہلے دیکھا اور اس کا مد مقابل حسن آج تک ملتا ہی نہیں کیونکہ میؔر لفظ کے معنی ہیں دو تین آدمیوں کی سربراہی کرنا۔ اسی لئے میں مقطع میں اس طرح سے اس کا مفہوم بیان کرتا ہوں۔

اگر میں مطلع کا تعلق مقطع کے ساتھ اس غزل میں رکھوں تو واضح ہے کہ میر صاحب غزل کے مطلع کو مقطع میں نچوڑ کر بیان کر کے کہہ رہا ہے کہ میں نے حسین شکل دیکھی مطلب ایسا معشوق اس دنیا میں دیکھا جس کا حسن آج تک نہیں ڈھونڈنے سے ملتا ہے۔ اسی لئے غالب کے تاثرات اور غالب کی غزل کے تاثرات ایک جیسے نہیں ہے لیکن میں یہ پڑھنے والے کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ لفظ 'ہم' کے بیان بازی پر دونوں شاعروں کی اپنی اپنی غزلوں میں کیا کیا ردعمل ہیں جسے پڑھتے ہوئے میں سوچتا ہوں۔ لیکن غالب کو ایک بہت ہی عظیم شاعر تسلیم کرتا ہوں، اس نے بھی ہم پر بات کہی ہے لیکن نچوڑ الگ ہے جیسے کہ میؔر کے مقطع میں 'ہم' لفظ جمع کے تصور سے ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ 'ہم' پر میں یہ کہتا ہوں کہ اس غزل میں سیدھا سادہ مفہوم ہے۔ غالب نے لفظ 'ہم' پر ایک گہری سوچ پڑھنے والوں کے خیالات میں ابھارا ہے جیسے:

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقت خوش میرؔ نکہت گل تھا

شاعر فرماتے ہیں کہ میں نے مختلف اقسام کی معلومات حاصل کیں۔ لیکن سب کے سب معشوق کی تعریف کرتے کرتے یہاں تک پہنچے کہ انہیں نکہت گل کے نام سے ہمیشہ پکارنا چاہئے۔ مطلب اے معشوق تمام لوگ آپ کی تعریف میں لگے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی تعریف کرتے کرتے تھک کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں بھی ان کی رائے کو تسلیم کر کے آپ کو نکہت گل کے نام سے پکارتا ہوں۔

جب میں اس مقطع کو پڑھتا ہوں جسے میرؔ نے بہت ہی اچھے طریقے سے بیان کیا ہے لیکن آپ خود بخود دیوان غالب میں یہ دیکھیں گے کہ ہر لفظ 'ہم' غزل میں پڑھتے ہوئے سوچتے ہیں کہ ہم کو جمع میں کہا ہے یا واحد میں۔ لیکن میرؔ نے یہاں غزل کے مقطع میں ہم کو ٹھیک طرح سے سمجھایا ہے مطلب دو تین آدمیوں کے سربراہ کے طور پر حرف 'ہم' استعمال کیا ہے۔ ورنہ 'ہم' کے بجائے میں بھی استعمال کر سکتے تھے۔ **''خوب دریافت جو کیا میں نے''**

مطلب لفظ 'ہم' کے بجائے وزن کے اعتبار سے لفظ 'میں' بھی استعمال کر سکتے تھے لیکن 'ہم' کو اسی لئے استعمال کیا ہے تاکہ جو دعوئے شعر کا جواب ہے وہاں پر میرؔ تخلص ہے میر دو تین آدمیوں کا سربراہ سمجھا جاتا ہے اسی لئے دعوئے شعر کے جواب میں میر کہنے پر ہم کا استعمال کیا ہے لیکن غالب نے ایسی بیان بازی غزلوں میں نہیں کی ہے۔ 'ہم' کو جمع کے اعتبار سے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ 'ہم' کو واحد اور جمع کے طور پر اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے۔

چھاتی سے ایک بار لگاتا جو وہ تو میرؔ
برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ سالتا

میرؔ فرماتے ہیں کہ اے معشوق میں بار بار آپ کی یادداشت اور لگاؤ سے متاثر رہا ہوں، یہ میں بہت سالوں سے آپ کے خیالات اور جذبات سے متاثر ہو کر دور ہوا ہوں۔ الگ

ہونے کی وجہ سے بہت سے زخم میرے سینے میں اُبھرے ہیں، لیکن ان زخموں کو میں کسی کو نہیں دکھا سکتا ہوں اور نہ ہی انہیں کسی کو دکھانے کے قابل ہوں۔ اسی لئے اے معشوق جب آپ کیساتھ میری ملاقات یا آپ مجھ سے کسی جگہ ملنے کی کوشش کریں تو اسی وقت آپ کو ان زخموں کو دیکھ کر یقین آئے گا کہ مجھ میں برسوں تک آپ سے محبت کے لئے اتنی تلاش اور اتنا پیار دل میں اُبھرا ہے۔

اگرچہ مقطع کا مفہوم میرؔ کے لفظی معنی کے حوالے سے میں بتاؤں تو میں یہ کہوں گا کہ 'ہم' کا لفظ سبھی کے لئے لکھا ہے۔ مطلب میرؔ دو تین آدمیوں کا سربراہ تصور کرنے کے لحاظ سے ہم لفظ جماعتیوں کو یہ کہہ رہا ہے کہ اے معشوق جذبات کو جب میں دکھاؤں تو بہت سے زخم میرے سینے میں اُبھرے ہیں۔ ان زخموں کو آپ ہی دکھانا جب معشوق سے ملاقات کسی وقت متوقع ہو۔ میرؔ خود کہہ رہا ہے کہ آپ سب مجھے رُکن سمجھ کر یہ کہہ رہے ہو کہ جب بھی معشوق کے ساتھ آپ کی ملاقات ہوگی تو اسی وقت اپنے زخم ان کو دکھانا اور آپ ہمیں یہ زخم دکھاتے ہو جو کہ ہمیں برداشت نہیں ہوتا۔ جب بھی آپ کی ملاقات معشوق کے ساتھ متوقع ہو تو ان زخموں کو معشوق کو دکھا کر پاک محبت کی شہادت سے واقف کرنا۔

جب میں غالبؔ کے مقطع کو غور سے پڑھتا ہوں وہاں پر اس نے مقطع کے اعتبار سے اپنا مقطع حرفوں کے لحاظ سے جواب دہ لکھا ہے، لیکن اس مقطع سے میرؔ نے دو طریقوں کا مطلب بیان کیا ہے جو کہ میں نے بیان کیا، اگر میر کے بجائے شاعر نے دوسرا کوئی قلمی نام لکھا ہوتا تو اس سے بھی اس مقطع کا مطلب نکال سکتے ہیں اور اس انداز میں 'ہم' جمع اور واحد کی صورت میں مطلب کے لحاظ سے سمجھا سکتے ہیں۔ میر کے نام سے 'ہم' اسی لئے لکھا گیا ہے۔

کیوں نہ ہم پہلے اس غزل کے مطلع کو پڑھیں اور پڑھ کر مقطع کا پھر ایک بار موازنہ کر کے یہ سوچیں کہ کیا حرف 'ہم' میرؔ نے صحیح استعمال کیا ہے۔ اس انداز میں میرؔ نے 'ہم' کو غزل کے مطلع کا جواب دعویٰ بنایا ہے جیسے کہ

فریاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رہ کے ڈالتا
پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا

اب میں اس غزل کے مطلع کو اس طرح بیان کرتا ہوں کہ جب ہم دو تین آدمیوں نے کسی آدمی کو بڑا سمجھ کر عزت بخشی۔ مطلب وہ ہمارا بزرگ آدمی ہے۔ بزرگی کے ناطے جب ہم کسی بزرگ کے ہاتھ میں کوئی چوٹ پاتے ہیں تب ہم اس سے کہتے ہیں کہ یہ کیسے نمودار ہوئی۔ مطلب اگر اسے چوٹ آئی یا پھوڑا نکلا یا جسم کے دوسرے اعضاء میں کسی قسم کا برا حال دیکھنے میں آیا تو ہم ضرور اس بزرگ کو یہ کہیں گے کہ یہ کیسے نمودار ہوا۔ یہی خیال اس مطلع کا پڑھنے میں آتا ہے۔ جیسے کہ میر صاحب کو دو تین آدمی دیکھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہاتھ سے کیوں فریاد کرتے ہو۔ کیا آپ نے ہاتھ میں پتھر رکھا ہے یا کسی کو پتھر پھینکنا ہے یا اپنا ہاتھ پھیلا رہے ہو، لیکن ان ہاتھوں کو اس طرح سے نہیں دکھانا۔ ایسے دکھانے سے بزرگی کا جوش اور عزت نیست و نابود ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے اس طریقے سے ہاتھ مت دکھائیے۔ اپنے ہاتھ کو پیچھے رکھ کر اور ایک انسانیت کے ناطے ہی اپنے ہاتھوں کو رکھنا جس سے کہ آپ کی بزرگی کا رتبہ بلند پایہ سمجھا جائے گا۔ اسی لئے مقطع میں میر صاحب ان کو جواب دے کر یہ کہہ رہے ہیں کہ میری چھاتی میں معشوق نے برسوں کی ہجر کے زخم پیدا کئے ہیں۔ جن زخموں کی تپش سے مجھے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں اور ان ہاتھوں کو پھیلا کر مجھے سکون سا محسوس ہوتا ہے۔ اب جب آپ ان ہاتھوں کو پھیلانے سے منع کرتے ہو پھر بھی میرے برسوں کے زخم دیکھ کر آپ کو اعتبار آئے گا کہ کس طرح معشوق کے دور ہونے سے مجھے زخم سینے میں برداشت کرنے پڑے۔

اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مطلع کے اعتبار سے مقطع کو میر نے ایسا بیان 'ہم' کے حرف سے جوڑا ہے ورنہ میر 'ہم' کے بجائے 'آپ' بھی استعمال کر سکتے تھے۔

''برسوں یہ زخم سینے کا آپ کو نہ سالتا''

اب حرف 'ہم' کو یہ کہیں گے 'ہم' اُردو زبان میں واحد کا مطلب بھی کہتے ہیں اور 'ہم' میں

کا مطلب بھی نکلتا ہے۔ جب میؔر نے 'ہم' استعمال کیا تو اس کا مطلب غزل کے مطلع کو اپنے ساتھیوں کو جواب دے کر مقطع میں لفظ 'ہم' استعمال کیا ہے، مطلب یہ کہہ رہا ہے کہ میں برسوں سے زخموں کا شکار ہوا ہوں جس سے میں دور رہ کر معشوق کے ہجر میں بیماری کا شکار ہوا۔ اگر اس کے بجائے 'آپ' استعمال کرتے تو اس اعتبار سے مطلع غزل کا الگ ہو جاتا۔ میں تب یہ کہہ رہا ہوں کہ میؔر نے اپنے ساتھیوں کو جواب دے کر 'ہم' استعمال کیا ہے۔ 'آپ' استعمال کرنے سے انہیں فریاد کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

کیا طرح ہے آشنا گاہے گہے نا آشنا

یا تو بیگانے ہی رہیے ہو جیے یا آشنا

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق ہمارے دور رہنے سے زندگی کسی بھی اعتبار سے اچھی طرح سے نہیں سج سکتی۔ اگر چہ ہم آپس میں مل جل کر رہتے تو زندگی ٹھیک طرح سے سج سکتی ہے۔ دور رہنے سے لوگ بیگانہ کہہ سکتے ہیں۔ اے معشوق کیا نر کے بغیر مادہ سج سکتی ہے یا مادہ کے بغیر نر سج سکتا ہے، جب تک دونوں کا میل ملاپ نہ ہو۔ اسی لئے کیا فائدہ ہے اس آشنا میں اکیلے رہنے کا اور اگر دور رہا تو سب لوگ اس آشنا کو بیگانے کے طور پر تعریف کریں گے۔ اسی لئے اے معشوق میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ اپنے آشنا کو سجانے کے لئے کبھی بھی دور نہ رہئے۔ آپسی جوڑ سے ہی دُنیا میں عزت اور آبرو ہے۔ میؔر فرماتے ہیں کہ مختلف قسم کے آشنا ہیں جن کو لوگ سجاتے ہیں لیکن عام طور پر ایسے آشنا کو لوگ عزت فراہم نہیں کرتے جس آشنا میں نادان رہتے ہوں۔ مطلب بیگانوں کی اس دنیا میں عزت اور احترام نہیں ہے۔

جب میں مقطع اس غزل کا پڑھتا ہوں میں سوچتا ہوں کہ میؔر صاحب دو تین آدمیوں کے سامنے باتیں بتا کر ''اس مطلع کے عنوان کے دائرے میں'' اپنے تاثرات آشنا کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ایسی زندگی مرتب کرنی ہے جس سے کہ ہمارے ساتھ معشوق بھی زندگی بسر کرے اور ایسا احساس بھی ہونا چاہئے کہ یہ زندگی نر اور مادہ ہی بسر کرتے ہیں۔ اسی لئے

اکیلے پن کی زندگی کا سماج میں کوئی احترام ہی نہیں ہوتا۔ مطلب ہر ایک انسان شادی شدہ ہونا چاہئے۔ اسی لئے ان دو آدمیوں سے میر صاحب فرماتے ہیں کہ کیا یہ آشنا سج سکتا ہے جبکہ اس آشنا میں ایک ہی آدمی ہو۔ کیوں کہ آشنا دو آدمیوں سے سج سکتا ہے، اور ایک آدمی سے بیگانے کی نام سے پکارا جائے گا۔ ہمیں بیگانہ نہیں بننا ہے جب تک اس دنیا میں ہمیں خدا نے بھیجا ہے ہمیں دانشور کی حیثیت سے یہاں کام انجام دینا ہے۔

داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میرؔ
ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

میرؔ فرماتے ہیں ہم ایسی زندگی سے پریشان ہوتے ہیں جس میں دشواریاں پیدا ہوتیں ہیں۔ دشواریاں اسی لئے پیدا ہوتی ہیں کیوں کہ ہمارا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا ہے۔ جس مقصد کے لئے انسان کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کا بائمل نہ ہونا ہی بہت سی پریشانیوں کا سبب ہوتا ہے۔ جس پریشانی سے بہت سارے داغ چھاتی میں نمودار ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان زخموں سے دور رہ کر ہی ہمیں نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ ہمیں کوئی ایسا نصیحت کرنے والا دوست ملے جس سے ہم ان زخموں سے نجات پاسکیں۔ مطلب یہ اگر ہمیں زندگی میں کوئی مقصد حاصل کرنا ہوتو اسے حاصل کرنے سے پہلے ہمیں کسی سے پوچھنا چاہئے یا کسی سے صلاح ومشورہ کرنا لازمی ہے تاکہ ہم ان سے کہیں کہ کیا ہم اس مقصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اگر مشورہ دینے والا سوچ سمجھ کر کہے کہ مقصد پورا ہوسکتا ہے تو ہمیں کامیاب ہونے کے کام کرنا چاہئے۔ باقی خدا کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن ہمیں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جدو جہد ضروری کرنی چاہئے۔ اسی لئے میرؔ فرماتے ہیں کہ اے معشوق اگر آپ نے اپنے طور طریقے سے کوئی استاد بنایا ہوتا تو آپ کے دور ہونے سے میری چھاتی میں داغ نمودار نہیں ہوتے لیکن یہ داغ اس لئے نمودار ہوئے کہ آپ کو صلاح ومشورہ دینے والا کوئی نہیں۔ کیوں نہ آپ کو مجھ سے ہی بطور محبوب یا معشوق صلاح ومشورہ لینا چاہئے۔ اگرچہ آپ کے دل میں میرے

لئے اعتبار ہے۔

اب میں یہ وضاحت سے کہہ رہا ہوں کہ میرؔ نے مقطع کے لحاظ سے ایسی بات کہی ہے جس میں لفظ میرؔ یعنی دو تین آدمیوں کا سربراہ یا بڑا رکن کو یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو صلاح ومشورہ دینے کے لئے موجود ہوں۔ جب آپ مجھ سے صلاح ومشورہ لے لوگے تو کبھی بھی آپ کی چھاتی میں داغ نمودار ہوسکتا ہے اور ان داغوں سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ میں آپ کی چھاتی میں داغ نمودار کرنے کے لئے محرم لگا سکتا ہوں۔

اب میں یہ دعویٰ سے کہہ رہا ہوں کہ میرؔ نے مطلع اسی انداز پر بیان کیا ہے جس سے کہ مقطع کا نچوڑ ایک دوسرے سے جوڑ سکے اور آپ خود پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دونوں کا جوڑ ایک ہی ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ نے مطلع اسی لئے بیان کیا ہوگا کہ اس نے کئی ایسے آدمیوں کی زندگی خراب حالت میں دیکھی ہوگی۔ تبھی تو میرؔ نے مطلع اور مقطع میں ایسی بات کا رجحان لکھا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرؔ نے غزل معشوق اور محبوب کے اعتبار سے تحریر کی ہے۔ اب ہم معشوق اور محبوب کا مفہوم بھی نکال لیتے ہیں ورنہ میرؔ نے یہ غزل کسی آدمی کی بربادی پر تحریر کی ہوگی تب تو اس قسم کی نصیحت ہم مطلع اور مقطع میں پاتے ہیں۔

گرچہ سردار مزوں کا ہے امیری کا مزا
چھوڑ لذت کے تئیں لے تو فقیری کا مزا

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق اگرچہ میں غریبوں کو ایک نصیحت کرنے والا بندہ ہوں لیکن میں امیروں کے خلاف نہیں ہوں، میں امیروں کو بھی نصیحت دیتا ہوں کہ وہ کیسی زندگی بسر کریں لیکن میں امیری کی لذت کو غریبی کی لذت میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں، لیکن دونوں کو تبدیل کرنے سے زیادہ فقیری کا مزہ بھی لینا چاہتا ہوں۔ لیکن اے معشوق فقیری اور امیری کا تصور کرنا بہت ہی مشکل ہے، دراصل غربت میں ہی انسان سبق سیکھتا ہے" اگرچہ میں میرؔ ہوں مطلب میں سردار ہوں لیکن میرے گروہ میں امیر اور غریب دونوں ہی بستے ہیں اور فقیر

بھی بستے ہیں۔ ان تینوں کا ردعمل دیکھ کر اے معشوق میں التماس آپ سے کرتا ہوں کہ میں ان کی لذت چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہی اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں لیکن ایسی لذت تب ممکن ہے جب آپ میرا ساتھ دینے پر رضامند ہو جاؤ گی۔

میرے خیال میں میر نے یہ مطلع اسی لئے تحریر کیا ہے تاکہ مقطع کے ساتھ جوڑ رہے، جیسے کہ لفظ سردار سے اس طرح کا مفہوم میرے خیال میں آتا ہے۔

میرؔ دو تین آدمیوں کا سردار مانا جاتا ہے جو کہ اُردو کی لغتوں میں لکھا ہوا ہے۔ اسی لئے مطلع کے ابتداء میں سردار کہہ کر میرؔ کہہ رہا ہے کہ میں ایسے لوگوں کا سردار ہوں جو کہ امیری، غریبی اور فقیری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا سردار ہونے کے باوجود میں نے کوئی لذت ان تینوں سے حل کر محسوس نہیں کی، اور نہ ہی میں ان کے معاملات میں دخل دیتا ہوں بلکہ نصیحت کرتا ہوں۔ میں نے ان تینوں کے ساتھ لذت محسوس کی ہے مطلب ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں لیکن ان تینوں کی لذت مختلف محسوس کی، ایک جیسی لذت نہیں ہے۔ اسی لئے میں پسند کرتا ہوں فقیری کی زندگی اس میں بہت احترام بھی ہے اور لذت بھی ہے۔ میرے خیال میں اسی لئے میر نے مطلع میں سردار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ہم تو گمراہ جوانی کے مزوں پہ ہیں میرؔ
حضرت خضرؑ کو ارزانی ہو پیری کا مزا

شاعر فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی جوانی برباد کی ہے یعنی اپنی جوانی میں گمراہ رہا، میں نے گمراہ ہو کر کسی کی لذت محسوس نہیں کی۔ کیوں کہ حضرت خضرؑ کے خیالات میرے دماغ میں پناہ گزیں رہتے ہیں۔ میں افلاطونی خیالات بچپن میں سوچتا تھا، ایسے خیالات کو دماغ میں رکھ کر مجھے اپنی زندگی ویران دکھنے لگی۔ لیکن کیا کروں جوانی کا دور برباد ہوا۔ پھر بھی میں پچھتا کر یہ کہہ رہا ہوں کہ دماغ میں حضرت خضرؑ کے خیالات نہیں آنا چاہئے جب کوئی بھی جواں سال آدمی مجھے ملے گا یا وہ میری نصیحت پر عمل کرے گا تو میں اس سے پہلے یہ کہوں گا کہ حضرت خضرؑ

کے خیالات دماغ میں کبھی نہیں لانے چاہئیں۔

اب میں شاعر کے مقطع کے اعتبار سے یہ مفہوم کہہ رہا ہوں کہ کسی گروہ کا سردار بن کر شاعر جہاں سردار خود شاعر ہے یہ ان جوانوں کو نصیحت دے رہا ہے جن کی زندگی برباد ہونے پر تلی ہوئی ہے وہ کبھی بھی حضرت خضر کے خیالات اپنے دماغ نہیں لائیں۔ ہمیشہ مزہ ایسا لینا چاہئے جس سے عمر بھر فائدہ حاصل ہو۔ جس سے فائدہ حاصل نہ ہو اگر اس میں لذت بھی محسوس ہو لیکن اس لذت کو بڑھاپے میں محسوس کر کے ہمیشہ کے لئے دور رکھنا چاہئے۔

اب میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ شاعر نے لفظ 'ہم' نصیحت کے لئے استعمال کیا ہے اور 'ہم' گروہ کا سردار بن کر بیان کیا ہے اور ہم کا لفظ ''میں'' کے نام سے لکھا ہے مطلب 'ہم' کہہ کر یہ نصیحت کرتا ہے کہ میں جوانوں کو حضرت خضرؑ کے خیالات سے مبرا کروں اور میں ان کو ایسی لذت سے دور رکھوں جن سے انکی زندگی برباد نہ ہو جائے۔ ایسی لذت سے واقفیت کراؤں گا جس سے ان کی زندگی تا ابد اچھے ڈھنگ سے گزرے۔

اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر نے سردار لفظ 'ہم' کے ساتھ وابستہ کرنے کے لئے لکھا ہے اس کے بجائے غالب نے 'ہم' کا استعمال کیا ہے لیکن اس انداز سے غالب نے اپنی غزلوں میں 'ہم' استعمال نہیں کیا ہے۔ اور میرؔ کے مفہوم میں بہت ہی سنجیدہ مفہوم پڑھنے میں محسوس ہوتا ہے۔

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا
افسانہ محبت مشہور ہے ہمارا

شاعر فرماتے ہیں اے معشوق جب بھی میں گلی کوچوں میں پھرتا ہوں، اب تک لوگ آپ کے اور میرے بارے میں باتیں کیا کرتے ہیں اور دیکھ کر کہہ رہے ہیں کہ یہ وہی معشوق ہے جو کہ کسی محبوب کے لئے گلی کوچوں میں چلتا پھرتا ہے۔ اتنی بدنامی ہونے سے ہماری محبت کا افسانہ بھی تحریر کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب آپ کے اور میرے درمیان جو تعلقات ہیں وہ گلی کوچوں

میں بہت ہی مشہور ہیں۔اسی لئے بہت لوگ ہمیں دیکھ کر افسانے کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اگر چہ ایسی محبت آپ نے نہیں کی ہوتی تو افسانے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اور کسی کی بیان بازی پر قلم کا اعتبار بھی نہیں ہوتا۔اے معشوق آپ اور مجھ میں اتنی مشہوری ہوئی ہے۔

میں اس مطلع کو اس طرح سے بیان کرتا ہوں کہ شاعر نے اسی لئے مطلع بیان کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو یہ نصیحت دیں کہ محبت کرنے پر اور محبت میں دراڑ پر بہت سارے افسانے تحریر کر سکتے ہیں۔ مطلب جب بھی کوئی محبت کرے تو اس پر بہت سارے افسانے لکھے جاسکتے ہیں۔اسی لئے شاعر نے یہ بیان کیا ہے کہ غزل کو تحریر کرنے سے بہت ساری باتیں بتا کر افسانے بھی لکھ سکتے ہیں۔جبکہ مقطع میں اس طرح کہہ کر لکھتا ہے۔

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

اے معشوق اگر چہ ہمارے درمیان تناؤ ہے جس کی وجہ سے مل نہیں سکتے۔لیکن ہمارا مقصد بہت ہی اچھا ہے اور اس مقصد کو باعمل کرنے کے بعد ہی ہماری کامیابی بہت ہی مشہور ہوسکتی ہے۔اسی لئے مقصد کے بغیر محبت کرنا بے معنی ہے۔ بامقصد کوئی بھی کامیابی انجام دینا دانائی ہے، اگر مقدر میں ہے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن مقصد کو اگر ہم خاک میں ملائیں گے تو قدرتی طور پر مقصد باعمل نہیں ہوسکتا ہے۔اے معشوق میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ کوئی بھی خیال خاک میں ملانا نہیں چاہئے۔ ہر ایک خیال کو دل و دماغ میں رکھ کر اسے عمل میں لانا چاہئے۔جس سے مقدر میں لکھا ہمارا پورا ہوسکتا ہے۔ جتنا خیال اے معشوق محبت کا آپس میں رکھیں گے اتنا آپسی مقصد پورا ہوسکتا ہے۔نہ کہ مقصد کو خاک میں ملا کر برباد کریں۔مقصد کو کبھی بھی برباد نہیں کرنا چاہئے۔

میرؔ کا مطلب سردار ہے، سردار کہہ کر میرؔ مقطع میں بتا رہے ہیں کہ ہمیں اکٹھے مل کر ہر ایک مقصد میں کامیابی ہوگی۔ہمیں مختلف خیالات نہیں رکھنے چاہئیں۔ ہمارا ایک ہی خیالات سے

مقصد پورا ہوسکتا ہے۔ ہمارا آپسی میل میلاپ میں ہی فائدہ ہے۔ ہمیں کوئی بھی مقصد خاک میں دفن نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں وہ مقصد خاک میں دفن کرنا چاہئے جس سے ہمیں فائدہ حاصل نہ ہو سکے۔ اور جو کہ قوم کے حق میں نہ ہو، خاک میں ایسی چیزیں دفنانی چاہئیں جن سے بربادی کے آثار نظر آئیں۔ اسی لئے سردار کہہ کر شاعر کہہ رہا ہے کہ میں ایک گروہ کا مقصد خاک میں نہیں ملاتا میں سردار ہو کر ان کا مقصد پورا کرنے پر کوشاں ہوں۔

مطلع اور مقطع کو میں نے پڑھ کر بیان کیا لیکن اب میں مطلع اور مقطع کا نچوڑ کچھ اس طرح لکھتا ہوں:

شاعر نے مطلع میں یہ کہا ہے کہ کسی بھی بات پر افسانہ لکھتے ہیں، اسی لئے مقطع میں شاعر فرماتا ہے کہ جب بھی ہم کوئی خیال اپنے دل میں رکھیں تو ہم اُس خیال پر افسانہ تحریر کر سکتے ہیں۔ اسی لئے شاعر نے فرمایا کہ ہمیں کوئی بھی مقصد یا خیال الگ نہیں کرنا چاہئے اور اس خیال کو سوچ کر افسانے کی شکل میں تحریر کرنا چاہئے۔ اسی لئے شاعر نے مشتِ خاک کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کسی بھی خیال کو دفنانا نہیں چاہئے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ خیال با مقصد ہونا چاہئے جس سے ہم افسانہ تحریر کر سکیں۔

میرے خیال میں شاعر نے مطلع اور مقطع کو اسی لئے بیان کیا ہے تا کہ ایک مصنف کو یہ کہیں کے افسانہ کس طرح سے تحریر کر سکتے ہیں مطلب اگر کوئی سوچ ہمارے دل میں آئے اس سوچ کو الفاظ کے ذریعے افسانہ تحریر کر سکتے ہیں۔ اسی لئے شاعر نے مصنفوں کو یہ کہا ہے کہ کوئی بھی خیال اگر اپنے دماغ میں آئے اسے خاک میں دفن نہیں کرنا چاہئے۔

مندرجہ بالا سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ لفظ 'ہم' غالب اور میرؔ نے استعمال کیا ہے۔ لیکن غالب نے جمع اور واحد کے انداز میں بیان کیا ہے۔ میرؔ نے لفظ 'ہم' کو جمع کے طور پر بھی اور واحد کے طریقے پر بھی استعمال کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ میرؔ نے اکثر زبان کے قانون کے دائرے میں رہ کر 'ہم' کو بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس غالبؔ نے 'ہم' کو زبان کے قانون کے

دائرے میں نہ رہ کر بیان کیا ہے۔ میں یہ بھی دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ میرؔ کی غزلوں میں آمد کا رجحان کم دیکھنے میں آتا ہے اس کے برعکس غالبؔ کی غزلوں میں آمد کا رجحان زیادہ پڑھنے میں آتا ہے۔ اسی لئے ان دونوں کی باتوں کو جوڑ کر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرؔ نے 'ہم' کو زبان کے دائرے قانون میں بیان کیا اور غالبؔ نے اسی لئے زبان کے دائرے میں بیان نہیں کیا ہے کیونکہ اس کی غزلوں میں آمد پایا جاتا ہے۔

اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لفظ 'ہم' میں کتنا فرق غالبؔ اور میرؔ کے کلام میں پڑھنے میں محسوس ہوتا ہے۔

دیوان غالبؔ کی غزلوں میں

افسانے کے طرز پر مطلع اور مقطع پیغام غالبؔ کے حوالے سے

میں پہلے پیغام غالبؔ پڑھنے والوں کی توجہ کو اس بات پر مرکوز کرنا چاہتا ہوں جس کے تحت پڑھنے والے کو خود بخود محسوس ہو جائیگا کہ غالبؔ نے مطلع اور مقطع کو آپسی جوڑ میں ہی لکھ کر بیان کیا ہے۔ جس کے حوالے سے میں نے پیغام کے طور طریقوں سے بیان کیا ہے، اب میں پہلے مطلع اور مقطع کو ذکر کر کے اس بات کی طرف توجہ مرکوز کروں گا جس سے کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو گا کہ غالبؔ کے مطلع اور مقطع میں افسانے کہنے کی بھی گنجائش ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا

شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ یہ شوق رہا کہ میں خوشحالی میں اپنا کام کروں لیکن میں خوشحالی میں کوئی کام نہیں کر سکا۔ نہ کرنے کی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے مرنے کا ہی مزہ چکھنا چاہئے کیونکہ میرے ارمان معشوق پورے نہیں کرتا ہے جس سے کہ میں یہ سوچتا ہوں کہ میرے لئے موت ہی بہتر ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ! اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اب شاعر فرماتے ہیں کہ میں اس دنیا سے جدا ہوں کیونکہ اگر میں اپنی داستان یا نثر کس کو سناؤں یا کوئی میری داستان کو پڑھے تو اسے پڑھ کر کیا فائدہ ہوگا۔ مطلب میں اگر اس جہاں کے خیالات دل میں نہیں رکھوں تو ہر بات پر یہ لوگ کہیں گے کہ اس کی عبارت ہی موجود نہیں ہے۔ جب عبارت ہی موجود نہیں تو اشاعت کہاں حاصل ہوگی اور دونوں چیزیں حاصل نہ ہونے کی وجہ سے میری قسمت پر کون سوچے گا اور میرے نام جو کچھ بھی خدا نے یہاں رکھا ہے جس جس کے پاس رکھا ہے وہ کیسے ان چیزوں کی ادائیگی پیش کرے گا۔ اسی لئے اے معشوق میں اس دنیا کو نہیں بھول سکتا۔ میں ہر ایک بات کی عبارت کو اشاعت میں چھپا کر لوگوں کو ادا کروں گا۔

مقطع کے لفظ کے مطلب کے دائرے میں مَیں یہ کہوں گا کہ شاعر نے یہ کہا ہے کہ ہمیں کسی بات سے توجہ نہیں ہٹانی چاہئے۔ ہمیں ہر بات کو عبارت کے دائرے میں بیان کر کے اسے اشاعت کی صورت میں ادا کرنا چاہئے۔ جس سے کہ ہر ایک یہ سوچے کہ اس طرح سے لڑائی جھگڑے یا کسی فساد سے فتحیابی ہو سکتی ہے۔

اب میں پڑھنے والوں کی توجہ اس طرح سے مرکوز کروں گا کہ انہیں یہ سمجھ آئے کہ غالب کے مطلع میں افسانے کہنے کی گنجائش بھی ہے اور ہم افسانے کے طریقے سے بھی غزل کے مطلع کو بیان کر سکتے ہیں جیسے کہ

ہوس کو ہے + نشاطِ کار کیا کیا = ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

نہ ہو مرنا + تو جینے کا مزا کیا = نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بلائے جاں ہے + غالب! اسکی ہر بات = بلائے جاں ہے غالب! اسکی ہر بات

عبارت کیا + اشارت کیا، ادا کیا = عبارت کیا اشارت کیا، ادا کیا

''ہوس کو ہے''

میں ہر ایک طریقے سے پریشان ہی پریشان ہوا ہوں جب میں کسی کام کے لئے جاتا ہوں تو مجھے کام ملتا ہے میں کام کرتا ہوں لیکن اجرت بہت ہی کم ملتی ہے۔ جس محنت سے میں کام انجام دیتا ہوں اس کے مطابق مجھے اجرت نہیں ملتی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میری خواہشات یا میرے ارمان اس دنیا میں پورے ہی نہیں ہوتے اور جو اجرت مجھے اقتصادی کے دائرے میں حاصل ہونی چاہئے وہ حاصل ہی نہیں ہوتی۔

''نشاطِ کار کیا کیا''

اب جبکہ خواہشات ہی پوری نہیں ہوئی اجرت محنت کے مطابق موصول ہی نہیں ہوئی تو آپ ہی کہیں کہ میں کیسے خوشحال رہوں اور کیسے میں نشاط باغ میں بیٹھ کر پھولوں کو دیکھوں یا شام نشاط منعقد کروں۔ میرے لئے مناسب نہیں ہے کہ میں لفظ نشاط کو دل میں سنبھال کر رکھوں جبکہ محنت کے مطابق اجرت ہی موصول نہیں ہوئی۔

''نہ ہو مرنا''

جب میں اُجرت ہی محنت کے مطابق حاصل نہیں کرتا ہوں تو میں ہر ایک جگہ جا کر کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی ایسا کام حاصل ہو جائے جس سے کہ محنت کے مطابق اجرت حاصل ہو جائے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تھک گیا۔ تھک کر میں اب محسوس کرنے لگا کہ میں مرنا چاہتا ہوں میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں لیکن میں خودکشی کرنے سے دور رہ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے ماں، باپ اور بہنیں ہیں۔ میرے اہل وعیال فاقہ کشی سے مر جائیں گے۔ اب اسی لئے یہ سوچتا ہوں کہ اگر محنت کے مطابق اجرت حاصل نہیں ہوتی پھر بھی تھوڑا بہت اہل وعیال کو میری محنت سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں مرنا یا خودکشی کرنا نہیں چاہتا۔

''تو جینے کا مزا کیا''

جب مجھے ایسے خیالات ابھرے تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اجرت بھی کم اور معاوضہ بھی

کم۔ مجھے غم ہی غم اور ستم ہی ستم ہے۔ یہ سوچتا ہوں کہ جینے کا مزہ ہی نہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ میں اپنے اہل وعیال کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔ میں ہی ایک واحد آدمی ہوں جو اہل و عیال کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اسی لئے ان کے لئے میں جینا چاہتا ہوں اگرچہ اس زندگی میں مزہ ہی نہیں ہے پھر بھی میں جینے کا مزہ لینا چاہتا ہوں۔ مطلب میں اپنے اہل وعیال کی پرورش کے لئے جینا چاہتا ہوں حالانکہ جینے میں مزہ ہی کیا ہے۔

''بلائے جاں ہے''

اب میں نے خودکشی کو ترک کیا۔ میں اب اپنی محنت کو قائم ودائم رکھ کر اپنے اہل وعیال کی پرورش کے لئے کام کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ان دوستوں کو بھی دیکھتا ہوں جو دوست میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے جن کا مستقبل بہت ہی اچھا دیکھتا ہوں۔ غربت کی وجہ سے میں اپنا مستقبل نہیں بنا سکتا۔ جہاں بچوں کی مزدوری پر پابندی ہے وہیں میں نے قانون کو بالائے طاق رکھ کر بچپن میں ہی اہل وعیال کی پرورش کے لئے محنت کی۔ جس کی وجہ سے میں تعلیم حاصل نہ کرسکا۔ اس وقت بہت سے وسائل تعلیم حاصل کرنے کے لئے موجود ہیں لیکن خدا نے میری قسمت میں یہ وسائل نہیں لکھے جس کی وجہ سے میرا مستقبل ٹھیک نہیں رہا۔ جب میں ان دوستوں کو دیکھتا ہوں دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہوں شرمسار ہوتا ہوں کیونکہ وہ بڑے بڑے عہدوں پر کام کرتے ہیں۔ خواہ وہ سرکاری عہدہ ہو غیر سرکاری۔ لیکن ان دوستوں سے ملاقات نہیں کرتا۔ اپنے اہل وعیال کیلئے محنت کرتا ہوں۔

''بلائے جاں ہے'' یہ کہہ کر ان کے ساتھ تعلقات نہیں رکھتا۔

''غالبؔ! اس کی ہر بات''

میں نے اتنی جدوجہد اپنے اہل وعیال کی پرورش کرنے میں کی۔ ہاں میں شادی شدہ نہیں ہوں بلکہ اہل وعیال میں بڑا ہونے کے ناطے دن بھر محنت کرنے کے لئے گھر سے نکل کر کام پر جاتا ہوں اور دن بھر مزدوری کرنے کے بعد اُجرت حاصل کرکے ان پیسوں سے اہل و

عیال کو پالتا ہوں۔ مجھے ہر وقت یہ خیال آتا ہے کہ میری خواہشات پوری نہیں ہوئیں۔ جبکہ میں ان دوستوں کو دیکھتا ہوں جو کہ بڑے بڑے عہدوں پر کام کرتے ہیں۔ لیکن اجرت لیتے وقت اور اس کو اہل وعیال میں بانٹنے کے وقت مجھے ایسی باتیں یاد آتی ہیں۔ خیر جب میں ماں باپ کا شام کے لئے بستر ہ ٹھیک کرتا ہوں اور ان کو سلاتا ہوں تو ان کو سلاتے ہوئے میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے ایسی بات پر توجہ نہیں دینی چاہئے۔ مجھے ایسی بات پر توجہ دینی چاہئے جس سے کہ میں ماں باپ کی پرورش کرسکوں، مجھے ان کی پرورش کے لئے غالبؔ بن کر بزدل نہیں بننا ہے۔ مطلب مجھے بہادری سے ان کی خدمت کرنی ہے اور بزدل نہیں بننا ہے۔ اسی لئے میں غالب کا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر اپنے کنبے میں غالب ہوں۔

"عبارت کیا"

جب محلے میں ہمسایہ مجھے اور میرے کنبے کو دیکھ کر کہتے ہیں ایسا آدمی ان کنبے والوں کو کہاں ملے گا جو کہ اپنے کنبے کی پرورش کرتا ہے جس نے ان کی پرورش کے لئے تعلیم حاصل نہیں کی۔ مانتے ہیں اقتصادی بحران کے وجہ سے تعلیم حاصل نہ کرسکا لیکن پھر بھی اپنی محنت مزدوری کر کے اپنے کنبے کو پالتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم سب محلے والے دیکھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اس پر کونسی عبارت ہم لکھ سکتے ہیں۔ اس پر عبارت لکھنے کی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن پھر بھی سب محلے والے تعریف کرتے کرتے تھک جاتے ہیں کہ ایسا آدمی اس محلے میں دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ اور کہتے ہیں عبارت کیا لکھیں۔

"اشارت کیا، ادا کیا"

جب محلے والوں کی تعریف پڑھتے ہیں تو سب یہ کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی غیر آدمی مجھے محلے میں بلانے آتا ہے تو وہ مجھے ڈھونڈتے ہیں ڈھونڈتے ہوئے میرے گھر کو دیکھتے ہیں اور دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کو اور اجرت دن کی مزدوری پر دیں گے کیونکہ ماں باپ کی خدمت اور اہل وعیال کی پرورش دیکھ کر ہم بہت ہی متاثر ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم اسے اجرت کی

ادائیگی سے ہی اس کی تعریفوں کا انعام پیش کریں گے۔ جس سے کہ سب محلے والوں کو سمجھ آئے کہ کنبے کی پرورش اور ماں باپ کی پرورش کتنی ضروری ہے۔ جس سے سبھی خوش ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں اس اجرت پر اور اس کی محنت پر ہمیشہ غور و خوض کرنا چاہئے۔

اب اس دلیل کا عنوان یہ بھی رکھ سکتے ہیں محنتانہ، کیوں نہ ہم اس دلیل کو یہ بھی لکھیں کہ پرورش کرنا لازمی ہے۔ اسی لئے اس دلیل کو عنوان یہ دیں گے۔ ''پرورش غالب'' مطلب بہادری سے ہر ایک کی پرورش انجام دینی چاہئے۔

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق ہر ایک نے پہلے یہ بیان بازی کی ہے کہ عورتوں سے باز آنا چاہئے مطلب عورتوں کے ساتھ زیادہ تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں کیونکہ جب بھی عورت کے ساتھ کھلے دل سے بات چیت کرتے ہیں تو ہم یہ کہہ کر ان کا جواب سنتے ہیں کہ ہم آپ کے انداز بیان پر کسی وقت ایسا انداز بیان ظاہر کریں گے جس سے کہ آپ کو سبق یاد آئے گا۔ مطلب آئندہ کے لئے ہمارے ساتھ بات نہیں کر سکتے۔ اے معشوق جب میں نے آپ کے ساتھ پاک محبت کے تعلقات قائم کئے تو آپ مجھ سے جدا ہو کر زندگی بسر کر رہی ہو۔ اس زندگی کے بسر کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ آپ مجھے ان تعلقات سے سبق سیکھاتی ہو، لیکن میں ایسی باتوں سے بہت ہی واقف ہوں۔ میں اسی لئے ایسا سبق نہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے سب کے سب مجھ سے ڈرتے ہیں کیوں کہ میں ایک سنجیدہ محبوب ہوں۔ میں ایسا محبوب بھی نہیں ہوں کہ میں آپ کے ساتھ گہرے تعلقات رکھوں جس سے کہ مجھے آپ سے سبق سیکھنا پڑے۔ اس سبق کو نہ سیکھنے کی وجہ سے میں ایسے تعلقات آپ کے ساتھ نہیں رکھتا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اے معشوق میں جب اپنی گہری چھاپ آپ پر نہیں ڈالتا ہوں نہ ڈالوں گا اسی لئے آپ میرے دوستوں کو یہ کہتے ہو کہ وہ معشوق ایسا ہے کہ میرے ساتھ گہرے تعلقات نہیں رکھتا ہے۔اس کے جواب میں دوست کہتے ہیں کہ اے معشوق ہم بھی ان سے ڈرتے ہیں کہ ہمیں وہ بھی کسی طرح سے واقف نہیں کراتے۔اسی لئے ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ معشوق کون ہے جو کہ واقفیت ہی نہیں کراتا ہے نہ ہمیں واقف کار بناتا ہے۔اس لئے اے معشوق ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم کو آپ سے توجہ مرکوز کرنی چاہئے کہ آپ کے ساتھ ان کے تعلقات ہے وہ کیسے تعلقات آپ کے ساتھ نبھاتے ہیں جبکہ وہ کسی توجہ کا واقف کار ہی نہیں بناتے ہیں۔اے معشوق ہم اور آپ بھی کہتے ہیں کہ غالب کون ہے۔

مقطع کے دوسرے مفہوم کے دائرے میں مَیں یہ کہتا ہوں کہ ہم جب اپنی زبان کھولتے ہیں اور کھول کر ایک دوسرے کو بتاتے ہیں کہ کسی نے ہمیں اس بات سے واقف ہی نہیں کرایا جس بات پر ہم واقف کار ہونا چاہتے تھے لیکن ہم اس کے پوشیدہ راز پر بہت ہی خوش ہوئے۔ جو بھی کوئی پوشیدہ راز اپنے پاس چھپا کر رکھتا ہے تو اسکی ہم تعریف کرتے ہیں کہ وہی فتحیابی کے درجہ تک پہنچنے والا آدمی ہے۔مطلب چغل خور آدمی ہی فتحیاب نہیں ہوسکتا۔اسی لئے اس آدمی کو یا اس معشوق کو فتحیابی حاصل ہوتی ہے جو محبوب اور معشوق کے ساتھ زیادہ گہرے تعلقات نہیں رکھتے وہی پاک محبت میں فتحیاب ہوسکتے ہیں۔

جور سے باز آئے + پر باز آئیں کیا = جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا

کہتے ہیں ہم تجھ کو + منہ دکھلائیں کیا = کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ + غالبؔ کون ہے؟ = پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟

کوئی بتلاؤ کہ + ہم بتلائیں کیا؟ = کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

"جور سے باز آئے"

غلام نبی ایک مشہور شہری بس میں سفر کرتا ہے۔سفر کرتے ہوئے اس نے ایک عورت کو

کسی مرد کو ڈانٹتے ہوئے دیکھا، ڈانٹ کر اس عورت نے مرد کو یہ کہا کہ سگریٹ پینا اقبال جرم ہے جبکہ آپ سیٹ پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہو اور سر عام اقبال جرم کرتے ہو۔ سگریٹ کی وجہ سے مجھے بہت برا محسوس ہوتا ہے اور میں سگریٹ کی بُو سے اُلٹی محسوس کرتی ہوں۔ مرد نے سگریٹ کو فوراً بس کی کھڑکی سے باہر پھینکا اور سگریٹ سے پرہیز کیا۔ غلام نبی کہتا ہے کہ جب ہم سفر کر رہے تھے تو وہ عورت اس مرد سے بہت ہی غصہ کا اظہار کیا۔ لیکن سبھی سواریاں خاموش رہیں، آخر کار بس کسی مقام پر پہنچی۔ وہاں پر سبھی سواریاں بس سے اتریں، اتر کر اس عورت نے اس مرد کو پولیس کے حوالے کیا۔ پولیس کے حوالے کر کے اس مرد نے پولیس کو اپنی دلیل سے آگاہ کیا اور یہ کہا کہ میں نے اقبال جرم کیا اور اسی وقت سگریٹ کو باہر پھینکا۔

"پر باز آئیں کیا"

پولیس کے حوالے کرنے کے بعد سب سواریاں دوسرے مقام پر جانے کے لئے تیاریاں کرتی ہوئی دیکھیں گئیں۔ غلام نبی کہہ رہا ہے کہ مجھے دوسرے مقام پر جانا پڑا اس لئے میں دوسری بس میں چڑھا۔ اسی بس میں یہ عورت بھی بیٹھی۔ میں حیران ہو گیا کہ یہ عورت میری سیٹ کے پاس ہی بیٹھی ہے۔ ہم دونوں بس میں سفر کرنے لگے۔ غلام نبی نے اس عورت سے کہا کہ اگر اس مرد نے اقبال جرم کیا پھر آپ نے کیوں پولیس کے حوالے اس کو کیا۔ جواب میں عورت نے مجھے کہا کہ "پر باز آئیں کیا"۔ مطلب عورت کہنے لگی کہ اگر ایسے مرد کو میں پولیس کے حوالے نہیں کرتی تو یہ باز نہیں آتا وہ دوسری بار بھی ایسی غلطی کا ارتکاب کرتا۔ جس سے دوسرے مسافر بھی تکلیف محسوس کرتے۔ اسی لئے میں نے ایسے آدمی کو پولیس کے حوالے کیا تا کہ ایسے مرد کو سمجھ آئے کہ اقبال جرم کرنے کے بعد دوبارہ ایسا جرم نہیں کرنا چاہئے اور اس سے دوسرا آدمی سبق سیکھے گا۔

"کہتے ہیں ہم تجھ کو"

غلام نبی نے عورت سے کہا کہ بچارہ مرد بہت ہی پریشان ہے۔ پولیس اس کو حراساں

کرے گی لیکن اس مرد کو اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اے عورت جب اس نے اقبال جرم کرلیا تھا تو کیا فائدہ ہوا اسے پولیس کے حوالے کرنے سے۔ غلام نبی کہتا ہے کہ جب میں نے ایسی بات عورت کو کہی تو کہنے لگی یہ میرا کام ہے۔ اور یہ بھی کہنے لگی کہ ''کہتے ہیں ہم تجھ کو'' مطلب آپ کو کونسی آفت آئی میرے ایسے کام سے آپ کو خاموشی سے سفر کرنا چاہئے۔ اگر آپ کچھ اور بکواس کرنے سے باز آئیے۔

''منہ دکھلائیں کیا''

غلام نبی نے ایسا بیان اس عورت کا سنا تو وہ بہت ہی پریشان ہونے لگا۔ غلام نبی کہہ رہا ہے کہ جب میں سفر کر رہا تھا تو میں ڈرنے لگا۔ ڈر کے مارے دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ ایسی عورت خطرناک بھی ہے اور شریف بھی ہے لیکن قانون داں بھی ہے۔ ڈرتے ہوئے غلام نبی کہنے لگا کہ مجھ پر ایسا غلط الزام نہ دیں جس سے کہ میں بہت ہی شرمندہ سواریوں کے سامنے ہو جاؤں اور خدا سے رجوع ہو کر یہ کہنے لگا کہ ''منہ دکھلائیں کیا'' مطلب ایسی عورت مجھ پر ایسا غلط الزام نہ لگائے جس سے کہ میں سواریوں کے سامنے سفر میں بدنام ہو جاؤں۔ اس بدنامی کے وجہ سے میں دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا اور ڈر کے مارے یہ پھر کہنے لگا کہ ''منہ دکھلائیں کیا'' اور ڈرتے ہوئے میں اپنی منزل پر پہنچا۔ پہنچ کر خدا سے شکر کرنے لگا کہنے لگا کہ ''منہ دکھلائیں کیا''

''پوچھتے ہیں وہ کہ''

جب میں بس سے اترا تو میں اس جگہ پہنچا جس جگہ مجھے جانا تھا۔ پہنچتے ہی بہت سارے دوستوں نے میرے چہرے کی حالت دیکھی، دیکھ کر وہ مجھے کہنے لگے کہ غلام نبی صاحب آپ کا منہ کیوں شرمسار دیکھنے میں آتا ہے۔ مطلب آپ کے چہرے کا رنگ ایسا نہیں ہے جیسا کہ پہلے ہم نے دیکھا تھا۔ میں اندر ہی اندر سڑنے لگا کہ ''منہ دکھائیں کیا'' اور محسوس کرتے ہوئے یہ بھی کہنے لگا کہ ہے تو میرا منہ کالا لیکن مجھے ان سوال کا جواب دینا ہے۔ میں نے سوچ

کر کہا ''پوچھتے ہیں وہ کہ'' اب جب پوچھ تاچھ ہی اپنے دوستوں سے سنی تو لفظ' کہ' استعمال کرنا پڑا۔ ان کو ایسی دلیل سے واقف کیا، جسے سن کر وہ بھی محسوس کرنے لگے اور اپنی اپنی رائے دے کر انہوں نے کہا کہ بیچ دائرے قانون کے اس عورت نے اپنا کام اچھے طریقے سے انجام دیا۔ دوسری بات انہوں نے یہ بھی کہی کہ عورت کا منہ آج تک غلام نبی نے نہیں دیکھا۔ عورت سے ڈرنا چاہئے۔ جب یہ باتیں انہوں نے بتائیں تو میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ اور ڈر کے مارے میں بالکل خاموش رہا۔

''غالبؔ کون ہے؟''

غلامی نبی کہہ رہے ہیں کہ جب میں نے ایسی باتیں اُن دوستوں کو بتائیں، تو مجھے غالب کے اشعار یاد آئے تو میں کہنے لگا کہ لفظ غالب کا مطلب فتحیابی ہے، میں نے کوئی فتحیابی نہیں کی میں ہار گیا اور ہارنے کی وجہ سے ہی میرے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ حتیٰ کہ میں نے قانون شکنی نہیں کی۔ میں بالکل قانون کے دائرے میں رہا۔ اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ غالب کون ہے مطلب بہادری یا فتحیابی کیسے آتی۔ مجھے کیسے اس دلیل میں فتحیابی ہوتی کیونکہ میں عورت کی باتوں سے ڈرنے لگا، میں ڈر کے مارے بس میں دوسری سیٹ پر بیٹھ کر یہ کہنے لگا کہ مجھے ایسی عورت سے نجات ملنی چاہئے۔ اب میں یہ سوچ کر کہہ رہا ہوں کہ ''غالبؔ کون ہے؟'' جبکہ میں نے قانون کا احترام کیا لیکن میں لفظ غالب کے مفہوم کے دائرے میں فتحیابی نہیں کر سکتا۔ میں نے کوئی فتح نہیں پائی۔ اگرچہ میں نے اس عورت سے یہ کہا کہ اب ایسے مرد کو معافی کر دینا چاہئے لیکن یہ کہنے پر میں نے اپنی باتوں پر فتحیابی حاصل نہیں کی۔

''کوئی بتلاؤ کہ''

غلام نبی کہتا ہے کہ میں جب بھی دلیل دیکھ کر کسی اور جگہ قیام کرتا ہوں میری حالت پرانی حالت سے بالکل جدا ہو جاتی ہے میں ڈر کے مارے یہ سوچتا ہوں کہ ایسی دلیل نہ میری نظر میں آنی چاہئے اور نہ میں ایسی دلیل دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ میں ایسی دلیل کو پڑھنا چاہتا ہوں۔

اسی لئے میں ایسی دلیل کس دوست کو بتاؤں اور جیسا کہ "کوئی بتلاؤ کہ" مطلب یہ بتانے والی دلیل ہے ہی نہیں تو اس دلیل سے کس کو واقف کراؤں۔

"ہم بتلائیں کیا؟"

غلام نبی خاموشی سے یہ سوچنے لگا کہ جب میں گھر میں بیٹھوں تو مجھے ایسی دلیل کمرے میں بیٹھ کر یاد آئے گی تو کیا میں ایسی دلیل اپنی بیوی کو بتا سکتا ہوں اگر میں بتاؤں تو وہ سن کر مجھے اسی طرح ڈانٹے گی جس طرح اس عورت نے ڈانٹا۔ اسی لئے اپنی عزت کا احترام خیال کرتے ہوئے ایسی دلیل اپنی بیوی کو نہیں سناؤں گا۔ جبکہ میں اس کے ساتھ ہر وقت ہر لمحہ حاضر رہتا ہوں اور بازار کی دلیل سے عورت کو واقف کرنا گھر کے ماحول کے لئے اچھا نہیں ہے۔ اسی لئے میں یہ کہہ کر اس بات کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کرتا ہوں کہ "ہم بتلائیں کیا؟"

جب میں مطلع اور مقطع کو جوڑ کر کہانی بتاتا ہوں تو میں اس کہانی کا عنوان یہ لکھ کر کہوں کہ "ہم بتلائیں کیا؟" یا "جور سے باز آئے"۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر؟
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق میں نے اتنی قوتِ برداشت رکھی جس پر میرے دوست ایسی حالت دیکھ کر ناراض ہوئے ہیں اور مجھے ایسی حالت دیکھ کر مختلف خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ کئی یہ کہتے ہیں کہ اے دوست تجھ میں کتنی قوتِ برداشت ہے کہ آپ آج تک معشوق کے سلوک سے کمزور ہو گئے، لیکن اتنی کمزوری کے باوجود آپ میں قوتِ برداشت ہے، لیکن اے معشوق جو لوگ میری قوتِ برداشت دیکھتے ہیں وہ میری قوتِ برداشت پر دیدار کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ کتنا ہجر کا تاب محبوب میں پایا جاتا ہے۔ اے معشوق اس کا مطلب یا تو آپ میری قوتِ برداشت دیکھ کر مجھے آزماتے ہو یا تو آپ میرا طاق دیکھتے

ہو، مطلب آپ اس وقت میرا دیدار کرنا چاہتی ہو جس سے کہ آپ میری قوتِ برداشت کو آزما کر ہی دیکھنا چاہتی ہو، تو آپ ان اصولوں کے تحت میرا دیدار کرنا چاہتی ہو۔

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا

یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مقطع میں غالب فرماتے ہیں کہ اتنا تاب برداشت کرنے کے باوجود میں نادانی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا ہوں، میں سر نہیں پھوڑنا چاہتا اور میں آزردہ نہیں ہوتا ہوں لیکن میں یہ سب قوتِ برداشت اس وقت مسمار کر کے رکھتا ہوں جب میں آپ کی دیوار کو دیکھتا ہوں۔ دیکھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر چہ مجھے تیری یاد آتی ہے پر تو اپنے دیدار سے واقف کراتی لیکن میں اس واقفیت کی دیوار کو دیکھ کر ہی سوچتا ہوں میں نے آپ کا دیدار کیا ہے۔

اگر میں مقطع کو لفظ غالبؔ کے حوالے سے بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ اے معشوق اگر میرے دوست میری قوتِ برداشت پر ناراض ہوتے ہیں پھر بھی وہ یہ کہہ کر کسی اور کو ایسی بات سناتے ہیں کہ غالب میں کتنی قوتِ برداشت ہے اور کتنی طاقت ہے پاکِ محبت میں معشوق دیدار نہیں کراتی، لیکن خود شاعر نادان نہیں بنا۔ اگر چہ دیدار کر کے واقف نہیں ہوا لیکن سر بھی نہیں پھوڑ ڈالا جب بھی قوتِ برداشت حد سے پار کر کے شاعر کو محسوس ہوتا ہے تو وہ معشوق کی دیوار کا ہی دیدار تصور کر کے قوتِ برداشت میں تھوڑا فرق محسوس کرتا ہے اور نادان پن بھی ٹل جاتا ہے۔ یہ کہہ کر یا یہ سن کر ہمیں قوتِ برداشت کے لفظ پر سیکھنا چاہئے اور ہمیں نادان نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہمیں بہادری اور قوتِ برداشت سے فتح حاصل کرنی چاہئے۔ فتح کرتے ہوئے ہمیں اپنا حال شوریدہ نہیں بنانا چاہئے بلکہ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ برداشت کرنے سے ہی ہم کچھ نہ کچھ فتح محبت میں حاصل کر سکتے ہیں۔

اب میں غزل کے ان چار مصرعوں کو کہانی کے انداز میں بیان کرتا ہوں۔ جیسے

کیوں جل گیا نہ تاب+ رُخ یار دیکھ کر؟ کیوں جل گیا نہ تابِ رُخ یار دیکھ کر؟

جلتا ہوں اپنی طاقت+ دیدار دیکھ کر = جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ+ شوریدہ حال کا = سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا

یاد آگیا مجھے تری+ دیوار دیکھ کر = یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

''کیوں جل گیا نہ تابِ''

دُنیا میں تمام لوگ صحتیاب اپنے آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی اس دنیا سے رخصت پذیر نہیں ہونا چاہتا ہے لیکن جب یہ انسان دنیا میں کئی مشکلات کا سامنا کرتا ہے تو اس وقت انسان زندگی سے تنگ آکر یہ سوچتا ہے کہ کیوں نہ میں اس دنیا سے رخصت پذیر ہی ہو جاؤں۔ لیکن جب بھی اس کے سر پر موت منڈراتی ہے تو اس وقت انسان اس دنیا سے رخصت پذیر نہیں ہونا چاہتا۔ اسی طرح سے ایک آدمی راستے پر چلتا ہے سڑک کو پار کرنے کے لئے بطور احتیاط تھوڑا رک کر انتظار کرتا ہے۔ اگر چہ انسان کو بہت سے غم محسوس ہوتے ہیں پھر بھی وہ سڑک کو احتیاط سے پار کرنا چاہتا ہے۔ اتنی بھیڑ میں اپنی زندگی کو بچانا چاہتا ہے مطلب وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں اس دنیا سے رخصت پذیر ہو جاؤں گا۔ وہ اگر برداشت کرتا ہے تو اپنی زندگی کو بچانے کے لئے اسی لئے وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ ''کیوں جل گیا نہ تابِ'' مطلب اپنی زندگی کو بچانے کے لئے وہ تاب لاکر قوتِ برداشت کو نہیں جلانا چاہتا یعنی دفن کرنا چاہتا ہے۔ وہ قوتِ برداشت اسی لئے قائم ودائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس بھیڑ میں موت کا شکار نہ ہو جائے، اسی لئے یہ کہہ کر کہتا ہے کہ ''کیوں جل گیا نہ تابِ''۔

''رُخ یار دیکھ کر؟''

جب یہ باتیں سوچتا ہے تو سوچ کر یہ بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے وقت پر کسی کے پاس پہنچنا ہے۔ وہاں مجھے کسی سے ملنا ہے مل کر جب وہ میرا دیدار کر کے میرے ساتھ ناراضگی کا اظہار نہیں کرے گا لیکن کروں کیا بھیڑ ہونے کی وجہ سے سڑک پار نہیں کرسکتا۔ اپنے آپ کو موت کے سائے میں نہیں سلانا چاہتا۔ اسی لئے میں سڑک کو پار کرنے کے لئے تاب لاتا ہوں۔ یہی

تاب جلتا ہے اور جلتے ہوئے اپنے اس قیام پر نہیں پہنچ سکتا ہوں جہاں مجھے وقت پر پہنچنا ہے۔ اسی لئے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں تاب لا کر ہی دیدار کرتا ہوں اور یہی دیدار اس وقت میں سمجھتا ہوں کہ یہی ''رُخ یار دیکھ کر؟'' سوچتا ہوں میں نے تاب کو اس بھیڑ میں جلایا۔

''جلتا ہوں اپنی طاقت''

رُخ یار کو دیکھ کر جب میں نے تاب کو جلایا۔ جلاتے ہوئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں جلاتا ہوں اپنی طاقت کے بل بوتے پر جب اس تاب کو بھیڑ کی وجہ سے جلاتا ہوں تو میں یہ کہتا ہوں کہ اسی میں ہی طاقت دیکھتا ہوں جس طاقت کے وجہ سے سڑک کو پار نہیں کر سکتا ہوں سڑک کو پار نہ کرنے کی وجہ سے اسی طاقت سے میری جان بچتی ہے اور کسی حادثے کا شکار نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں اگر میں وقت پر اس یار کے پاس نہیں پہنچ سکتا ہوں بلکہ میں سڑک کو پار کرنے کے لئے تاب کرتا ہوں تاب کرنے سے میں اس کی قوت آزماتا ہوں اور تاب کو سڑک پر ہی جلاتا ہوں۔ اسی لئے میں یہ سوچتا ہوں جب اس تاب کو جلایا تو اس میں قوت دیکھی قوت کا مطلب مجھے سڑک کے حادثے سے بچایا اسی لئے میں کہہ رہا ہوں ''جلتا ہوں اپنی طاقت''

''دیدار دیکھ کر''

اب میں جلاتے ہوئے اس وقت کا دیدار اس طرح سے کرتا ہوں کہ جب میرے ساتھ دوسرا کوئی آدمی سڑک کو پار کرنے کے لئے انتظار میرے ساتھ کرتا ہے لیکن اس میں تاب نہیں دیکھا اس نے تاب کی طاقت کو نہیں جلایا بلکہ بھیڑ میں سڑک کو پار کیا۔ پار کرتے ہوئے وہ سڑک کے حادثے میں مبتلا ہوا۔ جب وہ سڑک کے حادثے میں مبتلا ہوا تو میں نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی، لوگ اسے بچانے کے لئے ہسپتال پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کی جان بچ جائے، یہ دیکھ کر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اسی ایک دیدار سے مجھے نصیحت ملی کہ میں تاب کو سڑک پار کرنے سے پہلے ہی جلاؤں اور جلا کر اسی کو رُخ یار دیکھ کر سمجھوں اور سمجھ کر یہ کہوں کہ

''دیدار دیکھ کر'' مجھے حادثے سے زندگی بچانی ہے۔

''سر پھوڑنا وہ غالب''

میری فتحیابی اسی میں ہے کہ میں سڑک کے حادثے سے بچ جاؤں اور زندگی کو حادثے کے شکار میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا ہوں۔تاب کرتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ یہ ایسی قوت ہے جس میں نادان پن بھی محسوس ہوتا ہے اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ ''سر پھوڑنا وہ غالب'' اگر شاعر نے کہا کہ میرے میں قوتِ برداشت نہیں ہے اور برداشت نہ کرنے کی وجہ سے میں سر کو پھوڑ ڈالوں گا۔سر کو نہیں پھوڑ ڈالا بلکہ میں نے تاب کیا تاب کرتے ہوئے میں نے تاب کا ہی سر پھوڑا، اگرچہ میں دوست کے پاس وقت پر نہیں پہنچا اور اس کا رُخ نہیں دیکھا لیکن اپنی جان بچانے کیلئے میں نے تاب کا ہی سر پھوڑا اور مجھ میں فتحیابی محسوس ہوئی اس لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ''**سر پھوڑنا وہ غالب**'' غالب کا لفظ میں نے تاب میں مبتلا کیا اور لفظی مطلب میں میں نے فتحیابی تاب کو کیا اور حادثے کا شکار نہیں ہوا۔

''شوریدہ حال کا''

جب میں اس دوست یا یار کے پاس وقت پر نہیں پہنچا اور وقت پر میں نے اس کا رُخ ہی نہیں دیکھا نہ دیکھنے کی وجہ سے مجھے شوریدہ حال میں مبتلا ہونا پڑا، مانتا ہوں شوریدہ حال کی قوت میں نے تاب میں مبتلا کی، زندگی کو بچانے کے لئے میں نے تاب کو ہی سڑک پر رُخِ یار تسلیم کیا اور اپنی جان بچائی۔جب مجھے وہ یار اس واقعہ کے بعد ملا تو مجھے کہنے لگا کہ اے دوست تو نے مجھ سے بے وفائی کی ہے کیونکہ آپ نے مجھے رُخ نہیں دکھایا، میں آپ کے رُخ کے لئے تاب کرتا رہا، اتنا تاب کرتا رہا کہ میں قوت برداشت سے باہر اپنے آپ کو سمجھنے لگا۔ مجھے تیری یاد آ کر میری زندگی میں ''**شوریدہ حال کا**'' دائرہ محسوس ہونے لگا۔

''یاد آ گیا مجھے تری''

جب میں نے یہ الفاظ یار کے سنے تو مجھے یاد آ گیا وہ حادثہ جس کے تحت میں نے تاب کو

سڑک پر جلایا اور تاب کو ہی رُخ یار میں مبتلا کیا۔ ان سب باتوں کا ذکر میں نے اس دوست کو بتایا، بتا کر میں نے بھی یہ کہا کہ "یاد آ گیا مجھے تری" اور یہ سن کر میری تعریف کرنے لگا، تعریف سنتے ہوئے دونوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر آپ مجھے رُخِ یار وقت پر نہیں دکھا سکے لیکن آپ نے قوت کو جلا کر اپنی زندگی کسی حادثے سے بچائی۔ جس سے کہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ صحتیابی ملی اور کسی حادثے کا شکار نہ ہوئے۔

"دیوار دیکھ کر"

جب ہم دونوں نے ایسی باتیں کہیں اور دونوں کو احساس ہوا کہ زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمیں آپسی دیدار (ملاقات) وقت پر نہیں ہوئے اگر وقت پر نہیں تو کسی حادثے میں مبتلا ہونے سے اپنی زندگی بچائی اور دوست کو دوست نے کہا کہ ہماری دوستی ایک دیوار کی طرح قائم و دائم ہے، اور ہم آپسی دیوار کو توڑنا نہیں چاہتے یہ دیوار ہمیں تاابد موجود رکھنی چاہئے۔ ہمیں آپسی شکوہ نہیں کرنا چاہئے اگر ہم کسی وقت آپس میں نہیں مل سکیں اور اسی لئے دانشوروں نے کسی ضروری کام پر حاضر نہ ہونے کی وجہ پر یہ بتایا ہے کہ کوئی (ضروری کام کسی سازگار حالت کی وجہ سے) یہ الفاظ بتا کر اس کہانی کو اختتام پذیر کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری دوستی میں ہمیشہ ہر خیر "دیوار دیکھ کر" بتانی چاہئے۔ اگرچہ دوست آپسی ملاپ ہر روز نہیں کر سکتے پھر بھی دوستی کی دیوار مضبوط ہے اسی لئے ہر غیر ہماری دوستی دیکھ کر بتا رہے ہیں۔ **"دیوار دیکھ کر"** میں اس افسانے کو اس عنوان سے بھی کہہ سکتا ہوں "دیوار دیکھ کر" اور تاب کو جلانا۔

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق میرے دل میں اتنی قوت ہے کہ میں آپ کا رُخ دیکھ کر لرزتا ہوں، لرزتا اسی لئے ہوں کہ آپ کا تصور مہر درخشاں کے نام پر کرتا ہوں، مطلب آپ کی صورت چاندنی جیسی ہے اور یہ دیکھ کر میرا دل گھبرا رہا ہے اور سوچتا ہوں کہ چاندنی کی صورت

میرے دل میں ہی پہنچے۔ مطلب ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس سے کہ آپ کا دل میرے دل کے ساتھ رُجوع ہو جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچتا ہوں کہ آپ اپنے دل کو میرے دل کیلئے نہیں پیش کر سکو گی، اسی لئے اس سوچ میں مجھے ایسی چاندنی صورت کو دیکھنا ہے لیکن جب میں شب ہجر میں اپنا وقت گزاروں تو اس وقت میں آپ کی صورت میں میری صورت شبنم کے قطروں میں مبتلا ہو جائے گی جس سے کہ میں بہت ہی برباد ہو سکتا ہوں۔ اسی لئے اے معشوق ان باتوں کو الگ کر کے آپ میرا دل اپنے دل کے ساتھ قائم ودائم رکھو گے تو مجھے برباد ہوتے نہیں دیکھنا۔ مطلب میری زندگی کو کانٹوں میں مبتلا نہیں کرنا۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی؟

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

غالب فرماتے ہیں کہ جب میں نے پہلے ہی معشوق سے یہ درخواست کی کہ آپ میری زندگی کو گلاب کے کانٹوں کی طرح خاردار نہ بنائے کیونکہ گلاب کے کانٹوں سے بہت سی مشکلات رونما ہوتی ہیں۔ بہت سی مشکلات کے باوجود اگر آپ میرے دل کو اپنے دل کے پاس سنبھال کر رکھو گی، تو میں یہ نصیحت دے رہا ہوں کہ پاک محبت میں مجھے اسی شدت سے الگ رکھنا، لیکن اگر آپ ان باتوں سے الگ رکھو گے تو آپ کی اور میری پاک محبت کامیاب ہو سکتی ہے اور کامیابی کی وجہ سے سب لوگ یہ کہیں گے کہ فتحیابی ہوئی ہے مطلب پاکِ محبت میں کامیاب ہونے پر فتحیاب ہوئے ہیں اور اسی لئے لفظ غالب صحیح ہے کہ جب ہم کسی چیز کو فتح کریں گے تو ہمیں کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

لرزتا ہے+ مرا دل + زحمت مہر درخشاں پر

میں ہوں+ وہ قطرۂ شبنم+ کہ ہو خار بیاباں پر

نہ لڑ ناصح سے+ غالبؔ کیا ہو+ اگر اس نے شدت کی؟

ہمارا بھی+ تو آخر زور+ چلتا ہے گریباں پر

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی؟

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

""لرزتا ہے""

بہت دن گزر گئے کہ ہم نے جناب اسلم کو گھر میں نہیں دیکھا جب ہم نے معلوم کیا اسلم صاحب کہاں گئے ہیں تو ان کے اہل وعیال نے یہ کہا کہ وہ گاؤں گئے ہیں لیکن ایک مہینے گزرنے کے بعد پھر انہوں نے یہی کہا کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں۔ محلے اور شہر والوں نے یہ سوچا کہ اتنی دیر تک وہ کسی بھی جگہ اتنا قیام نہیں کرتے ہیں لیکن ہم گھر والوں کو کہتے رہے کہ وہ ہمارے کہنے پر خوف محسوس کرتے ہیں، کیا کوئی پوچھ تاچھ کرنے پر یا کسی کے مزاج پرسی پر ""لرزتا ہے"" لیکن اب ہم نے جب محسوس کیا کہ ایسے پوچھ تاچھ کرنے پر ان کا لڑکا لرزتا ہے تو اب پوچھ تاچھ کرنی بند کردی اور ان کے اہل وعیال سے کچھ نہیں پوچھا۔ تو پھر ہم نے ایسے گھر کا نام ہی ""لرزتا ہے"" میں مبتلا کیا۔

""مرادل""

جب کئی دن اور سال گزر گئے تو ایک آدمی نے اسلم کے نام خط لکھا۔ تو ہمیں ڈاکیہ نے کہا ہے کہ یہاں کوئی اسلم صاحب رہتا ہے۔ تو ہم نے اس کو جواب دیا کہ اس مکان میں رہتا تھا لیکن ایک سال سے اس کو دیکھا ہی نہیں۔ اس پوچھ تاچھ پر ان کے گھر والوں نے کچھ بھی نہیں کہا تب تو ہم نے اس مکان کا نام ہی ""لرزتا ہے"" رکھا۔ تو ڈاکیہ نے جواب دیا اس خط کو میں کیسے ان کے حوالے کروں جبکہ اسلم صاحب رہتے ہی نہیں تو پھر اس نے اس چٹھی کو واپس کر کے یہ لکھا کہ وہ آدمی ایک سال سے گاؤں میں حاضر نہیں ہے اور اس مکان جس کا نام ""لرزتا ہے"" ڈاکیہ نے ایسی باتیں سنی تو اس مکان کے اندر داخل ہی نہیں ہوا اور نہ چٹھی ان کو دی کیونکہ لفظ لرزتا ہے ہی سے ""مرادل"" گھبرانے لگا۔ مطلب ڈاکیہ کا دل گھبرانے لگا۔

""زحمت مہر درخشاں پر""

ڈاکیہ کے ایسے الفاظ سن کر ڈاک خانے والوں نے خط ارسال کرنے والے کو خط واپس کیا اور ان باتوں سے روشناس کیا۔ جب چٹھی ارسال کرنے والے نے ڈاکخانہ والوں کو اس

بات سے آگاہ کیا کہ اسلم صاحب ایک سال سے گھر میں حاضر ہی نہیں تو وہ اس کی غیر حاضری پر بہت ہی غم وغصہ میں مبتلا ہوا۔تو ارسال کرنے والے نے یہ سوچا کہ اس چٹھی کو فی الحال میں اپنے پاس ہی رکھوں اگر اسلم صاحب مجھے کبھی ملیں گے تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ ڈاک والوں کے ذریعے سے مجھے اس خط کو واپس کر کے یہ بتایا ہے کہ ایک سال سے محمد اسلام گھر میں ہے ہی نہیں اور غیر حاضری کی وجہ سے محلے والوں نے اس عمارت کا نام لرز تا رکھا اور پھر ڈاک خانے کے ڈاکیہ نے یہ سن کر کہا کہ میرا دل ایسا لفظ سن کر لرزتا ہے اب میں اس چٹھی کو موجود رکھتے ہوئے ایسی جگہ پر منتقل کروں جس جگہ کا نام میں ''زحمت مہر درخشاں پر'' رکھوں اور جب بھی اس خط کو دیکھوں تو میں یہ کہوں کہ **''زحمت مہر درخشاں پر''**

''میں ہوں''

ایک سال گزرنے کے بعد محلے والوں نے اسلم صاحب کو دیکھا وہ حیران ہو گئے کہ ایک سال سے اسلم صاحب کہاں گئے ہوئے تھے، محلے والے تعجب میں رہے تو آپس میں یہ بات کہنے لگے کہ شاید یہ کہیں اپنا کاروبار کرتا ہے یا کسی کے ساتھ کاروبار کرنے میں مست ہے۔ جس کی وجہ سے ایک سال تک گھر نہیں لوٹے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ اگر ہم اسلم صاحب سے روبرو پوچھیں گے تو وہ صحیح جواب سے ہمیں واقف نہیں کریں گے۔جس کی وجہ سے ہم لوگ مطمئن نہیں ہوں گے۔ یہ سوچتے ہوئے اسلم صاحب ان کے روبرو آئے تو وہ کہنے لگے کہ آپ ایک سال کے بعد گھر لوٹے ہو۔کیا آپ ہی اسلم صاحب ہو تو انہیں نے جواب دیا کہ میں ہوں اسلم صاحب اور **''میں ہوں''** بتا کر کہنے لگے۔

''وہ قطرۂ شبنم''

جب دوستوں نے، محلے والوں نے یہ سنا کہ اسلم صاحب نے کہا کہ میں ہوں میں ہوں اسلم صاحب کو دوست کہنے لگے کہ گھر میں بھی نہیں رہے اور پوچھتے پوچھتے تھک کر یہ کہنے لگے کہ ان کا بیٹا اطمینان بخش جواب نہیں دیتا۔تو ہم نے اس گھر ہی کا نام رکھا ''لرزتا ہے'' تو

ڈاکیہ نے بھی محلے والوں کی دلیل سن کر یہ کہا کہ لرزتا ہے میرا دل، ہم حیران ہیں کہ اسلم صاحب کہاں گئے یہ کہتے ہوئے اب اسلم صاحب نے کہا کہ مجھے ایسا کام کسی غریب نے سونپا جس سے کہ میں نے گھر میں حاضری نہیں دی۔ ایک سال میں نے اپنی بھاگ دوڑ ایسے کام میں لگائی جس کی وجہ سے میں بالکل مصروف رہا اور گھر والوں سے دور رہا۔ ایک معصوم فرد اپنے بڑے کنبہ پرور سے دور ہوئے۔ ان کی پرورش کر کے میں نے ان کا گھر اقتصادی طور پر سنبھالا اور اب وہ گھر بہت ہی اچھا ہے۔ میں نے ایک غریب کنبے کا پالن پوشن کے لئے اتنی محنت کی اور اپنے گھر میں بڑے لڑکے کو یہ کہا کہ آپ اپنے گھر کی دیکھ بھال کرو۔ اس طریقے سے میں نے وہ گھر بھی غربت سے بچایا اور میں محنت کر کے آپ لوگوں کو یہ بتاتا ہوں کہ اس گھر کو سنبھالتے ہوئے میں نے اس کا نام رکھا **"وہ قطرۂ شبنم"**

"کہ ہو خار بیاباں پر"

ہم دوستوں نے اس کی باتیں سنیں تو وہ کہنے لگے اسلم صاحب نے اچھا کام کیا ہے۔ بہت محنت کی ہے۔ ایک غریب گھر کی پرورش سال بھر کی اور اسے غربت سے بچایا۔ اسی لئے ہم اسلم صاحب کو اپنے طریقے سے تعریف کرتے ہوئے ہم یہ کہیں **"کہ ہو خار بیاباں پر"** مطلب مشکلات میں گلاب کو سنبھالا اور جو گلاب کے ارد گرد کانٹے تھے ان کو الگ کر کے گلاب کے پھول کو محفوظ رکھا۔ مطلب اگر کسی گھر کو غربت میں دیکھا تو ان کی غربت کو دور کر کے اچھی اقتصادی حالت میں مبتلا کیا۔ مطلب پھول گلاب کے پیدا کئے اور کانٹے کی طرح کی مشکلات کا سامنا کیا۔ اسی لئے ہم محلے والے آج اسلم صاحب کا نام نہیں پکاریں گے بلکہ **"ہو خار بیاباں پر"** کے نام سے ہی انہیں پکاریں گے۔

"نہ لڑنا صبح سے"

جب محلے والوں نے مشورہ کیا کہ ہم اسلم صاحب کو محلے کی طرف سے خطبہ پیش کریں گے اور خطبے میں ہم اسے اعزاز دیں گے جس اعزاز کا نام **"کہ ہو خار بیاباں پر"** اور سب کے

سب محلے والوں کو اس اعزاز سے نصیحت ملے گی کہ اگر کسی غریب کی امداد کرنی ہو تو وہ پردہ پوشی میں ہی کرنی چاہئے تا کہ ان کی بدنامی بھی نہ ہو اور لینے اور دینے والے کا نام ونشان بھی نہ ہو۔ اسی لئے ہم محلے والے بہت ہی خوش ہوئے کہ اسلم صاحب نے ایک نیک کام کیا۔ اور ایک سال تک اس کے فرزند اپنے گھر کی دیکھ بھال کرتے رہے حتیٰ کہ ہم سب محلے والے دوست اس کے گھر گئے لیکن انہوں نے کسی راز سے ہمیں واقف نہیں کرایا، اس کا بھی مطلب ہے کہ اگر کسی کو کوئی امداد پیش کرنی ہو تو وہ پردہ میں ہی کرنی چاہئے۔ اس اعزاز سے محلے والے کو نصیحت ملے گی اور نصیحت ایسی ملے گی کہ ہمیں اگر کسی کو مدد کرنی ہو تو ہمیں کسی کو نہیں بتانا چاہئے۔ اسی لئے ہمیں ناصح سے کبھی نہیں جھگڑا کرنا اور نہ ہی اس سے لڑائی بھی کبھی نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں ہر ایک کی نصیحت کو قبول کرنا چاہئے۔ اسی لئے ہم سب دوست اعزاز پیش کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی کہہ رہے ہیں کہ ''نہ لڑ ناصح سے'' مطلب ہمیں کسی ناصح سے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ جو بھی وہ کہے ہمیں سوچ سمجھ کر اس نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔

''غالب کیا ہو''

جب محلے والوں کی طرف سے اسلم صاحب کو اعزاز دیا گیا تو اس وقت محلے والوں کو یاد آیا کہ اسلم صاحب کو یہ اعزاز ہم نے اسی لئے دیا تا کہ محلے میں دوسرے شخص کی بھی ایسے کام انجام دینے میں حوصلہ افزائی ہو۔ اسی لئے ہم اس اعزاز کو پیش کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ''غالب کیا ہو'' مطلب فتح کس بات کی ہوئی۔ فتح اس بات کی ہوئی کہ اس محلے میں ایک آدمی نے کسی گھر کو اقتصادی بحران سے بچا کر ایک بہت ہی اہم کام انجام دیا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ فاتح کی شکل میں اسلم صاحب گھر میں حاضر ہیں اور اعزاز دے کر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ''غالب کیا ہو'' مطلب فتحیابی کیا ہوئی ہے۔ فتحیابی پڑھنے والے کو معلوم ہی ہے۔

''اگر اس نے شدت کی''

جب اعزاز محلے والوں نے اسلم صاحب کو پیش کیا تو بہت سے دوستوں نے اس اعزاز

پر اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر انہوں نے کام انجام دیا ہے تو ہمیں ایسا اعزاز بھی نہیں دینا چاہئے تھا۔ ہمیں اس بات کا ذکر خفیہ رکھنا چاہئے جبکہ سب کہتے ہیں کہ کسی غریب خاندان کو مالی امداد کرنا بہت ہی اچھا کام ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ پوشیدہ طریقے سے کام انجام دینا چاہئے۔ اسی لئے ہمیں یہ ٹکراؤ ان کی باتوں پر پیدا ہوا۔ مطلب اس میں شدت بھی پیدا ہونے لگی، لیکن رونما ہونے کے باوجود ہم بھی یہ تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں کیوں ایسے اعزاز پر شدت کے حالات پیدا کرنے ہیں۔ "اگر اس نے شدت کی" اظہار یہ ہے کہ جب اسلم صاحب سے ہمارے ہی دوست اعزاز کے ملنے کے بعد ملیں گے تو وہ کہیں گے کہ لوگوں نے اس میں ٹکراؤ پیدا کیا، اسی لئے ہمیں کیوں اس بات پر ٹکراؤ پیدا کرنا ہے۔ اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہم یہی کہیں گے کہ **"اگر اس نے شدت کی"** مطلب اسلم صاحب کو لوگ کہیں گے کہ اسی میں ٹکراؤ پیدا کیا آپ کو اعزاز لینے پر۔

"ہمارا بھی"

لیکن جب یہ اعزاز اسلم صاحب نے قبول کیا بہت سارے محلے والوں نے مبارکباد دی اور مبارکباد دینے پر انہیں تاثرات بھی بتائے کہ محلے میں آپ ہی نے غریب گھرانے کا خیال رکھا۔ اور ہم آپ کے لئے بہت ہی دعا کرتے ہیں اور مبارک باد کہتے ہیں اور اسی لئے ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ **"ہمارا بھی"**، مطلب ہماری بھی مبارکباد قبول کرنا۔ ہمیں نہیں بھولنا ہم آپ کے ساتھ ہیں اسی لئے ہم پھر یہ الفاظ کہہ کر آپ کو مبارکباد دے کو کہہ رہے ہیں کہ "ہمارا بھی" قبول کرنا۔

"تو آخر زور"

جب محلے والوں کے بہت سے دوستوں نے اسلم صاحب کے اعزاز پر خوشی کا اظہار کیا تو انہوں نے تخمینہ لگایا کہ کتنے لوگوں نے اسلم صاحب کے اعزاز پر مبارکباد دی اور کتنے لوگوں نے مبارکباد نہیں دی۔ میں نے پہلے ہی بیان کیا کہ لوگوں نے اس اعزاز پر شدت کا ماحول

دوستوں میں پیدا کیا۔ لوگوں نے شدت کا ماحول ترک کر کے مبارکباد کے ہی خیالات میں رہے۔ لیکن دونوں کی رائے سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ آخر زور انہی کا رہا جنہوں نے اس کام پر اسلم صاحب کو اعزاز دیا اور انہی کی اکثریت دیکھنے میں آئی۔ اسی لئے ہم ان دوستوں اور ان لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ آخر کار سبھی نے اسلم صاحب کے کام پر اچھا ردعمل ظاہر کیا ہے اور اسی لئے ہم کہہ رہے ہیں کہ **''تو آخر زور''** انہیں کا رہا جنہوں نے **اسلم صاحب کو اعزاز دینے کا** وعدہ کیا۔

''چلتا ہے گریباں پر''

جب اسلم صاحب نے اعزاز قبول کیا اور قبول کرنے کے بعد گھر واپس چلے گئے تو ان کے فرزند نے انہیں کہا کہ آپ کے ہاتھ میں لگتا ہے کوئی اعزاز ہے۔ اسلم صاحب نے اپنے فرزند کو دلیل سے واقف کرایا۔ دلیل سن کر اسلم صاحب کا فرزند بہت ہی خوش ہوا اور اعزاز دیکھ کر اور اعزاز کا نام پڑھتے ہوئے یہ تاثرات بیان کئے کہ آج کل انہی کو اعزاز سے نوازا جاتا ہے جو اعزاز دینے والے کا گریباں پکڑتا ہے۔ مطلب خوش آمدید یا کسی طریقے سے اعزاز دینے والوں کو رشوت کے طریقے سے خوش کراتا ہے۔ پھر اعزاز سے نوازا جاتا ہے لیکن یہ پہلا موقع میں نے دیکھا اور پہلی بار ایسا دیکھا کہ محلے والوں نے اور کئی دوستوں نے آپ کے کام کا احترام کر کے اعزاز سے نوازا۔ ورنہ **''چلتا ہے گریباں پر''** مطلب انہی کو اعزاز سے نوازا جاتا ہے جن کو بہت سے اراکین جانتے ہیں اور ان کی جان پہچان کے لئے اعزاز سے نوازا جاتا ہے وہ کام سے وابستہ نہیں بلکہ وہ فرد کے اثر ورسوخ پر ہی اعزاز سے نوازتے ہیں اسی لئے اعزاز پڑھتے ہوئے میں اس بات سے واقف کراتا ہوں کہ **''چلتا ہے گریباں پر''** مطلب آپ نے کسی کا گریباں نہیں پکڑا اور گریباں پکڑنے کے بغیر ہی آپ کو اعزاز سے نوازا گیا۔

اگر میں اس مضمون کا عنوان تشکیل دے کر یہ لکھوں ''آج کل کا اعزاز'' یا ''اسلم صاحب

کی غیر حاضری'' یا ''لرزتا ہے'' مطلب بہت سے عنوان اس نثر پر لکھ سکتے ہیں۔

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

اے معشوق میں ہر ایک دن اپنے طریقے سے آپ کا دیدار کرنا چاہتا ہوں لیکن دیدار ہوتا ہی نہیں حتیٰ کہ میں نے بہت کوشش کی۔ اب میں نے چلتے ہوئے نشاں راستے میں دیکھے لیکن ان نشانوں کو بھی میں نے نہیں پایا۔ مطلب جب آپ گھر سے باہر جائیں گے تو ضرور پاؤں کے نشان کوچے پر یا سڑک پر دیکھنے میں آئیں گے۔ نشانوں کو میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایسا اندازہ لگا کر میں نے سوچا کہ جو بھی کوئی آج کل محبت کرتا ہے تو وہ ان نشانوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے، لیکن مجھے ایسے نشان دیکھنے میں نہیں آئے۔ اور ان نشانوں کو نہ پا کر میں یہ کہنے لگا کہ یہ بدگمانی ہے، مطلب اگر میں گزرتا ہوں آپ کے نشان نہیں پاتا ہوں نہ دیکھتا ہوں تو میں یہ کہتا ہوں کہ ایسے خیالات کبھی نہیں دل میں رکھنے چاہئے۔ جس کو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ بد گمانی کا جامہ تصور کیا جاتا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

شاعر فرماتے ہیں کہ جب میں نے آپ کے نشان سڑک پر بھی نہیں دیکھے اور ان نشانوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ نہ میں نے آپ کو کوئی اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور نہ میں نے آپ کو باہر جا کر کبھی نہیں دیکھا۔ ایسے حالات گزرتے ہوئے شاعر فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں آپ کی تحقیق کے لئے سخنور ہونا چاہئے۔ جن کو کوئی کام نہ ہو اور آپ کے دوستانہ تعلقات کے لئے اپنے تاثرات لکھیں مطلب ان آدمیوں کو میں سخنور کے نام سے پکاروں گا۔ لیکن اے معشوق ان سخنوروں کا مشورہ بھی لینا چاہتا ہوں تو وہ بھی آپ کو یہ کہیں گے کہ غالب کا انداز بیان ضرور دیکھنا جس سے کہ اے معشوق آپ کو کشش پیدا ہو سکتی ہے اور آپ خود بخود میرے سامنے محبت

کا جامہ پہناؤ گے لیکن غالب فرماتے ہیں کہ ان باتوں سے بھی معشوق میں کوئی دوستانہ تعلقات نہیں رہیں گے۔

لفظ غالب کے بیان کے حوالے سے اپنے خیالات بتاؤں تو میں پہلے یہ کہوں گا کہ غزل کے مطلع میں شاعر نے یہ بیان کیا ہے کہ میں نے محبوب کے ساتھ کوئی اشارہ بازی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ میں نے اس کے نشان سڑک پر دیکھے، پھر بھی ایسے نشان دیکھنے کے لئے میرے دل میں بدگمانی پیدا ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی میں ایسی سوچ میں کامیاب نہیں ہوا۔ تبھی تو غالب فرماتے ہیں کہ آپ کی دلیلوں پر آپ کے ہجر پر سخنور ہی محبت کر سکتا ہے۔ جس آدمی کو فرصت ہوگی وہی آدمی آپ کے ایسے نظر بیان پر تحقیق کر سکتا ہے۔ میں کوئی سخنور نہیں ہوں لیکن جو کوئی آپ کی محبت کے لئے سخنور پیدا ہوگا اس سے یہ کہیں گے کہ غالب کا ہے انداز بیان اور۔ مطلب میرے لحاظ سے فتحیابی اسی کی ہوگی جو آپ کے ساتھ محبت کرے گا۔ جس کو آپ کے ہر ایک نشان یا آپ کے اشارے سے واقفیت ہوگی۔ وہی محبت کرنے والا آپ کے ساتھ محبت کرنے میں فتحیاب ہو سکتا ہے۔

ہے بسکہ ہر اک + انکے اشارے میں نشاں اور = ہے بسکہ ہر اک انکے اشارے میں نشاں اور

کرتے ہیں محبت + تو گزرتا ہے گماں اور = کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

ہیں اور بھی دنیا + میں سخنور بہت اچھے = ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا + ہے اندازِ بیاں اور = کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

"ہے بسکہ ہر اک"

کئی دن گزرنے پر بھی ایک فوجی جوان نے اپنے گھر والوں کو کوئی خط نہیں بھیجا۔ اس کے گھر والے ہر روز خط کے لئے پریشان رہے۔ پریشانی اس بات کی کہ فوجی جوان کا پتہ ہی نہیں کہ آخر وہ اپنی حاضری یا اپنی حفاظت کہاں کر رہا ہے۔ یہ تصور اپنے دل میں رکھتے ہوئے فوجی جوان کی بیوی نے سوچا کہ معلوم نہیں میرے خاوند نے کن وجوہات سے خط لکھنا چھوڑ

دیا۔مطلب اپنے اہل وعیال کا خیال ہی نہ رکھا۔فوجی جوان کی بیوی نے یہ کہا کہ میں اسی کی وجہ سے ایک کام کرتی ہوں مطلب وہی میرے گھر کی دیکھ بھال کرتا ہے، ہر طرح سے وہ میرے گھر کا چراغ ہے۔ ان کی تعریف کرتے ہوئے میں یہ کہہ کر پکارتی ہوں کہ **"ہے بسکہ ہراک"** مطلب میری ہر ایک چیز کا وہی مالک ہے۔اسی لئے میں ہر دفعہ یہ کہہ رہی ہوں کہ **"ہے بسکہ ہراک"**

"ان کے اشارے میں نشاں اور"

چھ مہینے گزرنے پر بھی فوجی جوان کا کوئی خط موصول ہی نہیں ہوا۔ یہ سوچتے ہوئے فوجی جوان کی بیوی کو بہت سے شکوک پیدا ہونے لگے۔وہ اس سوچ میں ڈوبنے لگی شاید اپنے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے وہ چل بسے اور مجھے دھوکہ دینے والا ہے۔بیوی کہنے لگی مجھے پورا بھروسہ ہے کہ وہ کسی غیر عورت کے اشارے پر نہیں چلنے والا مرد ہے۔نہ ان کے نشاں کو تسلیم کرے گا۔یہ سوچتے ہوئے یہی کہنے لگی اپنے خاوند کے اشارے میں **"ان کے اشارے میں نشاں اور"** مطلب میرا خاوند کسی غیر عورت کے ساتھ بھاگنے والا نہیں ہے۔جس طرح وہ حفاظت کا کام سرحد پر دے رہا ہے اسی طرح سے وہ میری نگاہیں بھی اپنی نگاہوں کے ساتھ ملا کر سرحد کی حفاظت کر رہا ہے لیکن معلوم نہیں "ان کے اشارے میں نشاں اور" یہ بھی ممکن ہے کہ دشمن کے اشارے میں نشاں اور مطلب دشمن کے اشاروں کو دیکھ کر وہ سرحد پر نشاں ان کے دیکھتا ہوگا۔جس سے کہ اس کو چھ مہینے تک فرصت ہی نہیں ملی خط لکھنے کی۔اسی لئے میں اس بات کو اختتام پذیر کرتی ہوں وہ یہ **"ان کے اشارے میں نشاں اور"**

"کرتے ہیں محبت"

ایسی سوچ میں ڈوب کر فوجی جوان کی بیوی کہنے لگی کہ وہ دشمن کی حرکتوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے اپنے فرائض سرحد پر انجام دے رہا ہے۔اسی لئے میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ اس کو میرے ساتھ محبت ہے **"کرتے ہیں محبت"** کیوں کہ وہ میرے ساتھ بھی محبت کرتے ہیں

اور ملک سے محبت کرتے ہوئے وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ اسی لئے میں یہ کہتی ہوں کہ

''کرتے ہیں محبت''

''تو گزرتا ہے گماں اور''

فوجی جوان اپنی سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے اپنا وقت گزارتا ہے۔ ملک سے وفاداری کرتے ہوئے وقت گزارتا ہے۔ مطلب وہ ملک کی وفاداری کے لئے دن رات مصروف ہے اور اپنی مصروفیت گھر کے ماحول پر نہیں مرکوز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھ مہینے تک انہیں گھر کے ماحول کا معلوم ہی نہیں، کوئی خط وکتابت ہے ہی نہیں۔ لیکن انہیں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے فوجی جوان اپنا وقت گزارتا ہے اور گماں ہے کہ اس سے کوئی بھی تعلق کسی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ سرحد کے ساتھ ہے۔ سرحد پر دشمن کی نگاہوں کو دیکھ کر ان کے ارادوں کو مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ تو ہم فوجی جوان کی بیوی کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ **''تو گزرتا ہے گماں اور''**

''ہیں اور بھی دنیا''

جب فوجی جوان نے چھ مہینے تک کوئی خط ہی اپنی بیوی کو نہیں لکھا تو بیوی نے سوچا کہ مجھے گھر کی دیکھ بھال کرنی لازم ہے۔ اخراجات بھی گھر کے بڑھنے لگے ہیں کیوں نہ میں ان کے اخراجات سے دور ہوں مطلب ان کی ماہانہ تنخواہ پر بھروسہ نہ کر کے، گھر کے اخراجات خود محنت کر کے اٹھاؤں۔ اسی لئے ان کے بغیر ہی میں یہ کہوں **''ہیں اور بھی دنیا''** مطلب اگر میں پڑھی لکھی فوجی جوان کی بیوی ہوں تو مجھے کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جس سے میں اپنے بچوں کو پال سکوں اور ان کی پرورش کر سکوں۔ مانتی ہوں کہ میرا خاوند مجھے ماہانہ تنخواہ بھیجتا ہے لیکن میں اس ماہانہ تنخواہ پر زیادہ اعتبار نہیں کرتی۔ اسی لئے فوجی جوان کی بیوی سوچتے ہوئے یہ کہنے لگی ''ہیں اور بھی دنیا'' مطلب مجھے کسی اور کام میں اپنے آپ کو مصروف کرنا چاہئے جس سے کہ میں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر سکوں۔ اسی لئے میں یہ کہہ کر اپنی سوچ کو اختتام تک پہنچاتی ہوں کہ **''ہیں اور بھی دنیا''**

”میں سخنور بہت اچھے“

جب فوجی جوان کی بیوی نے یہ سوچا کہ اس کا خاوند سرحد پر دشمن سے ملک کی حفاظت کرنے میں مصروف ہے تو وہ سوچنے لگی کہ مجھے اس کے بل بوتے پر جینا نہیں چاہیئے، صرف اپنا چال چلن سماج میں اچھا رکھنا ہے۔ کئی رشتہ دار بیوی کے پاس آنے لگے اور کہنے لگے کہ کیا کوئی خط موصول ہوا، عورت کہنے لگی کہ چھ مہینے سے زائد کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ اسی طرح سے بیوی کے پاس بہت سے لوگ رشتہ دار آنے لگے اور اپنے اپنے تاثرات کہنے لگے۔ مطلب اب فوجی جوان کی بیوی یہ کہنے لگی کہ اب میرے پاس سخنوروں کی حاضری دن میں دیکھنے میں آتی ہے مطلب جب انہیں کوئی کام ہی نہیں تو مجھ سے پوچھ تاچھ کے لئے روز آتے ہیں۔ یہ نہیں پوچھتے کہ مالی حالت اچھے ہیں یا نہیں بلکہ صرف باتوں سے ہمدردی جتاتے ہیں نا کہ ہاتھوں سے۔ مانتی ہوں کہ آج کل بلا تاخیر ماہانہ تنخواہ موصول ہوتی ہے لیکن گھر کے اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے تنخواہ سے اہل وعیال کا گزارہ نہیں ہوتا۔ اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے اور بھی مالی تعاون ہونا چاہیئے، لیکن میں نے سبھی رشتہ داروں میں یہ پایا کہ وہ باتوں سے ہمدردی دکھاتے ہیں اور ہاتھوں سے دور رہتے ہیں اسی لئے میں انہیں یہ کہہ کر اس لفظ سے پکارتی ہوں کہ وہ سخنور ہیں۔ مطلب وہ صرف باتیں کرتے ہیں اور ہاتھوں سے پیچھے رہتے ہیں۔ اب میں یہی کہہ رہی ہوں کہ ”میں سخنور بہت اچھے“ مطلب سوچتی ہوں میں بھی اپنی سوچ میں سخنور کا کام انجام دیتی ہوں تب میں کہہ رہی ہوں کہ **”میں سخنور بہت اچھے“**

”کہتے ہیں کہ غالبؔ کا“

بہت دِنوں کے بعد ایسا ماحول دیکھتے ہوئے فوجی جوان کی بیوی کہنے لگی کہ معلوم نہیں کہ میرے خاوند دشمن کے گرفت میں آکر اس دنیا سے دور ہوئے لیکن بس اس انداز میں بھی اب سوچتی ہوں بہت لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا خاوند بہادر ہے۔ بہادر ہونے کے ناطے وہ اگر دشمن کے ساتھ لڑائی بھی کریں تو وہ فتح ہو سکتا ہے اور دشمن کے ارادے کو مسمار کر سکتا ہے، یہ بھی لوگ

کہنے لگے وہ غالب ہے مطلب وہ فتح کرسکتا ہے لیکن میں ان باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتی ہوں۔ یہ سب کچھ حال خدا کو ہی معلوم ہے کیونکہ میں گھر میں بیٹھی ہوں اور میرا خاوند کسی سرحد پر اپنی حاضری دے رہا ہوگا۔ تبھی تو میں یہ تسلیم نہیں کرسکتی ہوں " **کہتے ہیں کہ غالب کا**" مطلب میرا خاوند فتح کرنے والا ہے۔

"ہے اندازِ بیاں اور"

جب ایسے خیالات فوجی جوان کی بیوی کو ابھرے لیکن سب سوچ بالکل الگ رہی، جب فوجی جوان کی بیوی نے یہ سنا کہ بہت سے فوجی جوان سرحدوں پر دشمن کی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے اپنے ملک سے وفاداری کے تئیں سرحد پر اپنا کام انجام دیتے ہیں مطلب وہ دشمن کی حرکتوں کو لمحہ لمحہ دیکھنے میں مصروف ہیں۔ اسی لئے " **ہے اندازِ بیاں اور**" مطلب کسی بھی جوان کا ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہے کون کس طریقے سے اپنے ملک کیلئے سرحد پر ملک سے وفاداری کے لئے کام انجام دیتے ہیں۔ معلوم نہیں دشمنوں کی حرکتوں اور ان کے ارادوں سے اس دنیا میں جاں بحق ہوئے۔ مطلب وہ ملک کی وفاداری کیلئے شہید تو نہیں ہوئے یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے۔ تبھی تو بہت سارے جوانوں کے گھر والوں کو خط موصول نہیں ہوئے، لیکن یہ سن کر فوجی جوان کی بیوی کہنے لگی اب میں یہ سن کر شک میں مبتلا ہوئی۔ جب یہ باتیں فوجی جوان کی بیوی پر اثر انداز ہوئیں تو وہ کہنے لگی کہ " **ہے اندازِ بیاں اور**"

اگر میں اس کہانی کو عنوان کے ضمن میں لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ "**شکوک پورے نہیں**" یا " **ہے اندازِ بیاں اور**"

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

شاعر فرماتے ہیں بہت دنوں تک میں یہ سوچتا رہا کہ معشوق کے ساتھ میری ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ پھر میں نے دن گننا شروع کیے اور دن گنتے ہوئے میں اس بات پر پہنچا

کہ کسی نہ کسی دن میں ضرور ان کا دیدار کروں گا۔ کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ آج کے دن ضرور ان سے ملاقات ہو ہی جائے گی۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ لازم تھا۔ مطلب معشوق کو ضروری مجھے کسی نہ کسی بات سے واقف کرنا تھا لیکن دن گزرنے کے بعد بھی دیدار ہی نہیں ہوا۔ نہ ملاقات ہوئی۔ تبھی تو میں الگ سوچتا ہوں اور کہتا ہوں کہ سوچتے ہوئے میں تنہائی میں بیٹھا ہوں اور تنہائی میں بیٹھ کر ایسی باتیں سوچتا ہوں کہ معشوق کا دیدار ضرور کروں گا، لیکن میں نے ابھی تک کوئی دیدار ہی نہیں کیا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ کتنے دن تک میں تنہا رہوں جبکہ میں نے تنہائی میں دن بھی گزارے ہیں اور دن گزارتے ہوئے یہ کہنے لگا کہ کسی نہ کسی دن مجھے لازماً ملنا تھا۔

ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

شاعر فرما رہے ہیں کہ جب میں نے لازم لفظ استعمال کیا مطلب میں نے یہ سوچا کہ محبوب کو ضرور مجھے ملنا تھا اور راستے میں کئی دن تک انتظار کرتے ہوئے وہ لازم لفظ ہی معطل ہوا۔ مطلب ملاقات ہی نہیں ہوئی میں تنہائی میں رہا۔ اب لوگ مجھے جب راستے میں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غالب صاحب وہ لازماً لفظ کہاں۔ آپ کی قسمت میں ان کے ساتھ ملاقات ہی نہیں تھی اور یہ بھی کہہ رہے ہیں غالب آپ تنہائی میں ہی زندگی بسر کرتے ہو۔ آپ کی قسمت میں معشوق کا دیدار ہی نہیں، ملنساری ہی نہیں۔ مجھے یہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ جب آپ دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے تو کیا اس وقت آپ کا معشوق آپ کی قبر پر حاضری دے گا یا نہیں۔ جب میں نے لوگوں کے تاثرات سنے تو میں کہنے لگا کہ اے معشوق میری قسمت میں آپ کے ساتھ کوئی بھی ملاقات نہیں کیا۔ میرے مرنے کے بعد میری تمناؤں کو آپ زندہ رکھو گی اور یاد کرو گی۔ جب کہ اتنا عرصہ ہوا آپ کے ساتھ وصل ہی نہیں ہوا اور میں ہجر میں اپنی زندگی بسر کرتے ہوئے دن گنتا ہوں۔ اور دن گنتے ہوئے آپ کو میری محبت پر احساس ہی

نہیں ہو رہا ہے۔

اگر میں مقطع کو لفظ غالب کے انداز میں بیان کروں تو میں کہوں گا جب کئی دن تک، کئی سال تک غالب کی ملاقات معشوق سے نہیں ہوئی۔ وہ بہادری کی صفت سے دور رہا اور محسوس نہیں کیا کہ مجھے معشوق دغا دے رہی ہے۔ اس دغا کو دور کیا اور دور کرتے ہوئے شاعر سوچنے لگا کہ میں اپنی قسمت پر بیزار ہوں۔ جب میری قسمت ساتھ دے گی تو میں ضرور معشوق کے سے ملاقات کروں گا کیوں میں اپنی زندگی معشوق کے لئے نادان بن کر بتلا کروں گا۔ مجھے اپنی زندگی کو نادانی میں مبتلا نہیں کرنی چاہئے۔ مجھے بہادری سے اپنی زندگی تنہائی میں گزارنی چاہئے اور تنہائی میں رہ کر میں معشوق کو فتح کرسکتا ہوں اور میں تنہائی سے نادانی تسلیم نہیں کروں گا۔ نادانی تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے دانائی کو فتح کروں گا اور نادانی کو نیست و نابود کروں گا۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا + رستا کوئی دن اور	=	لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں + اب رہو تنہا کوئی دن اور	=	تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ + کیوں جیتے ہیں غالبؔ	=	ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے + کی تمنا کوئی دن اور	=	قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

''لازم تھا کہ دیکھو مرا''

دنیا میں لفظ لازم کا سبھی احترام کرتے ہیں۔ اسکولوں میں استاد طلباء کو پڑھاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ مضمون پڑھنا لازم ہے۔ اگر ہم سرکاری دفاتر میں جائیں گے تو وہاں پر بھی افسر لوگ اپنے ماتحتوں کو کئی باتوں پر یہ دباؤ ڈالتے ہیں کہ کام کرنا لازم ہے یا راستے میں ہم جس طرف چلتے ہیں قانونی طور پر ہمیں اسی طرف چلنا ہے جس راستے پر قانون نے اجازت دی ہے تاکہ چلتے ہوئے کسی حادثہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اسی لئے لفظ لازم ضروری ہے۔ جب لازم لفظ نے اپنی قوت دیکھی تو وہ یہ کہنے لگا کہ مجھے ہر جگہ عزت و احترام ہے لیکن جب زیادہ

احترام لفظ لازم میں دیکھا تو لوگوں میں بھی یہ احساس پیدا ہوا کہ جمہوری طرز میں لوگوں نے لازم کو معمولی وقعت دی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھا کہ اگر ہم قانون کے دائرے میں کام نہیں کریں گے اور لفظ لازم کو دائرے میں استعمال کرتے ہیں تو سرعام کئی قتل وغارت کے امکان ہیں۔اسی لئے طرز جمہور میں بھی، شخصی راج میں بھی لازم کی وقعت اہم ہے۔

جب لفظ لازم کے دائرے میں کسی ایک نے کسی کے ساتھ کاروبار کیا تو کاروبار کرتے ہوئے ان کو تجارت میں نفع ہونے لگا لیکن شراکت کے ماحول میں لازم نے ایک گروہ کو بددیانتی کے خیالات پیدا ہونے لگے اور انہوں نے پیسوں کو خرد برد کیا۔جس کی وجہ سے دوسرے افراد کو نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔یہ سوچتے ہوئے کہنے لگے کہ لازماً ان کو ہمیں نفع سے واقف کرنا تھا لیکن نہ کیا۔حرف لازم دیکھتا رہا، اور لازم کو محسوس ہوا کہ اب مجھے لازم لفظ کے انداز میں نہیں دیکھتے ہیں۔مجھے مرا ہوا لفظ کی شراکت میں دیکھتے ہیں۔اسی لئے لازم سوچنے لگا کہ اب مجھے شراکت میں دوسرے شریک یہ کہیں گے کہ وہاں لازم لفظ رہا لیکن ہم اس کا تصور یہ کریں گے ''لازم تھا کہ دیکھو مرا'' مطلب بہت ضروری تھا کہ ہم لازم کو زندہ دیکھتے لیکن شراکت میں گھپلا ہونے پر ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ''لازم تھا کہ دیکھو مرا'' مطلب تقسیم محنت کے برابر ہونی چاہئے تھی لیکن برابری نہیں کی گئی۔اس کے برعکس لازم کے لفظ کو الگ کر کے کہتے ہیں کہ ''لازم تھا کہ دیکھو مرا''

''رستا کوئی دن اور''

جن شریکوں کو اپنے نفع سے الگ کیا گیا اور جن شریکوں نے نفع کو اپنی تحویل میں لے لیا اور دوسرے شریکوں نے نقصان کا سامنا کیا۔اب وہ نفع والے شریک کو کہنے لگے آپ نے لفظ لازم کو دفنایا جس سے کہ آپ نے نفع کو اپنی تحویل میں لے کر ہمیں نقصان میں رکھا۔ہمیں محسوس ہوا کہ آپ ہمیں کسی اور راستے میں پہنچانا چاہتے ہیں اور کئی دنوں کے بعد آپ جدائی حاصل کرنا چاہتے ہو۔یہ سن کر نفع والے شریکوں نے کہا کہ ہاں ہم لفظ لازم کو دفناتے ہیں

کیوں کہ آپ لفظ لازم کے کپڑے پہنتے ہو ہم ان کپڑوں کو پسند نہیں کرتے۔اسی لئے ہم آپ کو دعویٰ سے یہ کہتے ہیں کہ ''رستا کوئی دن اور'' مطلب آپ کو ہم سے دور ہونا چاہئے جس سے کہ آپ وہیں لازم کی پوشاک پہنو گے اور نفع اسی طریقے سے حاصل کر سکتے ہو۔اسی لئے ہم اس لفظ پر ڈٹے ہوئے ہیں ''رستا کوئی دن اور''

''تنہا گئے کیوں''

جب نقصان والے شریکوں کو یہ معلوم ہوا کہ نفع والے شریک لازم کی پوشاک نہیں پہنتے ہیں اور ہمیں نقصان میں غرق کرنا چاہتے ہیں تو پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ ہم لازم کی پوشاک پہنتے ہیں اور لازم کا جھنڈا بلند کرتے ہیں۔اسی لئے ہمیں ان کے ساتھ تنہا ہی رہنا ہے اور تنہائی میں زندگی بسر کرنی ہے۔جب تنہائی میں ہم زندگی بسر کریں گے وہاں پر دوسری تجارت کرنے کا ارادہ رکھیں گے اور لازم کے پرچم کو ہم اس تجارت میں لہرائیں گے تو پھر سبھی نے اس بات پر اتفاق کیا۔اور نقصان والے شریک اب لازم کا پرچم بلند کیا اور نیا کاروبار کرنے کا آغاز کیا۔لازم کا پرچم لہراتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ ''تنہا گئے کیوں''

''اب رہو تنہا کوئی دن اور''

جب نقصان والے شریکوں نے لازم کا پرچم لہرایا تو کہنے لگے کہ تنہا گئے کیوں، ہم نئی تجارت کو اپناتے ہوئے اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ہم تنہا گئے کیوں کہ شریک ہونے کے ناطے ہمیں دوسرے شریکوں نے نفع نہیں دکھایا بلکہ نقصان دکھایا۔جس سے ہمیں مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔انہیں لازم تھا کہ سچائی سے ہمیں واقف کراتے۔ان کے دلوں میں میل پیدا ہونے لگا جس کی وجہ سے انہوں نے لازم کا پرچم نیست و نابود کیا۔اسی لئے ہم تنہا ہی نیا کاروبار شروع کر رہے ہیں اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے پاس لازم کا پرچم ہے۔اور لازم کا لفظ یہ ہے کہ ہمیں جو کوئی بھی نفع حاصل ہو ہر ایک کو اس سے واقف کر کے ان میں بانٹنا ضروری ہے۔مطلب ہم لازم کا پرچم اپناتے ہیں۔جب کاروبار میں مست رہتے

ہوئے کسی ایک کے دل میں میل پیدا ہونے لگے مطلب وہ کہنے لگے کہ میں ایک امیر آدمی ہوں میں کیوں اپنی تجارت کو شراکت میں ڈالوں۔ کیوں نہ میں اپنی تجارت کو تنہا ہی کروں۔ سوچتے ہوئے اس آدمی نے لازم کا پرچم لہرانے سے انکار کیا۔ جس دن تجارت میں اس آدمی کو لازم کا پرچم لہرانا تھا اس دن اس نے لازم کا پرچم نہیں لہرایا۔ وہ دوسرے شریکوں سے یہ کہنے لگا کہ میں تنہا اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں اس پرچم کو تسلیم نہیں کرتا ہوں۔ میں امیر گھرانے کا آدمی ہوں میں اپنا کاروبار اا الگ کرنا چاہتا ہوں جب دوسروں نے سنا تو انہوں نے یہ کہا کہ **''اب رہو تنہا کوئی دن اور''** مطلب جب آپ الگ کاروبار کرنا چاہتے ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم آپ کو لازم کا پرچم لہرانے کو کبھی نہیں کہیں گے اور آپ ہمارے دائرے سے باہر ہوگئے۔ اسی لئے ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ **''اب رہو تنہا کوئی دن اور''**

''ناداں ہو جو کہتے ہو کہ''

آدمی نے ان کے ساتھ شراکت الگ کر کے اپنا کاروبار شروع کیا اور اس نے بہت سے ملازموں کو بھرتی کیا۔ اور وہ ملازم اپنا کام انجام دیتے رہے۔ وقت ایسا آیا کہ ملازموں نے لازم کا پرچم پسند کیا۔ کیوں کہ وہاں پر ملازموں نے یہ دیکھا کہ وہاں ہر ایک ملازم کو سہولیات مہیہ ہے لازم کے پرچم کے تحت، مطلب وہ اُس دن تعطیل بھی دیتے ہیں جس دن تعطیل ہونی چاہئے۔ اس کے برعکس امیر آدمی مہینے بھر کام میں مصروف رکھتا ہے اور قانونی تعطیل سے محروم رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ آدمی لازم کا پرچم نہیں لہراتا ہے۔ اسی لئے لازم کے پرچم کو عزت فراہم کرنے کے لئے ہم اس کے ساتھ ناطہ توڑتے ہیں۔ جب ملازموں نے اس آدمی کی ملازمت چھوڑی اس نے یہ کہا کہ اے ملازم بھائیوں آپ نے مجھ سے ناطہ کیوں توڑا۔ تو ملازموں نے یہ کہا کہ آپ نے لازم کا پرچم اس شراکت میں نہیں لہرایا جس کی وجہ سے ہم آپ کے ساتھ تعلقات الگ کر کے کام نہیں کرتے ہیں۔ جب امیر آدمی نے یہ باتیں سنیں تو وہ

سوچنے لگا کہ میں ان شریک بندوں کو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ لازم کا پرچم غلط طریقے سے لہراتے ہیں۔اب مجھے احساس ہونے لگا کہ لازم کا پرچم ضروری لہرانا ہے۔اب میری تجارت ٹھپ ہوکر رہ جائے گی۔ مطلب جب ملازم ہی بھاگ جائیں گے تو تنہا تجارت کیسے کروں گا۔اسی لئے میں خود ہی کہتا ہوں ''ناداں ہو جو کہتے ہو کہ'' مطلب میں دانا نہیں ہوں۔ جس وقت میں ان سے الگ ہو گیا تو مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ لازم کا پرچم ضروری لہرانا ہے اسی لئے مجھے جب وہ دیکھیں گے کہ تجارت میں نقصان ہوا اور کاروبار ٹھپ ہوکر رہ گیا تو ضرور کہیں گے کہ ''ناداں ہو جو کہتے ہو کہ'' اسی لئے میں ان کے ساتھ اب پھر ناطہ جوڑنا چاہتا ہوں۔

''کیوں جیتے ہیں غالب''

بہت دنوں تک جب امیر آدمی نے کوئی کاروبار نہیں کیا تو اس کی مالی حالت بہت ہی بدترین ہوگئی۔ مطلب وہ غریبی کی حالت میں مبتلا ہوا۔ جس کی وجہ سے وہ ان شریک والوں کے یہاں بطور نوکر ملازمت کرنے لگا لیکن پہلے انہوں نے اسے ملازمت فراہم نہیں کی۔ بعد میں ان سبھی نے مشورہ کیا کہ امیر آدمی کی حالت بری ہے اور جس کی وجہ سے اسے ہم وہ کام کرنے کو کہیں گے جس پر اس نے ہماری عزت ملیامیٹ کی۔ وہ یہ کہ اسے ہر صبح ہمیشہ لازم کا پرچم لہرانا ہے اور لازم کے پرچم کا احترام کرنا ہے۔ جس سے کہ امیر آدمی کو احساس ہو جائے کہ لازم کے پرچم میں کتنا احترام ہے۔ جب اس نے اپنا کام کیا تو لازم کا پرچم لہراتے ہوئے یہ کہنے لگا کہ '' کیوں جیتے ہیں غالب'' مطلب مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس پرچم میں کونسی فتحیابی تھی کہ جس میں آپ کا لہرانے کا کام کروں۔ مجھے لازم کا احترام کرنا چاہئے۔ اسی لئے میں نے پرچم کا احترام نہیں کیا اب میں آپ کی ضد سے بہت ہی متاثر رہا ہوں کہ آپ کے پرچم میں جیت ہے اور جیت جانے کی وجہ سے آپ بہادر ہو۔ بہادری سے آپ کو فتحیابی حاصل ہوئی ہے۔ مطلب لہراتے ہوئے مجھے احساس ہوتا ہے کہ فتحیابی لازم کے پرچم میں ہی ہے۔ اگر میں نے اس پرچم کا احترام اپنے کاروبار میں کیا ہوتا تو میں آج غربت میں زندگی

نہیں گزارتا۔ اسی لئے میں یہ کہہ کر اس بات کو اختتام کے مرحلہ تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ

''کیوں جیتے ہیں غالبؔ''

''قسمت میں ہے مرنے''

جب امیر آدمی نے ان شریکوں کی حالت دیکھی جواُن سے بھی خستہ حالت میں تھے۔ اب ان کی معاشی حالت بہترین دیکھی۔ یہ دیکھ کر امیر آدمی سوچنے لگا کہ صرف میں لازم کا پرچم لہراتا ہوں اور لہراتے ہوئے میں اپنی قسمت پر روتا روتے ہوئے یہ کہہ رہا ہوں کہ **''قسمت میں ہے مرنے''** لیکن میری قسمت ہی ایسی رہی کہ میں نے احترام نہیں کیا۔ مجھے ان شریکوں کا بھی احترام کرنا چاہئے جن شریکوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ہمیں لازم کا پرچم برقرار رکھنے کے لئے آپس میں تعاون کرنا چاہئے۔ میں نے پہلے ان شریکوں کو بھی مشورہ دیا جنہوں نے نقصان والے شریکوں کو دیا۔ وہ بھی میرے لئے برے دن رہے۔ اب جبکہ نقصان والے شریکوں نے میرا احترام کیا لیکن میں نے لازم کے پرچم کا احترام نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے میں یہ سوچتا ہوں **''قسمت میں ہے مرنے''**۔ اب میری قسمت اور مستقبل اسی پرچم کو لہرانے کے لئے ہے۔ اور اسی پرچم کے لہرانے پر مجھے دن کی اجرت ملتی ہے اور گھر کا گزارہ کرتا ہوں۔

''کی تمنا کوئی دن اور''

جب امیر آدمی نے لازم کا پرچم لہرایا تو اپنی حالت کو سدھار نہیں سکا جس کی وجہ سے گھر کے اخراجات میں اتار چڑھاؤ آیا۔ اب اس بات کا بھی احساس ہونے لگا کہ میری خواہش یہ رہی کہ میں دنیا کا سب سے بڑا امیر بن جاؤں لیکن میں دنیا کا سب سے بڑا امیر نہ بن سکا۔ وہ اس لئے کہ میں نے لازم کا پرچم الگ کیا۔ لازم کے پرچم کا اگر میں احترام کرتا تو میری سب خواہشیں امیری کی پوری ہوتیں، مطلب لازم کے پرچم میں اتنا غرور اور اتنی طاقت ہے کہ اس نے میری خواہشوں کو برباد کیا۔ اور میری امیری کو غربت میں بدلا۔ جس کی وجہ سے میری

تمنا ملیا میٹ ہوئی، مطلب خاک میں ملکر یہ احساس دلانے لگا کہ ''کی تمنا کوئی دن اور''
مطالب جب آپ ان باتوں سے سبق حاصل کرو گے تب آپ یہ کہو گے کہ تمنا پوری نہیں ہوئی
ہے اور اب یہ کہوں '' کی تمنا کوئی دن اور'' اب، کسی اور دن سوچ کر اپنے خیالات کو امیری میں
مرکوز کرنا چاہئے۔ اس کے باوجود بھی یہ نہیں کہتے کہ مستقبل امیری میں مبتلا ہوسکتا ہے۔
اب جبکہ اس دلیل کو عنوان کے ضمن میں لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ ''لازم تھا'' یا ''امیری یا
غریبی''

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

پہلے میں اس مطلع کے بارے میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ غالب نے زیادہ تر غزلوں میں
لفظ زخم کا استعمال کیا ہے۔ غالب کو بہت سے صدموں کا مقابلہ زندگی بھر کرنا پڑا اور ان
صدموں کا مقابلہ خود اپنی تخلیق میں بیان کرتا رہا۔ غالب کا مطلب ہے فتح کرنا جب ان
زخموں کا مقابلہ کیا اور جیت بھی حاصل ہوئی تب بھی تو تخلص غالب رکھا اور پہلے اسد کے نام
سے مشہور رہے لیکن زخموں کو دیکھ کر اسد کا نام ترک کر کے غالب کا ہی لفظ تخلص میں استعمال کیا
ہے۔ ممکن ہے غالبؔ نے اپنے معشوق کے ساتھ ملاقات کی ہوگی کیونکہ ردیف اور کافیہ میں
لفظ نمک کا استعمال کیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ نمک زخموں کے لئے بہت ہی خطرناک ہے جس
کے ڈالتے ہی درد محسوس ہوتا ہے۔ لیکن تب ہی ڈال سکتے ہیں جب تک نہ ہم نے نمک کا مزہ
چکھا ہوگا ممکن ہے غالب نے لفظ نمک کو اسی لئے اس شعر میں استعمال کیا گیا ہوگا کیونکہ شاعر
نے معشوق سے ملاقات روبرو کی ہوگی۔ پھر ملاقات کے بعد بے وفائی کا جامہ پہنا ہوگا کیونکہ
مطلع اور مقطع میں خود غالب لفظ زخم کا استعمال کر کے بتا رہا ہے وہ دن کا مطلب پڑھنے والا یہ

سمجھے گا کہ نمک کا استعمال کر کے ہی محسوس ہوا ہے کہ نمک کا مزہ کیسا ہے۔اور جب کسی آدمی نے مزہ چکھا ہوگا اور اسی مزہ کو یاد کر کے درد محسوس ہوتا ہوگا کیونکہ جب نمک میسر ہی نہیں ہوا مطلب معشوق کے ساتھ ملاقات ہی نہیں ہوئی تبھی تو بے وفائی میں زخم نمودار ہوئے۔اور درد کو کم کرنے کے لئے نمک چھڑکتے ہیں، نمک چھیڑک کر درد دو تین منٹ تک تیز محسوس ہوتا ہے۔لیکن آہستہ آہستہ درد کم محسوس کرتے ہیں۔ممکن ہے غالب نے زخم نمک کے الفاظ اس مطلع اور مقطع میں اسی لئے استعمال کئے ہیں تا کہ انہیں یاد آئے کہ معشوق کے ساتھ ملاقات ہوئی پھر بے وفائی کے جامے پہنے اور پہن کر ان الفاظ سے ہی خود بخود اس غزل کو مرتب کر کے یہ لکھا ہے کہ مجھے اس کی یاد آنے کی وجہ سے زخم نمودار ہوئے۔دوسری بات میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے صحیح طور سے نمک کا استعمال اسی لئے کیا ہے تا کہ پڑھنے والے کو محسوس ہوجائے کہ معشوق کے ساتھ ملاقات ہوئی ہے نمک چکھا ہے لیکن پھر بے وفائی میں تبدیل ہوکر ایسا نمک بازار میں نہیں ملتا۔تا کہ میں ایسے نمک کو پھر چکھوں۔اس بات کا میں دوسرا ثبوت یہ بھی دے رہا ہوں کہ غالب نے لفظ پتھر کا بھی استعمال کیا ہے۔وہ اسی لئے کہ جب کسی آدمی کو دیکھا ہوگا اس کی تصویر دل میں رکھ کر اسے پتھر کی طرح یا تصویر کی طرح اپنے پاس موجود رکھا ہے۔اسی لئے غالب نے لفظ پتھر کا بھی استعمال مقطع میں کیا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے اپنے معشوق کے ساتھ ملاقات کی ہے تبھی تو مطلع اور مقطع میں زخم، مزہ، پتھر جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔خیر میرے خیال میں پڑھنے والے یا محقق جو چاہے سمجھیں لیکن میں نے اپنے طور سے وضاحت کی۔

اب میں غزل کے مطابق ہی مفہوم بتا رہا ہوں۔

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے بے وفائی اور تنہائی سے بہت سے زخم نمودار ہوئے۔ان زخموں

کا میں علاج نہیں کرتا اور نہ ان زخموں کو چھیڑتا ہوں۔ مطلب ہاتھ نہیں لگاتا ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ معشوق نے میرے لئے یہ ایک تحفہ دیا ہے۔اب جب کسی بھی وقت مجھے درد محسوس ہوتا ہے تو میں ان زخموں پر نمک کا استعمال کر کے درد محسوس کرتا ہوں۔ پھر میں آرام سے سوتا ہوں، مطلب نمک چھڑ کنے سے چند منٹوں تک درد برقرار رہتا ہے لیکن بعد میں آرام محسوس کرتا ہوں ۔ مطلب جب بھی میں ان زخموں کو دیکھتا ہوں میں معشوق کے تحفے کے طور پر کسی اور کو نہیں دکھاتا۔ میں نے نمک کا مزہ چکھا ہے جو بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔لیکن اس سے بہتر اگر معشوق ایک پتھر کی صورت میں میرے سامنے ہوتی تو میں ان زخموں کو پتھر میں مبتلا کرتا۔اور خود دیکھتا کہ نمک چھڑ کنے سے کیا اثر ہوتا۔غالب فرماتے ہیں کہ پتھر کے پگھلنے کے بعد نمک نکلتا ہے اور کئی لوگ اس کا مزہ بھی چکھ سکتے ہیں۔تو غالب یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں روبرو اپنے معشوق سے نہیں ملتا۔ میں ایک پتھر کی صورت بن کر اس کے پاس رہتا۔کیا وہ بھی مجھے نمک کے طور پر زخموں کی مرہم پٹی کرتی، لیکن معشوق جدائی کی وجہ سے میرے زخموں سے ہی محبت کرتی ہے۔ میں یہ گذارش کرتا ہوں کہ ان زخموں کی تاب نہ لا کر وہ مجھے پتھر کی صورت میں دیکھے۔اب میں سوچتا ہوں کہ اے معشوق اگر میں پتھر ہوتا تو پتھر کی صورت میں آپ کو ان زخموں کا مزہ ضرور چکھنا تھا اگر چہ پتھروں پر زخم نہیں ہے لیکن پھر بھی کسی وقت پتھر سے ہم زخم محسوس کرتے ہیں۔ان پر نمک نہیں چھڑ کتے لیکن کیا معشوق مجھے پتھر دیکھ کر نمک چھڑ کتی لیکن پتھر ہو یا روبرو دونوں صورتوں میں زخم نمودار ہوئے لیکن معشوق ان دونوں صورتوں میں مزہ ہی نہیں لے چکی ہے۔ میں معشوق سے گذارش کرتا ہوں کہ ایسے تحفے کو بھی آپ خود قبول کریں تا کہ آپ کو یہ محسوس ہو جائے کہ زخم کیا ہوتے ہیں اور زخم کن حالات میں نمودار ہوتے ہیں۔

شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے شوق سے آپ کا مزہ چکھا اور مزہ چکھنے کے بعد پھر آپ نے اس مزہ کو الگ کرنے کے لئے بے وفائی کے جامے نمودار کئے ۔جس سے مجھ میں زخم نمودار ہوئے لیکن اے معشوق اگر مجھے مزہ چکھنے کے لئے نہیں کہتی اور میں مزہ

نہیں چکھتا تو آپ کی یاد میں یہ زخم کیسے نمودار ہوتے۔ میں مزہ چکھے بغیر نمک کا استعمال نہیں کرتا، لیکن مجھے آپ کی جدائی پر اور آپ کے ہجر پر زخم نمودار ہوئے۔ اب میں ان زخموں پر کسی وقت نمک چھڑکتا ہوں مطلب جب بھی آپ کی جدائی پر کوئی مجھے بحث ومباحثہ کرنے پر مجبور کرتا ہے تو میں ان کو یہ جواب دیتا ہوں اور میں اندر ہی اندر محسوس کرتا ہوں کہ کہنے والے میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں اور اسی لئے میں ان کو بھی زخموں سے واقفیت نہیں کراتا ہوں مطلب ایسے معشوق سے پاک محبت میں اپنے راز کو پوشیدہ رکھ کر زخموں کو برقرار رکھتا ہوں۔ ان زخموں کا مزہ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ پاک محبت میں زخم اور نمک کا استعمال کر کے معشوق اور محبوب کو قوتِ برداشت رکھنا ضروری ہے۔

اگر میں مقطع کو لفظ غالب کے ضمن میں بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ شاعر فرماتے ہیں کہ جب بھی پاکِ محبت میں تناؤ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر معشوق اور محبوب الگ تھلگ ہو جاتے ہیں۔ تو اس دوران بہت سی باتیں رونما ہو سکتی ہیں۔ اور کچھ باتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے انسان کو اپنا پوشیدہ حال کبھی نہیں بتانا چاہئے۔ پوشیدہ رکھنے سے ہی اگر زخم نمودار ہو جائے تو ان پر نمک چھڑکنا اور ممکن ہے درد چند منٹوں کے لئے نمودار ہو جائے لیکن درد قابو میں رکھ کر خاموشی برقرار رکھنی چاہئے۔ اسی خاموشی سے معشوق اور محبوب کی محبت کے تناؤ میں فتحیابی ضرور مل سکتی ہے اور ہم پاک محبت کے دائرے میں محبت کو فتح کر سکتے ہیں۔

زخم پر چھڑکیں کہاں + طفلان بے پروا نمک = زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک

کیا مزہ ہوتا اگر + پتھر میں بھی ہوتا نمک = کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے + وہ دن کہ وجد ذوق میں = یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں

زخم سے گرتا تو میں + پلکوں سے چنتا تھا نمک = زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

”زخم پر چھڑکیں کہاں“

بہت دنوں کے بعد میں نے بہت سے لفظوں کو الگ الگ رکھا اور پھر ایک اجلاس بلایا۔

اجلاس بلا کر میں نے لفظ زخم کو اور باقی لفظوں کو بھی سامعین کے جگہ بیٹھنے کے لئے تلقین کی۔
جب سب الفاظ موجود رہے تو میں نے لفظ دل، لفظ دماغ اور لفظ آنکھ کو لفظوں کے اجلاس میں صدارت کرنے کو کہا، لیکن صدارت کرتے ہوئے باقی لفظوں نے لفظ زخم کے خلاف بہت سے مکالے پڑھے۔ اور سنایا کہ لفظ زخم ایک خطرناک لفظ ہوتا ہے جس سے پڑھنے والے لوگ نفرت کرتے ہیں، مطلب سب لوگ زخم کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جب میں نے یہ سنا تو میں نے تمام کے تمام لفظوں سے اپیل کی کہ ہمیں نفرت کی نگاہوں سے کسی کو نہیں دیکھنا چاہئے اگرچہ سبھی نے یہ بیان کیا کہ یہی لفظ زیادہ تر شاعروں نے مختلف غزلوں میں استعمال کیا ہے، لیکن ان لفظوں نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ہم کو پیار کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے بلکہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اب سب لفظوں نے مجھے یہ کہا کہ زخم پر "زخم پر چھڑکیں کہاں" میں نے جب لفظوں سے یہ بیان سنا تو میں نے اور بھی ردعمل ظاہر کیا۔
میں نے تمام کے تمام لفظوں سے کہا کہ کسی نہ کسی وقت بعض لفظ سے ایسا مفہوم نکلتا ہے جو کہ زخم کے برابر سمجھ میں آتا ہے اسی لئے ہمیں لفظ زخم کو نفرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھنا چاہئے، صدارت کرنے والوں نے اس بات پر مطمئن ہوئے کہ باقی لفظ بھی مطمئن ہو جائیں اور اس بات سے الگ جذبہ رکھیں گے تاکہ یہ نہ کہیں کہ **"زخم پر چھڑکیں کہاں"**

"طفلان بے پروا نمک"

جب اجلاس میں صدارت کرنے والوں نے ایسی بات کہی تو انہوں نے لفظ نمک کو یہ بتایا کہ آپ کبھی بھی ہمارا ساتھ نہیں دیتے ہو، وہ یہ کہ آپ بطور تحفہ ہمیں نمک نہیں کھلاتے ہو تاکہ ہم بھی آپ کا مزہ چکھتے۔ اس کے برعکس آپ زخم کے لئے مرہم پٹی کے طور پر لوگوں سے کہتے ہو کہ نمک کا استعمال کرو۔ مطلب اگر زخموں پر درد ہے تو اس درد پر نمک چھڑک کر اور بھی درد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جب یہ بات لفظ نمک کو بتائی تو اس نے کہا کہ میں اپنا استعمال ہر ایک کو بطور تحفہ دیتا ہوں۔ مطلب ہر کوئی میرا استعمال کر سکتا ہے اس پر لفظوں نے کہا کہ جب

بھی ہم زیادہ نمک استعمال کرتے ہیں تو ہمیں بہت ہی پیاس محسوس ہوتی ہے اور زیادہ استعمال کرنے سے زبان میں مزہ ہی نہیں رہتا۔ اسی لئے ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ آپ کا استعمال اگر کرنا ہو تو صرف زخموں پر کریں نہ کہ زباں پر۔ اس پر لفظ نمک نے بتایا کہ میں اپنے طریقے سے کہتا ہوں کہ مجھے خدا نے ہی نمودار کیا ہے اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ **"طفلان بے پروا نمک"**

"کیا مزہ ہوتا اگر"

جب لفظوں کے اجلاس میں صدارت کرنے والوں نے لفظ نمک سے اپنے تاثرات سنے تو صدارت کرنے والوں نے یہ کہا کہ جب بھی کسی شادی میں یا کسی دعوت نامے پر ہمیں بلایا جاتا ہے تو وہاں پر ہم کھانا کھاتے وقت مزہ محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں نمک سے ہی مزہ محسوس ہوتا ہے لیکن جب بہت سارے مہمان حاضر ہوتے ہیں تو اس وقت ہم سب الفاظ یہ کہتے ہیں کہ دعوت دینے والا بہت ہی پریشان ہوگا وہ یہ کہ جب اس نے دعوت کی تین سو آدمیوں کی، اب تین سو آدمیوں کے بجائے چھ سو آدمی حاضر ہوئے۔ اب مہمانوں کو بلانے والے کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سارے الفاظ یہ کہہ رہے ہیں کہ زیادہ نمک ڈالنے سے کھانے پینے کے مزہ میں کمی محسوس ہوگی اور سارے مہمان کم کھا کر کسی چیز کی کبھی مہمان بلانے والوں کو نہیں ہوگی۔ اور سبھی ٹھیک طرح سے کھانا کھا سکتے ہیں۔ اسی لئے اجلاس میں سبھی صدارت کرنے والوں نے کہا کہ ہم نمک کو یہ تحفہ دے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کا نام **"کیا مزہ ہوتا اگر"** لکھتے ہیں اور وہی اعزاز اس کو اسی اجلاس میں دیں گے جس سے کہ کوئی لفظ اس پر غلط فہمی کا اظہار نہ کرے۔

تبھی تو سارے لفظوں نے اپنے اجلاس میں مان لیا کہ "کیا مزہ ہوتا اگر" کے نام سے ہی نمک کو پکاریں گے۔

"پتھر میں بھی ہوتا نمک"

جب اجلاس میں اس قرارداد کو منظوری دی گئی تو باقی لفظوں نے یہ سوال اٹھایا کہ پہاڑوں سے نمک ملتا ہے اور کئی پہاڑوں سے نمک نہیں ملتا۔ مطلب ہم نقلی نمک کا استعمال سمندر کے پانی سے کرتے ہیں لیکن اصلی نمک پہاڑوں سے ہی نمودار ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم اس کی توجہ مرکوز کرتے ہیں اس بات پر کہ پتھر والے نمک کو اعزاز دیا جائے گا یا سمندری نمک کو۔ تو اس کو ایسا تحفہ دیا جائے گا، اس پر سب کے سب صدارت کرنے والے حیران ہوئے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم اس نمک کو اعزاز فراہم کریں گے جو کہ قدرتی طور پر نمودار ہوگا۔ اس کا مطلب یہ رہا کہ پتھر والے نمک کو ہی اعزاز سے نوازا جائے گا اس پر یہ بات سن کر لفظ نمک کو اس بات کا احساس دل میں ہوا کہ کاش **"پتھر میں بھی ہوتا نمک"** مطلب لفظ نقلی نمک نے یہ سن کر محسوس ایسے الفاظ سے کیا۔

"یاد ہیں غالب تجھے"

جب لفظوں کے اجلاس میں نقلی اور اصلی میں بحث مباحثہ ہوا تو سب کے سب لفظوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اسی کو اعزاز دیا جائے گا جو کہ قدرت نے پیدا کیا ہو۔ مطلب جو کہ قدرتی طور پر نمودار ہوا ہو جبکہ سارے لفظوں کو یہ محسوس ہوا تو وہ کہنے لگے کہ وہی کامیاب ہوسکتا ہے اسی کو فتحیابی حاصل ہوسکتی ہے جو قدرتی طور پر پیدا ہوا ہو۔ اسی کو اعزاز مل سکتا ہے اسی لئے انہوں نے لفظ غالب کا استعمال کیا اور کہنے لگے آپ کا استعمال فتحیابی میں کر سکتے ہیں۔ مطلب لفظوں نے یہ بیان بازی کی کہ غالب لفظ کا مطلب ہے فتح کرنا۔ اب نقلی نمک اور اصلی نمک میں اسی کی فتحیابی ہوگی جس میں قدرتی نمک ہو۔ جس کو اصلی نمک کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی لئے لفظ غالب کا بیان کرتے ہوئے باقی لفظوں نے یہ بتایا کہ "یاد ہیں غالب تجھے" مطلب ہمیں یاد ہے کہ ان دونوں میں کون فتحیاب ہوسکتا ہے۔ اسی لئے ہم لفظ غالب کو یہ کہہ رہے ہیں کہ اعزاز دیتے وقت آپ کو نقلی اور اصلی پتہ ہے اور آپ کو اسی لئے ہم اس لفظ سے پکارتے ہیں **"یاد ہیں غالب تجھے"**

''وہ دن کہ وجد ذوق میں''

جب سارے لفظوں کے اجلاس میں اس بات کا اظہار ہوا کہ لفظ نمک کو ہی اعزاز سے نوازا جائے گا اور اسی نمک کو جس میں قدرتی عناصر دیکھنے میں آتے ہیں اور نقلی نمک کو اعزاز سے الگ رکھا جائے گا۔اس پر لفظ زخم نے اپنا ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے صدارت کرنے والوں کو کہا کہ میرے لئے یہ بہت ہی خطرناک اور صدمہ پہنچانے والی بات ہے کہ جب مجھ پر لوگ نمک چھڑکتے ہیں اس وقت میں درد محسوس کرتا ہوں۔اس درد کو نقلی نمک سے میں محسوس کم کرتا رہا۔اب لوگ اصلی نمک کا استعمال کریں گے جو کہ سبھی گھروں میں موجود ہوتا ہے۔ جب بھی وہ لفظ زخم کو دیکھیں گے وہ ایسے نمک کا استعمال کریں گے تو مجھے درد دن رات محسوس ہو سکتا ہے۔اسی لئے میں اس اجلاس میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جس دن سے اس نمک کا استعمال کیا جائے گا تو میں اس دن سے وجود ذوق میں نمودار ہو جاؤں گا جس سے میرا درد زبردست محسوس ہو جائیگا اور اس دن سے مجھے معلوم ہو جائے گا کہ زخم ایک بہت ہی خطرناک چیز ہے جس کو دیکھ کر ہی لوگ ڈرتے ہیں۔اسی لئے میں ''وہ دن کہ وجد ذوق میں'' کے نام سے پکاروں گا مطلب جب بھی لوگوں میں اصلی نمک کا احساس ہو جائے گا تو اسی دن سے میں یہ کہوں گا ''وہ دن کہ وجد ذوق میں''

''زخم سے گرتا تو میں''

جب اجلاس میں صدارت کرنے والوں نے لفظ زخم کا بیان سنا اور اجلاس میں اس بات سے بہت ہی ناراضگی محسوس ہوئی، تمام لفظوں نے یہ کہہ کر اجلاس میں الگ ہونے کے لئے رضامند ہوئے اور صدارت کرنے والوں میں اس بات کا رُجحان پیدا کیا کہ نقلی نمک میں بھی زیادہ احساس اور توجہ لوگوں میں ہونی چاہئے تاکہ سمندر کا نمک تمام گھروں میں موجود رہے۔ اور ہمارے حرف زخم کو کسی غم میں مبتلا نہ ہونے دیا جائے۔اس پر صدارت کرنے والوں نے باقی لفظوں کو اس بات پر توجہ مرکوز کرائی کہ پہاڑی نمک دنیا میں کم نمودار ہوتا ہے اور پہاڑی

نمک بہت ہی کم ملکوں میں دستیاب ہے۔ اسی لئے اس پتھر کے نمک کو ہم حاصل نہیں کر سکتے۔
لوگوں کو نمک کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے انہیں نقلی نمک کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔
خواہ نقلی نمک میں کوئی بھی برائی صحت کے لئے نہیں ہے۔ اسے بھی اصلی نمک کے طور پر
گراہک استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم اس اجلاس میں اس بات کا احساس لوگوں کو دلاتے
ہیں کہ لفظ سمندر کا ہی لوگ زیادہ تر استعمال کریں گے۔ ہم مانتے ہیں کہ زخم سے عمر کم ہوتی ہے
کیونکہ ہمیشہ زخم کو ٹھیک کرنے کے لئے کوئی حکیم، ڈاکٹر علاج مریض کا کرتا ہے۔ مطلب زخم کو
مٹانے کے لئے بہت سی دوائیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم تمام لفظوں کی اس بات
پر توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ زخم کسی کو نہ ہو۔ اگرچہ لفظ زخم کو ہم بحیثیت اجلاس میں طلب کرتے
ہیں لیکن اس کا احترام بھی کرتے ہیں اور خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتے ہیں کہ زخم زیادہ نمودار نہ
ہو جائے۔ ہاں البتہ لفظ زخم کو ہم نفرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے اور اس کے رہنے
اور سہنے کے لئے دعا کریں گے کہ کسی کے دل میں اور کسی کو اس لفظ سے خطرہ لاحق نہ ہو جائے۔
یہ بات سن کر زخم کو محسوس ہوا کہ میں اگر لفظ زخم ہوں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ **"زخم سے گرتا تو
میں"** مطلب میرا وجود ہونا چاہئے لفظوں کے دائرے میں لیکن تجربہ کے طور پر لوگوں کے پاس
مجھے آنے کی اجازت نہیں ملنی چاہئے۔ صرف مجھے لفظ کے طور پر لوگ پڑھیں اور تجربہ کے
طور پر استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

"پلکوں سے چنتا تھا نمک"

جب اجلاس میں سارے لفظوں نے شرکت کی تو صدارت کرنے والوں نے باقی
لفظوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ ہم زخم کو بالکل ہی نیست و نابود نہیں کریں گے لیکن پھر بھی
اس کا وجود لفظ کے طور پر استعمال کریں گے اور خدا سے رجوع ہو کر یہ کہیں گے کہ سبھی انسانوں
اور حیوانوں میں زخم نمودار نہ ہو۔ اور زخم سے مبرا ہو جائیں۔ صرف لفظ زخم پڑھنے کے لئے
استعمال کیا جائے نا کہ تجربہ کے طور پر۔ اس بات پر باقی لفظوں نے بھی اجلاس میں منظوری

دی اور اس بات پر اتفاق کیا۔ اتفاق کرتے ہوئے اب سارے الفاظ، حرف نمک سے کہنے لگے کہ ہم آپ کا شکریہ کرتے ہیں اور شکریہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نمک میں بھی ایک طاقت ہے اور نمک سے ہی لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مطلب نمک کا استعمال ہر کوئی اس دنیا میں کرتا ہے۔ یہ سن کر لفظ زخم نے کہا کہ ہر ایک بندہ کے پاس جانے سے روکتے ہو مطلب مجھے تجربہ سے دور رکھتے ہو۔ دراصل آپ مجھے ایٹمی ہتھیار کے دائرے میں رکھتے ہو اور امن کی زندگی بسر کرنے کیلئے آپ مجھ سے ایٹمی ہتھیار کے طور پر پیار کرنے میں رضامند ہو۔ تبھی تو آپ تجربہ مجھ پر نہیں کر سکتے۔ میں بھی تمام لوگوں کو امن میں رہنے کے لئے رضامند ہوں اور میں بھی خدا سے یہ چاہتا ہوں کہ تجربہ کے طور پر لوگو مجھے استعمال نہ کریں اور صرف لفظ پڑھنے کے لئے لوگ استعمال کریں۔ جب لفظ نمک نے اجلاس میں ایسی باتیں کہیں اور باتیں کہتے ہوئے اس نے لفظ نمک پر یہ بات کہی کاش میں بھی **"پلکوں سے چنتا تھا نمک"**

اگر میں اس کہانی کا یا افسانہ کا عنوان لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ **"پلکوں سے چنتا تھا نمک" یا "امن سے زندگی بسر"**

ہے کس قدر ہلاک فریب وفا سے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

غالب نے دیوان غالب میں اس غزل کے مطلع اور مقطع میں زیادہ تر گل اور وفا کا استعمال کیا ہے، لیکن زیادہ تر لفظ گل کا استعمال کیا ہے اور لفظ بلبل کا بھی استعمال کیا ہے۔ اگر میں اس مطلع اور مقطع پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ وفا کو شاعر نے استعمال کیا ہے لیکن ہلاکِ فریب وفا کے ساتھ استعمال میں نہیں لانا چاہیے، مانتے ہیں کہ شاعر میں آمد ہے اور اس

آمد کو الگ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہم ادبی طور پر اس مطلع اور مقطع پر توجہ مرکوز کریں گے تو ہم اس بات پر بھی رضامند ہو جائیں گے کہ بلبل ایک پرندہ کا کاروبار انسانوں کے ساتھ نہیں ہے لفظ کاروبار اس وقت استعمال میں لانا چاہئے جب ہم دکانداروں کے ساتھ یا کوئی لین دین بازار میں کرتے ہیں یا ہم کوئی کام روپۓ کمانے کے لئے کرتے ہیں لیکن لفظ کاروبار اس مطلع میں نہیں استعمال کرنا چاہئے۔ بلبل کا استعمال شاعر نے کاروبار کے ساتھ کیا ہے لیکن بلبل اُڑتا ہے اور کسی درخت کے ٹہنی پر بیٹھتا ہے، اس میں کوئی لین دین نہیں ہے وہ کاروباری نہیں ہے وہ ایک پرندہ ہے پرندوں کے کام کاج کو سب لوگ جانتے ہیں۔ خیر غالب نے بلبل کے کاروبار پر ہائے بھی کیا ہے مطلب ردیف اور کافیہ میں ہائے گل لکھ کر بلبل کے کاروبار کے ساتھ جوڑا ہے۔ دوسری بات مقطع میں بھی اسی طرح کے کئی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ غالب شاعر خود کہتا ہے کہ مجھے تمنا ہے کہ اپنے خیالات کو بلبل کے کاروبار سے رجوع کروں۔ مانتے ہیں غزل میں تشبیہ دے کر باتیں لکھی جاتی ہیں، غالب ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور آمد بھی ہیں لیکن اگر ہم ادبی لحاظ سے مطلب اُردو کے طرز بیان سے یہ تحقیق کریں کہ کیا بلبل کاروبار میں مصروف ہوتی ہے تو سب کے سب یہ کہیں گے کہ بلبل کام وہی کرتی ہے جو قدرت نے اسے سونپا ہے۔ مطلب وہ کوئی پیسے کمانے والا کام نہیں کرتی ہے۔ جسے ہم کاروبار کے نام سے پکاریں۔ اس کا کاروبار تمام لوگوں کو پتہ ہی ہے۔ پھر بھی شاعر نے اپنے خیالات میں اگر ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں ہمیں اس بات پر توجہ مرکوز نہیں کرنی چاہئے اور ہمیں غور سے جذبۂ شاعر کا خیال سمجھنا چاہئے۔ میں مانتا ہوں شاعر نے اس مقطع اور مطلع میں ایسی دلیل سے بھی واقف کرایا ہے کہ ہم پھولوں کو جیب میں رکھتے ہیں لیکن پھول کو کبھی بھی جیب میں نہیں رکھنا چاہئے۔ اس کا مطلب مقطع اور مطلع میں شاعر نے اپنے زمانے کا واقعہ بھی بتایا ہے جس زمانے میں غزل کو تحریر کیا اور ہمیں اس بات سے بھی واقف کرایا کہ ان دنوں بھی لوگ گلاب کے پھولوں کو باغ میں کاٹتے تھے اور کاٹ کر جیبوں میں رکھتے تھے۔ جس کا مطلب اس مقطع

سے پڑھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ 'گل جیب قبائے گل' مطلب ان دنوں بھی لوگ باغوں میں پھولوں کو کاٹ کر جیب میں رکھتے تھے۔ یہ مصرعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اس زمانے کے حال سے بھی واقف کراتا ہے۔ اگر چہ اس زمانے میں بھی ایسے حالات دیکھنے میں آتے ہیں کہ کئی لوگ باغوں میں پھولوں کو کاٹ کر جیب میں رکھتے ہیں۔ مقطع اور مطلع کو ہم تاریخی انداز سے بھی ایک اہمیت دے سکتے ہیں۔

ہے کس قدر ہلاک فریب وفا سے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق مجھے گل کے طور پر آپ کے ساتھ وفاداری ہے۔ میں وفادار ہوں آپ کو سمجھنا چاہئے کہ میں آپ کی وفاداری پر کسی بھی طرح سے اپنے آپ کو ہلاک کرسکتا ہوں۔ مطلب میں آپ سے وفاداری پر اپنے کو قربان کرسکتا ہوں۔ اگر آپ مجھے وفاداری پر قربان کرنے کو کہو گے تو میں قربان ہو جاؤں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک ایسی بلبل ہوں کہ میرا کاروبار یہ ہے کہ میں ٹہنی پر بیٹھ کر اپنے ساز سے دوسروں کو مست رکھتی ہوں۔ جب بھی میرا ساز الگ ہوتا ہے یا سننے والا میرا ساز نہیں سنتا ہے تو حاضر ہونے والا مجھے تلاش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں لطف اندوز نہیں ہو رہا ہوں اس باغ میں بیٹھنے پر کیونکہ میں نے بلبل کی آواز نہیں سنی اور نہ اس کے گانے سننے میں مصروف رہا۔ میں باغ میں بلبل کو کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے جذبات کو نہ سن کر واہ واہ کرنے لگا۔ مطلب افسوس کرنے بیٹھ گیا۔ اسی طرح اس کا حوالہ دے کر شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق جب آپ مجھے وفاداری کرتے ہوئے نہیں دیکھتے ہو اور میری وفاداری کا امتحان ہی نہیں لیتے ہو تو آپ کی توجہ میں بلبل کے کاروبار کی طرف کرنا چاہتا ہوں کہ جب بھی اس کی آواز سننے میں نہیں آتی کتنا غم کا اظہار سننے والا کرتا ہے۔ اسی طرح جب میں آپ کو نہیں دیکھتا ہوں اور نہ دیکھنے سے مجھے غم محسوس ہوتا ہے مطلب شاعر معشوق کو بلبل سے تشبیہ دے کر یہ کہہ رہا ہے کہ پاک محبت کرنے میں میری

رضا مندی ہے۔ میں اس رضامندی کو کاروبار کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہوں۔ اگرچہ کاروبار تجارت سمجھتے ہو لیکن میں پاک محبت کی تجارت کسی مالی تعاون کے بغیر کرتا ہوں اور معشوق کے ساتھ اپنی عمر گزارنا چاہتا ہوں۔

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے جب بلبل کی آواز ہی نہیں کانوں میں آئی۔ میں نے بلبل کی آواز نہیں سنی۔ نہ سننے کی وجہ سے میری آرزو ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ میں بلبل کی آواز سننے کے لئے بیٹھا ہوں لیکن پتہ نہیں بلبل کہاں چھپی ہے۔ میں بلبل کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا کسی نے اس کو چُرایا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ کوئی جیب کترا اس کی جیب سے چوری کرے۔ کیونکہ بلبل کو جیب میں نہیں رکھ سکتے اور نہ نہیں آج تک کسی نے جیب میں بلبل کو رکھا۔ مطلب بلبل کے لئے جیب والی جگہ ہی نہیں۔ ہاں پنجرے میں رکھ سکتے ہو۔ اسی لئے شاعر نے جیب کو تشبیہ یہ کہہ کر دی ہے کہ جب میں پھولوں کو دیکھتا ہوں تو میری خواہش ہوتی ہے کہ پھولوں کو دیکھتے ہوئے بلبل کی آواز بھی سنوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر فرماتے ہیں کہ معشوق کے ساتھ روبرو میری بات ہونی چاہئے تاکہ میں اس کی آواز سن سکوں۔ آواز سن کر محسوس کروں کہ بلبل کی طرح اس میں آواز کی لرزش پیدا ہوتی ہے لیکن میں معشوق کو پا سکتا ہوں لیکن پاتے ہوئے میں جیب میں رکھ کر محبت کے لفظوں سے سنواروں گا۔ شاعر نے جیب کا مطلب یہ کہا ہے کہ معشوق میرے ہی ہاتھ میں ہے اور اسے کوئی جیب کترا نہیں چرا سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی اسے میرے بغیر نہیں پا سکتا ہے۔ معشوق میرے ساتھ ہمیشہ رہنے کے لئے رضامند ہے۔

مقطع کے متعلق میں یہ لکھتا ہوں کہ غالب نے مطلع کا جواب مقطع میں بھی بیان کیا ہے۔ مطلب مطلع اور مقطع کا جوڑ غزلوں میں ہمیں ملتا ہے۔ ہر کسی غزل میں مطلع کا جوڑ مقطع کے ساتھ میں نے پڑھنے والوں کو پیش کیا۔ اسی طرح سے مقطع میں لفظ غالب کے ضمن میں یہ

کہوں کہ غالب کے معنی فتح کرنا ہے یعنی شاعر کہتے ہیں کہ میں نے کئی دنوں سے بلبل کی آواز نہیں سنی۔ جس آواز کو میں کاروبار کے طور پر سنتا رہا۔ مطلب جب بھی میں باغ میں بیٹھتا تو وہاں پر میں بلبل کی آواز سنتا۔ جس سے کہ میں مست رہ کر دو تین گھنٹہ آرام سے رہتا اور مجھے پھول دیکھ کر اتنا مزہ نہیں آتا جتنا کہ بلبل کی آواز سن کر میرے کانوں میں خوشی محسوس ہوتی۔ لیکن میں دو تین دنوں سے اس کی آواز نہ سننے پر خوش نہیں ہوں۔ مجھے تمنا ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں باغ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ کئی لوگ پھولوں کو توڑ کر جیب میں رکھتے ہیں جسکی وجہ سے پھولوں کی صورت برباد ہو جاتی ہے۔ میں اس پر ناراض ہوں اسی طرح سے مجھے اس معشوق کا خیال آیا ہے جس خیال پر میں ہمیشہ اپنی تصنیف لکھتا ہوں۔ مطلب غزل گو ہوں جب میں معشوق کو جدا بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کیا اس معشوق کو کسی جیب کترے کے طرح کسی نے نہیں چرایا ہے۔ لیکن مجھے یہ خیال پھولوں کو کاٹنے پر ہی آیا۔ ایسا حال دیکھ کر بھی مجھے پوری توقع ہے کہ میرا معشوق میری وفاداری پر قائم ودائم ہے۔ اسے کوئی جیب کترا نہیں چرا سکتا۔ جس طرح باغ میں پھولوں کو کاٹ کر جیب میں رکھتے ہیں۔ اتنا دیکھ کر میں اپنی محبت میں ضرور فتحیابی دیکھوں گا مجھے پورا بھروسہ ہے میں معشوق کی پاک محبت میں فتحیاب ہوں گا۔

ہے کس قدر ہلاک + فریب وفا سے گل = ہے کس قدر ہلاک فریب وفا سے گل
بلبل کے کاروبار پہ + ہیں خندہ ہائے گل = بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
غالب مجھے ہے + اُس سے ہم آغوشی آرزو = غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے + گل جیب قبائے گل = جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

”ہے کس قدر ہلاک“

کئی دنوں سے لوگوں کی بھیڑ کسی سڑک پر دیکھنے میں آئی، بھیڑ دیکھنے پر لوگوں نے تحقیق کیا کہ یہ بھیڑ کس وجہ سے ہے۔ تمام لوگ اس بھیڑ سے بہت ہی غصہ میں ہیں لیکن بھیڑ دیکھ کر

یہ محسوس کرتے ہیں کہ بھیڑ میں کوئی اظہار ایسی باتوں کا نہیں کرتا لیکن جب لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک لاش، ایک مردہ آدمی جو کہ ایک نوجوان ہے اچانک اس کی موت ہوئی ہے اور لوگ جوق در جوق اظہار افسوس کرنے کے لئے آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بھیڑ اکٹھی ہوئی اور اس بھیڑ کو تتر بتر کرنے کے لئے کوئی بھی رضامند نہیں ہوتا ہے۔ اور لاش کو دیکھ کر بھیڑ میں لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ آخر یہ کیسے اس دنیا سے جاں بحق ہوا۔ مطلب لڑائی جھگڑے سے یا کسی حادثے کا شکار ہوا ہے۔ اسی لئے اس لاش کو دیکھ کر لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر سب کے سب کہہ رہے "**ہے کس قدر ہلاک**"

"فریب وفا سے گل"

جب بھیڑ میں لوگ اظہار افسوس کرنے بیٹھتے اور لوگ جوق در جوق آتے اور جاتے ہیں لیکن ہلاکت کی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔ سبھی یہ کہہ رہے ہیں کہ ابھی تو یہ جوان ہے لیکن افسوس کرتے ہیں کہ اے خدا اس جوان کے ساتھ کس قدر ہلاکت ہوئی۔ کیا اس کے کنبے والے اظہار افسوس کرتے ہیں۔ کیا ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ یہ کہتے اور روتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اب اس سڑک پر لوگوں کا چلنا پھرنا دوسری سڑک پر تبدیل ہوا۔ مطلب اب سبھی لوگ اس جوان آدمی کے اظہار افسوس کے لئے جوق در جوق آتے ہیں۔ ابھی تک سبھی یہی کہہ رہے ہیں کہ "**فریب وفا سے گل**" یعنی یہ نوجوان آدمی تھا۔ ایسا اظہار افسوس کرتے ہوئے اب کہہ رہے ہیں کہ ہلاکت کی وجہ بھی معلوم نہیں ہوئی۔ جو کوئی اب اس بھیڑ میں الگ ہو رہا ہے وہ یہی کہہ رہا ہے کہ "**فریب وفا سے گل**"

"بلبل کے کاروبار پہ"

جب لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر اور اظہار افسوس کرتے ہوئے کسی اور سڑک کی طرف جا کر دیکھیں تو وہ لوگ دوسروں کو بتاتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں سڑک پر اتنی بھیڑ ہے کہ لوگ اظہار افسوس کر کے بھی وہیں ٹھہرنا چاہتے ہیں تو دوسرے لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ آخر

معاملہ کیا ہے۔ وہ ہر ایک حالات کی توجہ ان لوگوں کو مرکوز کرتے ہیں۔ اب بھی اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نوجوان کی ہلاکت کی وجہ معلوم نہیں ہوئی ہے لیکن وہ ایک نوجواں اور بہت ہی بہترین آدمی تھا۔ بہت سے لوگ اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا ایک بلبل کی طرح ہمیں کاروبار سے واقف کراتا ہے۔ مطلب کسی کے پاس خوشی اور کسی کے پاس غم۔ ہر کوئی محنت کرتا ہے کوئی اجرت زیادہ کماتا ہے کوئی کم۔ یہ سب کچھ بلبل کے کاروبار پر ہے۔ مطلب خدا کے ہی رحم وکرم پر ہر کسی کا کام چلتا ہے۔ اسی لئے ہم بھی اظہار افسوس کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ''بلبل کے کاروبار پہ'' اپنا کلام بند کرتے ہیں۔

''ہیں خندہ ہائے گل''

جب دو تین دن تک بھیڑ سڑک پر کم ہی نہیں ہوئی تو اب لوگوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ کہا کہ اس دنیا سے ہر ایک آدمی کو ایک دن رخصت ہونا ہے۔ کوئی بھی شخص یا فرد یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں اس دنیا کا مالک ہوں، ہمیں اپنے کو اس دنیا کا مالک تسلیم نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہمیں اپنے کو اس دنیا میں بطور کیرایہ دار تسلیم کرنا چاہئے۔ کسی نہ کسی وقت بلاوا ضرور آتا ہے۔ ہم ایسی ہی باتیں ان لوگوں کو بتائیں گے جس سے بھیڑ بھی کم ہو جائے اور لوگوں میں اس بات کا احساس بھی ہو جائے کہ اب جو ہوا سو ہوا، مطلب نوجوان تھا، دنیا نہیں دیکھی اور کاروبار نہیں کیا ہمیں افسوس ہے۔ مطلب ہمیں ہر ایک بات پر افسوس ہے اور ان کے اہل وعیال پر بھی اظہار افسوس کرتے ہیں۔ لیکن اب ہمیں ان کی توجہ روزمرہ کے کاروبار پر مرکوز کرنی چاہئے۔ اور یہ بھی سوچنا چاہئے کہ دنیا کا کاروبار ایسا ہی ہے ہمیں ہائے کا لفظ استعمال کرنا چاہئے لیکن ہائے کے ساتھ مٹھاس کا استعمال بھی کرنا چاہئے۔ ہمیں اس بھیڑ کو کم کرنے کے لئے اور اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنے کاروباری زندگی میں رجوع کرتے ہوئے یہ کہنا چاہئے ''ہیں خندہ ہائے گل''

''غالبؔ مجھے ہے''

جب کئی لوگوں نے اس بات کا احساس بھیڑ کو کم کرنے کے لئے دلایا تو لوگ بھی ان باتوں سے مطمئن ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں لفظ غالب کا استعمال کر کے یہ کہنا چاہئے کہ جو بھی کاروبار ہم کرتے ہیں اس کاروبار سے ہمیں دور نہیں رہنا چاہئے خواہ ہمیں غم ہو یا خوشی۔ اپنے کاروبار میں اپنی زندگی کو مدغم رکھنا چاہئے جس سے کہ ہم اپنے اہل وعیال کے لئے روزی کا باعث بنیں اور انکی دیکھ بھال کر سکیں۔ اسی لئے ہمیں ایسے صدموں پر افسوس کرنا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہنا چاہئے کہ اس دنیا کے ہر مرحلہ پر فتحیابی کے جامے پہننے چاہئیں۔ اور پہن کر یہ کہنا چاہئے کہ ''غالبؔ مجھے ہے'' مطلب میں فتحیاب ان حالات میں ہوں اگر چہ اس دنیا میں آ کر غم بھی دیکھا اور خوشی بھی دیکھی۔ تو ایسے حالات اس بھیڑ میں نمودار دیکھ کر اس بھیڑ کو کم کرنے کے لئے اور لوگوں کو اپنے کاروبار میں مدغم ہونے کیلئے ہیں۔ یہی بات کہنی ہے

''غالبؔ مجھے ہے''

''اُس سے ہم آغوشی آرزو''

جب بھیڑ میں تمام لوگوں میں اس بات کا احساس ہوا کہ ہمیں اس دنیا میں ایسے ستم کا مقابلہ بھی کرنا ہے اور کئی مرتے ہیں کئی پیدا ہوتے ہیں کئی بے وقت اس دنیا سے جاں بحق ہوتے ہیں۔ ہمیں جب اس بات کا احساس ہوتا ہے تو ہمیں اپنی آرزو یعنی تمنا سے دور رہنا چاہئے۔ کئی لوگ سوچتے ہیں کہ میں ایسا کام کروں گا جس سے کہ میں خوشی حاصل کر سکوں، لیکن خدا کی رضامندی نہ ہونے کی وجہ سے ایسے کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ سارا بھروسہ خدا پر ہی کرنا چاہئے۔ کئی لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ہم بڑے عہدے پر اپنا کام انجام دیں گے۔ انجام دینے سے پہلے ہی ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سب اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کیا آرزو تھی جو پوری نہیں ہوئی۔ اور سبھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ

''اُس سے ہم آغوشی آرزو''

”جس کا خیال ہے“

جب لوگ اپنے کاروبار میں مشغول رہے اور سڑک پر راہ گیر کو دیکھتے رہے۔ کوئی کسی بات پر اظہار افسوس نہیں کرتے دیکھے گئے۔ صرف اس سڑک کا واقعہ سبھی کو یاد آنے لگتا ہے مطلب وہ سڑک پر چلتے ہوئے اس بات کو دہراتے ہیں کہ ہے کس قدر ہلاک اور دل سے اظہار افسوس بھی کرتے ہیں۔ مطلب سڑک کو دیکھ کر کہہ رہے ہیں کہ دو تین دن پہلے یہاں ایسا واقعہ نمودار ہوا کہ سبھی نے بہت بھاری بھیڑ دیکھی اور بھیڑ میں یہی کہتے رہے کہ ہے کس قدر ہلاک۔ جب ایک گاڑی وہاں سے نکلی تو ڈرائیور نے اپنے ساتھی کو بتایا کہ آپ کو اس سڑک کا خیال آتا ہے۔ اس نے کہا نہیں، ڈرائیور صاحب مجھے معلوم نہیں کہ یہاں پر دو تین دن پہلے ایسی بھیڑ اکھٹی ہوئی جس سے کہ لوگ اس راستے سے نہیں گزرے۔ تب میں آپ کو اس بات پر دوبارہ توجہ دلا کر کہتا ہوں کہ مجھے یاد آرہا ہے کہ واقعہ کیا ہے اور کیوں ہوا؟ مجھے اس نوجوان کا خیال ہے اسی لئے یہاں پر گاڑی چلاتے ہوئے یہ کہہ رہا ہوں کہ جس کا ”جس کا خیال ہے“ مطلب مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جس دن یہاں پر اتنی بھیڑ اکٹھی ہوئی کہ جس سڑک پر کوئی گاڑی نہیں نظر آئی اور گاڑی چلاتے ہوئے میں ان الفاظ کو دہراتا ہوں وہ ”جس کا خیال ہے“

”گل جیب قبائے گل“

جب ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے ان دنوں کی توجہ اپنے ساتھی کو دوبارہ کرائی تو وہ یہ سب باتیں سن کر اظہار غم میں مبتلا ہوا۔ سنتے ہوئے اس نے یہ بات بتائی کہ ایسے واقعات دنیا میں ہوتے رہتے ہیں اور ایسا کاروبار دنیا میں دیکھنے میں آتا ہے۔ مطلب ہم ایسے اہل وعیال بھی دیکھتے ہیں جہاں اس قسم کے ماتم ہوتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے ڈرائیور نے بتایا کہ یہ جوان گل تھا لیکن موت نے اپنی آغوش میں لے کر اس کے اہل وعیال کو غم زدگی کے ماحول میں مبتلا کر دیا۔ جس طرح باغ کے پھول کو جیب میں ڈال کر اسے خراب کر دیتے ہیں۔ اس کی

خوشبو بھی اچھی نہیں محسوس ہوتی اسی طرح سے موت نے ایسا کام کیا کہ ایسے جوان کو اپنی آغوش لے کر اسے ہر ایک کام سے یعنی کاروبار سے دور کر دیا اور میں یہی بات کہہ کر اپنا کلام اختتام پذیر کرتا ہوں۔ **"گل جیب قبائے گل"**

اس مضمون کا عنوان "گل جیب قبائے گل" یا "وجوہاتِ بھیڑ" لکھوں گا۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
مضمحل ہوگئے قوی غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

جب میں دیوان غالبؔ کی یہ غزل پڑھتا ہوں مطلع اور مقطع پر داد دینے کے بعد مجھے ایسے تاثرات لکھنے کو ملتے ہیں۔ پہلے فراق اور وصال کو شاعر نے اس انداز سے مطلع میں بیان کیا ہے کہ جدائی کا سوال وصال سے کیا ہے۔ مطلب مذکر اور مؤنث کی صورت میں یا دجواب دعویٰ جسے کہتے ہیں یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دوست کا متضاد دشمن ہے۔ اسی انداز سے غالبؔ نے مطلع میں شعر بیان کیا ہے۔ اگر میں یہ بھی دوسرے گہرے انداز سے کہوں "وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں" اس کا مطلب یہ ہے کہ رات، دن مہینہ اور سال، گر ہم دوسرے انداز میں بھی پڑھنے والوں کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ مطلب شاعر نے گہرے انداز سے شعر کو بیان کیا ہے۔ مضمحل کو مقطع میں بیان کر کے اُردو زبان میں اگر وہ یہ بیان کر کے اُداس کا استعمال کرتے لیکن شاعر نے نہیں کیا، قوی گلی کو کہتے ہیں لیکن گلی کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے فارسی کا ہی لفظ پھر استعمال کیا ہے۔ باقی الفاظ جن کو میں پڑھتا ہوں وہ اُردو کے لفظوں سے ملتے جلتے ہیں۔ تمام الفاظ اُردو زبان کے ہی ہیں۔ اگر شاعر نے وزن کے اعتبار سے بھی مطلع اور مقطع کو اس انداز میں بیان کیا ہوتا تو ہمیں سادہ طریقے سے سمجھ میں آتا۔ پھر بھی مقطع اور مطلع سادے الفاظ میں ہی بیان کیا گیا ہے اور پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے۔ میرا کہنے

کا مطلب ہے غالب نے آمد کا طریقہ زیادہ استعمال کیا ہے۔ مطلب قدرتی شاعری غالب میں موجود ہے ورنہ میں مطلع اور مقطع کو اس انداز سے لکھوں اور ایسا ہی مطلب اس لکھنے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسے

وہ جدائی اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
اُداس ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

مطلب میں نے وزن کے حساب سے لفظ 'فراق' کو 'جدائی' میں تبدیل کیا اور لفظ 'مضمحل' کو 'اُداس' میں تبدیل کیا۔ اس سے بھی شاعری کا نچوڑ غالب کے انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ میں نے پڑھنے والے کو یہ سکھایا کہ کیسے شاعری میں الفاظ کا ہیر پھیر کرتے ہیں لیکن انداز بیان ایک ہی ہوتا ہے، اگرچہ ہم غالب کے اس غزل کے مطلع اور مقطع پر بحث و مباحثہ کریں تو ہم یہی کہیں گے کہ غالب کے انداز قلم سے قدرتی شاعری پائی جاتی ہے جس سے پڑھنے والا بہت ہی متاثر ہوتا ہے۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

شاعر کہتے ہیں کہ جب میں معشوق سے جدا ہوا اور پاکِ محبت میں معشوق سے وصل نہ کر سکا تو میں نے اپنے ہمدرد دوستوں کے ساتھ بیان بازی کی۔ میں نے ان سے کہا وہ جدائی اور ملن کہاں ہے۔ میں مطمئن ہی نہیں ہوں اگر میں جدا رہتا ہوں۔ تو میں ان کو دل میں رکھ کر یہ سوچتا ہوں کہ اب وہ جدائی کہاں رہی میرے انداز میں وصال ہے، لیکن جب میں گہرے انداز میں سوچتا ہوں تو میں بھی کہتا ہوں کہ وہ میں جدائی میں ظاہری طور پر وصل کرنے بیٹھتا ہو، لیکن ایسی سوچ میں ڈوب کر میں نے شب و روز و مہینہ اور سال گزارا۔ جب پاک

محبت میں اپنے معشوق کے ساتھ میری کوئی بھی ملاقات نہیں ہوئی نہ انہیں احساس ہوا تو میں یہ کہنے لگا کہ کتنی راتوں، کتنے مہینوں اور کتنے سالوں تک مجھے جدائی میں اپنی زندگی بسر کرنی پڑی اور میرا وصال معشوق سے کب ہو۔

مضمحل ہو گئے قوی غالبؔ

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

میں نے پہلے غالب کی ہر غزل کے مطلع اور مقطع پر یہ بیان کیا ہے کہ مطلع اور مقطع ایک ہی ہے۔ اگر چہ مفہوم میں فرق ہے لیکن مطلع کے مطلب کا نچوڑ مقطع سے ملتا جلتا ہے۔ غالب کی ہر ایک غزل میں مطلع اور مقطع کے مفہوم الگ الگ ہونے کے باوجود ان میں جوڑ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح شاعر بیان کرتے ہیں کہ جب میں جدائی میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں تو میں یہ سوچتا ہوں کہ کتنی شب، کتنے مہینے اور کتنے سال اور گزریں گے جس کے بعد میں اپنے معشوق سے میل میلاپ کر سکوں۔ ایسے انداز میں شاعر فرماتے ہیں کہ میں ان خیالات میں ڈوب کر مایوس اور اداس ہوں اور یہی سوچتا ہوں کہ مجھے ایسا شخص ملنا چاہیے جو مجھے معشوق کی گلی ہی دکھادے مطلب جہاں وہ رہتی ہے۔ وہاں پر بہت سے ایسے آدمی بھی رہتے ہوں گے جن پر میں اعتبار کروں اور ان سے یہ کہوں کہ کتنے سالوں، کتنی راتوں اور کتنے مہینوں تک میں اپنے معشوق سے جدا رہوں گا۔ لیکن میری ان عناصر سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ اسی لئے میں فریاد اپنے آپ ہی سے کر کے اداسی میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں۔

اگر چہ میں غالب کے مقطع کو لفظ غالب کے مفہوم میں بیان کروں تو میں کہوں گا کہ شاعر فرماتے ہیں کہ اگر ہماری محبت میں جدائی لکھی ہوئی ہے تو کتنی راتیں، کتنے دن اور کتنے سال ہمارے میل ملاپ کے لئے لگیں گے۔ محبت میں معشوق سے ملنے کیلئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے ہمیں اُداس نہیں رہنا چاہیئے۔ کوئی شخص ہم سے یہ کہے کہ آپ پر معشوق کو اعتبار ہی نہیں ہے۔ اسی لئے وہ آپ سے مہینے، سال، اور دن جدائی میں گزارتے

ہیں، مطلب جب تک نہ وہ آپ کے خیالات سے واقف ہو جائے تب تک جدائی میں ہی زندگی بسر کرنی ہے۔اس خیال کو مدنظر رکھ کر میرے خیال میں غالب نے اپنے لفظ غالب کے مفہوم میں یہ بیان کیا۔ان باتوں کا خیال نہیں رکھنا چاہئے بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ ہمیں معشوق کے ساتھ محبت ہے اور محبت میں اداس نہیں رہنا چاہئے۔ہمیں فتحیابی کر کے ہی اپنے معشوق کے ساتھ ملنساری کرنی ضروری ہے۔محبت میں کئی سالوں،راتوں اور مہینوں کے بعد ہمارا وصل ضرور ہوگا اور وصل ہونے پر ہمیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ ہم پاکِ محبت میں ہمیں فتحیابی ہوئی ہے۔

وہ فراق اور + وہ وصال کہاں = وہ فراق اور وہ وصال کہاں

وہ شب و روز + و ماہ و سال کہاں = وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

مضمحل ہوگئے + قوی غالبؔ = مضمحل ہوگئے قوی غالبؔ

وہ عناصر میں + اعتدال کہاں = وہ عناصر میں اعتدال کہاں

''وہ فراق اور''

بہت دن گزرے جب ایک شہر میں طوفان آیا، بہت سے مکانوں کو نقصان ہوا۔کئی آدمیوں کا پتہ ہی نہیں وہ زندہ ہیں یا اس دنیا سے چل بسے۔ایسے ہی حالات میں ایک آدمی طوفان کے لپیٹ میں آکر کسی ایسے جنگل میں پہنچا جہاں پر رسل وسائل کا ذریعہ دیکھنے میں نہیں آیا۔یہ آدمی سوچنے لگا کہ طوفانی ہوا نے مجھے اس جنگل میں پہنچایا۔پریشانی کی حالت میں یہ سوچنے لگا کہ مجھے اپنے کنبے سے ہوا کے جھونکوں نے ہی الگ کیا۔جس کی وجہ سے میں اس جنگل میں اکیلا ہوں۔یہاں کوئی رسل وسائل کا ذریعہ ہی موجود نہیں ہے۔خوف زدہ آدمی اب کسی دوسرے پہاڑ کی طرف جانے کے لئے کوشاں ہوا لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنے لگا کہ یہاں ڈھلان ہے اور چاروں طرف پانی ہی پانی دیکھنے میں آتا ہے۔جس سے وہ پریشان رہا کہ میں اسے کیسے پار کروں کیونکہ پانی کا بہاؤ بہت ہی تیز ہے۔سوچتے ہوئے کہنے لگا کہ

میرے الفاظ یہی ہے کہ ''وہ فراق اور'' مطلب میں جدائی میں اور، میں جدا ہو کر اپنے کنبے کو نہیں دیکھ سکتا ہوں اور ان کے لئے مجھے پریشانی میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ طوفان نے ان کو کہاں پہنچایا ہو گا کیا وہ زندہ ہیں لیکن میں ان الفاظ سے اپنی سوچ کو قلمبند کرتا ہوں

''وہ فراق اور''

''وہ وصال کہاں''

جب اس آدمی کو ایسے خیالات آئے اور خوف زدہ ہو کر دوسری طرف نہیں جا سکا۔ سوچتے ہوئے یہی سوچا کہ میں اپنے گھر والوں سے جدا ہوا ہوں۔ اب کھانے پینے کا انتظام ہی نہیں۔ تقریباً ایک ہفتہ سے کچھ بھی کھایا نہیں۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک جانور روٹی کا ٹکڑا لایا اور اس آدمی کے حوالے کیا۔ یا تو جانور کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا گر گیا یا پھر آدمی نے اس کو زمین پر دیکھا۔ اس آدمی نے روٹی کے ٹکڑے کو ہی کھایا اور چباتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہی روٹی کا ٹکڑا میرے لئے امداد ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب میں اپنی بیوی سے ناز ونخرے کر کے روٹی چباتا تھا کہ روٹی اچھی نہیں بنائی ہے اور یہ بھی کہتا تھا کہ روٹی اچھے طریقے سے بناؤ۔ عورت مجھ سے ڈرتی تھی۔ وہ ہمیشہ میرے مزہ کے مطابق ہی ہر کھانا بناتی تھی۔ لیکن جب ایک ہفتہ تک اپنے کنبے سے طوفان کی وجہ سے دور رہا اور آج مجھے ایک ایسی روٹی کو چبانا پڑا جس روٹی کو میں نے کبھی نہیں چبایا۔ خیر زندگی میں ایسا وقت اور دور بھی آتا ہے۔ چباتے ہوئے اپنی بیوی کو یاد کرنے لگا، یاد کرتے ہوئے یہی کہا کہ ''وہ وصال کہاں'' مطلب مجھے کب اپنی زندگی میں بیوی سے ملاقات ہو گی۔ ورنہ مجھے اتنی مشکلات اس پہاڑ پر اور سہن کرنی پڑیں گی اور خوفناک مناظر دیکھنے پڑیں گے۔

''وہ شب و روز''

جب بہت وقت گزرا مطلب ایک ہفتہ گزرا تو یہ آدمی پریشانی کے حالات میں سوچنے لگا کہ رات کو ڈرتا بھی ہوں اور خوف زدہ ہو کر یہ محسوس کرتا ہوں جیسے کسی قید خانے میں ہوں

کیونکہ رات کے وقت ہی اس طوفان نے مجھے ایسی جگہ پہنچایا ہے جہاں رات کو مجھے خوف کی وجہ سے سکون کی نیند بھی حاصل نہیں۔ مطلب میں خوف کی وجہ سے بیدار رہتا ہوں۔ بہت سے جنگلی جانور کی بولیوں کی وجہ سے میں ڈرتا رہتا ہوں اور اس ڈر کی وجہ سے یہ یہی خیال آتا ہے کہ یہ شب جو ہے یہ ایک جہنم کا منظر ہے۔ رات کو میں دریا کے بہاؤ کی آواز بھی سنتا ہوں۔ میں برف کے منظر دیکھ کر محسوس کرتا ہوں جیسے کہ چاندنی رات ہو کیونکہ سفید رنگ ہونے کی وجہ سے چاندنی رات کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے اس برف کو دیکھنے سے رات اچھی کٹتی ہے۔ اگرچہ میں ڈرتا بھی ہوں لیکن سفید رنگ اور چاند کی روشنی کی وجہ سے میں رات گزارتا ہوں۔ اگرچہ مجھے نیند نہیں آتی ہے لیکن ان مناظر کو دیکھنے سے رات اچھی کاٹتا ہوں۔ اور رات کاٹتے ہوئے یہ سوچتا ہوں کہ وہ رات کہاں گئی جسے میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ گزارتا تھا اور بجلی کی روشنی میں بہت سے کام پورے کرتا تھا۔ مطلب مختلف کتابوں کو پڑھتا تھا اور ریڈیو سے خبریں بھی سنتا تھا۔ ٹی وی کے مناظر سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن اُس شب اور اِس شب میں فرق ہے اور میں یہی کہتا ہوں کہ طوفان نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اسی طوفان میں یہ مناظر اور یہ رات دیکھ کر کہتا ہوں کہ ''وہ شب وروز'' مطلب رات کو طوفان نے مجھے کیسے کیسے مناظر دکھائے اور ان مناظر کو دیکھ کر بہادری سے سامنا کرتا ہوں۔

''ماہ وسال کہاں''

کئی ہفتوں کے تک میں اس ڈھلان پر اپنی زندگی بسر کرتا رہا لیکن کسی کسی دن کھانے کو کچھ ملتا مطلب کبھی روٹی کا ٹکڑا اور کبھی پہاڑی پیڑوں کے پتے۔ کبھی ایسے پھول بھی چباتا جن کو چبانے پر مجھے بھوک ہی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن کسی بھی جنگلی جانور کو نہیں دیکھا۔ اگرچہ ان کی آواز میں مستقل سنتا تھا لیکن میرے پاس یا میرے سامنے کبھی بھی نہیں آئے۔ نہ ہی میں ان کے سامنے سے گزرا۔ خدا کا شکر ہے ان کو نہ دیکھنے کی وجہ سے میں زیادہ خوف زدہ نہیں ہوا۔ اخیر میں انہیں حالات میں اپنی زندگی اس پہاڑ پر گزارتا رہا۔ کبھی بھی اس پہاڑ میں جہاز

کی آواز نہیں سنی۔ میں رات اور دن جاگتا ہی رہا لیکن یہ بھی سوچتا رہا کہ اس سے بہتر موت ہی اچھی ہے۔ یہ بھی خیال آیا کہ طوفان نے مجھے یہاں پٹکا لیکن بھوکا نہیں رکھا۔ قدرتی مناظر سے ہی بھوک مٹ گئی اور اگر نیند بھی نہیں آئی مگر رات کی چاندنی کا منظر اور برف کے سفیدی کو دیکھ کر وقت گزارتا رہا۔ دن کو کبھی کبھی آفتاب کے کرنوں کو دیکھ کر خوش بھی ہوتا لیکن یہ بھی سوچتا کہ مجھے سورج کی روشنی پوری ہی نہیں مل پاتی کیوں کہ اتنا گنجان ور ڈھلواں پہاڑ کہ جہاں پر درخت ہی درخت نظر آتے تھے۔ سورج کی روشنی آتی تھی لیکن درختوں کی وجہ سے گرمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اب میں اس طوفان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اے طوفان آپ نے مجھے یہاں پہنچایا لیکن موت سے بھی بچ گیا۔ اب میں گذارش کر رہا ہوں کہ مجھے اپنے انداز سے کسی ایسی جگہ پر منتقل کیا جائے جہاں مجھے کھانے پینے کا سامان میسر ہو جائے۔ مجھے کسی ایسے طریقے سے یا ہوا کے ذریعے پہنچا دو۔ کتنے مہینوں اور سالوں تک میں یہاں رہوں اور رہ کر بھی میرا کام کیا ہے۔ ہاں مجھے آپ نے موت سے بچایا۔ وہ یہ کہ ہوا کے جھونکوں نے مجھے دریا میں نہیں پھینکا بلکہ ایسے ڈھلوان پہاڑ پر پٹکا جہاں مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے زندہ رکھا۔ اگر چہ زندہ رہنے کا سامان یہاں میسر نہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ بھوک مٹانے کے لئے کھاتا ہوں۔ میں یہ کہہ کر اس بات کو اختتام پذیر کرتا ہوں اور ہر وقت طوفان سے کہتا ہوں ''ماہ وسال کہاں'' جب میں اس بات کا اختتام ان الفاظ سے کرتا ہوں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اے طوفان کتنے سالوں اور مہینوں تک ٹھہرنا پڑے۔ کیا میں اپنے گھر والوں سے نہیں مل سکتا۔ ان کی بھی پریشانی ہے کہ طوفان نے ان کو کہاں سے کہاں تک پہنچایا ہوگا۔ کیا میرا بچہ ٹھیک ٹھاک ہے؟ کیا میری بیوی اپنی عزت کو بچاتی ہوگی؟ میرے کتے کی کیا حالت ہوگی؟ کب میں ہر ایک معاملے کا جائزہ لے سکوں گا؟ اے طوفان میں پھر یہی کہہ رہا ہوں۔ **''ماہ وسال کہاں''**

''مضمحل ہو گئے''

آدمی اس ڈھلان میں سوچتے ہوئے پریشان ہو رہا ہے۔ دن رات گھر کا ہی خیال آتا

ہے۔ کپڑے بھی نہیں بدلے ہیں۔ صرف کچھے اور شرٹ میں دن ورات گزر رہے ہیں۔ ایک دن بکروال اپنی گائے کو لیکر دوسرے پہاڑ کے جانب چل رہا تھا۔ اس آدمی کی نظر بکروال پر پڑی۔ آواز چلا کر دی مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ، بہت دیر کے بعد بکروال نے آواز سنی۔ سن کر وہ پریشان ہوا کہ انسان کیسے اس پہاڑی ڈھلان پر پہنچا؟ جو کہ ایک خطرناک جگہ ہے۔ چاروں طرف دریا ہے۔ اس گہرے دریا کو پار نہیں کر سکتے ہیں۔ سوچتے ہوئے بکروال نے اس سے یہ کہا کہ آپ وہیں ٹھہرنا میں کسی نہ کسی طریقے سے بچانے کی کوشش کروں گا۔ بکروال نے صرف یہ سوچا ہی تھا کہ اس نے ہاتھوں سے اشارہ کیا، ٹھہریئے ٹھہریئے۔ اس آدمی نے بکروال کا اشارہ دیکھا لیکن پھر بھی اس آدمی نے اداسی سے کہا کہ کوئی جواب نہیں آیا۔ مطلب مجھے نہیں بچا سکے۔ اس بکروال کو دن بھر اپنے بھیڑ بکریوں کے ساتھ دیکھا لیکن شام کے وقت بکروال کو نہیں دیکھا آدمی پریشان ہوا۔ اداسی میں یہ سوچنے لگا صرف بکروال نے دیکھا لیکن مجھے بچا نہیں سکا۔ مجھے کیوں نہیں بچا سکا۔ سوچتے ہوئے یہ بھی کہنے لگا کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس بکروال کے ذریعہ بچ سکتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی طریقہ سوچے گا جس سے میں اس ڈھلوان سے نکل جاؤں۔ کئی دنوں اور مہینوں تک اس بکروال کو دیکھا ہی نہیں۔ آدمی بہت پریشان رہا۔ میں کہنے لگا میری زندگی کا حشر کیا ہوگا۔ میں ایک قیدی کی طرح یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ پتہ نہیں مجھے قدرت کتنے دن تک اس قید خانے میں رکھے گی۔ کیا قدرت کا واسطہ اس طوفان کے ساتھ نہیں رہا ہے؟ ایک بکروال بھی مجھے دیکھ کر نہیں بچا سکا اور نہ میرے پاس آسکا۔ اسی سوچ میں آدمی ”مضمحل ہوگئے“ مطلب اداس ہوگئے اُداسی میں روتے ہوئے یہ دعا کی کہ اے خدا مجھے اس اداسی سے مبرا کر۔ **”مضمحل ہوگئے“**

”قوی غالبؔ“

آدمی بہت پڑھا لکھا تھا پڑھنے لکھنے کے وجہ سے ہی اس میں اتنی قوت تھی کہ وہ اپنی زندگی کئی سالوں، مہینوں اور کئی راتوں تک اس ڈھلان میں بسر کرسکا۔ تبھی تو زندہ رہا ورنہ اس

ڈھلان کے اردگرد اتنے گہرے دریا ہیں کہ ان کی آواز سن کر ہی انسان لرزتا ہے۔اس آدمی نے بہت سی زبانوں میں کتابیں پڑھی تھیں مثلاً اُردو اور ہندی کی کتابیں۔انہیں کتابوں کے علم سے اتنا وقت ڈھلان پر گزارا۔اس آدمی کو غالب کے کئی شعر یاد آنے لگے اور سوچنے لگا کہ غالب نے ''قوی غالبؔ'' لفظ بیان کیا ہے۔مجھے یاد آرہا ہے ''قوی غالبؔ'' اس لئے تو نہیں بیان کیا کہ بہادری کی کوئی گلی ہوتی ہے۔جس طرح میں نے اس بکروال کو دیکھا اور میں حیران ہوں کہ کیسے اس پہاڑ پر اپنے بھیڑ بکریوں کے ساتھ آیا ہے جبکہ ہر طرف دریاؤں کا مناظر دیکھتا ہوں ایسے دریا جو بہت گہرے ہیں اور میں بھی ڈرتا ہوں ان دریاؤں کو پار کرنے سے۔کیا وہ بکروال جسے میں نے دیکھا وہ ''قوی غالبؔ'' ہے مطلب اس کو غالب کے کوچے کی طرح کوئی کوچہ معلوم ہی ہوگا جس کوچہ کے راستے سے بکروال پھر شہر میں پہنچتا ہوگا یا پہاڑوں کے ایسے راستوں سے پھر شہر میں داخل ہوسکتا ہو۔لیکن کاش ''قوی غالبؔ'' کی یاد ہی نہیں آئے۔مطلب شاعر کو کوئی نہ کوئی کوچہ یا گلی یاد آرہا ہو جس سے وہ بکروال پھر بستی میں پہنچ جائے۔اب سوچ کر میں یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ غالب نے بھی کہا ہے کہ میں بھی اداس ہوں پاک محبت میں۔میں نے معشوق کی گلی کو نہیں دیکھا مطلب ''قوی غالبؔ'' نہیں دیکھی۔اسی طرح سے مجھے معلوم نہیں کونسی گلی ایسی ہے جس سے کہ وہ بہادری سے فتحیاب ہو کر شہر میں پہنچتا ہو۔کیا وہ میرے لئے کسی کو کچھ نہیں کہے۔جس سے میری زندگی بچ جاتی۔اگر خدا نے مجھے زندگی عطا کی تو میں شہر میں پہنچ کر ضرور ''قوی غالبؔ'' پر تبصرہ لکھوں گا اور میں یہی کہوں گا کہ مجھے ''قوی غالبؔ'' کسی ڈھلان پر یاد آگئی۔اور ممکن ہے اس نے بھی معشوق کے لئے کوئی کوچہ تلاش کیا۔اسی طرح میں بھی شہر میں جا کر یہی کہوں گا کہ ''قوی غالبؔ'' میرے دماغ اور دل میں زیادہ نمودار رہوا۔میں ایک ڈھلان میں اکیلا کئی سالوں تک اپنی زندگی بسر کرتا رہا۔

''وہ عناصر میں''

بکروال کو آواز دینے اور اشارہ کرنے کے بعد کئی مہینوں تک آدمی نے اس بکروال کو

دیکھا ہی نہیں۔دیکھا مطلب بکروال نے اسے ہاتھوں سے ہی اشارہ کیا لیکن اشارہ اس طرح سے کہ وہ اس آدمی کو اس ڈھلان سے اپنے ساتھ لے کر شہر میں پہنچا تا لیکن بکروال کے ذریعے بچاؤ ہی نہیں ہوا۔اگر چہ بکروال نے اشارہ بھی دیا لیکن اس اشارے کا اثر ہی آدمی نے نہیں لیا۔بکروال کئی مہینوں کے بعد شہر پہنچا وہاں پر اس نے بہت سے شہری آدمیوں کو اس بات سے آگاہ کیا کہ اس نے ایک آدمی کو کسی ایسی ڈھلان پر اکیلا بیٹھا ہوا دیکھا اور آواز دے رہا ہے کہ مجھے بچاؤ۔ میں اسی لئے آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ دماغ کا استعمال کرتے ہوئے اسے کسی طرح بچانے کی کوشش کرو،لیکن مجھے اب تک یہ معلوم نہیں کہ وہ آدمی زندہ ہے یا مر گیا ہے۔کئی لوگوں نے بکروال کو غور سے سن کر سوچنے لگے کہ ہم اس آدمی کو ڈھلان سے شہر کی طرف کس طرح لائیں گے جبکہ رسل و وسائل کے آثار ہی ممکن نہیں۔اس میں ہوش وحواس ہونے چاہئے اور وہ اسی لئے ہونے چاہئے کہ جہاز کس طرح سے ڈھلان پر پہنچے۔کیونکہ بکروال کے مطابق ڈھلان پر بہت سے درخت ہیں جن سے ڈھلان گنجان ہے مطلب درختوں کی وجہ سے زمین نظر نہیں آتی۔کئی لوگ سوچ کر کہنے لگے کہ ہم بکروال کے ساتھ جائیں گے اور ان سے یہ کہیں گے کہ درختوں کو کاٹ کر ڈھلان نظر آئے گی۔جس سے جہاز کا آنا ممکن ہو جائے گا۔اس طرح سے بہت سے اپنی اپنی رائے دینے لگے۔آخر بکروال سے بہت لوگوں نے یہ کہا کہ ہم آپ کیساتھ جائیں گے اور اس آدمی کو دیکھیں گے اگر زندہ ہوگا تو ہم اس کو صحیح سلامت شہر لائیں گے۔اس طرح سے کئی لوگوں نے بکروال کو اعتماد دلایا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔بکروال نے سوچ سمجھ کر کہا کہ کوئی بھی حرکت ایسی نہیں کرنی جس کی وجہ سے آپ راستے میں خطرے کے باعث بن سکیں۔مطلب اپنے دماغ ٹھیک سے استعمال کرنا۔ہوش وحواس قائم رکھ کر آپ میرے ساتھ پہاڑی سفر اچھے طریقے سے کر سکتے ہو۔سب لوگوں نے کہا کہ بکروال اپنے ہوش وحواس قائم رکھتا ہے ہمیں بھی اسی طرح سے پہاڑی سفر کرنا ہے اور بکروال کے ان اصولوں پر چلتے ہوئے یہ کہنا ہے کہ ''وہ عناصر میں''

مطلب بکروال ہوش وحواس میں ہی پہاڑی سفر انجام دیتا ہے۔اسی طرح سے ان آدمیوں نے بھی یہ کہا کہ ہمیں بکروال کے طرز پر چلنا ہے جس سے کہ ہم یہ کہیں ''وہ عناصر میں''

''اعتدال کہاں''

جب آدمی کو بچانے کے لئے کئی لوگوں نے مان لیا کہ ہم بکروال کے کہنے کے مطابق اس پہاڑ پر پہنچ کر آدمی کو بچائیں گے، لیکن کئی لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں یہ بھی بھروسہ نہیں کہ کیا وہ آدمی اس ڈھلان پر زندہ ہوگا یا مر گیا ہوگا۔اس بات پر قیاس کرنا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ بکروال کے مطابق ہی یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ وہ آدمی ایسی ڈھلان پر بیٹھا ہے جہاں پر کھانے پینے کے چیزیں میسر ہی نہیں ہیں اور خطرناک ڈھلان ہے۔اس پر لوگوں نے یہ کہا کہ ہمیں بکروال کے کہنے پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے اور کئی لوگوں نے بھروسہ کرنے کو کہا، ایسے دلائل سن کر بکروال نے سوچا کہ میں ان کے ساتھ اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ان لوگوں کو احساس ہی نہیں ہے کسی آدمی کو بچانے کا۔ان لوگوں میں یہ بھی احساس نہیں ہے کہ ہم بکروال کے ساتھ جا کر اظہار افسوس یا ہمدردی باتوں سے ہی جتاتے ہیں ہاتھوں سے کچھ نہیں کرتے۔بکروال نے یہ بھی کہا کہ میں نے ان کا بھروسہ جیتا لیکن انہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ ان کو میں یہ بھروسہ دلاتا ہوں کہ میں اس جگہ تک انہیں پہنچاؤں گا اور اس آدمی کو ڈھلان پر دکھاؤں گا جو کہ شہر کی طرف نہیں آسکتا۔اور وہاں پہنچنے کے رسل و وسائل مؤثر ہے ہی نہیں لیکن سوچتے ہوئے بکروال نے یہ کہا کہ ان آدمیوں میں ''اعتبار کہاں'' مجھ پر۔ان کو میرا بھروسہ ہی نہیں اعتدال ہی نہیں۔اب یہ کونسی ہمدردی اس آدمی کو بچانے کے لئے کریں گے۔یہ کہتے ہوئے بکروال ان لوگوں سے الگ ہوا اور پھر لوگ اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن بکروال بھاگ گیا۔اور کہنے لگا کہ اعتدال کہاں اعتدال کہاں۔لوگ پریشانی میں مبتلا ہوئے اور یہ کہنے لگے کہ ہمیں بکروال کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہئے تھا۔خیر بکروال کہاں گیا اور لوگوں نے پھر کیا کیا اس پر ہم کچھ نہیں لکھ سکتے۔

اگر میں اس دلیل کو عنوان کے لئے استعمال کروں تو اس کا عنوان میں یہ لکھوں گا کہ ''آدمی میں انسانیت لازمی'' یا ''اعتدال کہاں''

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
وحشت وشیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

دیوان غالب میں اس غزل کے مطلع اور مقطع کو گہرائی سے پڑھا۔ شاعر نے اس میں معشوق اور محبوب کے دلائل سے آگاہ کیا ہے۔ مطلع اور مقطع کو الگ الگ بیان کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ شاعر کو لفظ مرثیہ استعمال نہیں کرنا چاہئے، لیکن شاعر کی آمد پر میں کوئی بھی بحث کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ دوسری بات شاعر نے یہ بھی بیان کی ہے 'مرگیا غالب' یہ شاعر نے اچھا کہا ہے لیکن میں نے عام طور پر ہر غزل میں یہ پڑھا کہ شاعر اپنے واویلا کیلئے بہت کچھ لکھتا ہے جبکہ وہ معشوق سے اپنی جدائی کے اثر کو بیان کرتا ہے۔ اگر غالب نے لفظ مرگیا استعمال کیا ہے تو کئی فتح کرنے کے بعد اس دنیا میں مرتے بھی ہیں لیکن فاتح خوش رہتا ہے۔ خوشحال ہوتا ہے اور مرگیا استعمال نہیں کرتا۔ ہاں وہ فتح کرنے کے بعد دو تین دن یا دو گھنٹے کے بعد مرنے کا امکان ہوتا ہے لیکن فتحیابی کے ساتھ وہ لفظ مرگیا استعمال نہیں کرے گا۔ اب دوسری صورت میں جب وہ کسی چیز کو فتح کرے گا تو اس کے بعد یہی کہے گا کہ دشمن مرگیا۔ دشمن میں قوت ہی نہیں ہے تب مرگیا لفظ ٹھیک ہے۔ تو غالب کا انداز بیان اور سوچ ہے کہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مرگیا غلط لفظ ہے یہ شاعر کے آمد پر ہی سب کچھ بیان کر کے پڑھنے والے پڑھتے ہیں اور لفظ 'وشیفتہ' کو بھی غالب نے لفظ 'وشیفتہ' کہہ کر صاف بتایا ہے کہ اس کے ساتھ ہی مرثیہ کا لفظ ضرور نمودار ہو جائے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے شاعر کے مقطع میں اچھی طرح سے بیان بازی غزل کے مطابق لکھی ہے۔ آج کل کے شاعروں میں ایسے طریقے کا رجحان لکھنے میں

نہیں پڑ سکتے اور دوسری بات غالبؔ کے اس مطلع اور مقطع میں یہ بھی پڑھنے میں محسوس ہوتا ہے کہ اگر چہ مطلع کو سادہ الفاظ میں بیان کیا اور اس بیان بازی کو مقطع سے ہی جوڑ کر اپنی بیان بازی کو اختتام پذیر کیا ہے۔ جو کہ دوسرے شاعر کے لکھنے میں بہت ہی مشکل ہے۔ اس میں میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غالب کو غزلوں میں آمد ہمیشہ ظاہر ہوتی رہی ہے۔ جس سے کہ اس نے قدرتی طرز کی شاعری عوام تک پہنچائی۔ میرے خیال میں غالبؔ نے جو غزل تحریر کی ہے جس میں آمد زیادہ ہے مطلب قدرتی شاعری کا ردعمل ہے۔ قدرتی شاعری کے ہونے کے ناطے کئی الفاظ کو لکھنے سے یا بتانے سے تنقید نگار اپنی رائے لکھتے ہیں۔ لیکن میں اس رائے کو بھی درست مانتا ہوں۔ میرے خیال میں غالب نے مقطع میں لفظ وحشت کو صحیح ٹھہرایا ہے لیکن مرثیہ کو صحیح نہیں ٹھہرایا ہے۔ اگر مرثیہ کے بجائے واویلا کہیں گے تو غزل کے وزن کے مطابق لفظ مرثیہ اور واویلا ایک ہی سمجھا جائے گا۔ اسی طرح سے مقطع میں ہی غالب نے لفظ مر گیا بھی اچھا نہیں فرمایا ہے۔ اگر مر گیا کے بجائے افسوس لکھتا تو وہ صحیح رہتا لیکن قدرتی شاعری کے جامہ پہننے سے ہم شاعر کی قلم پر دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اپنے اپنے خیال اور اپنی اپنی قلم۔ غالب نے مطلع میں ہی صحیح لکھا ہے وہ یہ کہ '' کی وفا ہم سے'' اسی وفا کے مدمقابل جفا کا لفظ بھی صحیح لکھا ہے لیکن صرف مقطع میں ہی الفاظ غلط ہیں مطلب اگر شاعر ہے تو مر گیا پڑھنے والا صحیح نہیں برداشت کرتا۔

میرے خیال میں مقطع کو ہم اس طرح سے بھی لکھ سکتے ہیں جیسے

وحشت و شیفتہ اب واویلا کہویں شاید
افسوس غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

اب پڑھنے والے خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غالب کے مقطع پر کوئی اصلاح نہیں کی ہے بلکہ میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس اظہار پر پڑھنے والوں کو بھی اپنی اپنی رائے سے واقف کرانا چاہتا ہوں۔ خیر اس کتاب میں میں نے غالب کے تمام شعر آمد کے دائرے میں

ہی لکھے ہیں۔شاعر نے آمد کے بغیر کچھ نہیں لکھا ہے۔کئی شاعر زور زبردستی سے شعر کو لکھتے ہیں اور زور زبردستی سے قلم اٹھانے میں کامیاب ہوتے ہیں لیکن ان کی شاعری اتنی مقبول عام نہیں ہوتی ہے جتنی کہ آمد والے شاعر کی شاعری مقبول عام ہوتی ہے۔ غالب کے ہر ایک شعر میں بلند پایہ مطلب سمجھتے ہیں خیر سوچ اپنا اپنا خیال اپنا اپنا۔

کی وفا ہم سے ،تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

شاعر فرماتے ہیں اے معشوق بہت لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے آپ کے ساتھ وفاداری کی لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں وفا نہیں بلکہ جفا ہے۔لیکن یہ سن کر بھی آپ سے بے وفائی نہیں کرتا۔ بہت سارے عناصر اس دنیا میں جدا کرنے کیلئے ایسی باتیں کہتے ہیں۔کئی لوگ برے آمیوں کو اچھا کہتے ہیں اور اچھے لوگوں کو بہت برا کہتے ہیں ۔مطلب اپنے تاثرات سب کو صحیح انداز سے نہیں دیتے ہیں۔اسی لئے اے معشوق میں پاک محبت میں ایسے الفاظ نہیں سننا چاہتا ہوں نہ ان الفاظ پر بھروسہ کرنے والا آدمی ہوں۔ میں ایسا معشوق ہوں کہ اگر میں نے آپ کے ساتھ وفاداری کی ہے میں کسی کے ذریعے یہ سن کر تسلیم نہیں کروں گا کہ آپ جفا کرتے ہو۔میں یہ تسلیم کروں گا کہ آپ کے دل میں میرا کوئی نہ کوئی خیال ہےاور میں کیسے جفا کے طور پر آپ کو کہوں کہ میں وفا کے طور پر ہی آپ کیساتھ زندگی بسر کروں اور وفا ہی کروں۔

وحشت وشیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

مقطع میں شاعر فرماتے ہیں کہ میں ان باتوں پر بھروسہ کرنے والا نہیں کہ کئی لوگ یہ کہیں کے معشوق میں وفا نہیں اس میں جفا ہے۔میں آپ کی وفا پر پورا اعتماد کرتا ہوں اور اعتماد میں ایسی بات دل میں رکھی ہے۔اب اسی بات کا حوالہ دے کر غالب فرماتے ہیں کہ جب کئی لوگ

یہ کہہ کر معشوق کوڈراتے دھمکاتے ہیں تو وہ محبت میں ٹکراؤ پیدا کرتے ہیں۔ان کو اس بات پر توجہ نہیں دینی چاہئے۔ان کو محبت میں ٹکراؤ پیدا نہیں کرنا چاہئے۔یہ مفکر کا کام ہے جو کہ ایسے طریقے سے محبوب اور معشوق کے بیچ میں ٹکراؤ پیدا کرتے ہیں۔یہ گناہ ہے تبھی تو غالب مقطع میں فرماتے ہیں کہ ایسے حالات ظاہر ہونے سے انسان وحشت میں ڈوب جاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ واویلا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔لوگ اسے مرثیہ خوانی کی طرح دیکھتے ہیں، کئی کہتے ہیں کہ ایسی حالت ٹکراؤ سے پیدا ہوئی ہے۔اب معشوق اس دنیا سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ مرہی گیا۔مطلب نام ونشان ہے نہیں نہ معشوق کا اور نہ محبوب کا۔کہتے ہیں معشوق کا ایسا ماحول دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ بہت اچھی شخصیت تھے اور پاکِ محبت بہت ہی اچھا تھی۔نوجوان تھے کئی ایسا بھی کہتے ہیں کہ پاکِ محبت میں نونہال تھے لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے جدائی پر واویلا کیا۔مرثیہ خوانی کی، یہ کہہ کر اب خود غالب فرماتے ہیں کہ میں وحشت میں ڈوبنے والا آدمی نہیں ہوں۔میں مرثیہ کرنے کا احترام کرتا ہوں میں مذہبی طور پر مرثیہ کروں گا۔لیکن اے معشوق جب میں آپ کی محبت کے تناؤ میں وفائی کا پیغام جفا میں دیکھوں پھر بھی میں وحشت میں نہیں ڈوبوں گا اور اس وحشت سے میں ڈرتا نہیں ہوں۔ہاں اگر آپ میرے ساتھ بے وفائی کا برتاؤ کرو گے تو میں وفا ہی کروں گا اور خود بخود یہ کہوں گا کہ ایسے برتاؤ سے غالب مر گیا لیکن میں ہمیشہ ایک نوجواں کی طرح زندہ اور مقبول عام رہوں گا۔ مجھے سبھی میری لکھائی اور میرے جذبات پر نیا کہیں گے۔اور وہ میرے مرنے پر افسوس کریں گے۔وہ مجھے اس نام سے پکاریں گے کہ وہ مجھے نونہال کے نام سے پکاریں گے مطلب میرا تسلسل وفائی کے جاموں میں نہیں مٹ جائے گا۔میں ہمیشہ پاک محبت کی داستان بن کر تا ابد موجود رہوں گا۔یہ کہنا کہ غالب اس دنیا سے چل بسا ہے اور مرنے کے بعد اس کا نام ونشان نہیں رہا یہ غلط ہوگا۔مجھے تا ابد لوگ غالب کے نام سے ہی پکاریں گے اور کبھی تسلیم نہیں کریں گے کہ غالب مر گیا۔

اگر چہ میں غالب کیلفظ مقطع کے حوالے سے یہ بات لکھوں کہ غالب نے مقطع میں مرگیا استعمال کیا ہے، اس بات کا احساس میرے خیال میں غالبؔ غزل کے مطلع کے مطابق صحیح ٹھہراتا ہے وہ یہ کہ میری وفائی پر لوگ اگر میرے معشوق کے نزدیک آنے پر تناؤ پیدا کریں گے تو بھی میں ان کے تناؤ سے دور معشوق کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ میں لفظ جفا پر اعتبار نہیں کرتا ہوں اسی لئے ان باتوں کو مدنظر رکھ کر میں معشوق کے ساتھ ہمیشہ مقبول رہوں گا۔ میں مذہب کے دائرے کے تحت مرثیہ کا احترام کرتا ہوں لیکن جب مجھے ان باتوں میں وحشت پیدا ہوجائے گی تو میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ مرثیہ کروں یا افسوس۔ میں یہ کہوں گا کہ مجھ میں قوت ہے میں زندہ ہوں اگر لوگ اس تناؤ سے کہیں گے کہ غالب مرگیا ہے وہ لفظ ان کو واپس لینا چاہئے ان کو سمجھنا چاہئے کہ ان اصولوں پر میں فتحیاب ہوں اور میں مرنے والا نہیں ہوں۔ تناؤ کے حالات میں بہادری کے ساتھ وفائی کا مقابلہ کرنے پر تلا ہوا ہوں اور فتحیاب ہوں۔ میں کبھی نہیں سننا چاہتا کہ مرگیا، میں مرگیا کو حذف کر کے فتحیابی میں ہی رہوں گا۔ ہاں میں یہ کہوں گا کہ میں نے پاک محبت میں فتحیابی حاصل کی ہے اور وہ لوگ جو نفاق کرتے ہیں وہ مرگئے۔ مطلب اس دنیا کے تناؤ سے دور ہو گئے۔

کی وفا ہم سے+تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں	=	کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ+اچھوں کو برا کہتے ہیں		ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
وحشت وشیفتہ + اب مرثیہ کہویں شاید		وحشت وشیفتہ + اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالب + آشفتہ نوا کہتے ہیں		مرگیا غالب + آشفتہ نوا کہتے ہیں

”کی وفا ہم سے“

جب تمام دنیا کے ملکوں میں جمہوریت کا پرچم لہرانے لگا تو لوگوں نے اپنی رائے سے حکومتیں تشکیل دیں تو شخصی راج کا دائرہ نیست و نابود ہونے لگا۔ ہاں کئی ملکوں میں ابھی بھی شخصی راج کا دور ہے لیکن عام طور پر دنیا کے کئی ملکوں میں عوامی حکومتیں ہیں اور عوام کی رائے

لے کر ہی حکومتیں تشکیل دی جاتی ہیں۔ شخصی اور عوامی راج میں کئی کام انجام دینے پر بہت سے نقطے ابھرتے تھے۔ بہت سے مخالف بھی رہتے تھے اگر کوئی اچھا کام لوگوں کے لئے کرتا رہا تو پھر اسے بھی لوگ ناراض ہوتے رہے۔ جس طرح غلام احمد نے بہت بار اپنے وطن میں اچھے اچھے کام لوگوں کے لئے کئے جس کی وجہ سے لوگ بہت ہی متاثر رہے۔ طویل عرصہ تک جب غلام احمد نے بہت سے کام لوگوں کی بھلائی کے لئے کئے تو ایک شخص احمد اللہ نے بھی غلام احمد کی طرح اپنے کام انجام دیئے۔ غلام احمد ایسا کام انجام دینے لگا جسکی وجہ سے احمد اللہ اور غلام احمد میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ غلام احمد بھی لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرنے گا اور احمد اللہ بھی۔ جہاں غلام احمد لوگوں کی بھلائی کیلئے کوئی نیا کام ہاتھ میں رکھتا تھا تو وہاں احمد اللہ کے مخالف میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ اگر چہ محلے میں کوچہ کی مرمت کرانی لازم ہوتی تو وہ دونوں مخالف طریقے سے کام انجام دیتے تھے۔ محلے والے کہتے تھے کہ یہاں سڑک ہونی چاہئے غلام احمد ان کا احترام کرتا تھا اور احمد اللہ اس کا مخالف ہو کر دوسرے محلے والوں کو کہتا کہ یہ سڑک اس طرف ہونی چاہئے۔ اس طرف تعمیر ہونی چاہئے۔ اس طرح دونوں کے کام انجام دینے پر تناؤ کا ماحول دیکھنے میں آتا۔ دونوں کے کاموں پر اپنا اپنا تبصرہ لوگ دیتے رہے۔ ان دونوں پر اپنا ردعمل کا اظہار کرتے رہے اور کہتے رہے ''کی وفا ہم سے'' مطلب جب لوگوں سے پوچھتے تھے تو غلام احمد نے آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے کیا کام انجام دیا۔ وہ لوگ جواب میں کہتے کہ جس طرح سے ہم کہتے تھے وہی کہنا مانتا رہا۔ اسی طرح سے لوگ احمد اللہ کے بارے میں بھی رائے لیتے رہے۔ وہ بھی انہیں الفاظ سے جواب دیتے رہے۔ مطلب دونوں کے کام کاج میں تناؤ پیدا ہونے لگا لیکن سبھی اس تناؤ میں یہ کہتے رہے **''کی وفا ہم سے''**

''تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں''

جب کسی بڑے عہدے دار نے لوگوں کو ان دونوں کے بارے میں تبصرہ کرنے کو کہا وہ یہی کہہ رہے تھے کہ ہم جب دونوں کو کوئی کام انجام دینے کو کہتے ہیں وہ دونوں کام مختلف

طریقوں سے انجام دیتے رہے۔ اگر ہم کسی جگہ عمارت کو تعمیر کرانا چاہتے ہیں تو وہاں تعمیر عمارت ہو جاتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مخالف لوگ اس تعمیر پر رضامندی کا اظہار نہیں کرتے۔ اس رضامندی کی رہنمائی غلام احمد یا احمد اللہ کر رہے ہیں۔ مطلب لوگوں کو اپنے دائرے میں رکھنے کے لئے ایسے کام دونوں انجام دیتے ہیں۔ اس پر بڑے عہدے دار نے یہ کہا کہ اب ان دونوں کے کام پر لوگوں سے رائے پوچھنی پڑے گی جسکا ہم احترام کریں گے۔ جس میں لوگ زیادہ تعداد میں ہاں کریں گے انہی کا کام کرنا پڑے گا۔ مطلب لوگوں کی رائے لینا۔ جب دونوں کے خیالات پر اور لوگوں کی مانگ پر رائے سرکاری عہدے دار لیتا رہا تو اس وقت ہارنے والا یہی کہہ رہا تھا "تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں" مطلب وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میری رائے پر لوگوں نے زیادہ تعداد بتا کر مخالفت کی ہے اسی لئے لوگوں کی رائے پر احترام کرتا ہوں۔ احترام کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ "تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں" مخالف لوگ میری وفا کو جفا کے نام سے پکارتے ہیں جب بھی میں اپنی رائے سے تعداد ہار جاتا ہوں۔

"ہوتی آئی ہے کہ"

جب دونوں کا مقابلہ ہوا تو لوگ دونوں سے یہ کہتے رہے کہ ہم نے اپنے انداز سے رائے دی لیکن آپ لوگوں کی وجہ سے کس رائے میں اکثریت پائی گئی جس کو سرکاری عہدیدار تسلیم کرتے ہیں۔ جب بھی دونوں میں سے ایک ہار جاتا تھا تو ہارنے والا لوگوں سے مخاطب ہو کے یہ کہتا رہا کہ "ہوتی آئی ہے کہ" مطلب ہار اور جیت دہندگانوں کی رائے سے "ہوتی آئی ہے کہ" صرف یہ کہتے تھے کہ اکثریت طور پر ہی سرکاری اور غیر سرکاری اہلکار رائے تسلیم کرتے ہیں۔

"اچھوں کو برا کہتے ہیں"

جب سرکاری عہدے دار لوگوں کی اکثریت کے مطابق کام انجام دیتے رہے یا غیر سرکاری طرز پر بھی ایسی طریقے کا ردعمل کا رانجام دیا، تو اس طریقے سے ایک دوسرے پر بطور

مخالف بلی اور چوہے کی طرح دیکھتے رہے، لیکن دونوں کام کرتے رہے۔ مطلب غلام احمد اور
احمد اللہ لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرتے رہے اور لوگوں کا کام کرتے ہوئے یہ بھی کہتے تھے
کہ کل کوئی کام کرنے پر ہمارے خلاف رائے دیتا ہے۔ لیکن ہم لوگوں کا کام اچھا ہی کرتے
ہیں۔ اسی لئے ہم ان الفاظ سے اس بات کو اختتام کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کا کام کرنا چاہتے
ہیں وہ یہ کہ ''اچھوں کو برا کہتے ہیں'' اگر ہم اچھا بھی کرتے ہیں تو لوگوں کی رائے میں برا ہوگا تو
اسی کے حق میں سرکاری اہلکار کام کرتے ہیں یا برا کرنے پر برائی کرتے ہیں، لوگ کی اکثریت
اس پر رائے دے کر اپنا ردعمل بیان کرتی ہے۔ مطلب اچھا ہو یا برا ہو سرکاری یا غیر سرکاری
اہلکار اکثریتی طور پر رائے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی لئے احمد اللہ اور غلام احمد یہ الفاظ کہہ کر لوگوں
کو کہتے ہیں ''اچھوں کو برا کہتے ہیں''

''وحشت وشیفتہ''

جب دونوں کا کام باقی لوگوں نے دیکھا کہ احمد اللہ اور غلام احمد اکیلے ہی وہ آدمی ہیں جو
لوگوں کی کام کاج کے لئے رہنمائی کرتے ہیں اور لوگوں میں دونوں مقبول عام ہو گئے ہیں۔
اگر چہ دونوں کی رائے پر اکثریت سے سرکاری یا غیر سرکاری اہلکار کام کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ
دونوں بہت مشہور ہو رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم دو تین بندے ان لوگوں کی رہنمائی کریں جس
سے کہ دونوں کا اثر لوگوں کے دائرے میں کم دیکھنے میں آئے، جب ایک اور آدمی لوگوں کی
بھلائی کے لئے اٹھا تو غلام احمد اور احمد اللہ کے درمیان سمجھوتہ ہونے لگا کہ ہم کسی تیسرے فریق
کو لوگوں کی بھلائی اور رہنمائی کرنے کے لئے اٹھنے نہیں دیں گے۔ اس بات پر دونوں
رضامند ہوئے اور دونوں نے ایسا ماحول لوگوں میں پیدا کیا کہ دونوں پر تناؤ پیدا ہونے لگا۔
مطلب ایسا تناؤ کہ وحشت کے مناظر دیکھنے میں آئے، جسے دیکھ کر اب لوگ ڈرنے لگے
اور کہنے لگے کہ کیا ہم غلام احمد کے حق میں یا احمد اللہ کے حق میں رائے دیں گے جبکہ تیسرا فریق
ہمارے درمیان دونوں کی بدنامی کا پردہ فاش کر رہا ہے۔ جب تیسرے آدمی نے لوگوں میں

ایسے بھروسے کا ماحول پیدا کیا کہ لوگوں کو دونوں کی غلطیوں کا پردہ فاش کرنے لگا۔ اب لوگ غلام احمد اور احمد اللہ کے خلاف ہونے لگے ان سے نفرت ہونے لگی۔ پھر ان دونوں نے لوگوں میں وحشت کا ماحول پیدا کیا۔ جس وحشت سے لوگ اپنی رائے دینے سے دور ہوئے وہ اب رائے دینے سے انکار کرتے ہوئے دیکھنے میں آئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اہلکاروں نے ایسے مناظر دیکھ کر اس بات کو ''وحشت وشیفتہ'' کے الفاظ سے قلم بند کیا۔ بڑے اہلکاروں چاہے وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری تنگ ہونے لگے کیوں کہ لوگوں کی بھلائی کے لئے اور تعمیر کے لئے رائے ہی نہیں حاصل ہوئی اور کام ٹھپ ہو گیا۔

''اب مرثیہ کہوں شاید''

جب لوگوں نے ایسا ماحول دیکھا تو لوگ بہت سی مشکلات میں گرفتار ہونے لگے۔ مرمت، تعمیر، سڑکیں اور کئی رسل ورسائل کے میدان میں بہت سی مشکلات محسوس کرنے لگے۔ اب لوگ یہ کہنے لگے کہ دراصل اس دنیا میں بڑے یا چھوٹے رہنما کسی دوسرے اور تیسرے کو اٹھنے نہیں دیتے۔ اسی لئے وحشت کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں نے آپس میں باتیں کیں اور تعمیرات میں بھی ترقی نہیں دیکھی۔ جس کی وجہ سے مشکلات میں اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ لوگ آخر کار تنگ آ کر یہ کہنے لگے کہ ہر ایک آدمی لوگوں میں رہنمائی کا حق رکھتا ہے اور اگر کوئی تیسرا، چوتھا یا پانچواں آدمی لوگوں میں رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔ تو ہمیں اکثریت کی رائے کا احترام کرنا ہے۔ اسی لئے کیوں ہم تعمیرات کو برباد کریں، کیوں ہم ترقی کے راستوں میں رکاوٹ پیدا کریں۔ ہمیں دوسرے فریقوں کا بھی احترام کرنا چاہئے۔ اسی لئے ترقی نہ ہونے کی وجہ سے ہم ہمیشہ واویلا کرتے رہتے ہیں۔ کئی کہہ رہے ہیں کہ محلے میں پانی نہیں، بجلی کی قلت ہے۔ اسی طرح سے بہت سی مشکلات سنا کر اب لوگ کہنے لگے کہ تیسرے چوتھے اور پانچوے آدمی کی رہنمائی پر واویلا نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں ہر ایک آدمی کی رہنمائی پر اس کا احترام کرنا چاہئے۔ وہ ان الفاظ سے اپنا تبصرہ اختتام پذیر کرنے پر تلے

رہے۔ **''اب مرثیہ کہوں شاید''**

''مر گیا غالب''

جب لوگوں نے اس بات پر پورا اعتماد کیا کہ ہمیں کسی ایک کے علاوہ بہت سارے رہنماؤں کا احترام کرنا ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں۔ اسی لئے ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ دو ہی فریق ہیں۔ ہمیں ہر ایک آدمی کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہئے۔ پھر اکثریت کی رائے پر ہی کام انجام دینا چاہئے۔ یہ بتاتے ہوئے غلام احمد اور احمد اللہ بہت ہی مایوس کن ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم اس شاعری پر داد دیتے ہیں جو کہ غالب نے اپنی غزل میں بیان کی ہے وہ لفظ ''مر گیا غالب'' غلام احمد اور احمد اللہ آپس میں یہ کہنے لگے کہ لوگوں کے ساتھ ہمارا رشتہ محبوب اور معشوق کے طرز والا رہا۔ جس کی وجہ سے لوگ ہمیں محبوب اور معشوق کی طرح عزت واحترام کرتے تھے۔ مطلب ہم دونوں لوگوں کے درمیان معشوق اور محبوب کی طرح ابھرے۔ لیکن لوگوں کو اس پر نفرت ہونے لگی۔ لوگ اب ایسا ماحول نہیں تسلیم کرتے ہیں۔ وہ دو سے زیادہ آدمیوں کی بھی رہنمائی پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں غالب کا وہ مصرعہ یاد آرہا ہے ''مر گیا غالب'' کیوں کہ ہم لوگ غالب کی طرح انہیں محبوب کہہ کر وفاداری دکھاتے رہے اور دکھاتے ہوئے اب یہ لوگ ایسا ماحول اور ہماری رہنمائی پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے دونوں نے یہ کہہ کر اپنا تذکرہ بیان کیا کہ **''مر گیا غالب''**

''آشفتہ نوا کہتے ہیں''

جب غلام احمد اور احمد اللہ نے لوگوں کا ایسا رجحان دیکھا تو دونوں لوگوں کیلئے رہنمائی کرتے رہے لیکن اسی اثناء میں نئے نئے رہنما بھی ابھرنے لگے جو کہ لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرتے رہے۔ اب سرکاری اور غیر سرکاری عہدیدار لوگوں کی اکثریت کے مطابق ہر ایک کی رائے کو ظاہر کرتے اس رائے کا احترام کرتے اور احترام کرتے ہوئے ان کے مطالبات مانتے۔ جب ایسا ماحول لوگوں میں پایا تو غلام احمد اور احمد اللہ کو اب لوگ کہنے لگے

کہ آپ کے دور میں کیا دیکھتے تھے اور اب اس دور میں کیا دیکھتے ہیں۔ بزرگ لوگ ان کو دیکھ کر یہ تبصرہ کرتے ہوئے دیکھے گئے کہ تھا زمانہ جب آپ کے مشورے سے بہت سی تعمیر با عمل کراتے رہے لیکن اب لوگوں میں ایسا ماحول دیکھنے میں آیا وہ آپ دونوں کی کم ہی رہنمائی پسند کرتے ہیں اور نئے نئے پودے رائے کے لئے ابھرنے لگے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہم کہہ رہے ہیں کہ کہاں غلام احمد اور کہاں احمد اللہ۔ یہ سن کر دونوں لوگ جواب میں کہہ رہے ہیں کہ اب زمانہ ہے کہ **"آشفتہ نوا کہتے ہیں"** مطلب اب جو نئے پودے ہیں ان کا کام انہی کی رائے لوگوں کو لینی ہے اور ان کی رائے اکثریت سرکاری اور غیر سرکاری لوگ تسلیم کریں گے۔ اسی لئے ہم آپ کا احترام اور آپ کا ردعمل ایسے قلمبند کرتے ہیں کہ **"آشفتہ نوا کہتے ہیں"**

اگر میں اس دلیل کو عنوان کے لحاظ سے لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ ہمیشہ وہی نہیں اور یہ بھی کہوں گا کہ **"آشفتہ نوا کہتے ہیں"**

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

شاعر کی یہ غزل میں نے دیوانِ غالب میں پڑھی اور اس کا مطلع اور مقطع پڑھ کر مجھے اپنے تاثرات لکھنے کا موقعہ ملا۔ وہ یہ کہ شاعر نے جذبہ شاعری میں غزل کو دُنیا بھر میں روشن کیا، غالبؔ کی قلم ایک ہی ملک میں روشن نہیں ہوئی بلکہ دنیا کے تمام ملکوں میں روشن ہے اور کئی غزلوں کے ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں۔ جب میں نے غالب کے اس مطلع اور مقطع کو گہرائی سے سوچا اور پڑھا تو میں نے جانچہ کہ غالب نے اپنا بیان آمد کے دائرے میں لکھا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ بہت ہی بڑے پڑھے لکھے عالمی شاعر ہوئے ہیں لیکن میں ایسی بات نہیں کہہ سکتا ہوں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ دنیا بھر کی اردو غزل گو میں واحد غزل گو غالب

کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ابھی تک ایسی غزل اردو زبان میں ملی ہی نہیں۔ اگر چہ میرؔ نے بھی اس سے زیادہ غزلیں تحریر کی ہیں لیکن میرؔ کی اتنی غزلوں میں دیوان غالب کی غزل ہی ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کرتی ہیں۔ خیر خیال اپنا اپنا رائے اپنی اپنی۔ کئی یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب ہی بڑا شاعر نہیں ہے بلکہ اس سے بہت بلند شاعر بھی اُردو زبان میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بھی متفق ہوں۔ جب میں نے غالبؔ کے اس مطلع پر تنقیدی لحاظ سے سوچا تو میں نے سوچا کہ لفظ ذکر، ذکر غالب نے مطلع میں اچھا ظاہر کیا ہے لیکن اگر ہم اس لفظ کو گہرے انداز میں سوچیں گے تو بدی کا لفظ بھی ساتھ بیان کیا ہے۔ بدی جو کہ ہندی زبان سے وابستہ ہے اگر بدی کے بجائے عقل استعمال ہوتا کتنا ہی اچھا رہتا، ہاں اگر ذکر کے بجائے خیال استعمال ہوتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا کیونکہ جب عقل صحیح ہو تو خیال بھی صحیح ہے۔ عقلی سوچ سے ہی خیال مرتب ہوسکتا ہے۔ اسی لئے غالب نے ذکر لفظ کا بیان جو مطلع میں کیا ہے وزن کے حساب سے ہی بیان کیا ہے اگر دائرے وزن سے الگ مطلع کو لکھیں گے تو ہم ذکر کے بجائے خیال لکھیں اور بدی کے بجائے عقل لکھیں گے لیکن وزن کے حساب سے دونوں لفظ نہیں بج سکتے۔ ہاں آج کل کے دور میں شاعر اتنا گہرے وزن پر نہیں سوچتے ہیں وہ ذکر کے بجائے خیال اور بدی کے بجائے عقل ہی استعمال کرتے۔ اسی لئے اس انداز میں ہم مطلع کو بیان کر سکتے ہیں۔ جیسے

خیال میرا یہ عقل بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

جب ہم شاعر کے مقطع پر نظر ڈالتے ہیں تو پڑھتے پڑھتے یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاعر نے لفظ ظہوری آمد کے دائرے میں ہی استعمال کیا ہے، ورنہ ظہوری باریک لفظ ہے بجائے خفائی کے، دوسرے آدھے شعر میں شاعر نے لفظ 'حجت' کا استعمال کیا ہے لیکن یہ بھی ایک باریک لفظ تصور کیا جاتا ہے لیکن شاعر کو شاعری پر ناز ہے اور دنیا بھر میں غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی

لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ مقطع میں کچھ غلط فہمی ہے۔ مفہوم کے دائرے میں مقطع بہت بلند پایہ سوچ ہے لیکن شاعری میں غزل گو اس طرح کے باریک لفظ غزل میں استعمال کیا نہیں کرنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ آج کل زیادہ تر شاعر اپنے کو غزل گو لکھتے ہیں لیکن ان میں آمد بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ اسی لئے غالب کی غزل آمد پر منحصر ہے تبھی تو ان لفظوں کو نہیں ہٹا سکتے ہیں۔ اسی لئے میں تسلیم کرتا ہوں کہ غالب نے آمد کی توجہ اپنے خیال میں پائی جاتی ہے۔ خیر اس بات پر اپنی اپنی رائے اور اپنا اپنا تبصرہ ہر کوئی بھی کر سکتا ہے۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

غالب اپنے اس مطلع میں فرماتے ہیں کہ ہر ایک آدمی یہ کہہ رہا ہے کہ غالب معشوق غالب کا ہی ذکر کرتا ہے۔ مجھے اس بات پر کوئی افسوس نہیں ہے مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی میرے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتا ہے، مجھے ایسی باتوں پر کوئی تنقید نہیں لکھنے کو محسوس ہوتی ہے۔ میں ان باتوں سے متفق ہوں، اگر کوئی غیر فریق میرے بارے میں کوئی بات کسی کو سناتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس پر ناراض ہو جاؤں۔ میں اپنے طور پر اپنی بدی۔ سے اس کو اپنا ہی سمجھوں گا نا کہ غیر۔ مطلب جب تک نہ میرے معشوق میں میرا خیال ہے تو ایسی باتیں وہ کسی فریق کو نہیں بتاتے۔ اس کا مطلب اس کے دل میں میرا خیال ہے اور میرے خیال پر ہی دوسروں سے مشورہ لے کر باتیں کرتی ہیں۔ مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے البتہ مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ روبرو اگر وہ ایسی باتیں کرتے تو مجھے بھی معشوق کے وصل کا امکان رہتا اور امکان ہونے کے ناطے مجھے معشوق کے ساتھ کوئی بھی دوری محسوس نہیں ہوتی۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

غالب غزل کے مقطع میں ہمیشہ مطلع کو وابستہ کرتا ہے اسی لئے مطلع کے دائرے میں یہ

کہتا ہے کہ مجھے کوئی بھی صدمہ نہیں اگر کوئی شخص میرے بارے میں کسی کو باتیں بتاتا ہے میں خوش ہوں وہ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ باتیں بتاتا ہے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ تبھی میرا اظہار کرتے ہیں جب کہ ان کو میرے دل کا خیال ہے مطلب وہ اندر سے ہی میرے دل کو چاہتے ہیں۔ چاہنے والا پوچھتا چھ بھی کر سکتا ہے جس سے میں ناراض نہیں ہوں۔ میں جدائی سے ناراض ہوں اتنی دوری سے تبصرہ کرنا اچھا نہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر معشوق نزدیک ہوکر روبرو باتیں بتاتے اور مجھے وصل کا امکان رہتا جس کے امکان سے ہی میں معشوق سے دوری محسوس نہیں کرتا اور معشوق بھی کوئی بات میرے بارے میں کسی غیر سے نہیں پوچھتے۔ اسی بیان پر غالب مقطع میں یہ کہتے ہیں کہ اتنا نور اور عقل ہے کہ ان دونوں میں کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہوسکتا، نور کا مطلب یہ نہیں کہ میں خوبصورت ہوں بلکہ میرے پاس اتنا ظہور ہے کہ جو کوئی میرے اسے دیکھتا ہے وہ پسند کرتا ہے۔ ظہور میرے پاس اخلاق ہے میرے پاس باتیں کرنے کا سلیقہ ہے۔ میں ہر ایک بڑے اور چھوٹے کا دل سے احترام کرتا ہوں، اسی لئے سب کے سب میری ان تعریفوں پر ناراض نہیں رہتے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ میں ہر ایک کی حاجت رواں کرنے والا آدمی ہوں، مطلب میں ایک حاجت مند آدمی ہوں میں کسی کو حاجت سے دور نہیں رکھنا چاہتا ہوں، اگرچہ میرے پاس کچھ نہ کچھ ہے تو میں دوسروں کو بانٹ کر اپنے پاس بھی رکھتا ہوں۔ اسی لئے اگر میں حاجت مند کی حاجت پوری نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی طریقے سے کوئی حاجت پیش کروں، اگرچہ میں مشہور نہیں ہوں لیکن میرے کردار سے میری شہرت ہے اور مجھے اس شہرت سے ظہوری کے نام سے بھی پکار سکتے ہیں اور تبھی تو میں مطلع میں یہ کہہ چکا ہوں کہ میرے بارے میں کوئی بھی اگر تذکرہ کرتا ہیں اس پر ناراض نہیں ہوتا۔ ہاں میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرے بارے میں اگر کوئی تعریف کسی سے کرے تو میرے روبرو ہی کرنی چاہئے تاکہ میں اس کے ساتھ وصل کروں اور میں بھی یہ محسوس کروں کہ میرے بارے میں اچھے تاثرات بتا رہے ہیں۔

میں نے غالب کے مفہوم کو لفظ غالب کے دائرے میں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بندہ کسی کی تعریف کرتا ہے اس پر انسان کو گمراہ نہیں ہونا چاہئے۔کبھی کسی حاجت پر تعریفوں کی بوچھاڑ کر کے کسی آدمی کی حاجت نکالنے پر ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں۔لیکن باوجود اس کے میں ان باتوں پر خیال کم کرتا ہوں۔ میں ہر ایک کو دعویٰ سے یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی غلطی یا برائی ہو وہ روبرو ہی کہنی چاہئے تاکہ غلطیوں سے مبرا ہو سکے۔اسی طرح غالب فرماتے ہیں کہ اگر کوئی کسی چیز کی تعریف کریا نہ کرے ہمیں دونوں صورتوں میں ہر ایک کی بات سننی چاہئے اور اس پر جفا نہیں کرنی چاہئے بلکہ بہادری سے ہر ایک کے برے اور اچھے خیالات سننے چاہئیں اور جو بھی ایسی باتیں بتاتا ہے وہ اپنی حاجت اس انسان سے نکالتا ہے جس کو ایسی باتیں سننے سے سکون ملتا ہے، اس کا سکون باتوں ہی سے حاجت نکلتی ہے اور سننے والا ایک حاجت مند تصور کیا جاتا ہے۔اسی لئے ان باتوں کو مدنظر رکھ کر غالب فرماتے ہیں کہ وہی اس دنیا میں فتحیابی حاصل کرتا ہے جو کسی کی تعریف سنے یا کسی کی تعریف کرے یا کوئی کسی کی برائی کرے۔ان تمام باتوں پر انسان کو ناراض نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے ایک فتحیابی کے نظریہ سے سن کر یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ایسی باتیں سننی چاہئیں اور بزدل نہیں بننا چاہئے۔انہی اصولوں سے انسان دنیا میں فتحیاب ہوسکتا ہے اور فتحیابی بھی کرسکتا ہے۔

ذکر میرا بہ بدی + بھی اسے منظور نہیں = ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے +تو کچھ دور نہیں = غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل+ میں خفائی غالبؔ = ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ+ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں = میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

"ذکر میرا بہ بدی"

استاد اور شاگرد اس دنیا میں بہت ملتے ہیں لیکن استاد کے کہنے پر طالب علم آگے چلتا ہے یا نہیں اس پر ہم تبصرہ نہیں کر سکتے۔جب تک کہ ہم دونوں کے طور طریقے نہ دیکھ لیں۔وہ روبرو

دیکھنے سے ہی معلوم ہوسکتا ہے۔ کئی استاد طالب علم کو اچھے ڈھنگ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ استاد میں شوق رہتا ہے کہ اس کا طالب علم بڑے عہدے پر فائز ہو یا اچھا شہری ملک کا بنے، لیکن یہ سب کچھ قدرت کے لین دین پر ہی منحصر ہے۔ اسی طرح سے رام لال ایک طالب علم روز مدرسے جاتا ہے، مدرسے میں دس سے چار تک بیٹھ کر استاد کی پڑھائی پر دھیان دیتا ہے، جس طرح سے اس کے استاد پڑھاتے ہیں اسی طرح سے وہ اپنی پڑھائی کرتا ہے۔ مطلب استاد رام لال کو ہر طرح سے ٹھیک پڑھاتے ہیں لیکن جب رام لال مدرسہ جاتا ہے تو وہاں پر اس کی تعریف ہر ایک استاد کرتا ہے، ایک دن لڑکوں نے یہ سوچا کہ رام لال کی ہی تعریفیں ہوا کرتی ہے یہ سن کر تمام لڑکے ناراض ہونے لگے۔ تمام طلباء یہ کہنے لگے کہ اس میں کونسی ایسی خوبی ہے کہ جس کی وجہ سے تمام استاد اس کی ہی تعریف کرتے ہیں۔ جب استادوں نے سنا کہ بہت سے طلباء رام لال کے کام کی وجہ سے ہم پر ناراض ہوئے تو وہ استاد دوسرے طلباء کو یہ کہنے لگے کہ انہیں بھی اسی طرح سے محنت کرنی ہے اور جماعت میں اپنا کام کر کے دکھانا ہے جس سے کہ ہم استاد آپ سے بھی خوش ہوں گے۔ یہ سن کر رام لال نے سوچا کہ مجھ پر دوسرے لڑکوں کو کیوں حسد ہوئی، رام لال نے ہر روز اپنا کام استادوں کو دکھایا وہ اتنی محنت کرتا رہا کہ استاد حیران ہوتے تھے کہ اس کی لکھائی اور اس کے سوالوں کے جواب پر، جب باقی طلباء نے یہ دیکھا کہ رام لال سے ہم بہت پیچھے ہیں۔ تو طلباء نے یہ کہا کہ ہم کیسے رام لال کو پیچھے ڈھکیلیں، تمام طلباء اس پر ناراض ہوئے اور کہا کہ اگر رام لال اچھا ہے اور مدرسہ کا کام اپنی جماعت کے مطابق کرتا ہے۔ تو ہم کیوں حسد کریں۔ ہم اپنے کام پر ہی جائزہ لے لیں گے اور سوچیں گے کہ ہم کیوں رام لال سے پیچھے ہیں۔ یہ کہہ کر طلباء نے کہا کہ ہمیں رام لال سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہئے، لیکن اس پر بہت سے طلباء ناراض بھی ہوئے اور بہت نے رام لال کے حق میں اپنی رائے دی۔ اپنی رائے دے کر ایک طالب علم یہ کہنے لگا کہ اگر ہم سوچیں تو رام لال اپنی محنت ہی کی وجہ سے اچھا ہے۔ تمام استاد اس کی محنت کی عادت سے

خوش رہتے ہیں اسی لئے اس طالب علم نے یہ کہا کہ کیوں نہ میں ''ذکر میرا بہ بدی'' مطلب میں کیوں نہ اپنی عقل کی ہی جانچ پڑتال کروں کہ کیسے میں رام لال سے پیچھے ہوں اور میں بھی ایسی ہی محنت کرتا ہوں لیکن رام لال میں کونسا جادو ہے جس سے کہ تمام استاد تعریفوں کی بوچھاڑ کر کے ہمیں خاموش کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر اس طالب علم نے کہا کہ ''ذکر میرا بہ بدی'' مطلب اگر میں اپنے آپ کا ذکر کرنے یا سوچنے بیٹھوں تو مجھے اپنی عقل سے ہی سوچنا چاہئے میں کیسے رام لال سے پیچھے رہا۔ اسی لئے کہتے ہوئے طالب علم نے کہا کہ **''ذکر میرا بہ بدی''**

''بھی اسے منظور نہیں''

جب رام لال دن بدن مدرسے میں باقی طلباء سے بلند مقام حاصل کرنے لگا تو باقی طلباء نے یہ کہا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ رام لال میں کونسا جادو ہے۔ ہم اس جادو کو دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے متعلق ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔ مطلب رام لال ایک محنتی طالب علم ہے۔ ہم اتنی محنت نہیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری اتنی عزت نہیں استادوں کی نظروں میں جتنی رام لال کیلئے ہے۔ یہ کہہ کر سبھی طلباء یہ کہنے لگے کہ آپ کو یہ کہنا نہیں چاہئے **''بھی اسے منظور نہیں''** مطلب ہمیں رام لال کے کام پر کوئی ٹکراؤ نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ رام لال ایک محنت کش طالب علم ہے اتنی محنت ہم نہیں کر سکتے جتنی کہ رام لال محنت کرتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ''بھی اسے منظور نہیں'' مطلب ہمیں اس کے کام سے منظور نہیں ہیں۔ جس طرح مدرسہ کی جماعت میں کام کرتا ہے ہم کیوں اس میں رکاوٹ پیدا کریں۔ اسی لئے طالب علم نے کہا کہ میں باقی طلباء سے اس بات پر یہ اظہار کرتا ہوں کہ **''بھی اسے منظور نہیں''** مطلب مجھے ایسی بات کہنے کے حق میں نہیں ہوں۔

''غیر کی بات بگڑ جائے''

جب تمام طلباء میں ایک طالب علم نے یہ کہا کہ **''بھی اسے منظور نہیں''** اس پر دوسرے طلباء بہت ناراض ہوئے، انہوں نے سوچا کہ معلوم نہیں رام لال کے ساتھ ان طلباء کے

گہرے دوستانہ رشتے ہیں۔اسی لئے رام لال کی تعریف کرتے ہیں۔لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ رام لال کے ساتھ کون سے رشتے ہیں جس سے کہ اس نے ہماری باتوں پر یہ کہا کہ بدی بھی اسے منظور نہیں ، یہ بات اسی لئے بتائی ہوگی کیوں کہ رام لال کا خاص دوست اور خاص طالب علم یہی ہے اور رام لال اس طالب علم کے ساتھ ہی مدرسے آتا ہے اور گھر واپس جاتا ہے،لیکن اس بات کو ہم منظور نہیں کریں گے۔ہمیں پرنسپل صاحب سے ملنا ہے اور ان سے یہ بات کہنی ہے کہ ہم بھی تمام طلباء اپنی پڑھائی میں بہترین ہیں۔لیکن ہماری پڑھائی استادوں کو بہتر ہی نہیں لگتی۔وہ ہمیشہ رام لال کی تعریف کرتے ہیں۔جب سبھی طلباء پرنسپل صاحب سے ملے تو ان سے اس بات پر توجہ دلا کر یہ کہا کیا وجہ ہے کہ تمام اساتذہ رام لال کی تعریف کرتے ہیں۔پرنسپل نے سن کر تسلیم کیا اور ان کا شکوہ بھی سنا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہنے لگے کہ ان کو رام لال کی محنت پر حسد ہے جسکی وجہ سے یہ طلباء بھی رام لال کی محنت پر بہت ہی حسد کرتے ہیں۔استادوں کا احترام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے پرنسپل نے طلباء کو بتایا کہ تمام طلباء استاد کی نظروں میں ایک ہی ہوتے ہیں۔انہوں نے رام لال میں کچھ ایسا دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے تمام استادوں نے اس کی تعریف کی ہوگی۔لیکن میں اس مدرسے کے طلباء کی اس بات سے متفق نہیں ہوں یہ غیر کی بات کے طور پر تسلیم نہیں کرتا ہوں۔آپ کو سوچنا چاہئے کہ رام لال میں کچھ نہ کچھ تو ہے جس کی وجہ سے تمام اساتذہ تعریف کی بوچھار کرتے ہیں۔ ایسی ہی محنت آپ سبھی طلباء کو کرنی چاہئے جس سے کہ رام لال کو اتنا احترام استادوں سے نہ ملے۔آپ بھی استادوں کی نظروں میں رام لال جیسے ہی طالب علم ہو،کوئی بھی طالب علم استاد کی نظر میں الگ نہیں ہے ہاں نظریہ اس بات پر الگ ضرور ہے۔رام لال باقی طلباء کے مقابلے پڑھائی میں اچھی طرح محنت کرتا ہے۔مدرسے کے استادوں کے مطابق یہ نہیں کہیں گے کہ فلاں طالب علم اچھا ہے یا فلاں طالب علم برا ہے۔استادوں کے سامنے تمام جماعتوں کے طلباء ایک جیسے ہوتے ہیں اور ایک جیسا سلوک تمام اساتذہ طلباء کے ساتھ کرتے ہیں۔اسی

لئے میں یہ نہیں کہوں گا کہ **"غیر کی بات بگڑ جائے"** مطلب استاد کوئی غیر نہیں ہے وہ مدرسے میں ہی رہ کر آپ سبھی طلباء کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ان استادوں کو میں آپ کی سوچ کے مطابق غیر نہیں کہہ سکتا اور اگر استادوں کے بجائے مدرسے کے باہر کوئی ایسی بات کہتا تو میں تسلیم کرتا لیکن استاد غیر نہیں ہے۔اسی لئے میں استادوں کو غیر نہ سمجھ کر یہ نہیں کہوں گا کہ **"غیر کی بات بگڑ جائے"** مطلب استاد غیر ہے اور ان کی بات سے تناؤ پیدا ہو۔ یہ کہہ کر مدرسے کے پرنسپل نے طالطلباء سے درخواست کی کہ انہیں اپنی جماعتوں میں اچھی طرح پڑھائی کرنی چاہئے اور رام لال جیسا طالب علم بننا چاہئے جس سے کہ اسکول کی رونق دوبالا ہو جائے۔مطلب تمام طلباء کو محنت کرنی چاہئے۔ پڑھائی سے دُور نہیں ہونا چاہئے یہ کہہ کر طلباء سے پھر ان الفاظ کو دہرایا **"غیر کی بات بگڑ جائے"**

"تو کچھ دور نہیں"

جب طلباء نے پرنسپل صاحب کی ایسی باتیں سنیں تو کہنے لگے استادوں کے متعلق پرنسپل صاحب نے صحیح باتیں کہیں اور طلباء نے آپسی مشورہ کر کے یہ کہا ہمیں اپنی جماعتوں میں جا کر پڑھائی شروع کرنی چاہئے اور کسی کے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ہمیں رام لال کی طرح محنت کرنی ہے جس سے کہ ہم بھی استادوں کے نظروں میں رام لال جیسے طالب علم بن جائیں۔لیکن ایک طالب علم نے اپنے اندر ہی کہا جبکہ باقی طلباء نے ایسی بات نہیں کہی کہ اُس نے ایسا ماحول پیدا کیا جس سے کہ دو تین دن مدرسے میں ہلڑ بازی دیکھنے میں آئی ،لیکن میں اپنی سوچ میں ہی غلط رہا۔میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں رام لال کے بارے میں طلباء کو گمراہ کرنے کا ماحول بناؤں اور رام لال کے خلاف ایسی باتیں بتاؤں جس سے طلباء اور استادوں میں تناؤ پیدا ہو جائے اور دو تین دن کی چھٹی ہو جائے۔یعنی جماعت میں پڑھائی نہ ہو اور آرام سے ہم سب گھر بیٹھیں۔لیکن ایسی سوچ پر اس طالب علم کو شکست دیکھنی پڑی اور سوچنے لگا کہ میرے گھر والے مجھے پڑھنے کے لئے یہاں بھیجتے ہیں اور تمام اساتذہ میرے کام پر بہت ہی ناراض

ہوتے ہیں کیونکہ میں پڑھائی میں کمزور ہوں جسکی وجہ سے اساتذہ مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔اب میں نہ گھر جا سکتا ہوں اور نہ مدرسہ سے باہر نکل سکتا ہوں اور نہ ایسا ماحول مدرسہ کے اندر قائم کرسکتا ہوں۔اسی لئے جائیں ''تو کچھ دور نہیں''۔اب طالب علم سوچنے لگا کہ میں کہاں جاؤں۔کیوں نہ میں استاد کا احترام کروں اور پڑھائی میں محنت کر کے انکا دماغ بناؤں کہ میں بھی رام لال جیسا طالب علم بن سکتا ہوں۔

''ہوں ظہوری کے مقابل''

جب یہ طالب علم محنت سے کتابوں کے ہر لفظ کو ہر روز پڑھ کر تحقیق کرنے لگا اور یاد کرنا شروع کیا تو برے اعتراف کو کرنے لگا تو اتنی محنت کے باوجود رام لال جیسا طالب نہیں بن سکا۔لیکن رام لال کا اثر اس طالب علم میں ظاہر لگا، مطلب اگر رام لال مدرسے میں 25 نمبر حاصل کرتا تو یہ طالب علم 18 نمبر حاصل کرنے لگا۔یعنی آپسی نمبروں کو حاصل کرنے میں بہت کم فرق پایا گیا۔اپنی کمزوری دیکھ کر خود سے یہ طالب علم کہنے لگا کہ اگر چہ میں اتنی محنت کرنے پر بھی رام لال جیسا طالب علم نہیں بن سکا۔مدرسے میں استادوں نے امتحان منعقد کیا۔امتحان کے دوران بہت سے پرچوں پر رام لال اور اس طالب علم نے محنت کی لیکن رام لال کی طرح یہ طالب علم نمبر حاصل نہ کرسکا لیکن استادوں نے پھر بھی اس طالب علم کی تعریف کی اور طلباء سے کہا کہ محنت کرنے کے بعد بھی 8 نمبروں سے پیچھے رہا۔یہ سن کر اس طالب علم نے یہ کہا کہ ''ہوں ظہوری کے مقابل'' مطلب میں نے اگر محنت کی لیکن رام لال کا مقابلہ نہ کر سکا۔رام لال جیسا نہیں بن سکا۔اگر چہ مجھ میں محنت کرنے کی قوت ہے لیکن قدرت نے مجھے ایسا نور نہیں بخشا جیسا کہ رام لال کو بخشا ہے۔اسی لئے مجھ میں ایسا نور ہے ایسا ظہور نہیں ہے جیسا کہ رام لال میں ہے۔میں یہ کہہ کر اس بات کو اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ ''ہوں ظہوری کے مقابل'' مطلب میں محنت کرتا ہوں لیکن رام لال کے مقابلے کی نہیں۔لیکن مقابلہ بھی کرتا ہوں۔اگر نمبر میں فرق ہے لیکن پھر بھی کامیاب ہونے کے لئے اپنی محنت استادوں کو

دکھاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس طالب علم نہ کہا "**ہوں ظہوری کے مقابل**"

"میں خفائی غالب"

ایک دن استادوں نے رام لال کو مدرسے میں ایسا مضمون لکھ کر سب کو سنانے کے لئے کہا جس سے کہ تمام طلباء میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ اپنے گھروں میں جا کر بھی پڑھائی میں محنت کریں نہ کہ اپنا سارا وقت کھیل کود میں گزاریں۔ لیکن استادوں نے اس طالب علم کو نہیں مدعو کیا جو طالب علم رام لال کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ اگرچہ نمبر میں فرق رہا پھر بھی نمبر حاصل کرتا رہا۔ یہ بات سن کر وہ طالب علم ناراض ہوا۔ جب رام لال نے مضمون مدرسے میں استادوں اور پرنسپل کو سنایا تو تمام طلباء کو پڑھائی کے ساتھ زیادہ دلچسپی محسوس کی گئی، اور رام لال کو پرنسپل نے انعام سے نوازا جس سے وہ بہت ہی خوش ہوا۔ انعام ملنے کے بعد استادوں نے اس پر تبصرہ کرنے کے لئے اس طالب علم کو مدعو کیا جو کہ رام لال کے ساتھ مقابلہ کر رہا تھا لیکن نمبروں میں تھوڑا فرق آنے پر اس نے انعام پر تبصرہ طلباء اور استادوں سے کیا تو اس نے رام لال کی تعریف کی۔ تعریف کرتے ہوئے یہ شکوہ بھی کیا کہ میں "میں خفائی غالب" مطلب اگرچہ میں رام لال جیسا فتحیاب طالب علم نہ بن سکا لیکن پھر بھی میں محنت کروں گا اور اپنی محنت کی وجہ سے میں فتحیاب ہوں گا۔ میں غالب ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں استادوں کی اس بات پر ناراض ہوں کہ ان کو مجھے بھی بولنے کیلئے مدعو کرنا چاہئے تھا لیکن ایسا استادوں نے نہیں کیا۔ باوجود اس کے میں بہت ہی خوش ہوں کیوں کہ میری سوچ رام لال جیسی نہیں ہے۔ اسی لئے میں طلباء سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی رام لال جیسی محنت کرنا اور اس جیسا طالب علم بننا اسی لئے "میں خفائی غالب" کیوں میں اپنے آپ کو خفائی غالب کہتا ہوں کیوں کہ میں بہادر ہوں لیکن ناراضگی اس بات کی ہے کہ میں رام لال جیسا نہیں بن سکا۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو اعزاز خود ان الفاظ سے دیتا ہوں "**میں خفائی غالب**"

”میرے دعوے پہ“

جب استادوں نے یہ بات اس طالب علم کی زبانی سنی جو کہ اس نے رام لال کے اعزاز میں سنائی اور اس کے مقالے پر تبصرہ کیا تو وہ بہت ہی خوش ہوئے اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے تمام استادوں نے اس طالب علم کے تبصرہ پر شکریہ کیا اور یہ کہا کہ ہم اس طالب علم کو آج سے اس کے ہی نام سے پکاریں گے۔ ہم اس سے یہ کہیں گے ”میں خفائی غالب“ جب طالب علم نے یہ سنا تو وہ بہت ہی خوش ہوا۔ اب باقی استادوں اور پرنسپل نے مدرسے میں طلباء سے یہ بات کہی کہ ہم ایسے طلباء کو پھر کبھی ایسے نام سے اعزاز دیں گے جس سے کہ طالب علم کی توجہ پڑھائی پر زیادہ بڑھے۔ جب اس طالب علم نے استادوں سے یہ سنا کہ مجھے ایسے نام سے اعزاز ملنے والا ہے تو وہ سوچنے لگا کہ میرا جو کہنے کا مدعا تھا وہ صحیح نکلا اور استادوں نے میرے کہنے کا بہت ہی احترام کیا۔ تو طالب علم نے خود سے کہا کہ میرے دعوے کا انہوں نے احترام کیا مطلب مجھے اپنا خیال یہ رہا کہ میں خفائی غالب ہوں، اگرچہ میں محنت کرتا ہوں لیکن میں رام لال جیسا نہ بن سکا۔ پھر بھی میرے دعوے کا استادوں نے احترام کیا اور مجھے انعام دینے پر استادوں نے رضامندی کا اظہار کیا۔ تبھی تو میں خود سے یہ کہہ رہا ہوں کہ ”میرے دعوے پہ“ مطلب میرے کہنے پر۔

”یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں“

جب دس پندرہ دن گزر گئے تو استادوں نے اس طالب علم کو بلایا اور طلباء کے سامنے ”میں خفائی غالب“ کے اعزاز سے نوازا۔ طالب علم بہت ہی خوش ہوا اور استادوں نے طلباء کے سامنے یہ کہا کہ اگرچہ طالب علم رام لال جیسا محنت کش طالب علم نہیں بن سکا لیکن وہ اپنی محنت کو رام لال سے وابستہ کرنا چاہتا ہے لیکن پھر بھی رام لال کے مقابلے اس کے نمبروں میں فرق پایا جاتا ہے۔ خیر ہم ایسے طالب علم کی محنت کرنے پر بہت ہی خوش ہیں۔ اسی لئے ہم اسے ”یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں“ کا اعزاز دیتے ہیں۔ جس میں حجت کا لفظ طالب علم میں

ہمت پیدا کریگا۔ ہم اس سے یہ حاجت نکالتے ہیں کہ رام لال جیسا مشہور طالب علم یہ نہیں بن سکا پھر بھی اس نے محنت اور کوشش کی ہے۔ طلباء سے یہ کہہ کر اس جلسہ کا اختتام ان الفاظ کو کہہ کر کرتے ہیں **''یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں''** مطلب اگر رام لال مشہور ہے پھر بھی اس سے ہم یہ کہیں کہ مشہور نہیں۔

اگر چہ میں نے غالب کے مطلع اور مقطع کے حوالے سے یہ دلیل بیان کی اس کا مطلب میں نے کوشش کی کہ دوسرے انداز میں غالب کے شعروں پر دلیل لکھتے ہوئے میں اگر اس دلیل کا عنوان لکھوں تو میں یہ لکھوں گا۔ 'میں خفائی غالب' یا 'رام لال طالب علم'

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیادہ نہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

جب میں غالب کی اس غزل کے مطلع اور مقطع پر بحث و مباحثہ لکھوں تو میں یہ پھر پڑھنے والے کا خیال مرکوز کرتا ہوں کہ اگر وہ اس مطلع اور مقطع کو غور سے پڑھیں تو انہیں محسوس ہو جائے گا کہ دنیا میں غالب جیسا بلند پایہ تجربہ کار شاعر اور غزل گو کسی دوسرے کے مقابلے میں نہیں پا سکتے ہیں۔ اگر چہ میں اس مطلع اور مقطع پر بغور بحث کرنے بیٹھوں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب کا رجحان فارسی میں زیادہ ہے جبکہ اُردو میں اس کا رجحان بہت ہی کم ہے۔ مانتے ہیں کہ فراق اور قیامت جیسے الفاظ فارسی زبان کے ہیں، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان دنوں اردو بولنے والے علاقوں میں فارسی زبان کا بھی استعمال ہوتا ہے اور تاریخ کے اوراق پڑھنے سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر چہ غالب غزل کے لکھنے پر آمد کھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی لفظوں کا نچوڑ فارسی کے لفظوں سے ملتا ہے۔ وہ ان دنوں روزمرہ کی اردو کے ساتھ فارسی کے الفاظ بھی استعمال میں لایا کرتے تھے۔ شخصی راج ہونے کی وجہ سے فارسی کا رجحان بہت ہی زیادہ

پایا جاتا تھا، تبھی تو غالب کی شاعری میں فارسی کے الفاظ کثرت سے پڑھنے میں آتے ہیں۔ کیوں کہ شاعری میں اظہار بیان ماحول کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر اس دور کی بات پر بحث ومباحثہ کرنے بیٹھیں تو اس وقت بھی انگریزی، ہندی اور علاقائی زبانوں کا رجحان دیکھنے میں آتا ہے جس سے کہ کئی اردو لکھنے والے اپنی تحریر میں ان زبانوں کے الفاظ کا بھی استعمال کیا کرتے تھے۔

غالب کے مطلع اور مقطع پر بحث لکھوں تو میں شاعری میں مطلع اور مقطع اس انداز سے بیان کروں گا،

نہیں کہ مجھ کو مشکل کا اعتقاد نہیں
شب ہجر سے روز جزا زیادہ نہیں

تم ان کے وعدے کا بیان کیوں کرو غالبؔ
کیا کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

میں نے مطلع اور مقطع میں لفظ 'قیامت' کے بجائے 'مشکل' کا استعمال کیا ہے اور 'فراق' کے بجائے 'ہجر' استعمال کیا ہے۔ اسی طرح سے 'ذکر ان سے' کے بجائے 'بیان' لفظ استعمال کیا ہے اور 'یہ' کے بجائے 'کیا' لفظ استعمال کیا ہے۔ پھر بھی کسی دوسرے پڑھنے والے کو محسوس ہوسکتا ہے کہ یہ کمال کا مطلع اور مقطع ہے۔ اگرچہ میں غور سے ان لفظوں کے متبادل پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ وزن کے اعتبار سے شاعری نہیں تسلیم کی جاسکتی ہے۔ مانتے ہیں کہ مشکل قیامت کا متبادل بھی استعمال کرسکتے ہیں لیکن وزن کے اعتبار سے یہ گہر الفظ ہے۔ اسی طرح سے اگر ہم 'ذکر ان سے' کے بجائے 'بیان' استعمال کریں تو شعر کا لہجہ ٹھیک ہوگا، لیکن وزن کے اعتبار سے ٹھیک نہیں ہوگا۔ اسی طرح سے اگر ہم 'یہ' کے بجائے 'کیا' استعمال کریں تو وزن کے اعتبار سے شاعری تسلیم نہیں کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ یہی مطلع اور مقطع کوئی غیر

پڑھیں گے تو ان کی رائے یہ ہوگی کہ شاعری کمال کی ہے لیکن یہ نہیں محسوس کریں گے کہ یہ کسی شاعر کی شاعری ہے اور الفاظ کو تبدیل کر کے بیان کی گئی ہے۔ لیکن جب کوئی ماہر تعلیم یا محقق ضرور یہ رائے دے گا کہ یہ کسی مشہور شاعر کا کلام نہیں ہے۔ اسی لئے پڑھنے والے کو ہر مطالعہ کو تحقیق کرنا چاہئے تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ کیا مصنف یا غزل گو نے خود بیان کی ہے یا کسی اور کی زمین کو چرایا ہے، یہ تحقیق کرنا اردو زبان میں اوّلین کام ہے۔

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیادہ نہیں

شاعر غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ مجھے کبھی بھی ایسی مشکلات محسوس نہیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے میں یہ کہوں کہ میں ایسی حالت میں ہوں کہ میں ہل نہیں سکتا۔ مجھے اعتقاد اور بھروسہ ہے کہ ہر ایک مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہوں۔ میں کبھی بھی مشکل کو مشکل نہیں کہتا۔ میں قیامت کو قیامت کہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے اعتقاد ہے کہ میں قیامت کا مقابلہ بھی کر سکتا ہوں۔ ہاں اے معشوق جب میں اور آپ جدائی میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں تو مجھے شب فراق یعنی شام کے وقت آپ کی جدائی پر بہت ہی صدمہ محسوس ہوتا ہے۔ میں ہر روز اپنے جسم کے اعضاء کو دیکھ کر سوچتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر چہ میں قیامت کا مقابلہ کرتا ہوں مجھے اعتقاد ہے کہ میں قیامت کا مقابلہ کروں گا لیکن میں شب فراق کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اے معشوق میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے شب فراق میں مبتلا نہ کیا جائے۔ اے معشوق میں پاک محبت میں آپ کے ساتھ ہی اپنی زندگی شب فراق کے بغیر گزارنا چاہتا ہوں۔

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

غالب غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ اے معشوق میں نے پہلے ہی آپ سے یہ کہا تھا

کہ آپ کی محبت میں آپ سے الگ رہ کر اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ خاص کر شب کے وقت جب میں تنہائی میں اپنے آپ کو پاتا ہوں تو اس وقت مجھے اس وقت قیامت محسوس ہوتی ہے۔ تو میں آپ کو یاد کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں قیامت کا مقابلہ کر سکتا ہوں مجھے اعتقاد ہے لیکن میں شب فراق میں نہیں رہنا چاہتا۔ میں شب فراق کو قیامت سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں۔ اسی لئے میں آپ کو تلقین کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے سے دور رہنے مت دیں۔ میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ نے کبھی بھی مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا۔ نہ وعدے کا ذکر کیا۔ آپ کبھی میرے ساتھ بھی وصل کرو گے لیکن آپ کو میرے وصل کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔ آپ خود کہو کہ اتنی تنہائی کے باوجود میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ کو وصل کا خیال ہونا چاہئے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اے معشوق آپ کو میرے وصل کے بارے میں کوئی بھی توجہ نہیں۔ میں آپ کو وصل کے بارے میں توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ مجھے شب فراق کے ماحول میں مت رکھیں۔

اگر میں لفظ غالب کے دائرے میں اس مقطع کا مفہوم لکھوں تو میں لکھوں کہ شاعر نے یہ بتایا ہے کہ اگر پاک محبت میں کوئی بھی صدمہ محسوس ہو یا معشوق کی طرف سے صدمے ملیں تو ہمیں ان صدموں کو بالائے طاق رکھ کر پاک محبت کے دائرے میں ہی رہنا ہے اور ہمیں معشوق کا خیال نہیں چھوڑنا ہے۔ کبھی نہ کبھی معشوق ہمارے دائرے میں ضرور آ کر پاک محبت کے طور طریقے سے وصل کے ماحول میں دیکھیں گے اور دیکھ کر ہم اس وقت ان خیالات کو یاد کریں گے جن سے ہمیں قیامت محسوس ہوئی۔ ہم قیامت کا مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن شب فراق کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی لئے جب پاک محبت میں شب فراق کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو ہمیں بہادری سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ اور مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں فتحیابی حاصل ہو جائے گی۔ جس فتحیابی سے ہم یہ کہیں گے کہ ہم لفظ غالب کے دائرے میں فتحیاب اپنی پاک محبت میں ہوئے ہیں۔

نہیں کہ مجھ کو+ قیامت کا اعتقاد نہیں = نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے +روز جزا زیادہ نہیں = شب فراق سے روز جزا زیادہ نہیں
تم انکے وعدے کا+ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ = تم انکے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور+ وہ کہیں کہ یاد نہیں = یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

"نہیں کہ مجھ کو"

ایک دن کچھ ایسا دیکھنے میں آیا کہ عورت اپنے نونہال لڑکے سے جدا ہوگئی۔ جدا ہونے کے بعد اس عورت نے بہت سے علاقوں، شہروں اور گاؤں کا دورہ کیا۔ جگہ جگہ اپنے بچے کی تلاش میں مست رہی لیکن بچے کو نہیں ڈھونڈ پائی۔ اسی اثناء میں عورت نے ایک فقیر سے التماس کیا کہ کسی وجہ سے راستے میں میرا لڑکا جدا ہوگیا اور اسے ڈھونڈتے اسے دس سال گزر گئے۔ لیکن ان دس سالوں میں کبھی بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ یہ سن کر فقیر نے کہا اے عورت مجھے معلوم نہیں میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ اور مجھے میں ایسا جادو نہیں آتا کہ میں آپ کے لڑکے کے بارے میں واقف کروں۔ مجھے خود عبادت میں غلطیاں ہوتی ہیں پھر بھی خدا کا نام لیتا ہوں اسی لئے میں ایسی باتوں سے دور ہوں۔ نہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا فرزند کہاں ہے یا زندہ بھی ہے یا نہیں یہ خدا ہی جانتا ہے۔ ایسی باتیں مجھ سے نہ کرو کہ آپ مجھے لڑکے کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میں کیسے بتا سکتا ہوں ہاں میں آپ کا احترام کرتا ہوں آپ میرے پاس بیٹھ سکتی ہو اور کھانا بھی کھا سکتی ہو لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ آپ کا فرزند کہاں ہے۔ تو میں آپ کے اس التماس کو اختتام تک پہنچا کر یہ کہہ رہا ہوں "نہیں کہ مجھ کو" مطلب مجھے جب معلوم ہی نہیں ہے تو مجھے کیوں ایسی باتیں کہنے پر مجبور کرتی ہو۔ میں ایک سیدھا سادہ خدا کا بندہ ہوں۔ میرے پاس کوئی بت نہیں ہے نہ کوئی وسائل ہیں جن سے کہ میں آپ کے فرزند کے بارے میں معلوم کر سکوں۔ تو میں پھر اس لفظ کو دہراتا ہوں **"نہیں کہ مجھ کو"**

”قیامت کا اعتقاد نہیں“

دس سال کے بعد عورت زیادہ پریشان ہوئی۔سوچتے ہوئے خود بخود یہ محسوس کرنے لگی کہ اے خدا میرا فرزند دس سال کا ہوتا اور کسی کام کے قابل ہوتا۔افسوس ہے کہ مجھے کسی بھیڑ میں ایسے فرزند سے جدا ہونا پڑا۔ یہ سوچ کر عورت خدا سے رجوع ہوئی اور کہنے لگی میری اس مصیبت میں کیا آپ کام نہیں آؤ گے اے خدا۔ میں دس سال سے اپنے فرزند سے دور ہوں۔ جس سے کہ میں پریشان ہو کر نہ جانے کتنے گاؤں اور شہر، گلی کوچے اسکو ڈھونڈا لیکن اس کا نام ونشان نہیں ملا۔ میں آپ سے دعا کر کے یہ التجاء کر رہی ہوں کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اپنے لڑکے کے سے ملایئے۔میں بچے کے بغیر قیامت محسوس کرتی ہوں۔ اگرچہ مجھے زندگی گزارنے کے لئے روزمرہ کی سہولیات میسر ہیں پھر بھی اپنی اولاد کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے جب مجھے اپنے فرزند کی یاد آتی ہے تو اس وقت میں کہتی ہوں کہ اے خدا قیامت کا اعتقاد نہیں، اے خدا کیا آپ کو میری اس قیامت پر بھروسہ نہیں ہوتا کہ فرزند کے بغیر یہ عورت اپنی زندگی کیسے بسر کرتی ہے۔اس بات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات پھر دہراتی ہوں قیامت کا اعتقاد نہیں۔

”شب فراق سے“

جب شہر میں کافی بھیڑ کی وجہ سے اس عورت کا بچہ جدا ہو گیا جس کے بعد وہ رونے لگا۔ عورت کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ میرے سے بچہ جدا ہو گیا۔روتے ہوئے کسی امیر آدمی نے اس بچے کو دیکھا اور اس کا رونا بند کیا۔کئی مٹھائیاں کھلائیں اور کئی تماشے دکھائے۔اسے ماں کا بچھڑنا یاد دلایا۔ یہ امیر بزرگ آدمی بہت ہی اچھا تھا لیکن اتنی دولت ہونے کے باوجود بغیر اولاد اپنی زندگی بسر کرتا رہا۔ بہت سی شادیاں کیں لیکن خدا نے اولاد عطا نہیں کی۔ جب اس امیر آدمی نے ایسے بچے کو دیکھا اور اپنے ساتھ دیکھ بھال کرنے کے لئے لے گیا۔کبھی کبھی بچے کو اس بھیڑ کی یاد آتی جس بھیڑ میں اس کی ماں جدا ہوئی تھی اور اس آدمی کے

تحویل کو بھی یاد کر کے یہ سوچنے لگا کہ مجھے اس بھیڑ کے وقت اسی آدمی نے میری دیکھ بھال کی۔ پھر بھی ماں کی یاد کو بچہ بھولا نہ سکا۔ بچے کو یاد ہے مجھے کہ اس آدمی نے اپنے گھر میں پرورش کی ہے لیکن اپنی ماں سے جدا ہوں۔ بچہ دس سال کا ہوا، ایک رات کو سوتے سوتے ماں کی یاد آئی۔ شب بھر یہ سوچتا رہا ہے کہ میری ماں مجھے ضرور ڈھونڈتی ہوگی لیکن میں کہاں جا کر اس سے ملوں اور اس کا چہرہ دیکھوں۔ اس آدمی نے دس سال پرورش کرنے کے بعد اس بچے سے کہا آپ کو میں نے اپنا لڑکا ہی سمجھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کسی بھیڑ میں الگ ہو کر اپنی ماں سے جدا ہوئے اور آپ کو روتا ہوا میں نے دیکھا۔ میں نے اپنے گھر لا کر آپ کی پرورش کی لیکن آپ کو ماں کی ضرور یاد آتی ہوگی۔ بچے نے جواب دیا میں دس سال کا ہوا ہوں مجھے یاد ہے آپ نے میری پرورش کی لیکن مجھے اس ماں کی یاد آتی ہے جس نے مجھے دو تین سال تک پالا اور بڑا کیا۔ اس کے ہر ایک پیار کا لمحہ میرے دل میں بسا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے میں یہ سوچتا ہوں کہ میری ماں رات کے وقت تنہائی میں میرے بغیر کیا کرتی ہوگی مطلب ''شب فراق سے''۔ مجھ سے جدا ہونے کے بعد وہ شب بھر سوچتے ہوئے یہ کہتی ہوگی کہ اپنے لڑکے کو کہاں ڈھونڈوں۔ لیکن امیر آدمی کی پرورش میں مست رہا، مجھے ماں کی عدم موجودگی سے زیادہ پریشانی بھی نہیں۔ آپ کی تحویل میں مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن پھر بھی میں رات کے وقت ماں کو یاد اس طرح سے کرتا رہتا ہوں کہ وہ ''شب فراق سے'' اس کا تصور میں ''شب فراق سے'' ہی پکاروں گا۔ جب تک نہ وہ مجھے ملے تب تک اسے ماں کے بجائے ''شب فراق سے'' کے نام سے پکاروں گا، کیونکہ مجھے رات بھر اس کی جدائی محسوس ہوتی ہے اور رات گزرنے کے بعد مجھے یادداشت میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ کی پرورش سے مجھے ماں کی یاد دن میں نہیں آتی۔ تبھی تو میں اپنی ماں کو ''شب فراق سے'' پکارتا ہوں۔

''روز جز از یادہ نہیں''

جب امیر آدمی نے سنا کہ دس سال پرورش کرنے کے بعد بچے کو ماں کی اس طرح سے

یاد آتی ہے اور یہ بچہ کبھی بھی اپنی ماں کو نہیں بھولتا۔ اگر چہ میں نے بہت سے طریقے اپنائے پھر بھی مجھے یہ کہتا ہے کہ میں ماں کو ''شب فراق سے'' پکارتا ہوں مطلب اپنی ماں کو نہیں بھولتا۔ امیر آدمی نے سوچا کہ اس کے ذہن میں اپنی ماں کا ہی خیال ہے نہ کہ میرا۔ اب امیر آدمی نے سوچا کہ دن بھر میں اس بچے کو مختلف بچوں کے کھلونے دے کر اسے ماں کے خیال اور پیار سے جدا کر دوں گا۔ لیکن یہ کتنی دیر تک رہے گا۔ اب بچہ جو کہ دس سال کا ہوا ہے مجھ سے الگ رہے گا یا میرے گھر سے بھاگ جائے گا۔ ممکن ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے بھاگ کر اپنی ماں کے تلاش میں ضرور اپنی زندگی لگائے گا۔ اگر میں اس بچے کو اس عمر میں ماں سے الگ کروں وہ بھی گناہ ہے لیکن پھر بھی میں اس سے محبت سے پیش آوں گا۔ یہ سوچتا ہوں کہ کسی نہ کسی دن میری تحویل میں ایسا بچہ نہیں ہوگا۔ اسی لئے میں اس کو محبت کرتے ہوئے ان الفاظ سے دہراتا ہو ''روز جز از یادہ نہیں'' مطلب اگر میں روز اس بچے کے ساتھ محبت سے پیش آوں گا لیکن کبھی نہ کبھی میری محبت سے دور ہو جائے گا کیونکہ اس کے ذہن سے ماں کی یاد نہیں نکلتی۔ اسی لئے میں یہ محبت پیش کرتے ہوئے ایسے الفاظ سے کہہ رہا ہوں ''روز جز از یادہ نہیں'' اور یہ کہہ رہا ہوں کہ کتنے روز تک محبت پیش کروں۔ زیادہ دنوں تک بھی محبت آپس میں قائم نہیں رہتی۔ پھر بھی اگر مجھ سے الگ ہو جائے گا میں اپنے آپ سے اس کی جدائی پر غم اور صدمہ محسوس کروں گا۔ اسی لئے دونوں صورتوں میں میرا یہی خیال ہے کہ **''روز جز از یادہ نہیں''**

''تم ان کے وعدے کا''

جب بچہ آہستہ آہستہ پندرہ سال تک پہنچا تو اس نابالغ بچے نے امیر آدمی سے کہا کہ میں آپ کا پالن پوشن نہیں بھول سکتا ہوں۔ آپ نے میری پندرہ سال تک پرورش کی ہے۔ میں آپ کی عزت ہمیشہ اپنے باپ کی طرح کرتا رہا۔ لیکن میری یہ گذارش ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح سے میری ماں سے ملا دو۔ میں اس کے پاس رہوں گا لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کی تحویل میں اپنی زندگی تا ابد گزاروں گا۔ اگر میں کام کے لائق بھی نہیں ہوا تو بھی میں اپنی کمائی

ہوئی اجرت آپ کو ہی دے دوں گا۔لیکن ماں اس کی حق دار نہیں۔ میں آپ سے صرف یہ گزارش کرتا ہوں کہ مجھے کسی نہ کسی طریقے سے ماں کے پاس پہنچادیں یا اس کی شکل دکھادیں۔تا کہ میں اس کے پاس دیر تک بیٹھوں اور اس کا حال پوچھوں۔ یہ سن کر امیر آدمی نے بچے سے کہا کہ میں آپ کی باتوں سے بہت ہی خوش ہوں اور میں آپ کو اولاد ہی سمجھتا ہوں۔لیکن آج آپ کی اس بات کے بعد میں اپنی اولاد ہی تسلیم کروں گا۔سمجھنے اور تسلیم کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔اسی لئے امیر آدمی نے کہا کہ میں تسلیم کر کے یہ کہوں گا کہ میں نے اسے کسی بھیڑ میں دیکھا اور اپنی تحویل میں لے کر اس کی پرورش کی لیکن پرورش کے دوران مجھے بچہ نہیں بھولا۔اب رہا ماں کا مسئلہ، وہ بہت ہی مشکل ہے پھر بھی میں کیسی طریقے سے ماں کی تلاش کروں گا کہ اگر وہ ملی تو وہ بچے کی زندگی کے لئے بہترین ثابت ہوگی۔اب امیر آدمی نے اس بچے سے کہا اگر آپ کی ماں مل جائے تو کیا آپ مجھ سے الگ زندگی بسر کرو گے۔ میں اس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں بے اولاد آدمی ہوں لیکن خدا نے مجھے آپ سے بھیڑ میں ہی ملاقات کرا کے میری اولاد بننا مقدر کر دیا تھا۔اسی خدا کے فضل سے پندرہ سال تک آپ میری پرورش میں رہے اور آپ بھی مجھے بھولنا نہیں چاہتے۔آپ وفاداری پر تا ابد قائم ودائم ہو۔تبھی تو میں آپ کی ماں کو ڈھونڈنے کے لئے بہت ہی کوشش کر رہا ہوں۔اگر آپ کی ماں مجھے ملی تو میں اس کو بھی اپنے ہی گھر میں رکھوں گا۔ کیونکہ میں نے آپ کی پندرہ سال پرورش کی۔میری اتنی پرورش کے باوجود آپ نے جو باتیں مجھے سنائیں جن سے میں بہت خوش ہوا اور ان باتوں کو آخری داؤ میں رکھ کر اس عنوان کو قلمبند کیا ''تم ان کے وعدے کا'' مطلب آپ اپنی ماں کے وعدے پر بھی ڈٹے ہو اور میری پرورش پر بھی ڈٹے ہو مطلب آپ وفادار بچہ ہو۔اسی لئے میں یہ کہہ کر اس بات کو ختم کرتا ہوں کہ **''تم ان کے وعدے کا''**

''ذکر ان سے کیوں کرو غالب

جب بچے کی ماں پندرہ سال تک بچے سے جدا اپنی زندگی بسر کر رہی تھی تو قدرتی طور پر

بچے کی ماں بوڑھی دیکھائی دینے لگی۔ بیٹے کی تلاش میں ماں کہاں کہاں پہنچی۔ وہ اس کی محبت کی خوبی سے ہی پایا جائے گا۔ اس کی ہمیں داستان ہی نہیں سنانی کیونکہ اگر اس بارے میں ہم داستان لکھیں تو ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اسی لئے بات کا نچوڑ کم کرنے کے لئے ہم اس ماں کے پیار کا ذکر اس طرح کر رہے ہیں کہ اب جب اچھی طرح تلاش کرنے پر بھی اپنی اولاد سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تو ایسی ماں ایک ایسے گھر میں بیٹھی ہے جہاں تمام فرقے قیام کرتے ہیں۔ ایک دن آدمی دھوپ میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک مراسلہ یہ پڑھا "ذکران سے کیوں کروغالبؔ" جس میں شایع کردہ نے یہ لکھا تھا کہ ایک بچہ پندرہ سال قبل اپنی ماں کی گود سے بھیڑ میں جدا ہو گیا تھا۔ پندرہ سال بعد لڑکا اپنے مالک سے گذارش کرتا ہے جس مالک نے اسکی پندرہ سال تک پرورش کی۔ اب وہ اس آدمی سے یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح سے ماں سے ملاؤ۔ اب اس آدمی نے بہت سے اخباروں میں یہ مراسلہ چھپوایا ہے کہ اگر کسی عورت کا بھیڑ میں بچہ لاپتہ ہو گیا ہو تو میں اُس بچے کو اس کی ماں کے حوالے ضرور کروں گا۔ اسکی ماں کو اخبار کے ذریعے بچہ کی گمشدگی کی اطلاع فراہم کرنی ہے۔ اسی لئے شائع کردہ نے اس عنوان کے تحت اخبار پڑھنے والوں سے یہ اپیل کی ہے کہ اس عنوان کو "ذکران سے کیوں کروغالبؔ" تحویل کیا تاکہ یہ خبر ہر ایک کو پہنچ سکے کیونکہ پندرہ سال کے بعد ماں کو اگر یاد دلائیں گے تو وہ بھی اپنے بچے کو بھول سکتی ہے۔ یا وہ لڑکا بھی پندرہ سال کے بعد زیادہ پیار ماں سے نہیں کریگا جتنا کہ وہ اس آدمی کی یاد ہمیشہ دل میں رکھے گا جس نے اس بچے کی پرورش پندرہ سال کی۔ سمجھو وہ آدمی ایک باپ کی طرح بچے کے دل میں جگہ کر رہا ہے۔ اسی لئے میں نے اس مراسلے کا نام "ذکران سے کیوں کروغالبؔ" جب ایسی دلیل سے عورت کو اس آدمی نے واقف کرایا تو سن کر یہ عورت سوچنے لگی کہ شاید میرے لئے ہی اخبار میں کسی آدمی نے ایسا مراسلہ چھپوایا ہے کیونکہ مجھ سے ہی بچہ بھیڑ میں جدا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر اس آدمی سے کچھ نہیں کہا۔ سوچتے ہوئے یہ کہنے لگی کہ کیا کہوں اپنی دلیل پھر سننے کے بعد کیا فائدہ ہوگا کیونکہ اب

میری زندگی اس بچے کے الگ ہونے سے برباد ہوگئی، یہ حقیقت ہے کہ میں ایک غریب ہوں اور جہاں پر وہ امیر میرے بچے کو پال کر اچھے ڈھنگ سے اپنی زندگی بسر کرتا ہوگا۔ بہتر ہے مجھے اس آدمی کو ایسے مراسلے پر کچھ واقفیت نہیں کرانی۔ یہ سوچ کر عورت نے اس آدمی سے کچھ نہیں کہا اندر سے ہی کڑھنے لگی۔

"یہ کیا کہ تم کہواور"

جب آدمی نے اخبار کا حوالہ دے کر عورت سے الگ ہوا تو عورت رات و دن سوچنے لگی میں یہی اندازہ لگا سکتی ہوں کہ کہیں یہ دلیل جو اس آدمی نے اخبار پڑھ کر سنائی، میرے لئے ہی تو نہیں چھپوائی گئی ہوگی لیکن میں ایک غریب عورت ہوں میں خوش ہوں میری اولاد کسی امیر گھرانے میں رہے اور وہاں پر اس کی پرورش ٹھیک طرح سے ہو۔ جب میں اپنی شناخت اخبار کے ذریعے بتاؤں گی تو وہ امیر آدمی میرے بچے کی ٹھیک سے پرورش نہیں کرے گا اور میں بھی بوڑھاپے کی حالت میں کونسی بہتر پرورش اپنی اولاد کی کرسکتی ہوں۔ کیونکہ میرے پاس ایسے وسائل موجود نہیں ہیں جس کے تحت میں اپنے بچے کی پرورش کرسکوں۔ یہ سوچتے ہوئے کہنے لگی کہ جب یہ آدمی پھر اس اخبار کی خبر پر بات چھیڑنے کی کوشش کرے گا تو میں چپ چاپ رہوں گی اور اپنے اندر ہی اندر صرف یہ کہوں گی کہ "یہ کیا کہ تم کہواور" مطلب جب بھی اس اخبار کی ایسی بات چھیڑے گا تو میں اس اخبار کی خبر کا انکار کروں گی اور کچھ نہ کہتے ہوئے اس خبر کو اپنے اندر ہی دفن کردونگی۔ مطلب کسی کو اپنے راز سے واقف نہیں کرنا۔ اسی لئے میں ایسی اخبار پر اس آدمی کو اندر سے ہی ان الفاظ "یہ کیا کہ تم کہواور" کو کہوں گی اور خاموشی سے سنتی رہوں گی۔

"وہ کہیں کہ یاد نہیں"

جب عورت نیغ ور و فکر کر کے سوچا کہ اگر کبھی اس اخبار کی خبر کے بعد پولیس مجھے دھونڈنے کوشش کرے گی تو میں اس وقت کیا کہوں گی، میں یہ سوچ کر پریشان ہوں۔ ہاں

جب میرا لڑکا پندرہ سال سے زیادہ عمر کا ہو جائے گا تو وہ امیر آدمی کو چھوڑ کر میری تلاش میں مصروف ہو جائیگا۔ مطلب وہ مجھے ڈھونڈنے کے لئے بہت سے ذرائع کا استعمال کر کے مجھے ضرور تلاش کرلے گا۔ ممکن ہے وہ اس مہم میں کامیاب بھی ہو جائے اور جب وہ لڑکا مجھے ملے گا تو ضرور وہ مجھ سے گلہ اس بات کا کرے گا کہ بہت دفعہ مختلف اخباروں میں گمشدگی کی خبریں شائع کرائیں۔ لیکن پھر بھی آپ کو کسی نے اس خبر سے واقف نہیں کرایا۔ اور یہ کہتے ہوئے میرا بیٹا مجھ پر ضرور غصہ ہوگا اور ضرور کہے گا کہ ''وہ کہیں کہ یاد نہیں'' مطلب تجھے میری یاد نہیں آئی لیکن میں اس سے یہ کہوں گی کہ غربت کی وجہ سے میں بھول گئی تھی اور یہ مناسب سمجھا کہ آپ کی پرورش اسی گھر میں ہو جب تک کہ آپ بالغ نہ ہو جاؤ، اگر وہ دہرائے کہ ''وہ کہیں کہ یاد نہیں'' تو میں یہی کہوں گی کہ میں ہمیشہ تمہیں بھلاتی رہی لیکن پھر بھی میں اندر ہی اندر آپ کی یاد ہمیشہ میرے دل کو ستاتی رہی باوجود اسکے میں اس ستانے کو الگ کر کے آپ کی پرورش کے لئے ٹالتی رہی۔ تا کہ آپ بالغ ہو جائے اسی لئے میں بھی یہ کہوں گی کہ **''وہ کہیں کہ یاد نہیں''**

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یہ غزل میں نے دیوانِ غالب میں پڑھ کر مطلع اور مقطع پر بحث کی۔ میں کچھ اپنے تاثرات لکھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ غالب نے 'دائم' لفظ جو لکھا ہے یہ بہت ہی تاریخی لفظ ہے۔ مطلب اُردو زبان میں ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ ان کی رفتار قائم و دائم ہے یا کبھی کبھی ہم آپسی گفتگو میں اس طریقے سے کہتے ہیں کہ ہماری محبت قائم و دائم رہے۔ مکمل رہے۔ جس میں کوئی نفاق نہ پیدا ہو، شاعر نے لفظ 'دائم' استعمال کیا ہے جس میں وفائی کا رجحان دکھایا ہے۔ کہا میں مکمل طور پر آپ کے دروازے پر حاضر ہوں، لیکن پھر جوابِ دعویٰ کے شعر میں 'خاک'

لفظ استعمال کیا ہے اور لفظ 'پتھر' کا بھی استعمال کیا ہے۔ اگر خاک کہا تو خاک کے بعد پتھر کہنا درست نہیں ہے، دوسری بات غالب ایک بلند پایہ عالمی شہرت یافتہ شاعر ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ مکمل طور پر میں دروازے پر نہیں ہوں پھر جب دروازے پر نہیں تو اس کا مطلب معشوق کے ساتھ تعلقات ہی نہیں ہیں۔ جب تعلقات نہیں ہیں تو خود بخود خاک میں مٹ گیا، ہم اردو زبان میں عام طور پر یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی معاشی حالت خاک میں مل گئی۔ اسی طرح سے غالب نے پتھر کا استعمال کیا ہے۔ اگر پتھر کا استعمال کیا تو خاک میں ملیا میٹ کر کے ہم یہ کہیں گے کہ پتھر کا لفظ تاریخی ہے مطلب جب بھی ہم اس خاک کو پہچانے گیں تو ہم اپنے تاثرات بیان کریں گے کہ ہم نے ایسی خاک دیکھی ہے لیکن پتھر کی صورت میں نہیں۔ دوسری بات خاک زیادہ دیر تک تاریخی طور پر نہیں موجود رہتی ہے البتہ زمین کی شکل موجود رہتی ہے۔ خاک ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ خاک بیان کی ہے محبت کو اب اس خاک کو کیسے پتھر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہاں اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے خاک دیکھی لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں حوالہ دینا ہے کہ جہاں ہمیں پتھر دیکھنے میں آتا ہے لیکن اس لحاظ سے غالب نے صحیح کہا کہ معشوق کی خاک کو اگر دیکھنی ہے تو فوری طور پر دیکھو۔ اگر وہ ہوا میں اڑ گئی تو دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ مطلب خاک ہوا میں موجود نہیں رہتی ہے اور ہوا کے دباؤ سے خاک الگ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے صحیح استعمال غالب نے اس مقطع میں کیا ہے۔ وہ یہ کہ 'خاک' اور 'پتھر' کو صحیح انداز میں بیان کیا ہے۔ مطلب اگر خاک دیکھنی ہے تو فوراً دیکھو ورنہ پتھر کی طرح وہ موجود نہیں ہو گی۔ اسی لئے مجھے پتھر نہیں سمجھنا چاہئے۔ میں اس مطلع کا غالب کے قلمی اور ذہنی طور پر آمد کے طور پر ایک عجیب و غریب مطلب کے انداز میں سوچتا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غالب نے لفظ 'خاک اور پتھر' اس طریقے سے استعمال کیا ہے کہ پڑھنے والا حیران ہوتا ہے کہ کہاں خاک اور کہاں پتھر۔ پتھر کو ہم ہمیشہ دیکھ سکتے ہیں لیکن خاک کو نہیں دیکھ سکتے۔ خاک ہے لیکن جو بطور نشان خاک دیکھنا چاہتے ہیں وہ ہوا کے جھونکے سے اُڑ جاتی ہے۔ اسی لئے

غالب نے میرے خیال میں لفظ 'خاک' بیان کیا ہے کہ میرا وجود نہیں رہے گا اور کیونکہ مجھے صنم پتھر کے طور پر نہیں تسلیم کرتی ہے۔ دوسری بات ممکن ہے میرے خیال میں اسی لئے غالب نے لفظ 'دائم' کا استعمال کیا ہے تا کہ پڑھنے والے کو یہ بھی محسوس ہو جائے اگر مجھے محبت قائم ودائم ہے لیکن یہ محبت برقرار نہیں ہے، کیونکہ برقرار اسی لئے نہیں جو بھی چیز ہمیشہ رہنی چاہئے وہ رہی ہے لیکن آپ معشوق اس چیز کو در پر مطلب دروازے پر موجود نہیں رکھنا چاہتی۔ اگر غالب کا وجود ہے وہ معشوق کے در پر ہے لیکن اس وجود کو معشوق دائم نہیں رکھنا چاہتی ہے۔ اسی لئے غالب نے دائم کا استعمال مطلع میں کیا ہوگا۔ اگر ہم دوسرے انداز میں اس شعر کو یوں لکھیں کہ

ہمیشہ پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
مٹی ایسی زندگی یہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

اب پڑھنے والا یہ محسوس کرے گا کہ دائم کے بجائے ہمیشہ کیوں لکھا ہے، دائم کے بجائے سمجھانے کے لئے میں نے ہمیشہ لفظ اسی لئے لکھا ہے کہ شاعر ہمیشہ معشوق کے در پر حاضر رہتا ہے، لیکن وہ اس ہمیشہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر تسلیم نہیں کرتے پھر بھی ہمیشہ معشوق محبوب کو در پر دیکھتی ہے۔ خاک اسی لئے استعمال کیا ہے تا کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ شاعر کی مٹی زندگی بھر پتھر کی طرح نہیں ہے۔ مطلب وہ مٹی ایسی مٹی ہے کہ ہوا کے جھونکے سے اُڑ سکتی ہے۔ اسی لئے میں جلد بازی میں معشوق کو اس انداز میں پکارتا ہوں کہ وہ یہ کہے کہ مٹی ایسی نہیں ہے کہ پتھر کی طرح دیکھنے میں آئے۔ مٹی تو ہوا کے جھونکے سے اُڑ جاتی ہے۔ مطلب شاعر نے میرے خیال میں خاک کو محبت کا نشانے کے طور پر استعمال کیا ہے اور پتھر کو اسی لئے استعمال کیا ہے کہ وہ پاک محبت میں پتھر کی طرح اپنا وجود نہیں دکھانا چاہتا ہے۔ وہ اگر وجود دکھانا چاہتا ہے تو مٹی کے طور طریقے سے۔ پتھر موجود رہتا ہے وہ تاریخی اصولوں میں دیکھتے ہیں۔ مٹی تاریخی اصولوں میں دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ البتہ مٹی کو ہمیشہ جس جگہ پر ہم نے دیکھا لیکن وہ ایسی مٹی ہے جس میں نشان ہیں۔ وہ مٹی ہوا کے جھونکے سے الگ ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں

غالب نے الفاظ 'دائم اور خاک'، مطلع میں استعمال کئے ہیں جو کہ معنی کے اعتبار سے بہت گہرے ہیں۔ میں نے پہلے یہ بتایا کہ غالب کے عام الفاظ جو غزلوں میں استعمال کیے ہیں وہ زیادہ تعداد فارسی سے ملتے جلتے ہیں۔ قائم ودائم یہ دونوں لفظ فارسی کے ہیں۔ اس کے بجائے غالب نے لفظ 'ہمیشہ' کے بجائے 'دائم' کو استعمال نہیں کرتا وزن کے اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن اس فرق سے شاعر کی سوچ زیادہ فارسی کے الفاظ کے ساتھ ہی رہی ہے۔ خیر اپنی اپنی سوچ اپنا اپنا خیال۔

اگر ہم مقطع پر بحث ومباحثہ کریں تو غالب نے تسلیم کیا ہے کہ میں خدا سے رجوع نہیں ہوسکتا ہوں۔ مجھ میں کچھ غلطیاں ہیں کیونکہ غالب وظیفہ خوار ہے، مطلب اسلامی دائرے میں وظیفہ پڑھ کر خدا سے رجوع ہوتے ہیں اور اس سے بھی عبادت کرتے ہوئے سکون محسوس کرتے ہیں۔ لیکن غالب نے لفظ 'وظیفہ خوار' استعمال کیا ہے یہ مقطع میں نہیں لکھنا چاہئے تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی بادشاہ کو دعا کا مطلب شاعر فرماتے ہیں کہ میں ایسا وظیفہ نہیں پڑھ سکتا ہوں کہ میں دعا کروں اور میرے وظیفہ پڑھنے سے کسی کو سکون آئے اسی لئے میں اس کام سے الگ رہتا ہوں کیونکہ میں وظیفہ پڑھنے والا نہیں ہوں۔ ان دو لفظوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں بھی لوگ وظیفہ پڑھ کر بہت سے کام نکالا کرتے تھے۔ مطلب اگر کسی کو مشکلات یا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کو دور کرنے کے لئے لوگ وظیفہ پڑھتے تھے۔ وظیفہ پڑھ کر تھوڑا سا فرق محسوس کرتے تھے۔ میں اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس شعر میں تاریخی بیان بازی بھی ہے کہ ان دنوں لوگ وظیفہ پڑھ کر دعا بھی دیا کرتے تھے۔ اس بات کا حساس ہمیں غالب کے مقطع سے ہوتا ہے۔ جواب دعویٰ میں یہ کہتا ہے کہ میں ان وظیفوں کو نہیں پڑھ سکتا ہوں اگر میں پڑھ بھی سکوں تو میں کسی کا نوکر نہیں کہ میں کسی کی اچھائی کے لئے وظیفہ پڑھوں۔ مطلب ان لفظوں سے تاریخی منظر کے دور محسوس ہوتے ہیں، وہ لفظ نوکر سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان دنوں حکمراں لوگ تکلیف ختم کرنے کیلئے کئی بزرگ ملاحوں سے وظیفہ پڑھواتے

تھے تا کہ تکلیف باسہولیت آسان ہو سکے۔ اسی لئے اس شعر میں غالب نے کہا ہے کہ وہ دن نہیں آیا کہ میں نوکر کی طرح کام کروں اور وظیفہ پڑھوں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ تاریخی لحاظ سے ان دنوں زور زبردستی بھی مذہبی کام کرنے والے لوگوں پر دباؤ ڈالتے تھے اور کئی رہنماؤں کو بادشاہ مدعو کرتے تھے اور ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ کسی طرح سے وظیفہ پڑھوتا کہ ہر کام آسانی سے ہوجائے۔ اسی لئے غالب اس مقطع میں اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ ان دنوں مذہبی رہنماؤں کو زور زبردستی سے مذہبی دعا کرنے کے لئے بادشاہ اور وزیر بلاتے تھے، اگر چہ ان کو وظیفہ پڑھنے کی خواہش نہیں ہوتی تھی لیکن زور زبردستی سے پڑھنے پر مجبور کرتے تھے، اسی لئے غالب نے مقطع میں لفظ نوکر کا استعمال کیا ہوگا لیکن غالب کو لفظ 'خوار' کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ وظیفہ پڑھنے سے سکون ملتا ہے اور یہ ایک مذہبی لفظ ہونے کی وجہ سے اس کے بجائے خوار لفظ کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ مطلب خوار ایک برا لفظ ہے وظیفہ ایک اچھا لفظ ہے۔ خوار اور وظیفہ دونوں کو ایک ساتھ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ خیر شاعر کی اپنی سوچ اور طریقہ ہے۔ سب کچھ غالب نے آمد کے دائرے میں ہی بیان کیا ہے۔ اسی لئے میں اس بحث میں زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتا ہوں۔ جو لفظ 'وظیفہ خوار' غالب نے استعمال کیا ہے زیادہ تر اس کا اثر غالب کو اسی لئے ہوا ہے کیوں کہ اس نے بہت بار غزلوں میں وعدہ خوار بھی استعمال کیا ہے۔ لفظ خوار فارسی سے ہی لے کر اردو کے بہت سے شاعروں نے استعمال کیا ہے لیکن خود غالب کہتا ہے اگر وعدہ خوار نہ ہوتا، کسی دوسری غزل میں غالب نے لفظ بادہ خوار کا استعمال بھی کیا ہے مطلب شاعر نے زیادہ تر فارسی کے لفظوں کو اردو زبان کی غزلوں میں استعمال کر کے اپنی شاعری میں وسعت حاصل کی ہے۔ اس کے بجائے میر نے بھی فارسی کا رجحان اردو زبان میں دکھایا ہے لیکن غالب نے زیادہ رجحان اردو زبان میں ہی دکھایا ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

شاعر فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ معشوق کے در پر حاضر ہوتا ہوں لیکن لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہاں ہم شاعر کو نہیں دیکھتے۔ میں اپنے دل سے ہی اپنے خیالات اس معشوق کے در پر ہمیشہ رکھتا ہوں۔ مطلب اگر کوئی دیکھے یا نہ دیکھے میں ہمیشہ اپنے دل ودماغ کو اس کے در پر قائم ودائم رکھتا ہوں، لیکن مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں۔ میں ایک خاک کی طرح وہاں حاضر ہوں جو کبھی ہوا کے جھونکے سے غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں اس کے در د پر قائم ودائم ہوں۔ ہمیشہ کے لئے حاضر ہوں، لیکن اے معشوق اس سے آپ ایسا سمجھنا کہ میں ایک پتھر کی طرح آپ کے در پر اپنی حاضری ہر روز دیتا ہوں لیکن خاک سمجھ کر یا پتھر سمجھ کر میری حاضری کو قبول کر و یا نہ کرو لیکن میں آپ کے ساتھ ہمیشہ قائم ودائم ہوں۔ میں کبھی بھی الگ نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ یہ کہو کہ میرے در پر کبھی نہیں آنا تو آپ میری صورت کو پتھر کی طرح دیکھنا یا خاک کی شکل میں زمین پر دیکھنا اگر کسی وقت ہوا کے جھونکے سے خاک دیکھنے میں نہیں آئے تو پتھر کو ہی دیکھ کر سمجھنا کہ میرا محبوب در پر ہمیشہ کے لئے موجود ہے اور موجود رہے گا۔

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اے معشوق جب میں آپ کے در پر ہمیشہ کے لئے حاضر ہوں اور اپنی حاضری کو کبھی ختم نہیں کرسکتا۔ میں لوگوں کے سامنے حاضر نہیں رہتا۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ غالب کو اس کے در پر نہیں دیکھا۔ کیا کہہ رہے ہو کہ غالب اس کے در پر حاضر ہے اے معشوق میں نے پہلے کہا کہ میں خاک کی صورت میں بھی حاضر ہوں اور پتھر کی صورت میں بھی۔ لیکن آپ کو سمجھنا ہے تو میں کیا کروں۔ یہی نچوڑ شاعر اس مقطع میں بیان کر کے بتا رہا ہے۔ جب میں آپ کے در پر حاضر ہوں تو میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنے والا۔ میں آپ کے دیدار کے لئے وظیفہ پڑھتا ہوں تا کہ دعا حاصل کروں۔ یہ دعا آپ سے حاصل کر کے مجھے کچھ نہ کچھ سکون محسوس ہوگا۔ میں دعا کرنے والا بندہ ہوں اور میں اپنا وظیفہ پڑھنا نہیں چھوڑوں گا۔ کسی دن اگر میں وظیفہ

نہیں پڑھ سکا تو اس دن آپ یہ کہہ سکتے ہو کہ شاید اسی لئے نہیں پڑھا کہ اس نے یہ سمجھا ہوگا کہ وہ نوکر کی طرح اس کے در پر وظیفہ پڑھتا ہے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ غالب نے فرمایا ہے کہ اے معشوق میں خدا کی عبادت کی طرح آپ کی عبادت بھی کرتا ہوں۔ اگر آپ میری طرف نہیں دیکھتے ہو پھر میں وظیفہ پڑھ کر ہی ایک خادم کے طور پر آپ سے دعا حاصل کرتا ہوں۔ اگر آپ دعا نہیں کرو گے پھر بھی آپ کے دل سے میرے لئے دعا ضرور نکلے گی اور نکلتے ہوئے یہ احساس ہوگا کہ اتنی بار وظیفہ پڑھنے کے باوجود کچھ نہ کچھ اس سے حاصل ہی ہونا چاہئے تا کہ یہ نہ سمجھیں کے ایک نوکر کی طرح دروازے پر حاضری دے کہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکا۔ مطلب شاعر کے کہنے کا اس مقطع میں یہ ہے کہ اگر ہم مٹی یا پتھر کی صورت میں بھی خدا سے رجوع ہوں گے تو کچھ نہ کچھ حاصل ہو جائے گا اور خدا پر یقین کبھی نہیں ختم کرنا چاہئے ہمیں خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ کبھی بھی اپنا کام بغیر یقین کے نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم معشوق کے در پر کھڑے ہیں بطور خاک اور پتھر کے۔

شاعر نے یہ بتایا کہ ہمیں کسی بھی کام کو انجام دینے پر ناراض نہیں ہونا چاہئے اور جب بھی کوئی کام انجام دیں خواہ اس میں ہم کامیاب ہوں یا نہ ہوں، ہمیں اپنی کوشش سے نہیں چھوڑنی چاہئے جیسے کہ ایک خدا کا بندہ وظیفہ پڑھتا ہے اگر اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا پھر بھی خدا کے در پر ضرور اس کی دعا قبول ہوتی ہے یا اگر کسی وظیفہ پڑھنے والے سے ہم دعا کراتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ہماری بھی زندگی میں فرق آ ہی جاتی ہے مطلب خدا سے دعا مانگ کر ہم بہت سے فائدے حاصل کر سکتے ہیں اور کسی بزرگ کی دعا سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں ہر ایک کی دعا حاصل کرنی چاہئے تا کہ ہماری زندگی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ شاعر فرمارہے ہیں کہ ہمیں ہر کام میں محنت کر کے فتحیابی حاصل کرنی چاہئے۔ فتحیابی جن طریقوں سے حاصل ہوتی ہے وہ طریقے آزما کر ہی حاصل کرنی چاہئے لیکن ہمیں یہ نہیں کرنا چاہئے کہ ہم خدا کی عبادت کو منسوخ کریں۔ کچھ نہ کچھ خدا کی عبادت میں حاصل ہو کر فتحیابی کی سڑک کو

پار کر ہی لیتے ہیں۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر+نہیں ہوں میں = دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ+کہ پتھر نہیں ہوں میں = خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو + دو شاہ کو دعا = غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے کہ کہتے تھے+نوکر نہیں ہوں میں = وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

''دائم پڑا ہوا ترے در پر''

بہت سال گزرے جب ایک آدمی شہر میں فوت ہوا، فوت پر لوگوں نے غم وغصہ کا اظہار کیا۔ جب بھی شہر میں کوئی نیا کام ہونا ہوتا تو اس وقت تمام شہری اس سے صلاح ومشورہ لیتے تھے اور اسی کے تحت کام انجام دیتے تھے۔ اسی لئے شہریوں کو زیادہ افسوس ہوا کہ اچانک موت آنے کی وجہ سے ایسے ماہر سے، ہم جدا ہو گئے۔ جب کسی اور آدمی نے یہ سنا کہ شہر میں سبھی لوگوں کے دلوں میں غم وغصہ بھرا ہوا ہے اور اظہار افسوس کرتے ہیں۔ کسی دانشور کے موت کی وجہ سے وہ کوئی بھی نیا کام انجام نہیں دیتے۔ اس آدمی نے ان شہریوں کو بلا کر یہ کہا کہ موت تو ہر ایک کو آ کر ہی رہیگی اور کوئی بھی آدمی اس دنیا میں ہمیشہ کے لئے قیام نہیں کر سکتا۔ ہر مخلوق خواہ وہ پرندہ ہو یا حیوان ہو یا انسان ہو۔ اس دنیا میں بطور کرایہ دار مقیم ہیں اور موت کا شکار کسی نہ کسی دن ہونا ہی ہے۔ یہ بات شہریوں کو بتا کر کہا کہ ہمیں اپنا کام ہمیشہ کرتے رہنا چاہئے۔ دنیا کا کارواں اسی طرح سے چلتا ہے۔ کوئی بھی کاروبار کسی موت سے متاثر نہیں ہوتا۔ اسی لئے آدمی نے ہر شہری کو یہ نصیحت کی کہ اگر آپ کو کسی دانشور کی موت پر غم وغصہ محسوس ہو رہا ہے تو اس غم وغصہ ختم کر کے آپ اس کی پرانی تجویزوں کو یاد کرو اور دہراؤ تا کہ مشکلات کا حل نکل سکے۔ جس سے کہ آپ شہری بھی مطمئن ہوں گے اور کاروبار بھی چلتا رہے گا۔ یہ بات سن کر شہریوں نے کہا کہ آپ کو ہمیں کسی دوسرے کو بتانا ہوگا کہ اگر ہمیں کبھی کسی کام میں روکاوٹ آتی ہے تو اس وقت وہ آدمی کیسا مشورہ فراہم کرتا ہے۔ یہ سن کر شہریوں نے کہا کہ اب ہمیں

ان باتوں کو بھی یاد نہیں کرنا چاہئے آج کل کمپیوٹر کا دور ہے اور ہم کمپیوٹر سے ہی مشورہ لیں گے۔ اور اس کے مطابق کام انجام دیں گے۔ یہ سن کر شہریوں نے پھر بھی اس آدمی کی اچانک موت پر اظہار افسوس کیا۔ اور انہوں نے کہا کہ اس آدمی کا مشورہ بہت ہی اچھا محسوس ہوتا تھا کیونکہ ہمارے مسائل حل ہوتے تھے۔ یہ سن کر تمام شہریوں نے کہا کہ ہمیں اب ان باتوں میں زیادہ الجھنا نہیں ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم کمپیوٹر میں درج طریقوں کے مطابق اپنا کام کریں۔ اور ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اس آدمی کا معاملات ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔ ہم تمام شہری کام کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ وہ آدمی ہمارے ساتھ ساتھ ہے اور اس بات کا تصور ان الفاظ کے تئیں رکھتے ہوئے کہیں گے کہ ''دائم پڑا ہوا ترے در پر'' مطلب ہم شہریوں کو یہ احساس کام کرنے کے دوران ہونا چاہئے کہ اس آدمی نے ہمیں بہت سے صلاح ومشورہ دیئے جن سے ہمیں بہت سی مشکلات کا حل میسر ہوا۔ لیکن جب ہمیں کمپیوٹر سے بھی کوئی مشکل کام کا حل نہیں ملے گا تو ہم خود سوچ سمجھ کر اسکا حل ڈھونڈیں گے۔ اور ڈھونڈتے ہوئے اس کی یاد کر کے یہ کہیں گے کہ ''دائم پڑا ہوا ترے در پر'' مطلب ہم مشکلات کا حل نکالتے وقت سوچیں گے کہ وہ دانشور شہری ہمارے دروازے پر کھڑا ہے اور ہمیشہ کھڑا رہ کر بہت سی مشکلات کا حل ضرور فراہم کرے گا۔ مطلب اس کے دروازے پر سجدہ کر کے ہی مشکل کا حل ڈھونڈیں گے تبھی تو تمام شہری اس بات پر متفق ہونگے کہ ہمیں ہر مشکل کام کو انجام تک پہنچانا ہے۔ کمپیوٹر کا بھی ساتھ لینا ہے اور اگر کبھی کمپیوٹر سے حل نہیں نکلے گا تو ہمیں ان الفاظ سے کام کو کرنا ہے۔ ''دائم پڑا ہوا ترے در پر''

''نہیں ہوں میں''

کئی دنوں کے بعد کسی شہری کو کمپیوٹر سے بھی مشکلات کا حل نہیں ملا۔ جس کی وجہ سے وہ بہت ہی پریشان رہا اور حل کے لئے سوچتے ہوئے نیند آ گئی۔ تو اس نے خواب میں اُسی آدمی کو دیکھا جس آدمی پر لوگوں نے اظہار افسوس بہت دنوں تک شہر میں کیا۔ اُس آدمی کو شہری نے

تلقین کی کہ وہ کمپیوٹر سے بھی مشکل کا حل نہیں نکال سکا۔ تب اس آدمی نے کہا کہ اس کا حل یہ ہے کہ جس سے کہ آپ کو مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ جب وہ آدمی نیند سے بیدار ہوا تو خواب میں دیکھ کر جو تجویز اس آدمی نے اس کو بتائی اس نے اسی کے تحت کام انجام دیا۔ اور مشکل کا حل مل گیا۔ ملنے پر وہ اس آدمی کے قبر پر جا کر ہمیشہ گلدستہ پیش کر کے احترام کرنے لگا اور جب بھی کبھی اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور کمپیوٹر میں بھی حل موجود نہیں ہوتا تھا تو اس دن وہ اسی کے قبر پر جا کر اپنی مشکلات کا ذکر کرتا تھا۔ پھر کسی دن آدمی کو ایسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا کہ کمپیوٹر میں بھی حل موجود نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے پریشان ہو گیا۔ اسی کیفیت میں اسے نیند آ گئی۔ اسی آدمی کو پھر خواب میں دیکھا اور اس آدمی نے اس سے کہا کہ آپ میری قبر پر حاضری دے کر میرا احترام کرتے ہو۔ آج جو آپ کی مشکل ہے وہ میں بھی کئی تجویزوں کے باوجود حل نہیں کر سکتا۔ اسی لئے سب کا حل دینے والا خدا ہی ہے۔ مجھے خدا کی معرفت ہی ایسی عقل فراہم ہوتی رہی جس سے کہ میں شہریوں کو اپنی تجویز دے کر مشکل کا حل ڈھونڈتا رہا لیکن اس وقت جو آپ کی مشکل ہے اس کی تجویز میں نہیں دے سکتا۔ اسی لئے آپ سے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا سے رجوع ہو کر ایسی مشکل کا حل ڈھونڈنے کے لئے کسی دوسرے سے مشورہ طلب کریں۔ اس آدمی نے اس سے یہ کہا کہ آپ ہی کچھ نہ کچھ تجویز خود بھی دے سکتے ہو۔ جواب میں آدمی نے کہا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سب کچھ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی سوچ دینے والا ہے اور وہی کام انجام تک پہنچانے والا ہے۔ تو بیدار ہونے سے پہلے اس آدمی نے اس خواب کا عنوان یہ کہہ کر قلم بند کیا کہ "نہیں ہوں میں" نیند سے بیدار ہوا۔

"خاک ایسی زندگی پہ"

جب یہ آدمی نیند سے بیدار ہوا تو اس نے دوسرے آدمی کو اپنے خواب کے بارے میں بتا کر یہ کہا کہ میں حیران ہوں اور بیدار ہونے سے پہلے یہ لفظ "نہیں ہوں میں" پڑھا۔ بیدار اس بات پر ہوا کہ کوئی آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا جب تک خدا اس کے ساتھ نہ ہو۔ خدا ہی اپنے

بندوں کو ایسی عقل دیتا ہے جس سے کہ وہ نئے سائنسی طریقوں کا استعمال کرتے ہوئے کچھ نئی چیز ایجاد کریں تا کہ لوگ حیران ہوں اور ان کے رجحانات میں بیداری آئے۔ یہ بیداری بھی خدا ہی عطا کرتا ہے۔ ایک سائنسدان جو لوگوں کی کئی بیماریوں کے علاج کے لئے ایسی ایسی دوائیوں کا ایجاد کرتا ہے جس سے کہ بیماری نہیں اُبھرتی اور بیمار انسان پھر سے تندرست ہو جاتا ہے۔ اسی لئے خواب کے آخر میں یہ لفظ پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ خدا کے رحم و کرم سے ہی سب کام درست ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم کوئی بھی کام خدا کے توسل سے ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اسی لئے اس آدمی نے یہ سوچا کہ جب میں اپنی سوچ کے مطابق مشکلات کا حل ڈھونڈوں گا تو دوسری دفعہ کوئی اور آدمی مجھے کسی مشکلات کے بارے میں حل ڈھونڈنے کے لئے مشہورہ ضرور دے گا۔ تو میں پہلے اپنی مشکلات کو اپنی ہی عقل سے حل کروں گا۔ تب میں دوسرے آدمی کی مشکلات کا مشورہ دے کر اس کا بھی حل نکال سکتا ہوں۔ لیکن ہر مشکل کا حل خدا کے رحم و کرم سے ہی نکل سکتا ہے اگر ہمیں خدا ایسی سوچ ہماری عقل میں فراہم کرے گا۔ اسی لئے میں نے بیدار ہونے سے پہلے خواب میں ایسے لفظ پڑھ کر نصیحت حاصل کی۔ جب انسان کسی انسان کو نصیحت فراہم کرتا ہے تو وہ اس نصیحت پر چل کر انسانیت سیکھتا ہے۔ اسی طرح سے ملک یا شہر کے متعلق کوئی نصیحت یا تجویز فراہم کر کے انسان اس دنیا میں زیادہ دیر تک قیام نہیں کرتا۔ کیونکہ دنیا میں ہر ایک انسان کرایہ دار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں ہر ایک کام خدا کا نام لے کر ہی انجام دوں گا اور اسی کے رحم و کرم سے مشکل کا حل ضرور فراہم ہوگا۔ کیونکہ کام انجام دینے کے بعد آخر کار اس زندگی کو خاک میں ملا کر اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ مطلب آخری سانس لینے کے بعد ہمیں اپنی زندگی کو خاک میں ملانا ہے۔ اسی لئے یہ زندگی خاک کے مانند ہے اور ''خاک ایسی زندگی پہ'' تب اس آدمی نے مشکلات کا حل خود ڈھونڈنے کی کوشش کی اور اسی طرح سے اپنی زندگی کے کام انجام دیتا رہا اور خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتا رہا کہ اے خدا رحم آپ کا اور کام میرا۔ اسی لئے آخر میں یہ لفظ کہہ کر اپنی بات کو میں اختتام تک پہنچاتا

ہوں کہ ”خاک ایسی زندگی پہ“

”کہ پتھر نہیں ہوں میں“

جب اس آدمی نے اپنی زندگی کی مشکلات کا اسی طریقے سے سامنا کیا اور کرتا رہا تو پھر بہت سے شہریوں نے اس سے یہ کہا کہ آپ نے اپنی مشکلات کیسے حل کیں۔ اس نے ان لوگوں کو ان دلیلوں سے واقف کرایا جن کے تحت وہ خدا کی مدد سے ہر مشکل کا حل خود ڈھونڈتا رہا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میں کوئی ایسا جن نہیں ہوں نہ میرے پاس جنات ہیں اور نہ ہی میں کوئی جادوگر ہوں۔ میں ایک انسان ہوں انسان ہونے کے ناطے میں خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتا ہوں کہ مجھے ایسا شعور دیا جائے جس سے کہ میں ہر ایک مشکل کا حل خود ڈھونڈ سکوں۔ یہ بات سن کر دوسروں نے یہ کہا کہ یہ سوچ تو اچھی ہے۔ ناخواندگی کی وجہ سے کئی گاؤں کے لوگ اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے کام نہیں کرتے جس کی وجہ سے گاؤں کے کسی بزرگ سے مشورہ لے کر کام کرتے ہیں۔ اگر لوگ خود اپنی عقل سے کام کرتے تو کتنا اچھا ہوتا اور دوسرے آدمی سے مشورہ لینے پر راز فاش بھی نہیں ہوتے۔ مانتے ہیں بہت سی مشکلات کا انسان کو سامنا ہی کرنا پڑتا ہے لیکن خود مشکل کا حل ڈھونڈتے وقت دوسرے سے مشورہ لینا بھی اچھا ہے تاکہ کوئی اور مشکل نہ پیش آئے۔ لیکن اس بات کا احساس جب شہریوں اور گاؤں والوں میں پیدا ہوا تو وہ خود اپنی عقل سے ہی مشورہ لیتے رہے اور مشورہ لینے سے پہلے خدا سے رجوع ہو کر اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈتے رہے۔ ان آدمیوں نے اس آدمی کی بات تسلیم کر لی اور کہا کہ ہم ہمیشہ خدا سے رجوع ہو کر مشکل کا حل ڈھونڈیں گے اور یہ بھی کہیں گے کہ ہماری عقل خدا کے رحم و کرم پر ہے مطلب خدا کے رحم سے ہماری عقل میں ایسے ایسے خیالات آسکتے ہیں جن سے ہر ایک کام کو ٹھیک طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے ہم یہ کہیں ”کہ پتھر نہیں ہوں میں“ مطلب ہم کسی کے پاس جائیں اور ہم پتھر سے رجوع ہو کر یہ کہیں کہ اے پتھر ہمیں ایسی مشکلات درپیش ہیں۔ ان کا حل ڈھونڈو۔ لیکن اس کے پاس بھی حل نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر کسی

مشکل کا حل ہو سکتا ہے تو ہمیں خدا سے رجوع ہونا ہوگا۔ اگر ہم کسی دوسرے سے مشورہ لیں گے تو اس وقت ہماری سوچ اور راز کا پردہ فاش بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہم کسی کو خاص بات پر مشورہ دے سکتے ہیں نہ کہ ہر ایک بات پر۔ اگر کسی کے پاس ہم جا کر ہر از بار اس سے یہ کہیں کہ ہمیں ایسی مشکل درپیش ہے اس کا حل ڈھونڈو۔ وہ ہم سے یہ کہے گا کہ میں ہر ایک کی مشکل کا حل نہیں ڈھونڈ سکتا۔ میں کوئی پتھر نہیں ہوں کہ میرے پاس آپ لوگ ہزار بار آتے ہو اور مجھ سے مشورہ حاصل کراتے ہو۔ کتنی بار میں آپ کو مشورہ دوں۔ خود خدا سے رجوع ہو کر اپنے عقل سے بھی کام لینا چاہئے اور عقل سے کام لے کر مشکل کا حل ضرور حاصل ہو سکتا ہے۔ تبھی تو تنگ آ کر اس آدمی نے یہ کہا ''کہ پتھر نہیں ہوں میں'' اور کہنے کے بعد خاموش رہا۔

''غالب وظیفہ خوار ہو''

جب شہریوں میں ایسا احساس ہوا کہ خدا سے رجوع ہونے پر ہی ہر ایک مشکل کا حل ہو سکتا ہے کیونکہ تبھی ہماری عقل میں ایسی سوچ بیدار ہو سکتی ہے جس سے کہ مشکلات کا حل ضرور ہو۔ تب شہریوں نے کمپیوٹر کا بھی استعمال کیا لیکن انہیں کمپیوٹر سے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مطلب لوگ زیادہ تر خدا سے رجوع ہونے لگے اور خدا کے فضل و کرم سے ہی مشکل کا حل ڈھونڈتے رہے۔ تب تو انہوں نے اس مقطع کا استعمال کیا جسے غالب نے فرمایا ہے کہ ''غالب وظیفہ خوار ہو'' مطلب ہمیں خدا سے رجوع ہو کر وظیفہ پڑھنا چاہئے جسے پڑھ کر ہمیں کچھ نہ کچھ حاصل ہوگا۔ لیکن ہمیں خدا سے کبھی دور نہیں ہونا چاہئے اور اس ہی کا نام ہمیشہ لینا چاہئے۔ یہ سوچ کر تمام شہریوں اور گاؤں والوں نے غالب کو یاد کر کے یہ کہا کہ ''غالب وظیفہ خوار ہو'' مطلب وظیفہ پڑھنے سے بھی کچھ نہ کچھ سکون حاصل ہو سکتا ہے اور ایسی سوچ بھی دماغ میں ضرور آ ہی جائے گا جس سے کسی بھی مشکل وقت میں آسانی پیدا ہو سکے۔ اور مشکلات کا دور کافی دیر تک رہے گا اور اس وقت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اسی لئے کیوں نہ ہم اس کی نصیحت پر چلیں ''غالب وظیفہ خوار ہو'' مطلب یہ کہ جب بھی ہم کوئی وظیفہ پڑھیں تو ہم

پر مشکلات آئیں گے لیکن پڑھتے رہنے پر ان مشکلات سے آسانی سے نکلنے کے راستے بھی ہماری عقل میں ضرور آہی جائیں گے۔ مطلب ہم مشکلات کا حل اور مقابلہ بہادری سے بھی کر سکتے ہیں۔ مطلب خدا ہمیں ایسی عقل فراہم کرے گا جس سے کہ ہم مشکلات کو بہادری کے تیئں فتح کر کے انہیں آسان طریقے سے اختتام تک پہنچا سکتے ہیں۔ اسی لئے سبھی شہریوں نے مان لیا کہ کیوں نہ ہم اس لفظ کے ذریعے ہی یہ تسلیم کریں، ہمیں اپنی عقل سے ہی کام انجام دینا چاہئے۔ اور کسی خاص مشکل دور میں کسی سے مشورہ لینا لیکن ہمیشہ نہیں، اکثر اپنی عقل سے ہی مشورہ لینا اور ہمیں ایسا جذبہ رکھنا چاہئے کہ ہم یہ کہیں کہ ''غالبؔ وظیفہ خوار ہو''

''دو شاہ کو دعا''

یہ نہ سوچنا کہ وظیفہ پڑھنے سے یا خدا سے رجوع ہونے پر ہمیں ہمیشہ مشکلات کے دور سے گزرنا پڑے۔ کئی مشکلات کے دور آسکتے ہیں تو ہمیں ایسا جذبہ اپنے دل میں نہیں پیدا کرنا چاہئے جس سے کہ ہم یہ کہیں کہ خدا نے ہمیں مشکل دور میں ایسی عقل نہیں دی جس سے کہ ہم اُس مشکل کو ختم کر سکیں۔ ہم ایسا دور دیکھ کر وظیفہ نہیں پڑھیں گے۔ انسان کو ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ ہمیں ہمیشہ وظیفہ پڑھنا چاہئے ۔ خدا آزمائش کی گھڑی میں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیں بہت دفعہ آزما کر مشکلات کو ختم کرتا ہی رہتا ہے۔ اسی لئے اگر ہماری مشکل کا حل نہ ملا تو کبھی نہ کبھی تو مشکل کا حل ضرور مل ہی جائیگا۔ تو یہ سوچنا چاہیئے کہ ہمیں وظیفہ پڑھ کر بھی کوئی حل ہی نہیں نکلا۔ لیکن ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ وظیفہ پڑھنے سے ہمیں خدا کا کرم ضرور حاصل ہوتا ہے اور اس ہی کے تیئں اپنا دل پیش کر کے ہمیں کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ ہمیں وظیفہ پڑھنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے اگر کچھ بھی نہیں ملا پھر بھی ''دو شاہ کو دعا'' مطلب اگر ہمیں وظیفہ پڑھنے سے خدا نے کسی وقت مشکل کا حل نہیں نکالا یا عقل میں ایسی سوچ نہیں دی جس سے کہ ہم مشکل کا حل نکال سکتے لیکن کم ہمت نہیں ہونا چاہئے ہمیں ان باتوں کا احساس کر کے یہ کہنا

چاہئے کہ "دو شاہ کو دعا"

"وہ دن گئے کہ کہتے تھے"

ان باتوں پر شہریوں اور گاؤں والوں نے کام انجام دیا اور اپنی ہی عقل سے مشکل کا حل نکالتے رہے۔ایک آدمی نے تجارت کرنا شروع کی۔اس نے گاؤں میں دکان سجائی۔گاؤں میں بہت سے گراہک اس سے سودا لیتے رہے لیکن گاؤں کی حالت بہت ہی خراب تھی،لوگ وقت پر قرضہ دکاندار کو نہیں دیتے تھے۔جس سے دکاندار کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ان مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے دوکاندار بہت ہی پریشان میں مبتلا ہوگیا۔لیکن خدا کے رحم وکرم سے اپنا کاروبار چلاتا رہا۔ایسے دن بھی دکاندار کو دیکھنے پڑے، جب گراہک یہ کہنے لگے کہ روزمرہ کا سودا اب آپ کی دکان میں نہیں ملتا لیکن اندر ہی اندر دوکاندار یہ کہنے لگا کہ سب ادھار لیتے ہیں اور روپے دیتے ہی نہیں۔تو میں نیا سودا کیسے لاؤں اور دکان میں بیچوں، یہ سوچتے ہوئے دوکاندار خدا سے رجوع ہوا اور یہ کہا کہ ایک تو میں سب غریبوں کو دکان سے ساری چیزیں فراہم کرتا ہوں لیکن لوگ ادھار لیکر کچھ بھی نقد نہیں دیتے اور میری معاشی حالت بری ہونے لگتی ہے۔اس کے بعد دوکاندار کو لاٹری ٹکٹ حاصل ہوا جس سے تین لاکھ کا انعام حاصل ہوا۔انعام حاصل کرنے کے بعد دوکاندار کو ایک لاکھ روپئے کا نقصان ہوا تھا کیونکہ گاؤں والوں نے قرضہ کی ادائیگی ہی نہیں کی تھی لیکن خدا نے دوسرے طریقے سے ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ دیئے مطلب غریبی ہونے کی وجہ سے ادھار کا روپیہ واپس نہ مل سکا اور خدا نے اسی دکاندار کو دو لاکھ روپئے کا نفع اسی طریقے سے فراہم کیا جس سے کہ وہ یہ سوچ سکا کہ ادھار کی آدائیگی حاصل ہوئی۔اب اسے یہ احساس پیدا ہوا کہ مجھے اگر نقصان ہوا پھر بھی دو لاکھ روپئے کا نفع بھی حاصل ہوا جس سے کہ میں یہ نہیں سوچتا کہ مجھے نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔لاٹری ٹکٹ کے روپے وصول کر کے یہ کہنے لگا کہ "وہ دن گئے کہ کہتے تھے" اس کا مطلب تین لاکھ حاصل کرنے کے بعد خدا کا شکرانہ ادا کیا اور یہ کہا اگر چہ ادھار کا پیسہ واپس نہیں آیا تو

ایک لاکھ روپے کا نقصان کا سامنا کیا اور اسی دوران کچھ دن ایسے گزرے کہ میں یہ سوچتا ہوں کہ ایسے دن کبھی نہیں دیکھنا چاہتا اور پیسے حاصل کرنے کے بعد یہ کہا **"وہ دن گئے کہ کہتے تھے" "نوکر نہیں ہوں میں"**

جب دوکاندار کو نقصان کا سامنا کرنا پڑا تو لاٹری ٹکٹ کے پیسے حاصل کرنے کے بعد اب یہ سوچنے لگا کہ کیوں نہ میں اس گاؤں میں دوکان بند کروں کیونکہ یہاں کے لوگ ادھار لیتے ہیں لیکن ادا نہیں کرتے اور دوکاندار یہ کہنے لگا گاؤں والے مجھ سے ادھار لے کر نوکر سمجھتے ہیں انہیں احساس ہی نہیں کہ ادھار کی ادائیگی پر دوکاندار سے صرف سودا لیتے ہیں جس کی آدائیگی کا خیال ہی نہیں۔ اب جب مجھ سے ادھار لیتے ہیں تو مجھ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا نوکر ہے دکاندار نہیں۔ کیونکہ احساس ہی نہیں کہ مجھے کئی چیزوں کی کمی ہے اور اس کمی کو پورا نہیں کرسکتا کیونکہ ادھار کی ادائیگی نہیں وصول ہوتی۔ ادائیگی وصول ہونے کی وجہ سے میں اب خدا کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ اگر مجھے ادھار سے نقصان کا سامنا کرنا پڑا لیکن گاؤں کے لوگوں کو ہر ایک چیز کی سہولیت بھی فراہم کی۔ لیکن ان لوگوں کو ادائیگی کا خیال ہی نہیں ہے۔ یہ گاؤں کے لوگ مجھے ایک امیر تاجر سمجھتے ہیں۔ ادائیگی وصول نہ ہونے کی وجہ سے میں یہ دکان اور کاروبار بند کرتا ہوں۔ میں نقصان نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہ سوچتے ہوئے کہنے لگا کہ اسی سوچ پر مجھے ہمیشہ قائم ودائم رہنا چاہئے۔ تبھی تو ہم کوئی نقصان نہیں اٹھا سکتے۔ اسی لئے میں اس دکان کو بند کر کے یہ کہتا ہوں "نوکر نہیں ہوں میں" جب گاؤں والوں۔ نے دکان بند دیکھی تو انہیں احساس ہونے لگا کہ ہم نے ادھار کی ادائیگی ہی نہیں کی اسی لئے دکاندار نے یہ بات کہی ہوگی **"نوکر نہیں ہوں میں"**

جب میں نے اس مطلع اور مقطع پر ایسی رلیل بتائی تو میں یہ سوچتا ہوں کہ کیوں نہ اس عنوان سے اس دلیل کے ساتھ اختتام تک پہنچاؤں **"نوکر نہیں ہوں میں"**

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا ؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

مرزا اسد اللہ خان کا مطلع اور مقطع دیوانِ غالب میں پڑھ کر بحث کے لئے کچھ تاثرات لکھتا ہوں ۔غالب نے تمام غزلوں میں فارسی کا زیادہ رجحان اُردو زبان میں لکھا ہے۔ غالب نے اگر فارسی کا اُردو زبان میں استعمال کیا ہے پھر بھی میں یہ دعویٰ سے کہہ رہا ہوں کہ ان کی شاعری ان الفاظ سے سجتی ہے۔اگر اُردو زبان ایک لشکری زبان کی حیثیت سے دُنیا بھر میں مشہور ہے لیکن باوجود اس کے آپ کو مطلع اور مقطع پڑھ کر یہ محسوس ہوگا کہ غالب کی شاعری کو ہم زمانے حال کے ساتھ بھی وابستہ کر سکتے ہیں۔اگر غالب نے کم غزلیں لکھیں ہیں لیکن پھر بھی انہیں دُنیا کا غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے۔میں کچھ خامیاں تو بتاتا ہوں لیکن ان خامیوں کو ان کے خیالات سے دور کرتے ہیں جیسے کہ لفظ 'سنگ وخشت' کا استعمال کیا ہے،لیکن جب ہم داد دیتے ہیں سنگ وخشت ہی کہنے میں اچھا لگتا ہے۔اسی طرح سے لفظ 'درد' بھی پڑھنے میں اچھا لگتا ہے۔ اگر درد کے بجائے ہم بیمار لکھتے وہ وزن کے اعتبار سے کہنے میں صحیح نہیں لگتا۔غزل کے مطلع پر جو دوسرا شعر لکھا ہے اس میں اگر ہم لفظ 'روئیں' پر بحث کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ غالب نے ہمیشہ ایسے لفظ غزلوں میں استعمال کئے ہیں جیسے روئیں، زخم، آنسو اِن لفظوں سے ہی غالب کی شاعری میں رونق نظر آتی ہے، اگر ہم مطلع کے دوسرے شعر میں لفظ روئیں کے بجائے 'بہا کر آنسو' استعمال کریں گے تو ہم کو شعر الگ کرنا پڑے گا اور مفہوم کے اعتبار سے مطلع کی وہی بیان بازی پڑھنے میں آئے گی جس طرح غالب کے اصلی لفظوں میں مطلع میں بیان کی ہے۔جیسے کہ

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
آنسو بہا کر ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

جیسے کہ میں نے اوپر کے مطلع میں دوسرے مصرع میں آنسو بہا کر استعمال کیا اور روئیں گے ہم کو الگ کیا پڑھنے والے کو محسوس ہوگا کہ مفہوم کے اعتبار سے غالب کا ہی مطلب پڑھنے میں سمجھتے ہیں، لیکن روئیں گے غالب نے اسی لئے بیان کیا ہے کسی درد میں برداشتِ قوت ہوتی ہے جس سے مریض روتا نہیں ہے۔ صرف درد محسوس کرتا ہے لیکن جب کوئی اسے راستے میں ملتا ہے تو وہ اپنی طبیعت کے بارے میں بتاتا ہے۔ اسے درد محسوس ہوتا ہے لیکن ایسا درد جس میں آنسو بہانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن کبھی کبھی جب زیادہ درد محسوس ہوتا ہے تو اس وقت بیمار کہتا ہے کیوں نہ میں زار زار رو کر آنسو بہاؤں۔ میرے خیال میں غالب نے لفظ 'روئیں گے ہم' اسی لئے استعمال کیا ہے تاکہ اس روئیں گے ہم میں درد کے بارے میں پڑھنے والوں کو محسوس ہو جائے کہ کیوں شاعر نے روئیں گے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس طرح میں نے لفظ 'آنسو بہا کر' لکھا ہے لیکن اس میں درد کے ساتھ وابستگی نہیں رہی۔ وہ یہ کہ درد ہے لیکن رونے والا درد نہیں ہے۔ درد میں برداشتِ قوت ہے تبھی تو غالب نے روئیں گے ہم ہزار کا استعمال کیا ہے۔

جب میں غالب کے مقطع پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے مطلع مقطع کی وابستگی کے ساتھ ہی لکھا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی احتجاج بھی کیا ہے۔ احتجاج کا لفظ ہائے ہائے ہے اور ہائے ہائے آج کل بھی کسی وقت یا مجلس یا کسی جلسے میں عام استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر بہت سی تنظیمیں جب اپنی مانگیں حکومت کو پیش کرتی ہیں یا غیر سرکاری ادارے کے ملازم اپنی مانگیں منوانے کے لئے احتجاج کرتے ہیں۔ احتجاج کرتے ہوئے کئی ایسے حربے استعمال کرتے ہیں جن سے ہائے ہائے کے الفاظ سننے میں آتے ہیں۔ اسی طرح سے غالب نے لفظ ہائے ہائے کا استعمال کیا ہے مطلب ان دنوں بھی اس قسم کے احتجاج دیکھنے میں آتے ہوں گے اگرچہ انگریزی سامراج یا شخصی راج کا دور رہا لیکن پھر لوگ تنگ آکر ہائے ہائے کا استعمال بھی کرتے رہے۔ مطلب احتجاج بھی کرتے رہے۔ جس بات کا احساس میں غالب

کے لفظ 'کام بند' کا حوالہ دیتا ہوں۔ مقطع میں غالب نے صحیح کہا ہے کہ ان دنوں لوگ احتجاج کرتے وقت ہڑتال بھی کیا کرتے تھے اس کا ثبوت اس لفظ 'کام بند' سے ملتا ہے اور لفظ 'ہائے ہائے' کا استعمال سے بھی ملتا ہے۔ اگر میں دوسرے طریقے سے یہ بھی بتاؤں کہ ان دنوں ہڑتال کرنے کے باوجود بھی حکمران مانگے پوری نہیں کرتے تھے تو پھر وہ اپنی اجرت سے محروم رہتے۔ اپنی اجرت سے محروم ہونے کیلئے غالب نے لفظ 'روئے زار زار' کا استعمال کیا ہے لیکن اگر میں دوسرے طریقے سے بھی اس مقطع پر بحث کروں میں یہ بتاؤں گا کہ کیوں نہ غالب نے روئے لفظ کے بجائے 'بہا کر آنسو زار زار لکھا' جیسے

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
بہا کر آنسو زار زار کیا؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

پڑھنے والے پڑھ کر یہ کہیں گے کہ غالب کے مقطع کو اگر ادیب نے دوسرے طریقے سے لکھ کر پڑھنے والے کے لئے بیان کیا ہے تو مطلب وہی سمجھ میں آتا ہے جو مطلب غالب نے اپنے مقطع میں بیان کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مقطع میں تخلص غالب کا ہی لکھا ہے۔ اسی لئے غالب کا ہی مقطع ہے اگر میں یہ بھی کہوں کہ غالب نے اسی لئے لفظ 'روئیں زار زار' استعمال کیا ہے تاکہ ان شخصیتوں کو اس مقطع میں یہ سمجھائیں کہ اگر کام بند کریں گے تو انہیں ماہانہ اجرت سے کنارہ کش ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد ان کو اجرت کے لئے زار زار رونا پڑے گا۔ تبھی تو مقطع کے جوابِ دعویٰ میں غالب نے بیان کیا ہے کہ کام بند کرنے سے بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جب میں نے اس دعوئے شعر جو مقطع میں میں نے بیان کیا وہ یہ کہ میں نے لفظ 'آنسو بہا کر' لکھا اس کا مطلب مقطع کے آدھے مصرعے کا جوابِ دعویٰ مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔ مطلب آنسو بہا کر زار زار مطلب اس کا مفہوم یہ ہے کہ کام بند کیا گیا ہے۔ لوگ ہڑتال پر گئے ہیں انہیں اب کوئی اجرت نہیں ملیگی۔ تبھی تو وہ مقطع کے جواب دعویٰ میں کہہ رہے ہیں۔ آنسو بہا کر زار زار۔ اسی طرح سے غالب نے اس مقطع کو لکھ کر تاریخی مناظر

سے واقف کیا ہے وہ یہ کہ اس نے لفظ 'ہائے ہائے' اور لفظ 'روئیں زار زار' استعمال کر کے پڑھنے والے کو یہ اشارہ دیا ہے کہ ان دنوں بھی لوگ احتجاج پر جایا کرتے تھے۔ اب مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ پڑھنے والے کو محسوس ہو جائے گا کہ غالب نے مطلع اور مقطع ان دنوں کے حالات پر بھی بیان کیا ہے۔ اگر چہ مطلع اور مقطع کا مفہوم کسی عورت کے ساتھ باتیں کرنے کے برابر ہے لیکن ہم اس کی مشابہت ان دنوں کے لوگوں کے حالات کے بارے میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

شاعر فرماتے ہیں اگر میرا دل پتھر کی طرح مضبوط ہے لیکن اس مضبوطی کے باوجود میرے دل میں کیوں درد محسوس ہوتا ہے۔ مطلب اے معشوق میں کیوں آپ کی جدائی سے تنگ آ کر درد محسوس کرتا ہوں۔ میرا دل ایک ایسا پتھر ہے جو کہ بہت ہی مضبوط ہے۔ اب آپ یہ کہو گے کہ معشوق کا دیدار ہی نہیں ہوگا وہ کبھی ملے گی ہی نہیں۔ وہ اس طریقے سے رُلائیں گے لیکن اس ستائے جانے کی وجہ سے میں اے معشوق کیوں رونے بیٹھوں۔ میں نہیں رونے والا ہوں۔ میں اپنے دل کو ایک پتھر سمجھتا ہوں اور ان طریقوں سے ایسا پتھر نہیں پگھل سکتا ہے. جس سے کہ میں آپ کی جدائی پر یا دوسرے ستم پر رونا شروع کروں۔ میں ان آدمیوں کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ نہیں کرتا ہوں ہزاروں ستم سے رونے بیٹھوں۔ اسی لئے اے معشوق اس بات کا احساس آپ کو خود بخود محسوس ہونا چاہئے کہ میرا محبوب میری جدائی پر نہیں روتا ہے لیکن ایسے ستائے جانے کی وجہ سے میرا دل پتھر بن سکتا ہے نہ کہ مجھے رونا ہے اے معشوق اب ان باتوں پر بحث کر کے میں آپ کو یہ کہتا ہوں کہ آپ کے ستائے جانے کی وجہ سے میرا دل پتھر بن گیا جس پتھر کو دنیا کی کوئی بھی طاقت نہیں ہلا سکتی ہے۔

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
رویئے زار زار کیا ؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

شاعر غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں اے معشوق غالب کو خستہ نہیں سمجھنا وہ خستہ کے بغیر ہیں، اسی لئے میں آپ کے ساتھ تعلقات ختم نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میرے تعلقات آپ کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے خواہ وہ تعلقات آپ ٹھکرانا چاہو۔ میں اپنے تعلقات ٹھکرانے والا نہیں۔ آپ میرے ستائے جانے کی وجہ سے ہی رونا شروع کرو گے لیکن میں آپ کے رونے سے احتجاج نہیں کروں گا۔ مطلب آپ مجھے کچھ بھی کہو میں خستہ نہیں ہوں۔ مطلب غالب کہتے ہیں کہ میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ میں گھبراؤں اور گھبرانے سے میں آپ کی جدائی پر اور آپ کے اخلاق پر اپنا کام بند کر کے زار زار روتا ہوا نظر آؤں۔ میں ان آدمیوں کے ساتھ نہیں ہوں نہ میں آپ کے اس اخلاق پر ہائے ہائے کرنے والا بندہ ہوں۔ میں خستہ کے بغیر ہوں، میں رونے والا نہیں ہوں نہ میں ہائے ہائے کرنے والا ہوں۔

لفظ غالبؔ کے معنی کے مطلب پر میں اگر اس مقطع کو بیان کروں تو میں یہ لکھوں گا کہ فتحیابی اسی آدمی کی شخصیت کی وجہ سے ہو سکتی ہے جو آدمی بزدل نہ ہو جو آدمی کسی بزدل کام سے روئے۔ ہر ایک آدمی کو بہادرانہ قوت رکھنی چاہیے۔ فتحیابی ہائے ہائے کرنے سے نہیں حاصل ہوتی ہے بلکہ کچھ ایسا ماحول پیدا کرنا ہوتا ہے جس سے انسان زار زار نہ روئے اور آنسو نہ بہائے ان کے بغیر ہی دل کو مضبوط رکھ کر انسان فتحیابی حاصل کر سکتا ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت+درد سے بھر نہ آئے کیوں = دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار+کوئی ہمیں ستائے کیوں = روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
غالبؔ خستہ کے بغیر+کون سے کام بند ہیں = غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
رویئے زار زار کیا؟+کیجئے ہائے ہائے کیوں؟ = رویئے زار زار کیا؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

''دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت''

دُنیا کے ہر کونے میں غربت اور مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے یا کئی ایسے حالات پیدا ہونے کی وجہ سے دُنیا کے ہر ملک میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ غلط کام کرتے ہیں۔جن غلطیوں کے لئے ان کو اپنے مما لک میں سزا ملتی ہے اور سزا پانے پر سزایافتہ آدمی کہتے ہیں۔اسی طرح سے ایک ملک میں ایک بہت ہی خطرناک چور چوری کرتا تھا۔کبھی بھی وہ اپنے دھندے سے باز نہیں آیا،حتی کہ پولیس نے اس کو بہت بار جیل میں قید رکھا۔دو تین سال قید میں رہ کر بھی وہ اپنے کام سے باز نہیں آیا۔مطلب وہ چوری کرتا رہا۔اس دھندے میں اس کے ساتھ بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہوئے جو ایسا دھندہ کیا کرتے تھے۔بہتوں کو سزا ملتی تھی اور بہت سے سزایافتہ چھوٹ جاتے تھے۔مطلب عدالت کے حکم کے تحت انہیں سزا ملتی تھی تو بہت کو سزا نہیں ملتی تھی۔اسی طرح سے اس ملک میں ایک ایسا چور تھا جس کا نام دھنتر تھا وہ دنیا کے کونے کونے میں بہت ہی مشہور تھا۔اس نے اپنا جال دُنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا اور اپنے دھندے سے وہ لوگ بھی باز نہیں آئے جو اس کے ساتھ ایسا دھندہ کرتے تھے۔ ایک دن کسی قتل میں دھنتر مجرم پایا گیا۔جیل سے بھاگ فرار ہونے کے بعد اس کی تلاش دنیا کے کونے کونے میں ہونے لگی۔پھر بھی پولیس کے ہاتھ میں نہیں آیا۔اس طرح سے دُنیا کے تمام لوگ تنگ آگئے کہ ایسا آدمی ہی گرفت میں آنا چاہئے،ایک دن اس کے ہی ایک دوست کو پولیس نے پکڑا اور اس سے پوچھ تاچھ کی،پوچھ تاچھ کر کے اس نے دھنتر کا نام ونشان ہی نہیں بتایا۔مطلب اگر چہ اس کو معلوم تھا لیکن پولیس اور فوجیوں کی تفتیش کے باوجود اس کا اتہ پتہ ہی نہیں بتایا۔مار پیٹ ہونے کے بعد اس آدمی نے جیل سے رہا ہو کر یہ بتایا مجھ سے پولیس نے تفتیش کی لیکن میں نے کوئی بھی راز نہیں بتایا۔جب یہ دوسرے نے سنا تو کہا کہ ''دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت'' یہ تعریف بتاتے ہوئے کہا کہ آپ نے اتنی مار پیٹ کے باوجود اپنی بات نہیں بتائی۔کتنا برداشتِ قوت آپ نے دکھائی۔

”درد سے بھر نہ آئے کیوں“

اس آدمی نے رہائی کے بعد دھنتر کو تمام باتیں بتائیں اور اطلاع دی کہ دُنیا کے تمام لوگ آپ کی تلاش میں لگے ہیں۔ یہ بات سن کر دھنتر نے کہا کہ میں نے بہت سے ایسے کام دُنیا میں کیئے ہیں جس کی وجہ سے میں کسی بھی دنیا کے قید خانے سے رہا نہیں ہوسکتا۔ کیوں نہ میں خود پولیس کو بتاؤں اور جیل میں اپنی زندگی بسر کروں۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے دنیا بھر میں بہت سے غلط کام کیئے ہیں جس کا میں اقبال جرم کرتا ہوں۔ یہ سوچ کر دھنتر نے بتایا کہ میں حکومت اور پولیس کو اطلاع دے دوں کہ میں ہی دھنتر ہوں اور مجھے گرفتار کیا جائے۔ یہ کہہ کر اس نے بتایا میں ایک درد بھری کہانی ہوں اور میں کیوں اپنی درد بھری کہانی سے دوسرے کو واقف کروں۔ مطلب میں اپنی تمام غلطیاں قید خانوں کے حکمرانوں کے سامنے تسلیم کروں گا۔ لیکن تسلیم کرتے ہوئے میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں نے بہت لوگوں کو دکھ دیا۔ دکھ دے کر اور چوری کر کے بہت لوگوں کی معاشی حالت برائی میں تبدیل کر کے اچھی حالت میں منتقل کی۔ ان حالات اور ایسے واقعات کے باوجود میں اگر کوئی دھندہ ایسا ہی کروں تو یہ بھی ایک غلط کام ہے اور اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ سوچ کر دھنتر نے یہ بھی کہا کہ اگر میں اور ایسا کام کروں لیکن کسی نہ کسی وقت میں پولیس کے قبضے میں آجاؤں گا اور سخت سے سخت سزا کا مستحق ہوجاؤں گا۔ اسی لئے میں خود یہ سوچتا ہوں کہ کیوں نہ میں پولیس کے حوالے ہی خود ہوجاؤں۔ جب دھنتر نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کیا تو پولیس نے گرفتار کر کے ایسے الفاظ کہتے ہوئے دھنتر کو بند کیا ”درد سے بھر نہ آئے کیوں“ مطلب جب کہ دنیا کے نہ جانے کتنے لوگوں کو مختلف دکھ دیئے۔ اس وقت انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ دکھ دینا یا چوری کرنا بہت ہی غلط کام ہے اور قانون کی حفاظت نہ کرتے ہوئے اب اس بات کا احساس ہوا کہ غلط کام کرنا بہت ہی غلط چیز ہے۔ اسی لئے پولیس ہتھکڑی لگا کر یہ لفظ کہتے ہیں کہ ”درد سے بھر نہ آئے کیوں“ جب دھنتر نے بہت قتل کیئے بہت سی چوریاں کیں اس وقت نہ آئے،

تب آئے جب خودکو ان دردوں کا درد محسوس ہوا اور ہم ہتھکڑی لگا کر پھر یہ الفاظ دہراتے ہیں

''درد سے بھر نہ آئے کیوں''

''روئیں گے ہم ہزار بار''

جب پولیس نے دھنتر کو ہتھکڑی لگائی اور باندھتے ہوئے کہنے لگے کہ ''درد سے بھر نہ آئے کیوں'' ایسے لفظ کہہ کر جیل میں بند کر دیا اور دھنتر کو جج صاحب کے پاس پیش کیا۔ جج صاحب نے پولیس کو یہ حکم دیا کہ اس سے پہلے تفتیش کی جائے جس سے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کے کن کن آدمیوں کے ساتھ اس نے کیسے کیسے ظلم کئے ہیں۔ کہاں کہاں چوریاں کی ہیں۔ کہاں کہاں بم کے دھماکے کئے ہیں اور کدھر کدھر رات گزارتا رہا۔ کیسے اپنی شکل کو بدل کر الگ رہا۔ جج صاحب کے حکم نامہ ملنے کے بعد پولیس نے دھنتر کی تفتیشش روع کر دی۔ دھنتر خود کہنے لگا کہ میں نے کتنا ظلم کیا اور کتنا غلط کام کیا۔ آپ کو بتا کر اب مجھے خود محسوس ہوتا ہے کہ غلطیاں کرنا اچھا نہیں ہے۔ ان غلطیوں سے مبرا ہونے کے لئے میں خود جیل میں ہتھکڑیاں لگوا کر آیا ہوں اور جیل خانے میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اب جج صاحب نے تفتیش کے لئے کہا میں ان کے حکم نامے کا احترام کرتا ہوں لیکن میں ہر ایک جرم تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے بہت سے بم دھماکے کئے۔ بہت سے افراد زخمی بھی ہوئے ہیں۔ بہت بار جیل سے بھاگ گیا۔ بہت لوگوں کو میں نے قتل کیا اور بہت سارے مما لک میں چوری بھی کی ہے۔ اب تفتیش سے کیا فائدہ جب میں خود اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے غلطی کی اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جس کسی نے میرے بارے میں کوئی جرم بیان کیا میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے ایک قتل پر بہت ہی غم وغصہ محسوس ہوا۔ جب میں نے ایک لڑکے کو قتل کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک اکلوتا لڑکا تھا اور گھر والوں کا اس کے سواء کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اسی لڑکے کے رحم وکرم پر وہ گھر چلتا رہا۔ مطلب ان کی معاشی حالت اسی لڑکے کے ذریعہ چلتی تھی، جب مجھے اس بات کی واقفیت ہوئی تو میں زار زار رونے لگا اور رو کر خود سوچنے لگا کہ میں خود اپنی غلطیوں کو تسلیم کر

کے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردوں۔ میں جج صاحب کے حکم نامے کا احترام کرتا ہوں، اب تفتیش کرنے کا کیا فائدہ۔ یہ بات سن کر پولیس کے اہلکاروں نے یہ بیان دھنتر کا درج کیا اور پھر عدالتِ عالیہ میں جج صاحب کو ان باتوں سے واقفیت کرائی۔ جج صاحب نے یہ کہہ کر اس کی سنوائی ختم کی۔ جب اس نے یہ سنا کہ دھنتر خود ہر ایک غلطی کو تسلیم کرتا ہے یہ سن کر جج صاحب نے پولس اہلکاروں کو بتایا کہ یہ خود اپنی ہر ایک غلطی کو تسلیم کر رہا ہے۔ اسی لئے تفتیش کرنے کا فائدہ ہی نہیں۔ اب عدالت قانون کے تحت اس کی سزا طے کریگی جس کا سننا لازمی ہے۔ یہ سن کر دھنتر نے جج صاحب کو بتایا کہ میں خود تسلیم کرتا ہوں جس کسی نے بھی میرے خلاف پولیس اہلکاروں کے سامنے بیان لکھایا کوئی تحریری بات بتائی ہوگی میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ اسی لئے میں آپ کے حکم نامے پر کوئی غم وغصہ یا کسی بھی اپنے وکیل کو دلائل جرہ کرنے کے لئے پیش نہیں کرتا۔ جب میں اپنی غلطیاں تسلیم کرتا ہوں تو میں کیوں یہ کہوں کہ ''روئیں گے ہم ہزار بار'' مطلب مجھے جج صاحب کے حکم نامے پر رونا نہیں ہے۔ میں نے غلطی کی ہے اسی لئے میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے عدالتِ عالیہ کو یہ بتاتا ہوں کہ ''روئیں گے ہم ہزار بار'' مطلب جن کے ساتھ میں نے تشدد کیا ہے جن کو میں نے قتل کیا ہے جن کے گھر میں چوریاں کی ہیں۔ جہاں کہیں بھی میں نے ظلم کیا ہے۔ اس ظلم پر وہ لوگ خود بتائیں گے کہ ہم ایسے مجرم کو دیکھنا چاہتے ہیں اور دیکھ کر وہ میرے مجرمانہ وارداتوں پر یہ تبصرہ بیان کریں گے کہ ''روئیں گے ہم ہزار بار'' مطلب وہ مجھے دیکھ کر روئیں گے اور کہیں گے کہ اے مجرم تو نے اس کے بیٹے کو سرعام قتل کیا ہے۔ ہم اپنے بیٹے کے قتل پر روتے ہیں اور اگر آپ نے اقبال جرم عدالتِ عالیہ کے سامنے کیا لیکن ہم اس بات پر تصدیق کرتے ہوئے بتائیں گے ''روئیں گے ہم ہزار بار'' مطلب ہم اس واردات پر اظہار افسوس کریں گے جو اقبال جرم آپ کی تصدیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

''کوئی ہمیں ستائے کیوں''

جب عدالتِ عالیہ میں جج صاحب نے دھنتر کی باتیں سن کر اس پر اپنا فیصلہ سنایا اور پولیس نے دھنتر کو جیل میں رکھا جب تک عدالت سزا کے متعلق کوئی فیصلہ نہ سنائے۔ مختلف مما لک اور شہروں کے لوگ دھنتر کو دیکھنے کے لئے آئے تھے جب وہ جیل میں تھا۔ اس کو دیکھ کر بہت لوگوں نے اپنے اپنے تبصرہ کئے کہ اے دھنتر آپ نے چوری کی اور اتنے روپئوں کا ستیہ ناس کیا اور دھنتر آپ نے اس لڑکے کو قتل کیا جس سے گھر کا وسیلہ ہی ڈوب گیا اور دھنتر آپ نے ایسے ایسے واقعات دنیا میں رونما کئے جن کی وجہ سے تمام ملک آپ سے لرزنے لگے۔ ایسی باتیں سن کر دھنتر نے ان کو یہ جواب دیا کہ میں نے عدالت عالیہ کے سامنے اقبال جرم کیا لیکن آپ لوگ مجھے کچھ ان جرموں پر کچھ بتانے کیلئے کہتے ہو۔ میں اقبال جرم کرتے ہوئے آپ سے یہ کہتا ہوں کہ ''کوئی ہمیں ستائے کیوں'' مجھے آپ باتوں سے ہی ستا سکتے ہوں لیکن تفتیش نہیں کر سکتے۔ تفتیش سے بچنے کے لئے میں نے اقبال جرم کیا ہے لیکن آپ مجھے باتوں سے ہی ستاتے ہو۔ آپ لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے میں اس لفظ سے آپ کے بیان یا خیالات کو یہ کہہ رہا ہوں کہ ''کوئی ہمیں ستائے کیوں''

''غالب خستہ کے بغیر''

جب قید خانے میں دھنتر بہت سال تک رہا تو اس دوران اس نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ ہمیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہئے اور واقفیت بھی ہونی چاہئے کہ دھنتر چور تھا لیکن تعلیم یافتہ بھی تھا۔ تعلیم یافتہ ہونے کے ناطے جیل میں اسے کتابیں پڑھنے کا بھی موقع دیا گیا۔ اگر چہ عدالت نے سزا نہیں سنائی لیکن وہ جیل میں اور قیدیوں کے ساتھ بیٹھ کر بہت سی ادبی کتابیں بھی پڑھتا رہا۔ ایک دن غالب کے مقطع پر نظر پڑی اور پڑھ کر محسوس ہوا کہ غالب نے یہ بیان کیا ہے کہ ''غالب خستہ کے بغیر'' اس جملہ کو پڑھ کر دھنتر نے سوچا کہ غالب نے عشق کے بارے میں کچھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہی رہا معشوق اور محبوب کے بارے میں۔ وہ

پاکیزہ محبت پر عمل کرتا رہا۔ مطلب پاک محبت کی حد میں رہا، اس کے برعکس میں نے بہت سی غلطیاں کیں بہت سے جرم کئے۔ جس وجہ سے میں آج جیل میں ہی غالب کے مقطع پر سوچتا ہوں کہ یہ بات اس نے صحیح لکھی ہے۔ یہ پڑھ کر دھنتر نے سوچا کہ میں اِن الفاظ پر سوچ کر یہ کہوں گا کہ دھنتر خستہ کے بغیر مطلب دیانتداری اور خداپرستی کے بغیر میں نے بہت سی غلطیاں کیں اور میں ان غلطیوں سے تاحکم عدالت جیل میں ہی اپنی زندگی گزارتا رہوں گا۔ یہ سوچ کر دھنتر نے کہا کہ دھنتر غالب کے طرز پر یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ دھنتر خستہ کے بغیر اسی لئے یہ پڑھ کر میں دھنتر نہیں بتا سکتا ہوں میں "غالب خستہ کے بغیر" بتاؤں۔

"کون سے کام بند ہیں"

یہ کونسے کام بند ہیں۔ یہ پڑھتے اور سوچتے ہوئے دھنتر نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اور ان الفاظ پر سوچتا رہا کہ میں غالب کی طرح بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ "غالبؔ خستہ کے بغیر" لیکن میں نے ایسے کام کئے ہیں میں خستہ کے بغیر نہیں بتا سکتا ہوں۔ اسی دوران جیل کا بڑا سربراہ دھنتر کو دیکھنے کے لئے آیا، مطلب جیل کے سربراہ کو ہر قیدی کو دیکھ کر اپنے تبصرہ بیان کرنا تھا، دھنتر کو دیکھ کر اس اہلکار نے یہ کہا کہ انہیں کیسے قیدیوں کے ساتھ بیٹھ کر کتابیں پڑھنے کی اجازت ہے جبکہ اس نے بہت سے جرم کئے ہیں۔ ان جرموں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے جیل کے اہلکاروں نے کیسے کتاب پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ اسے کسی اور کام میں مصروف کرنا چاہئے، جو سزا کے برابر تسلیم کیا جائے۔ یہ سن کر جیل کے اہلکاروں نے اس کو بتایا ہم باحکم عدالت کچھ بھی نہیں قیدی کو کر سکتے ہیں۔ صرف ہم جیل میں بند رکھ سکتے ہیں جبکہ قیدی نے اقبال جرم کیا ہے۔ یہ بتا کر جیل کے اہلکاروں نے بتایا ہمیں عدالت سے کہ حکم نامہ ملنا چاہئے جس کے تحت ہم یہ کہیں کہ "کون سے کام بند ہیں" مطلب عدالت کے حکم نامے کے تحت ہمیں معلوم ہی نہیں کہ دھنتر کو جیل میں کونسی سزا ہے، اسی لئے ہم کوئی بھی کتاب چھین نہیں سکتے ہیں۔ یہ سن کر جیل کے بڑے اہلکار نے کہا کہ عدالت سے رجوع ہو کر حکم نامہ عدالت کا وصول

کرنا چاہئے تا کہ ہم عدالت کے حکم نامے کے تحت یہ صادر کریں کہ مجرم دھنتر کو ''کون سے کام بند ہیں''۔ مطلب عدالتِ حکم کے تحت ہمیں ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے قیدی کو ایسی سہولیات سے مبرا کرنا چاہئے۔ اسی لئے جیل کے اہلکاروں کو یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ عدالت سے حکم نامہ موصول کریں کہ دھنتر کو ''کون سے کام بند ہیں'' جس کو ہم نے جیل میں رکھا ہے۔

''روئیے زار زار کیا؟''

جب دھنتر نے یہ سنا کہ جیل کے اہلکاروں کو اب عدالت سے میرے کتاب پڑھنے پر اجازت لانی ہے تو اس نے یہ سن کر یہ کہا کہ میں نے اقبال جرم کیا ہے۔ میرے جرم پر بہت سے لوگ احتجاج کرتے ہیں بہت سے لوگ میرے کارنامے پر روتے ہیں۔ کیوں روتے ہیں اسی لئے روتے ہیں کہ میں نے سڑک پر بم کے دھماکے کئے ہیں اور کئی راہ گیر اچانک موت کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ میرے ان کارناموں سے صدمہ محسوس کرتے ہیں لیکن میں نے غلطی کی ہے میں نے اقبال جرم کیا ہے میں سزا کا مستحق ہوں اسی لئے ان کو میری مجرمانہ حرکتوں پر رونا ہی ہے لیکن اس کے باوجود میں کیوں یہ کہوں کہ ''روئیے زار زار کیا؟'' مطلب میں کیوں رؤں میں نے اقبال جرم کیا ہے۔ رؤیں تو وہ لوگ جن کے ساتھ میں نے گھات کیا ہے اور میری مجرمانہ حرکتوں پر ناراضگی اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ میں پھانسی کا بھی مستحق ہوں جس پر چڑھ کر میں یہی کہوں گا ''روئیے زار زار کیا؟''

''کیجئے ہائے ہائے کیوں؟''

جب عدالت میں جیل کے اہلکاروں نے جج صاحب کے سامنے دھنتر کے بارے میں اپنی گذارش پیش کی ہے کہ عدالت عالیہ ہمیں ابھی تک کوئی حکم نامہ صادر نہیں کیا کہ کونسے کونسے کام مجرم کو جیل میں کرنے ہیں۔ جس طرح سے ہم کسی قیدی کو دن بھر کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں۔ جن قیدیوں کو سزا با مشقت ملی ہوتی ہے اسی طرح سے ابھی تک دھنتر کو کوئی سزا نہیں ملی ہے۔ باحکم عدالتِ ہم نے دھنتر کو قید خانے میں رکھا ہے اور ہمیں اس بات کا بھی حکم

نامہ نہیں ملا کہ جس کے تحت ہم دھنتر کو کوئی سزا یافتہ کام دلا سکیں۔ یہ سن کر عدالتِ عالیہ نے حکم صادر کیا کہ مجرم خود تصدیق کرتا ہے کہ اس نے بہت سے بم پھینکے ہیں چوریاں کیں ہیں مختلف شہریوں کو بہت سے طریقوں سے ستایا ہے بہت سے قتل کئے ہیں، ایسی باتوں پر تصدیق کرتے ہوئے خود دھنتر تسلیم کرتا ہے کہ وہ پھانسی کا بھی مستحق ہے۔ اس بات پر باہر لوگوں نے احتجاج بھی کیا کہ ابھی تک دھنتر کو کوئی سزا عدالتِ عالیہ کے حکم نامے کے تحت نہیں ملی ہے۔ وہ جیل میں عیش و عشرت سے رہ رہا ہے اور مختلف کتابیں پڑھ کر اپنی زندگی عیش و آرام میں بسر کر رہا ہے۔ ایسے شکوے سنا کر لوگوں نے بہت ممالک میں احتجاج کیا کہ دھنتر کو پھانسی ملنی چاہئے اور جیل کے اہلکاروں کے خلاف ہائے ہائے اس بات پر کیا کہ انہوں نے دھنتر کو عیش و آرام کا سامان میسر کر رکھا ہے اور قیدی ہو کر قیدی کا سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔ عدالت عالیہ ان سب باتوں سے واقف ہوئی تو عدالت عالیہ نے مجرم کو پھانسی کی سزا سنائی۔ پھانسی کی سزا سنا کر جیل کے اہلکاروں نے دھنتر کو بتایا کہ آپ کی خواہش کیا ہے جب آپ کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ دھنتر نے اپنی خواہش یہ بتائی کہ ہر ایک قیدی کو جیل میں کتاب پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے یا اسے قید با مشقت دینے کے دوران اطلاعات کے وسائل فراہم کرنے چاہئے۔ یہی میری خواہش ہے۔ میں پھانسی پر چڑھنے کا مستحق ہوں لوگ میری پھانسی کے حق میں ہیں۔ اسی لئے میں عدالت عالیہ کے حکم نامے پر افسوس نہیں کرتا کیونکہ میں نے اقبال جرم کیا ہے۔ میں پھانسی پر چڑھ کر یہ کہوں گا کہ "کیجئے ہائے ہائے کیوں؟" مطلب میں عدالت حکم کا احترام کرتے ہوئے پھانسی پر چڑھ کر یہ لفظ دہراتا ہوں کہ **"کیجئے ہائے ہائے کیوں؟"**

اگر میں اس دلیل کو عنوان کے دائرے میں لکھوں تو میں یہی لکھوں گا "غالب خستہ" یا "اقبال جرم"۔

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

غالب نے غزل کے اس مطلع اور مقطع میں ایسی بات بتائی ہے کہ مجھے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں ادبی سرگرمیاں زیادہ پائی جاتی رہیں۔ اور بہت سی ادبی سرگرمیوں میں ادب کے بارے میں بحث ومباحثہ ہوا کرتے تھے۔ تبھی تو مطلع میں غالب نے لفظ 'بزم' استعمال کیا ہے۔ 'بزم' اس کو کہتے ہیں جس میں دانشور اور شاعر لوگ شریک ہوتے ہوں۔ بزم میں گانے بجانے کے سامان بھی میسر ہوتے ہیں۔ جن دنوں غالب نے اس مطلع کو تحریر کیا ہے ان دنوں رسل ورسائل کے وسائل زیادہ نہیں پائے جاتے تھے۔ اسی لئے مختلف گاؤں کے محلّوں میں اور بادشاہ کے محلوں میں ایسے بزم منعقد کئے جاتے تھے۔ جس بزم میں شاعر، گانے بجانے والے لوگ اور مکالہ پڑھنے والے بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ اسی لئے میرے خیال میں بزم کا استعمال کیا ہے۔ تاریخی حوالے سے یہ بات ثابت ہے کہ ان دنوں کم تعداد میں عورتیں بزم میں شرکت کیا کرتی تھیں۔ اسی لئے ممکن ہے کہ غالب گانے بجانے کی بزم میں ہی موجود رہا ہوگا اور اس کے لئے ممکن ہے کہ کسی کو اشارہ کرنے کے لئے ٹلے رہے۔ ممکن ہے کہ غالب کے معشوق کا زیادہ اثر گانے بجانے میں ہی رہا ہوگا کیونکہ غالب نے مختلف مطلع اور مقطع اور غزل کے شعروں میں زیادہ تر بزم کا ہی استعمال کیا ہے۔ اسی لئے میرے انداز میں گانے بجانے والی عورت ہی غالب کے معشوق کا تصور ہو سکتا ہے۔ اسی لئے غالب نے مطلع کے پہلے شعر میں بزم لفظ کا استعمال کیا ہے پھر لفظ 'اشارے' غالب نے بہت ہی بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں فارسی کا استعمال کم کیا ہے۔ اس میں سادہ اُردو کا اظہار کیا ہے۔ اگر میں اس مطلع پر یہ لکھوں اُس کے بجائے غالب نے کسی وقت غزل میں لفظ 'کسی کا بھی' استعمال کیا ہے لیکن بزم کو کسی لفظ سے استعمال نہیں کیا۔ اس کا مطلب غالب نے خاص کسی بزم کا ذکر مطلع میں کیا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ غالبؔ نے لفظ 'کسی نہیں' بیان کیا ہے اس

کے بجائے اُس کا استعمال کیا ہے مطلب اس کا استعمال اسی لئے کیا ہے کہ جہاں پر اس کے معشوق کا قریبی واسطہ رہا ہو اسی لئے لفظ 'اشارے' بھی مطلع میں بیان کیا ہے۔ اگر میں اس انداز سے اس مطلع کو بیان کروں تو نچوڑ اس کا یہ نکلتا ہے کہ 'کسی بھی بزم میں' اگر غالب کی ہی مانیں تو اس کے لفظ سے ہی مطلب نکلتا ہے خاص جیسے کہ

کسی بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے

بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

اس کا مطلب جب آپ کسی حرف کو مطلع میں پڑھو گے تو اس سے ہمیں یہ پتہ چلے گا کہ جس بزم میں میں بیٹھتا ہوں مجھے شرم آتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اصلیت کیا ہے۔ حیا ہونے کی وجہ سے لفظ شرم استعمال کرتا ہوں لیکن غالب نے یہ بیان کیا ہے کہ اُس بزم میں، مطلب خاص ایسی بزم جہاں پر اس کا معشوق حاضر ہے اور اسے کچھ نہیں بتا سکا کیونکہ حیا کا رجحان ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب کسی نواب کی ایسی محفل میں حاضر ہوا ہو گا جہاں اس کی معشوق بیٹھی ہوئی ہو گی۔ غزل کے مطلع میں ایسے تاثرات بیان کرتا ہے۔ ویسے تو غالبؔ خود نواب ہی تھے لیکن خاص کسی نواب کی محفل میں حاضر ہوئے ہوں گے۔

جب میں مقطع کو مطلع کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ جب غالب خاص کسی بزم کے بارے میں اپنے معشوق کو اشارہ دینا چاہتا ہے لیکن اشارہ نہیں کر سکتا کیونکہ کسی خاص نواب کی محفل یا بزم میں حاضر ہوا ہے۔ اب غالب اس مقطع میں فرماتے ہیں کہ مجھے معشوق کا جواب ہی اشارے کے ذریعے ملتا ہی نہیں ممکن ہے غالب ان اشاروں کو گانے بجانے کے طریقے سے سننا چاہتا ہے کیونکہ غالب کے زمانے میں بہت سے نواب بزم میں گانے بجانے کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ جب اس بزم میں غالب حاضر ہوا تو گانے بجانے سے ہی پورا یقین ہوا ہو گا کہ گانے بجانے سے ہی اس کی معشوق کا کوئی نہ کوئی جواب موصول ہو ہی جائے گا کیونکہ حیا ہونے کی وجہ سے بزم میں جواب نہیں دے سکتے، ممکن ہے گانے بجانے کی بزم

میں غالب بیٹھا ہے اور غزل کے مطلع کو بیان کیا ہے اور مطلع کو مقطع کے ساتھ وابستہ کرنے کے لئے لفظ سنا استعمال کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ گانے بجانے کی محفل میں غالب حاضر ہے اور اشارے سے گانے بجانے کے طریقے سے معشوق کا جواب سننا چاہتے ہیں۔ مطلب اس مقطع اور مطلع کا وابستہ غالب کے خیالات پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غالب نے غزل کا مطلع اور مقطع ایسی محفل کے خیال پر تحریر کیا ہے کہ جس میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ محفل شاعری محفل نہیں یہ بزم شاعری بزم نہیں ہے ادبی بزم نہیں ہے بلکہ گانے بجانے کی بزم ہی ہے۔ تو پھر غالب یہ نہیں بیان مطلع میں کرتا کہ حیا کا لفظ۔ مطلب شرم اور اشارے کا لفظ اور سنا کا لفظ ہاں ہم شاعری بزم میں کہتے ہیں اور سنتے ہیں لیکن وہ کئی کئی بزموں میں منعقد کیا جاتا ہے لیکن لفظ 'اُس سے' یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے غزل کو خاص بزم کا اشارہ دے کر مطلع کو تحریر کیا ہے اور مطلع کا واسطہ مطلع کے ساتھ رکھ کر گانے بجانے کی محفل کا ہی واسطہ دیا ہے۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ غزل میں گانے بجانے کا ذکر ہی نہیں لیکن لفظ حیا کے بیان سے لفظ 'سننا' کا ذکر ہے اگر ادبی بزم منعقد ہوتی تو اس کا لفظ مطلع میں بیان نہیں کیا ہوتا۔ اسی لئے میرے انداز میں میرے خیال میں غالب نے غزل کا مقطع کسی خاص بزم کا اشارہ دیا ہے جس سے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسی بزم میں ان کی معشوق حاضر رہی ہوگی۔ جس کو شرم کے مارے کچھ نہیں کہہ سکتا اور جواب بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ان سے تلقین کرتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ سنائیں جس کو سن کر مجھے کوئی نہ کوئی اشارہ حاصل ہوگا۔ خیر خیال اپنا اپنا اور اپنی اپنی رائے۔

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق مجھ میں حیا اور شرم ہے۔ میں ہر ایک کا احترام کرتے ہوئے اور شرم کا لحاظ رکھتے ہوئے بات کرسکتا ہوں اسی لئے اے معشوق جس بزم میں مَیں بیٹھا ہوں اس بزم میں مجھے شرم آتی ہے کیونکہ میں کوئی بھی اشارہ آپ کو نہیں کرسکتا ہوں،

حیا ہونے کی وجہ سے میں صرف اس خاص بزم میں بیٹھا ہوں لیکن میرے حق میں کوئی بھی رائے نہیں دے سکتا۔ جب میں محفل میں بیٹھا تو بہت سے بزرگ بھی دیکھنے میں آئے ان کے سامنے مجھے حیا آتی ہے کہ میں آپ کو کیا اشارہ کروں۔ اشارے کرنے سے میں باز آکر آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ میرا دل ہی نہیں لگتا جب تک نہ میں آپ کے ساتھ کوئی نہ کوئی بات کروں لیکن اس بزم میں مَیں صرف سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کوئی کسی کو کس قسم کا اشارہ کرے لیکن میں اپنی طرف سے کسی کو کوئی اشارہ نہیں کرسکتا۔ اسی لئے اے معشوق پاک محبت برقرار ہے جو بہت سے اشاروں کے بغیر قائم ودائم ہے

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

غزل کے مقطع میں شاعر غزل کے مطلع کو وابستہ کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ اے معشوق جب میں آپ کو کسی خاص بزم میں دیکھتا ہوں لیکن اس بزم میں مَیں حاضر ہو کر کوئی بھی اشارہ نہیں کرسکتا ہوں کیونکہ بزم میں بہت سے بزرگ حاضر ہوئے ہیں اور بزرگوں کے سامنے اشارہ کرنا اچھا نہیں ہے۔ مجھ میں شرم وحیا بھری ہوئی ہے۔ اسی لئے شرم کے مارے میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب غالب مطلع میں ایسی بات لکھتا ہے تو مقطع میں یہ کہہ رہا ہے کہ میں تمہیں یہ بات سنا کر اب یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے اشاروں کا ضرور اثر ہوگا لیکن جواب کا اس طریقے سے اثر ہونا چاہئے کہ میں ہی واحد اس جواب کو سنوں اور باقی حاضرین کو اشارے کا جواب نہ سمجھ آئے۔ مطلب غالب فرما رہے ہیں کہ کسی بزم میں کوئی ایسی بات سناتا ہے جس کو تمام سمجھ نہیں سکتے۔ اس بات کو وہی خاص آدمی سمجھ سکتا ہے جس کی طرح کہنے والے نے اشارہ کیا ہوگا۔ اسی لئے مجھے معشوق کے ساتھ پاکِ محبت ہے اور اس کو میں نے آج کسی خاص بزم میں دیکھا اور دیکھ کر غالب کو یقین ہے کہ وہ ان اشاروں کو دیکھ کر ہی میرے اشاروں کا جواب کسی طریقے سے بزم میں کہے گی جس سے مجھے سمجھ آئے کہ یہ معشوق کا ہی

اشارہ ہے۔

اگر میں غالب کے لفظ کے مطلب کے دائرے میں مقطع کو لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ جب بھی کسی خاص محفل میں کوئی بات سناتا ہےتو وہ بات سناتے ہوئے اس طرح اپنی باتوں کا اظہار کرتا ہے کہ سبھی کو ان باتوں پر کئی سوالوں کا جواب بھی موصول ہوتا ہے جو سوال کہنے والے کو کہے ہوں گے انہیں کا جواب کسی خاص بزم میں ان کو اشارے کو دکھا کر یا بتا کر ہی اثر ہوتا ہے۔ مطلب ہمیں کسی بھی کام میں کم ہمت نہیں ہونا چاہئے اگر چہ معشوق کو شاعر اشارہ نہیں کر سکتا ہےلیکن معشوق کی زبان سے ہی ان اشاروں کا جواب اثر ہو ہی جاتا ہے۔ اگر جواب نہیں ہوتا تو ہمیں محبت میں الگ نہیں رہنا چاہئےہمیں محبت کو برقرار رکھنا چاہئے اور کسی نہ کسی وقت جواب حاصل کر کے محبت میں فتحیابی ضرور حاصل ہو سکتی ہے۔اور ہم اپنی محبت میں فتحیاب ضرور ہو سکتے ہیں۔

اُس بزم میں + مجھے نہیں بنتی حیا کیے = اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے

بیٹھا رہا اگرچہ + اشارے ہوا کیے = بیٹھا رہا اگر چہ اشارے ہوا کیے

غالبؔ تمہیں کہو کہ+ ملے گا جواب کیا؟ = غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟

مانا کہ تم کہا کیے + اور وہ سنا کیے = مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

"اُس بزم میں"

آج تک دُنیا کے تمام ملکوں میں ہر کوئی اپنے اپنے استاد کا احترام کرتا ہےاور کر کے ہی رہیں گے۔ہم یہ عام طور پر سوچتے ہیں کہ استاد وہی ہیں جوہمیں تعلیم سے واقف کرائے وہ صحیح ہےلیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوچنا چاہئے کہ جب ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں تو استادہمیں بہت سے مضمون پڑھا کر مختلف مضمون سے واقف بھی کراتا ہے۔اسی وجہ سے ہم اچھے طالب علم سماج میں بنتے ہیں۔ یہی ایک نہیں بلکہ کوئی بھی کام سیکھنے پر ہمیں استاد کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ کام سے واقف کرا کے ہمیں ماہر بناتا ہے۔واقف کرانے والے کو بھی استاد کہیں گے مطلب

جو کوئی کسی ہنر کی تربیت دے تو اسکو بھی استاد کہیں گے۔ اب ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ مختلف پیشوں کو حاصل کرنے کے لئے مختلف استاد ہوتے ہیں۔ جو طالب علم کو کام سے واقف کراتے ہیں۔ اسی طرح سے ایک مشہور استاد دین محمد تھے۔ جس نے ایک ایسا ہنر کسی طالب علم کو سکھایا جس سے کہ وہ بہت ہی مشہور ہو کر یہ کہنے لگا کہ دین محمد میرا استاد ہے جس کی وجہ سے میں ایک ہنر مند ماہر سماج میں، قوم میں بن بیٹھا۔ کبھی ایسا موقع فراہم ہوا جب استاد اور طالب علم اکٹھے بیٹھے۔ وہاں کوئی مسئلہ سامنے آیا۔ اس مسئلے کا حل معلوم کرنے کے لئے دیگر طالب علم کو بھی بلایا گیا۔ بلا کر دونوں سے درخواست کی گئی کہ مسئلہ حل کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ بات سن کر طالب علم نے کہا کہ میرے استاد دین محمد ہیں میں کچھ بھی نہیں اپنے طریقے سے بتا سکتا ہوں۔ جب تک یہاں پر دین محمد موجود ہیں، میں استاد کی سوچ پر کوئی خلل نہیں ڈال سکتا ہے۔ جب اس محفل میں دین محمد نے ایسی باتیں سنیں تو اس نے فرمایا کہ میں اس محفل میں ہچکچاہٹ نہیں ڈال سکتا۔ جس محفل میں میرا طالب علم حاضر ہو۔ یہ طالب علم مجھ سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے کیونکہ یہ نیا پودا ہے میں نے بہت سے دور دیکھے اور بہت سا کام کیا مجھے ایک بزرگ کی حیثیت سے بزم میں تسلیم کرنا چاہئے یہ سن کر طالب علم نے کہا جب میرے استاد کسی بھی بزم میں موجود رہتے ہوں میں کوئی بھی رائے نہیں دے سکتا ہوں۔ یہ سن کر دین محمد نے طالب علم کے تاثرات پر یہ بتایا کہ جب بھی میرے طالب علم کو میری حاضری میں کوئی کام کرنا ہو تو میں اسے امتحان کے طور پر ''اُس بزم میں'' مسئلہ حل کرنے کو ضرور کہوں گا تا کہ میں یہ دیکھوں کہ طالب علم کیسا کام کرتا ہے۔ تبھی تو میں اس بات یہ کہہ کر اختتام تک پہنچاؤں گا ''اُس بزم میں''۔ مطلب طالب علم کو میرے سامنے اپنی رائے بتانی ہے اور تجربہ کر کے ہی میں یہ دیکھوں کہ طالب علم استاد سے اوپر پہنچا ہے اور خوش ہو جاؤں۔ اس لئے میں یہ کہوں گا کہ جہاں بھی میں حاضر رہوں گا طلب علم ہی پہلے اپنا کام ثابت کر کے دکھائے گا تبھی تو میں یہ کہوں گا ''اُس بزم میں''

"مجھے نہیں بنتی حیا کیے"

جب دین محمد نے ایسی بات بتائی تو بزم کی توجہ طالب علم پر مرکوز کی گئی۔ طالب علم نے کام کرتے ہوئے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا، جب طالب علم نے مشکلات کو حل کیا تو دین محمد بہت ہی خوش ہوئے اور یہ کہنے لگا کہ آج طالب علم مجھ سے زیادہ استاد کھائی دیتے ہیں۔ میں اگر استاد رہا ہوں لیکن اتنا کچھ نہیں سیکھا ہے جتنا کہ میرے طالب علم نے سیکھا۔ اسی لئے میں اپنے طالب علم کو بہت ہی پیار کرتا ہوں اور مجھے ایسا کام کرنا نہیں آتا جس کام کو میرے طالب علم نے ثابت کر کے دکھایا۔ ہمارے درمیان اب حیا کا پردہ ہی نہیں رہا۔ اسی لئے اس بات کی توجہ اس طرح مرکوز کرتا ہوں کہ "مجھے نہیں بنتی حیا کیے" مطلب طالب علم نے میرا احترام کرنے کے لئے یہ کام کرنے میں روکاٹ ڈالی لیکن میں نے طالب علم کی حیا کو الگ کر کے یہ سوچنے لگا کہ میں استاد کے سامنے ایسا کام کروں جو کہ مجھ سے بھی ماہر تسلیم کیے جائیں۔ اسی لئے دین محمد نے یہ بتایا کہ طالب علم کو حیا آئی کہ وہ کام نہیں نپٹا سکتا ہے۔ میرے احترام کے لئے ثابت کرنا ہی چھوڑا۔ میں اسی لئے ہر ایک طالب علم کو یہ کہہ کر بات کو اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ "مجھے نہیں بنتی حیا کیے" میں اپنے طالب علم کو حیا کے اصولوں میں رکھنا چاہتا ہوں وہ میرے سامنے کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے استاد کے احترام میں کوئی خلل پیدا ہو۔

"بیٹھا رہا اگرچہ"

جب دین محمد نے ایسی بات بتائی تو طالب علم نے اپنے استاد کا احترام کیا اور احترام کی وجہ سے چپ چاپ بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ میں استاد کے سامنے ایسا کام کر سکتا ہوں جس میں استاد نے مجھے ماہر بنایا ہے۔ یہ کام کرنے سے میرے استاد کی عزت کے خلل کے برابر ہے۔ احترام برقرار رکھنے کے لئے "بیٹھا رہا اگرچہ" میں اس کام کو کر سکتا تھا جب مجھے اس کام کو کرنے کے لئے استاد نے منظوری دی تبھی تو میں یہ بات سنا رہا ہوں کہ **"بیٹھا رہا اگرچہ"**

''اشارے ہوا کیے''

جب ایسی باتیں طالب نے کہیں تو دین محمد نے اس بات پر اس کی تعریف کی۔اور یہ کہا کہ دنیا بھر میں ہر ایک طالب ہر استاد کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔استاد کے احترام کے لئے طالب علم کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن مجھے اپنے طالب علم کو دیکھنا تھا کہ یہ کیسے ایسا کام کر سکتا ہے جو کہ میرا شاگرد رہا ہے۔اسی لئے میں نے طالب علم کو اس بات کا بھی اشارہ دیا کہ آپ میرے حاضری میں کام کرو لیکن اس نے میرے احترام پر یہ کہا کہ ''اشارے ہوا کیے'' اگرچہ استاد کا مجھے اشارہ ہوا کہ یہ کیا کرتا ہے تو میں کام کر سکتا تب میں استاد کے ''اشارے ہوا کیے'' انتظار کرتا رہا جب ''اشارے ہوا کیے'' کا جملہ استعمال ہوا تو میں نے استاد کا احترام کیا۔

''غالب تمہیں کہو کہ''

جب دین محمد نے طالب علم کی بات سنی اور اس نے بھی اپنی باتیں بتائی اور یہ کہا کہ میں اپنے طالب علم کو فتحیاب دیکھنا چاہتا تھا۔جس طرح فوجی سربراہ اپنے فوجی کو جنگ کی تربیت دے کر اسے جنگِ میدان میں حاضر رکھتا ہے اور وہ دشمن کے ساتھ لڑتے لڑتے فتحیابی حاصل کرتا ہے اسی طرح سے میں اپنے طالب علم کو فتحیاب دیکھنا چاہتا تھا۔جب میں نے طالب علم کو کام کرنے کا اشارہ کیا تو اس نے کیا۔تب میں نے اس سے بطور استاد ان لفظوں پر انعام دینے کو کہا مطلب میں اس طالب کو ان لفظوں سے نوازوں گا یعنی پیسوں سے نہیں بلکہ اپنی باتوں کے لفظوں سے نوازوں ''غالب تمہیں کہو کہ'' مطلب میں ایسے طالب علم کو فتحیاب کہوں گا جس نے ایسا کام کیا جس سے اس نے فتحیابی حاصل کی۔اور اسی لئے میں ایسے لفظ سے اعزاز حاصل کرتا ہوں ''غالب تمہیں کہو کہ''

''ملے گا جواب کیا؟''

جب دین محمد کی باتیں طالب علم نے سنیں تو اس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں استاد سے اوپر کوئی بات نہیں بتا سکتا ہوں نہ بیان بازی کر سکتا ہوں اسی لئے میں اس کے

اعزاز پر بہت ہی متاثر ہوا اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جس نے مجھے طالب علم سمجھ کر وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی کی اور اپنے سے بھی زیادہ ماہر بنایا۔ تبھی تو میں ان لفظوں کے اعزاز پر شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ بتا رہا ہوں کہ ان لفظوں کے اعزاز پر یہ تبصرہ کرنا ہے کہ ''ملے گا جواب کیا؟'' مطلب میں ان لفظوں پر انعام پانے سے بھی استاد کو کس طرح شکریہ ادا کر سکتا ہوں حالانکہ میں ابھی طالب علم ہوں۔ جب تک میں اس دنیا میں زندہ ہوں میں استاد کے ان لفظوں کے انعام پر یہ کہوں گا کہ **''ملے گا جواب کیا؟''**

''مانا کہ تم کہا کیے''

جب دین محمد نے طالب علم سے یہ باتیں سنیں اور انعام کے بارے میں تبصرہ سنا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس بات کو اختتام تک پہنچایا کہ میں نے طالب علم کو تسلیم کیا جو کہ مجھ سے لاکھ درجہ ماہر ہے اور مہارت کے اعتبار سے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ''مانا کہ تم کہا کیے'' مطلب جب میں نے اس کو اپنے کام پر ماہر کیا لیکن میں نے بھی ایسے تجربہ نہیں کیے اور نہ ایسی مہارت حاصل کی جو کہ میرے طالب علم نے حاصل کی ہے۔ وہ مجھ سے دوگنا اپنے کام میں ماہر بنا۔ اسی لئے میں اس طالب علم کے کہنے پر یہ بات کہوں گا کہ **''مانا کہ تم کہا کیے''**

''اور وہ سنا کیے''

جب طالب علم نے پھر دین محمد کا تبصرہ سنا تو وہ اٹھے اور اپنے استاد کو پھولوں کی مالا گلے میں ڈالی اور آپس میں میل ملاپ کیا، اور یہ بتایا کہ میں دین محمد کو کبھی بھی نہیں بھولوں گا۔ جب بھی میں اپنے کام میں مست رہوں گا اور کام میں اگر مشکلات آئیں گی تو اس وقت ان مشکلات کو حل کرتے ہوئے میں استاد کا ہی نام پہلے لیکر یہ کہوں گا کہ ''اور وہ سنا کیے'' مطلب کیا ان مشکلات کے دوران میں یہ کہوں گا کہ استاد نے میری تعریف کی ہے لیکن جب مجھے مشکلات آتی ہیں تو میں اس کو دل ہی دل سے یہ سنانا چاہتا ہوں کہ میں ان مشکلات کو حل کر کے میں یہ کہوں گا کہ اے استاد مجھے عقل وشعور ایسا دیں کہ میں مسئلہ حل کروں اور اپ کی

تعریف کو ان لفظوں سے قلمبند کروں ''اور وہ سنا کیے''

اگر میں اس دلیل کو جو کہ غالب کے لفظ شعروں کے حوالے سے لکھ کر بیان کیا اس دلیل کو میں اس عنوان کے ذیل میں بیان کروں گا۔

''دین محمد'' یا ''اشارے ہوا کیے''

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب نے خود اپنی غزلوں میں اپنا عیب بیان کیا ہے لیکن میں نے اس کے عیب کو واضح طور پر پہلے مطلع اور مقطع میں بیان کیا ہے۔ ممکن ہے کہ غالب شراب نہیں پیتے لیکن جب ہم اسی بات پر توجہ دیں گے تو ہم پینے کا بھی ذکر کر سکتے ہیں اور نہ پینے کا بھی۔ غالب ہر شعر میں سچائی بیان کرتا ہے۔ جیسے کہ اس نے پہلے ہی اپنے مقطع میں بیان کیا ہے کہ مجھے خدا دوست تسلیم کرتے لیکن میری بدقسمتی ہے کہ میں بادہ خوار ہوں، بادہ خوار ہونے کی وجہ سے مجھے لوگ ولی تسلیم نہیں کریں گے جیسے کہ غالب نے اپنے مقطع میں پہلے بیان کیا ہے،

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

اب ایسی ہی بات غالب پھر مقطع اور مطلع میں دُہراتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ میں کیسے سفر محمود جا سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے پاس بادہ خوار کا عیب ہے جس کو میں تسلیم کرتا ہوں اسی لئے میں مذہبی فرائض اصولوں کے تحت نہیں انجام دے سکتا ہوں۔

اب ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ غالب نے خود اپنی غلطیاں مختلف شعروں میں بیان کی ہیں اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اپنے مذہب کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتا رہا ہے۔ تب

تو غالب اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنی غلطی کو عوام کے سامنے غزلوں کے شعروں میں بیان نہیں کرتا۔ اس کا مطلب غالبؔ سچائی پر ہر ہمیشہ رہا ہے اور سچائی ہی پڑھنے والے کے دل میں اور زبان میں رکھی ہے۔ ممکن ہے کہ اُسی مطلع اور مقطع کو دوبارہ بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہوگا کہ مجھے پوری امید تھی کہ مجھے لوگ ولی تسلیم کرتے، لیکن وہ میرے غلط کام انجام دینے پر کیسے تسلیم کریں گے مجھے ایسی امید نظر نہیں آتی تب تو میں خود بخود ایسی باتیں بتا کر یہ سوچتا ہوں کہ میں کیسے سفر محمود انجام دے سکتا ہوں اور وہاں شریک ہو کر نماز ادا کر سکتا ہوں۔ میں خود ایک غلط کام کرنے والا خدا کا بندہ ہوں اسی لئے میرے خیال میں ایسا غلط کام نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے چھوڑنے کی عادت ہی نہیں۔ اسی لئے امید ہی نہیں کہ میں ایسی متبرک زیارت میں شریک ہو جاؤں۔

جب غالبؔ ہمیشہ یہی کہتا رہا ہے کہ میں غلط کام کرنے والا بندہ ہوں جو کہ میرے مذہب کے خلاف ہے۔ ایسی مخالفت کرنے سے میں اپنے مذہب کے اصول اسلامی قانون کے دائرے میں نہیں اپنا سکتا۔ لیکن پڑھتے ہوئے مقطع اور مطلع کو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے ان شعروں میں فارسی کا رُجحان کم بیان کیا ہے۔ اور اُردو میں ہی شاعری کی بیان بازی لکھی ہے، جبکہ ہم وزن اور مطلب کے اعتبار سے بھی متفق ہیں لیکن اگر غالب نے لفظ 'کوئی' کے بجائے امید کا لفظ استعمال کیا ہوتا تو دوسرے شعر میں بھی تب کا استعمال کیا ہوتا تو ممکن ہے اس مطلع سے مقطع کا رجحان الگ نہیں رہتا جیسے کہ

کب امید بر نہیں آتی
کب صورت نظر نہیں آتی

اگر میں ان لفظوں کا مطلب سناؤں تو میں یہ کہوں گا کہ جب مجھے امید ہی نظر نہیں آتی، ہے تو میں برے کام انجام دوں گا۔ تب میرے پاس برے کام کرنے کے طریقے موجود ہیں جسے دیکھ کر میری امید لوگوں میں گھٹ سکتی ہے میں عزت واحترام کھو سکتا ہوں۔

میں غالب کے ہی لفظوں پر بیان کرتا ہوں جس سے صاف ظاہر ہے کہ میں شراب کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اسی لئے غالبؔ نے لفظ 'کوئی' کا استعمال مطلع میں کیا ہے جس سے کہ غالب نے خود تسلیم کیا ہے کہ میں سفر محمود پر نہیں جا سکتا۔ وہاں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ وجہ میری یہی ہے کہ میں نشے کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے چھوڑنے کے لئے میں نے بہت سے طریقے اپنائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ جس سے کہ میں اس غلط کام کو چھوڑ سکوں اور میں ایک اسلامی اصول کے تحت کعبہ میں نماز ادا کر سکوں۔

جب میں غالب کے مطلع کو بھی گہرے انداز سے پڑھ کر سوچتا ہوں کہ خود غالبؔ اپنی غلطیاں تسلیم کرتا ہے اور خود کہتا ہے کہ میں اس غلطی سے شرمسار ہوں اور خود مقطع کے شعر جواب دعویٰ میں فرماتے ہیں کہ مجھے شرم آنی چاہئے غلط کام کرتے وقت لیکن اس شرم کو میں ظاہر ہی نہیں کرتا۔ اگر میں ظاہر کرتا تو ممکن ہوتا کہ میں وعدہ خوار نہیں ہوں اور سفر محمود پر جانے والا بندہ ہوتا خیر جو منظور ہی نہیں۔ اسی لئے ایسے غلط جامہ مجھے قدرت نے پہنائیں ہیں۔ اگر میں مقطع کے لفظوں پر نظر ثانی کروں تو غالبؔ نے صحیح مقطع اپنی شاعری کے انداز میں فرمایا ہے لیکن اگر ہم جواب دعویٰ میں لفظ 'کیوں' بیان کرتے تو اس سے امید کا نظریہ بہت گہرا سمجھ میں آتا، مطلب غالب کہہ رہے ہیں کہ مجھے امید ہی نہیں ہے اگر مقطع کے آخری شعر میں لفظ 'مگر' کے بجائے 'کیوں' استعمال کیا ہوتا تو اس سے یہ بھی مطلب حاصل ہوا ہوتا امید کہ غلط کاموں کی وجہ سے سفر محمود پر نہیں جا سکتا اور وجہ یہ بھی ہے کہ میں ایسے برا کام سے دور نہیں ہو سکا۔ اسی لئے لفظ 'کیوں' کا استعمال کرنے سے جدیدیت کا تصور شعر میں ہوتا ہے جیسے

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو کیوں نہیں آتی

جب 'کیوں' کا لفظ استعمال ہوتا تو غالب کو اپنی غلطیاں ترک کرنی پڑتیں اور کچھ وجوہات سے اپنے مذہب کا احترام کر کے غلطیوں کو ترک کر کے سفر محمود پر لازماً شریک ہونا

پڑتا لیکن شاعر نے لفظ 'کیوں' کے بجائے 'مگر' کا استعمال کیا اور اگر اس لفظ کا استعمال نہیں کیا ہوتا لفظ 'کیوں' سے غالب کو سفر محمود پر جانا پڑتا لیکن لفظ 'مگر' سے اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے اپنی غلطی کو تسلیم کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ میں بھی مقدس مقام پر شریک ہو جاتا۔ مگر میں ایک غلط کام کرنے والا آدمی ہوں۔ تبھی تو غالب نے لفظ 'مگر' کا استعمال کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ میں سفر محمود پر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ میں نے اسلامی قانون کے تحت غلطیاں کی ہیں۔

تبھی تو میرے خیال میں غالب نے وضاحت مقطع میں لفظ 'مگر' سے جوڑا ہے مطلب غلطیاں تسلیم کرتے ہوئے یہ کہہ رہا ہے کہ میں شریک نہیں ہو سکتا ہوں اور 'مگر' کے لفظ سے وجوہات بیان کرتا ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

شاعر فرماتے ہیں مجھے امید ہی نہیں ہے کہ میں ایسے برے کام سے نجات حاصل کروں تا کہ میں ایک قابل احترام اور قد آور شخصیت بن سکوں لیکن ایسے کام کو ترک کرنے کے لئے میں نے بہت کوشش کی لیکن میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے ایسے کام ترک کرنے کی امید ہی نظر نہیں آتی۔ امید نظر آتی لیکن 'بر' کے لفظ سے شاعر فرماتا ہے کہ اے معشوق اس کی نگاہیں بھی نہیں دیکھ سکتا ہوں جس سے امید نظر آ سکتی ہو۔ اسی لئے اے معشوق میں اپنے برے کام کی وجہ سے اپنی صورت بھی نیک آدمیوں کو نہیں دکھا سکتا کیونکہ مجھے امید ہی نہیں ہے کہ میں اس برائی کو چھوڑ دوں گا۔ جس سے مجھے گرد و نواح لوگ نفرت کرتے ہیں۔ اسی لئے اے معشوق آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو ان غلط کاموں کے باوجود مجھ سے محبت قائم و دائم ہے جبکہ یہ حقیقت ہے کہ میں ایک برا کام کرتا ہوں۔ کیا یہ میری برائی آپ کی پاکِ محبت میں قائم و دائم ہو گی۔

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب کے ہر مطلع میں مقطع کا حوالہ ایک دوسرے کا نچوڑ دے کر بیان کرتا ہے جو کہ آج تک کسی نے اس طرح کا نچوڑ بیان نہیں کیا ہے۔ جیسے کہ غالبؔ فرماتے ہیں کہ اس سے کوئی امید نظر نہیں آتی جس سے کہ وہ برے کاموں سے الگ رہے۔ برے کاموں سے دور نہ رہنے کی وجہ سے اپنے برے کام تسلیم کرتے ہوئے غالب نے خاص لفظ امید کا استعمال مطلع میں کیا ہے مطلب غالب لفظ 'امید' کو بیان کر کے مقطع میں یہ کہہ رہا ہے کہ جب مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہے اور ان سے دور رہنا چاہتا ہوں لیکن مجھے پوری امید تھی کہ میں ان غلطیوں سے دور رہوں گا لیکن اب مجھے ایسی امید نظر ہی نہیں آتی۔ غلط کام کرنے کی وجہ سے میں اسلامی قانون کے تحت کعبہ میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ جب بھی مجھے کعبہ میں برا کام کرتے ہوئے پکڑا جائے گا تو مجھے عوام یہ کہے گی کہ غالب ایسے برے کام انجام دینے پر تمہیں شرمسار ہونا چاہئے۔ تو ان الفاظ کے ساتھ ہی میں سفر محمود پر نہیں جاسکتا۔ جس کی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے ایسی شرم کو ختم کرنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ تبھی تو اے معشوق میں صاف طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں سفر محمود پر نہیں جاسکتا۔ یہ سب خدا کی ہی مرضی سے ایسے برے کام انجام دیتا ہوں جس سے کہ میری قسمت میں نیک کام کرنے پر حسد پیدا ہوتی ہے۔ تبھی غالب کہہ رہے ہیں مجھے امید بر نہیں آتی، مطلب میں شرمندہ ہوتا ہوں کہ میں سفر محمود میں زائرین کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے اے معشوق ان باتوں کو مد نظر رکھ کر آپ کو میرا نام مہمانوں کے فہرست میں نہیں لکھنا کیونکہ مجھے بہت سے مہمان نفرت کی نگاوں سے دیکھتے ہیں۔ وہی نفرت کرنے والے مہمان جب راستے میں ملتے ہیں تو مجھے ان لفظوں سے نواز کر کہتے ہیں کہ شرم تم کو نہیں۔

اب میں غالب کے مقطع کا لفظ غالب کے مطلب کے حوالے سے ہی بتاتا ہوں وہ یہ کہ

غالب کو سفر محمود پر جانے کی امید ہی نہیں۔ امید اسی لئے نہیں کہ وہ برے کام انجام دیتا ہے جس کی وجہ سے جانے کی اجازت ہی نہیں ملتی۔ ایسی بات کہہ کر شاعر فرماتا ہے جب بھی ہمیں برے کام کرنے کا احساس ہو تو اسی وقت ہمیں برے کاموں کو دفنا دینا چاہئے جس سے کہ سماج میں گندی نظروں سے لوگ نہ دیکھ سکیں۔ لیکن شاعر نے خاص لفظ 'امید' کا استعمال کیا ہے مطلب شاعر نے امید پر ہی خطاب شعروں میں کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اگر برے کاموں سے دور رہنے کی امید نظر نہیں آتی تو پھر ہمیں بزدل نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں بہادری سے ان برے کاموں کا مقابلہ کر کے فتحیابی حاصل کرنی چاہئے جس سے کہ ہمارے امید کی کرن جاگے اور غلط کاموں کو ترک کر سکیں۔

کوئی امید + بر نہیں آتی = کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت + نظر نہیں آتی = کوئی صورت نظر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے + جاؤ گے غالبؔ = کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو + مگر نہیں آتی شرم تم کو مگر نہیں آتی

''کوئی امید''

جب شخصی راج کا دور اختتام پذیر ہوا تو تمام لوگوں نے جمہوری طرز پر سرکار کی تشکیل کی۔ مطلب لوگوں نے خود حکومت بنائی اور ایوان کیلئے اراکین خود لوگوں نے چنے، جب کئی ملکوں میں چناؤ کے دوران یا عوامی حکومت تشکیل دینے کے دوران مختلف اراکین یہ کہنے لگے عوام کے لئے ہم ایسے کام انجام دیں گے جس سے کہ عوام ہمارا بہت ہی احترام کرے گی۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم ایوان بالا یا ایوان پائین کے رکن بن جائیں گے تو اس صورت میں بھی ہمارا احترام کیا جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے ایک آدمی نے ایسے کام انجام دیئے جن سے کہ لوگ بہت ہی احترام اس آدمی کا کرنے لگے لیکن پہلے تمام لوگ اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن جب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ آدمی ہماری بھلائی کے لئے کام انجام دیتا رہتا

ہے اسی لئے ہمیں اسے فراموش نہیں کرنا چاہئے ہمیں اس کا احترام کرنا چاہئے۔ اسی طریقے سے لوگوں کا تبصرہ اس آدمی پر دیکھنے میں آیا لیکن پھر بھی اس آدمی کے مخالف اس کو بدنام کرنے کے لئے لوگوں میں غلط افواہوں کے ذریعے اس کا احترام گھٹاتے رہے۔ ایسے حالات میں اس آدمی نے ان لوگوں کی بھی مخالفت کی باوجود اس کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ جب زیادہ تعداد میں لوگوں نے اس کے اچھے کام دبانے کی کوشش کی اور لوگوں کی توجہ اس کی اچھائی کے بجائے برائی پر ہی ڈالی تو اس آدمی نے ایسا ماحول دیکھ کر یہ کہا کہ میری تعریف کرنے کے بجائے لوگ نفرت کے نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن میں اپنے طریقے سے اچھا ہی کروں گا۔ وقت آنے پر میرے لئے لوگ اچھا کہیں گے اور میرے ہی تاثرات سن کر میرے ہی حق میں کوئی قصہ لکھیں گے اور کہیں گے۔ اسی طرح سے اس آدمی نے اپنی توجہ امید کی نگاہوں میں ہی مرکوز کی اگر چہ وہ روز اچھا کام لوگوں کی بھلائی کیلئے کرتا رہا لیکن اس کے مخالف اس کے اچھے کام کو برے کام میں مدغم کراتے رہے۔ لیکن ایسا ماحول دیکھنے کے باوجود بھی اس آدمی نے نیک کام کرنا بند نہیں کئے۔ ایک دن لوگوں نے اس کے خلاف عوامی جلسے میں بہت ہی برا بھلا کہا جس سے کہ تمام ملکوں نے حکومت کے اراکین کو درخواست کی کہ وہ اس معاملہ کی تحقیق کرائیں جس سے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ کونسی غلطی اس آدمی میں پائی گئی۔ یہ سن کر اُس آدمی نے خدا سے رجوع ہو کر یہ کہا کہ اے خدا جب میں نے کوئی برا کام یا برائی نہیں کی تو ان کی تحقیق سے کیا ہوگا، مجھے پوری امید ہے کہ میں سچائی پر کامیاب ہو جاؤں گا اور آخر کار مجھے عوام اچھی نگاہوں سے دیکھے گی یہی امید میں رکھتا ہوں۔ لیکن اس آدمی کے مخالفوں نے ایسا ماحول ملک، شہر اور گاؤں میں پیدا کیا جس سے کہ اس آدمی کو تمام لوگوں نے یہ فیصلا کیا کہ اسے ملک سے برطرف کیا جائے کہ وہ ملک میں جاسوسی کا کام انجام دیتا ہے۔ یہ سن کر اس آدمی نے جلاوطنی کا زمانہ دوسرے ملک میں گزارا اور یہی کہنے لگا کہ میوی سچائی پر اس ملک کی عوام کو یقین ہی نہیں ہوتا۔ ایسا ماحول دیکھ کر مجھے ''کوئی امید'' ہی نظر نہیں آتی۔ جب آدمی کو

احساس ہوا کہ جلاوطنی کے دوران میرے دماغ میں اپنے ملک کا احساس ہی نہیں تو یہ سوچ کر کہنے لگا کہ ''کوئی امید'' مطلب آدمی سوچنے لگا کہ کبھی نہ کبھی وہاں کے لوگوں کو احساس ہوگا کہ اچھے کام انجام دینے پر بھی وہ میری تعریف نہ کرسکے بلکہ اس کے عوض جلاوطنی کا زمانہ دیکھنا پڑا۔ جسے دیکھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں ''**کوئی امید**''

''بر نہیں آتی''

اس آدمی نے جلاوطنی کے دور میں سوچا کہ اچھے کام انجام دیتے ہوئے مجھے جلاوطنی کا زمانہ گزارنا پڑا، اور مجھے ابھی تک کوئی امید ہی نہیں کہ میں اپنے ملک میں پھر واپس جاؤں۔ یہ سوچ کر خود کہنے لگا شاید میرے لئے ایسے ذرائع نہیں، ایسے حالات نہیں کہ جس ماحول سے میں پھر واپس اپنے ملک میں قیام کروں۔ کسی غیر ملک میں قیام کرنا اچھا نہیں۔ اب اس ملک میں اس آدمی نے اپنے اثر ورسوخ سے شہرت کمائی، مطلب وہ ایسے کام اس ملک کی بھلائی کے لئے انجام دیتا رہا جس سے کہ تمام لوگوں اسکی تعریف کرتے رہے اور وہ لوگ اس آدمی سے کہنے لگے کہ اگر آپ کو اپنے ملک واپس جانے کے لئے امید نظر نہیں آتی ہے لیکن ہم آپ کو ایک بڑا عوامی عہدہ دے کر آپ کو اپنا رہنما بنائیں گے جس سے کہ آپ ہمارے ملک کو ترقی یافتہ ملک بناؤ گے۔ یہ بات سن کر اس آدمی نے سوچا کہ اس طریقے کے کام میں نے اپنے ملک میں انجام دئے لیکن افسوس وہاں پر میرے مخالفوں نے میرے خلاف ایسا ماحول پیدا کیا جس کی وجہ سے میں آج اس ملک میں جلائے وطنی کا زمانہ گزار رہا ہوں۔ اب میں حیران ہوں کہ ایک غیر ملک کے لوگ میرا ایسا احترام کرتے ہیں کہ ملک کا ہی سربراہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس بات پر سوچتے ہوئے اس آدمی نے اس ملک کے لوگوں کو تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ آپ کو میرے کام سے یا میرے چال چلن سے اتنا لگاؤ رہا کہ آپ مجھے ملک کے بڑے عہدے پر فائز کرنا چاہتے ہو۔ افسوس ہے مجھے اپنے ملک والوں پر کہ ان کو یہ احساس نہیں کہ وہ مجھے اپنے ملک میں احترام سے بلائیں۔ باوجود اس کے اس غیر ملک کے لوگ میرا ایسا احترام

کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملک کی سربراہی آپ کے ہی ہاتھوں میں ہونی چاہئے۔ایسی بات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ملک کے بارے میں کہنے لگا کہ میں اس جلسہ کا اختتام کرکے یہ کہتا ہوں کہ ''بر نہیں آتی'' مطلب لفظ 'بر' کو اپنا ملک تصور کرکے یہ بتایا کہ ان کو احساس ہی نہیں ہے بلکہ آپ کو احساس ہے۔ میں نے ایسا ہی کام اپنے ملک میں انجام دیا لیکن چند مخالفوں کی وجہ سے میرے خلاف سازش کی گئی جس کی وجہ سے میں جلائے وطن کیا گیا۔اسی لئے اس جلسہ کو اختتام تک پہنچا کر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ''بر نہیں آتی''

''کوئی صورت''

جب اس ملک کے لوگوں نے اس آدمی کے ایسے خیالات سنے تو انہوں نے اسے پھر عزت واحترام بخشا اور یہ کہا کہ آپ کو اپنے سے حب الوطن اور اپنے وطن کا حب الوطن الگ کرنا چاہئے کیونکہ آپ خود یہ فرماتے ہو کہ مجھے لوگوں سے پیار ہے لیکن آپ کے ملکی مخالف آپ کے پیار کو دشمنی میں بدل کر نفرت پھیلا رہے ہیں۔جس کی وجہ سے ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو خود کہنا چاہئے ''کوئی صورت'' مطلب آپ کو اپنے ملک کی صورت ہی دل میں نہیں رکھنی چاہئے۔

''نظر نہیں آتی''

ان لوگوں نے جلسہ عام میں اس آدمی سے اپنا ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'کوئی صورت' یہ سن کر اس آدمی نے پھر اس جلسے میں ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر مجھے آپ نے یہ کہا کہ آپ کو اپنے ملک کی صورت نہیں دیکھنی کیونکہ وہاں پر لوگ آپ کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔تو اس آدمی نے بتایا کہ مجھے لوگ نفرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے بلکہ میرے مخالف جو وہاں پر لوگوں کے چند ٹولیوں کیساتھ رہتے ہیں اور اپنی اکثریت دکھاتے ہیں جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اس ملک سے جلائے وطن کیا گیا۔میں جلائے وطن کا دور نہیں دیکھتا اگر چند مخالف لوگ میری مخالفت نہ کرتے کہ

میں ملک کا سربراہ بنوں۔ میں اپنے ملک کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں جبکہ آپ کہتے ہو' کوئی صورت' اس لفظ کو واپس لینا چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ لوگوں نے میری حواصلہ افزائی اتنی کی ہے کہ میرے حوصلوں کو دبانے کے لئے چند مخالفوں نے میرے خلاف آواز اٹھا کر ایسا ماحول بنایا کہ مجھے جلائے وطن کر کے خود یہ بیان کرنے لگے کہ اس آدمی کا اثر ملک میں نظر نہیں آتا۔ میں آپ لوگوں سے مخاطب ہو کر ان الفاظ سے جلسہ کو اختتام تک پہنچتا ہوں کہ'' نظر نہیں آتی'' مطلب میرے مخالف یہ کہہ رہے ہیں کہ اس آدمی کو جلائے وطن کے دور دکھائے گئے اب اس کی عزت لوگوں کے دلوں میں نہیں رہ گی۔ ہمارُے مخالف یہ کہتے ہیں کہ لوگوں میں ولولہ اور جوش اس مخالف آدمی کا نظر نہیں آتا جیسے پہلے نظر آتا تھا اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ'' نظر نہیں آتی''

'' کعبے کس منہ سے''

جب اس ملک کے لوگوں نے اس آدمی کا خیال عوامی جلسے میں سنا تو انہوں نے اپنا ردعمل مختلف انداز میں عوام کے سامنے بیان کیا۔ یہ بتایا کہ ہم عوام سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اس آدمی میں اپنے ملک کے لئے کتنا جوش ہے جسے ہم حب وطن کہتے ہیں۔ اگرچہ ہم نے اسے ملک کے بڑے عہدے پر فائز کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کیا اور انکار اسی لئے کیا کیونکہ وہ اپنے ملک میں ہی سربراہی کرنا چاہتا ہے۔ غیر ملک کو ترقی یافتہ کرنے سے غیروں کے لئے فائدہ مند ہے۔ لیکن اس آدمی نے یہ بھی کہا کہ میں ہر ایک ملک کا احترام کرتا ہوں لیکن پہلے اپنے ملک سے ہمیشہ وابستہ رہنا چاہتا ہوں۔ وابستگی کے لئے آدمی کو اپنے ملک کی خامیوں کو دور کرنا ہوتا۔ مجھ میں حب الوطنی کا جوش ہے۔ اس آدمی نے جلسہ عام میں ان کے بیان پر داد دیتے ہوئے عوام سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہمیں حب الوطنی کے جذبے سے اپنے ملک میں پہلے خدمت کرنی چاہئے۔ محبت اور اچھے اخلاق کے جذبوں سے تمام لوگ ایک دوسرے کا تعاون کریں گے۔ لیکن میں جلاء وطنی کے بعد اس غیر ملک میں آپ کے

سامنے حاضر ہو کر اس جلسے میں خطاب کر رہا ہوں۔ لیکن جب میں نے ان اراکین کا بیان سنا تو میں آپ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ حب الوطن کا جوش تا ابد موجود رہنا چاہئے اگر چہ میں جلائے وطن کا وقت اس ملک میں کاٹتا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنے ملک کے ساتھ محبت نہیں ہے۔ چاہے آپ نے مجھے اس ملک کی سربراہی کے منصب پر فائز ہونے کی تجویز رکھی لیکن میں اسی لئے رضامند نہیں ہوں کہ میں اپنے ہی ملک میں سربراہی کرنا چاہتا ہوں۔ اس ملک میں آپ کے ہی شہری سربراہ بن سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے مجھے میرے کام اور میری تہذیب کو دیکھ کر اس عہدے پر بیٹھنے کی رضامندی دکھائی میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔ میں ایک ایسی مثال دے کر آپ کا خیال مرکوز کرنا چاہتا ہوں جس میں ایک مقدس جگہ کا بیان ہے جہاں تمام ممالک کے مسلمان شریک ہو کر اپنے مذہب کا احترام کرتے ہوئے اور اس مقدس جگہ میں قیام کر کے نماز ادا کرتے ہیں لیکن اس مقدس جگہ وہی لوگ جاسکتے ہیں جو اسلامی اصل وضوابط پر عمل پیراں ہوں۔ وہی لوگ اس مقدس جگہ پر نماز ادا کر سکتے ہیں اور اسلامی اصولوں پر ہمیشہ قائم رہیں۔ وہی لوگ اس مقدس جگہ پر نمازیں ادا کر کے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم پرانے گناہوں سے توبہ کر کے اسلامی قانون کے تحت اپنی بقیہ زندگی نیک کام کر کے بسر کریں گے۔ مطلب کعبہ کے سامنے حاضر ہو کر مسلمان اپنے مذہب پر قائم ودائم رہنے کی دعا کرتا ہے اور وہیں نمازیں ادا کرنے کے بعد وہ اسلامی اصولوں پر چلنے کا عہد کرتا ہے۔ پچھلی زندگی میں کی گئی غلطیوں کی تلافی نماز ادا کرنے کے بعد کرتا ہے۔ اسی طرح سے میں مقدس جگہ اپنے ملک کو سمجھتا ہوں جس ملک کے لئے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہے اور ملک پر قربان ہونے کے لئے بدستور حاضر رہتا ہوں۔ ہمیں دشمن کے چنگل سے اپنے ملک کو آزاد کرانا ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے اس آدمی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ لوگوں نے ان سے یہ کہا ہے کہ آپ نے یہی ہمیں سمجھایا کہ ہر ایک نے اپنے ملک میں کچھ غلطیاں کی ہوں گی۔ تو آپ کبھی بھی جلائے وطن کے دور کو بھلا نہیں کہتے۔ آپ اپنے ملک کے لئے کسی بھی وقت جانے کے لئے تیار ہو بشرطیکہ

جلاوطنی کا دور ختم ہو۔ ہم آپ کا احترام کرتے ہیں اور یہ کہہ کر اس جلسہ کو اختتام پذیر کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک غلط کام کرنے والے کو نہیں بخشا جاتا۔ جس طرح سے اسلامی قانون میں غلطیاں کرنے والے کو خود احساس ہوتا ہے کہ وہ سفر محمود پر نہیں جا سکتا کیونکہ اس میں ایسے اصول نہیں پائے جاتے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ''کعبے کس منہ سے'' مطلب میں نے بہت سی غلطیاں کیں جن کو تسلیم کرتے ہوئے سفر محمود پر نہیں جا سکتا۔ اگر اس کو خود اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ غلطیوں کا پتلا ہوں اگر وہ انہیں دفن کر دے تو سفر محمود پر جا سکتا ہے۔ مطلب غلطیاں کرنے والے کو مقدس زیارت پر جانے کے لئے دل اجازت نہیں دیتا۔ اسی لئے جلسہ عام میں لوگوں نے اس آدمی کا شکریہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''کعبے کس منہ سے''

''جاؤ گے غالب''

جب اس آدمی نے مختلف خیالات جلسہ عام میں سنے تو جلسہ کو اختتام پذیر نہ کہہ کر خود لوگوں کے سامنے اپنے خیالات کہنے کے لئے جلسہ میں کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ میں آپ کی باتوں اور تاثرات پر بہت ہی شرمسار ہوں۔ آپ نے اچھی اچھی باتیں کہیں اور مثالیں دیں۔ جیسے کہ آپ نے 'کعبہ کس منہ سے' مثال دی یہ صحیح ہے اسلامی قانون کے تحت ہر ایک آدمی کو اپنے مذہب کا احترام کرنا چاہئے۔ جس طرح تمام مسلمان اسلام کی قدر اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن میں اپنے تاثرات لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں مذہب کا حوالہ نہیں دینا چاہئے۔ حوالہ دینے سے کئی لوگ دوسرے طریقے یا مطلب سے اسے موافق نہیں سمجھتے۔ اسی لئے میں اس پر اور اس حوالے پر تعاون نہیں کرتا بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہر ایک ملک کے شہری میں حب الوطنی کا جذبہ ہونا چاہئے خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ہمیں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہئے جس سے کہ بلا لحاظ مذہب وملت ملک کی وفاداری اور حب الوطنی کا پرچم ہر روز ملک میں لہرائے۔ مجھے ایسا ہی احساس تھا۔ ایسا ہی رجحان اور جذبہ تھا لیکن کیا کروں مجھے مخالفوں نے ملک سے الگ کیا۔ یہ سن کر عوام بہت ہی خوش نظر آئی اور اس جلسے میں دوسرے

کسی آدمی نے یہ تلقین کی کہ میں کچھ بتانا چاہتا ہوں اور جس کی وجہ سے لوگ اور بھی خوش نظر آئیں گے۔ یہ سن کر اس آدمی کو جلسے میں بلا کر درخواست کی گئی کہ آپ ہی اپنے آگے کے تاثرات بیان کریں۔ اس آدمی نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ہمیں اپنے ملک کی خدمت کے لئے اگر کئی مخالف عناصر جلائے وطنی کی سزا بھی دیں پھر بھی ہمیں ملک کے تئیں وفاداری اور راز داری قائم رکھنی چاہئے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہمیں ملک میں کسی عناصر نے اپنے ملک سے جلاء وطن کا دور دکھایا بلکہ اپنے ملک کے لئے حب الوطنی کا جذبہ ہونا چاہئے۔ اس آدمی نے یہ کہا کہ اگر ہم نے اس آدمی کو اپنے ملک کا رکن بھی بنایا لیکن اس آدمی نے اپنی اس رکنیت سے کنارہ کش اسی لئے رہے کہ اس نے اپنے ہی ملک میں ایسے عہدے پر لوگوں کی رضامندی سے کام کرنے کو تسلیم کیا۔ غیر ملک میں ایسے عہدے پر رہنے سے رضامندی نہیں دکھائی۔ اسی لئے میں اس جلسے کو اختتام پذیر کر کے یہ کہہ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم اس ملک میں اس کو اس نام کے اعزاز ''جاؤ گے غالب'' حوصلہ افزائی کریں۔ میں نے اعزاز کا نام اسی لئے رکھا کیونکہ اس آدمی کو میں نے جلائے وطنی کے دور میں بہت سی کتابیں پڑھتے دیکھا۔ زیادہ تر یہ آدمی غالب کے کتابیں اور انگریزی شاعروں کی کتابیں پڑھتا رہا۔ مجھے انگریزی شاعر کا نام یاد نہیں آرہا ہے جس کو جلائے وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لئے اس آدمی کا غالب پر کافی تبصرہ موجود ہے اور غالب کو بھی ہر روز پڑھتا ہے یہ دیکھ کر اس انگریز شاعر کی بات یاد آئی اور میں نے اُردو میں جلسے میں تقریر کی اور انگریزی شاعر کے بجائے میں نے اس کو اعزاز سے ''جاؤ گے غالب'' اسی لئے منتخب کیا تا کہ جب یہ آدمی اس ملک سے واپس اپنے ملک کو جائے گا تو یہی اعزاز لے کر جائے گا اور خود ہم یہ کہیں گے کہ اس ملک میں یہ غالب کی طرح یہاں بیٹھ کر ملک کا معشوق اور محبوب بنا تا کہ یہ سوچیں کہ جس طرح غالب نے معشوق اور محبوب کے بارے میں دیوان لکھا اسی طرح یہ آدمی حب الوطنی پر دیوان لکھتا رہا۔ مطلب اپنے ملک کے حالات کے بارے میں دل میں تبصرہ بیان کرتا رہا جس بیان سے

ہم اپنے ملک واپس جاتے وقت یہ کہیں کہ "جاؤ گے غالب"

"شرم تم کو"

جب جلسہ اختتام پذیر ہوا تو پھر اس آدمی کا شکریہ ادا کیا جس سے یہ احساس ہوا کہ یہ بہت ہی نیک آدمی ہے۔ یہ سن کر اُس آدمی نے یہ کہہ کر جلسہ کو اختتام پذیر کرنے کی کوشش کی کہ آپ نے مجھے اعزاز سے نوازا لیکن میں اس اعزاز کا بہت ہی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس بات کا شکریہ کر کے یہ تبصرہ بیان کیا کہ جن آدمیوں نے اِس آدمی کو اپنے ملک سے برطرف کیا اور جلائے وطنی کا دور دکھا کر اسے اپنے حب الوطنی کا احساس نہ دکھانے کے لئے الگ کیا ان آدمیوں کو ہم کہہ رہے ہیں کہ ان میں حسد بھرا حب الوطن کا جوش ہے۔ ایسا جوش ملک میں کسی شہری میں نہیں ہونا چاہئے بلکہ حسد کو الگ رکھنا چاہئے جس سے کہ یہ ہم سوچیں کہ ہر ایک کام ملک کے تیئں اچھا ہو۔ خواہ کسی جذبے سے ملک کے تیئں اپنی خدمت کا اظہار کرتا ہو اس کے کام سے ہمیں حسد نہیں رکھنی چاہئے۔ ہمیں ہر ایک کے کام کو دیکھنا چاہئے اور دیکھ کر یہ سوچنا چاہئے کہ اس نے کام کیا ملک کے تیئں اور ملک کی حفاظت کے لئے، نہ کہ ملک کو برباد کرنے کے لئے۔ اسی لئے ہمیں کسی کے حب الوطن کے جوش پر حسد نہیں کرنا چاہئے۔ اب ہم اس ملک کے ان مخالفوں سے خطاب کرتے ہوئے اس ملک میں یہ بات پہنچا چاہتے ہیں کہ ہم نے اِس آدمی کا جذبہ اپنے ہی ملک کے تیئں دیکھا اور کسی بھی طرح کی لالچ اس آدمی میں نہیں دیکھی۔ اسے اس ملک سے محبت ہے۔ باوجود اس کے کہ ہمیں ان مخالفوں کو یہ بات بتانی ہے کہ انہیں اس آدمی کے خلاف کچھ نہیں بولنا چاہئے۔ اگر بولتے بھی ہیں تو ان کو یہ کہنا ہے کہ "شرم تم کو" مطلب انہیں یہ کہنا ہے کہ کتنا حب الوطنی کا جوش اس آدمی میں ہے کہ یہ اپنے ہی ملک میں اچھے کام کرنا چاہتا ہے اور اس اچھائی سے ان مخالفوں کو شرم آنی چاہئے۔ اسی لئے اس جلسہ کو اختتام تک پہنچا کر یہ الفاظ کہتے ہیں "شرم تم کو"

"مگر نہیں آتی"

جب ایسی باتیں مختلف لوگوں اور دانشوروں نے سن کر ملک کے لوگوں کو احساس کرایا تو وہ خود یہ کہنے لگے کہ ہم حکمرانوں سے درخواست کریں گے کہ اس آدمی کو اس ملک میں پھر لانا چاہئے اور جلائے وطنی کو ترک کرنا چاہئے وہ آدمی بہت ہی اچھا ہے ان کو ان مخالف عناصر نے دبایا جو اس آدمی کے کام پر حسد کے شکار ہوئے، جس کی وجہ سے انہوں نے کئی غنڈوں کا ساتھ لیکر اس آدمی کیلئے ایسا ماحول پیدا کیا جس سے کہ حکمران تنگ آگئے اور اس آدمی کو جلائے وطنی کا حکم نامہ دیا گیا۔ پھر حکمرانوں نے اس آدمی کو جلائے وطن کا دور ختم کر کے اپنے ملک آنے کی دعوت دی۔ جب اس آدمی کو اپنے ملک جانے کی اجازت دی گئی تو وہ اپنے ملک جانے کی تیاریاں کرتا رہا جب لوگوں نے سنا کہ حکمرانوں نے اس آدمی کے خلاف جلائے وطنی کا حکم منسوخ کردیا اور اپنے ملک میں پھر واپس آرہا ہے تو لوگوں نے اس کے استقبال کے لئے مختلف طریقوں سے خوشیوں کا اظہار کیا اور مختلف استقبالیہ کمیٹی منعقد کیں تاکہ اس آدمی کو ملک میں داخل ہوتے وقت لوگوں کا استقبال دیکھنے میں آئے۔ استقبال کمیٹی میں وہ آدمی بھی رکن بنے جنہوں نے اس آدمی کو دبانے کے لئے مختلف حربے استعمال کیے تھے اور جن حربوں کی وجہ سے اس آدمی کو حکمرانوں کے حکم کے تحت جلائے وطن ہونا پڑا تھا۔ جب تمام لوگوں نے ان عناصر کو اِس استقبالہ کمیٹی میں بطور رکن پایا تو انہیں احساس ہوا کہ کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے اس کے کام کی مخالفت کی جس کی وجہ سے اس آدمی کو جلائے وطن ہونا پڑا۔ اب وہی لوگ ان کو استقبالیہ کمیٹی کے رکن دیکھ کر ایسا تبصرہ کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ان کو آج سے ہم ایسے الفاظ سے مخاطب کریں گے کہ ''مگر نہیں آتی'' مطلب انہیں شرمسار ہونا چاہئے لیکن شرمسار نہیں ہوئے بلکہ شرمساری کو دبانے کے لئے استقبالیہ کے رکن بن گئے اسی لئے ان کو ہم اس نام سے پکارتے ہیں ''مگر نہیں آتی''

اگر میں اس دلیل کو افسانے کے طرز پر لکھنا چاہوں تو میں اس عنوان کے دائرے میں اس دلیل کو قلمبند کروں ''مگر نہیں آتی'' یا ''جلائے وطن کے دور''

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی
عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمر طبیعی نہ سہی

غالب نے دیوان غالب میں اپنی غزلوں میں لفظ 'مرنے' کو بار بار مختلف شعروں میں بھی استعمال کیا ہے، لیکن اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی غزلوں میں معشوق سے ملاقات کیلئے اور پاکِ محبت میں کامیاب ہونے کیلئے اس لفظ سے دھمکیاں دیتا ہے اور غالب کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب لفظ 'مرنے' پر اسی لئے زیادہ توجہ دے رہا ہے تا کہ پڑھنے والے کو یہ سمجھ آئے کہ شاعر بزدل نہیں ہے اور پاکِ محبت میں وہ کبھی بزدلی معشوق کے سامنے نہیں دکھاتا۔ اسکے ساتھ ہی اس لفظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب موت کی دھمکیاں دے کر معشوق سے نزدیک آنے کیلئے دلی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ معشوق کو یہ احساس ہو جائے کہ جب محبوب اس دُنیا سے چل بسے تو میں کیسے پھر معشوق سے مل سکتی ہوں۔ اگر دوسرے شعروں کو ہم سنجیدگی سے پڑھیں گے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ غالب موت سے بھی ڈرنے والا شاعر نہیں ہے۔ خیر غزل کو ترجیح دینے کے لئے لفظ مرنے کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اگر شاعر نے مرنے کا لفظ استعمال کیا ہے جب انسان کو موت آجاتی ہے تو کیسے اس کو معلوم ہوگا کہ میری موت پر معشوق امتحان لے رہی ہے۔ یہ غلط بات ہے خیر غزل کو تحریر کرنے کے لئے اور معشوق کے ساتھ اپنی پاک محبت کی دلیلوں کو جرہ کرنے کے لئے شاعر نے یہ لفظ غزل کے مطلع میں استعمال کیا ہے ورنہ خود شاعر کہتا ہے کہ اگر معشوق کو میرے مرنے سے تسلی نہیں ہوئی ہے وہ معشوق کو موت کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا ہے پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ دھمکیاں دے کر پاکِ محبت کے قریب آنے کے لئے معشوق کا امتحان لے رہی ہے۔ ورنہ شاعر اسی مطلع میں مقطع کی وابستگی کر کے کہہ رہے

ہیں کہ میری طبیعت ان باتوں سے خراب ہوئی۔ اگر اپنی طبیعت کو اچھی دیکھنا چاہتا ہے تو کیسے غالب مطلع میں لفظ مرنے کا استعمال کرتا ہے، مطلع غالب معشوق کو قریبی وابستگی کے لئے ایسے لفظوں کا استعمال کرتا ہی رہا۔ بہت سی غزلوں میں شاعر نے ایسے الفاظ بہت بار دُہرائے ہیں۔

اگر چہ میں اس غزل کے مطلع کو غور سے پڑھوں اور سوچوں تو میں اس مطلع کو اس طرح پڑھنے والے کے سامنے اظہار کروں گا۔ وہ یہ کہ

نہ ہوئی گر مرے دیکھنے سے تسلی نہ سہی
دلیل اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

لیکن غالب کے مطلع کے ساتھ مقطع بتانے سے الگ تھلگ رہ جاتا ہے۔ اُدھر سے غالب مرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے اِدھر سے مرنے کے بجائے معشوق کی صورت کو دیکھنے کے لئے یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے تسلی پوری نہیں ہوتی ہے۔ معشوق کو دیکھ کر بھی اس طرح سے جواب دعویٰ کے شعر میں میں بتا رہا ہوں کہ ایسی دلیل باقی ہے جس سے کہ مجھے معشوق کے دیکھنے سے تسلی ہو جائے لیکن غالبؔ کے مطلع میں الگ مطلب اس شعر کو لکھنے سے نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ غالب کہتا ہے کہ معشوق کو میرے مرنے سے سکون آجائے لیکن پھر میں یہ محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ میرے مرنے کے حق میں ہے یا مجھے دھمکیاں دے کر امتحان کی گھڑی میں داخل کرنا ہے۔

اگر میں اس مطلع کو الگ مطلب کے لحاظ سے پڑھنے والے کی توجہ مرکوز کروں تو میں یہ کہوں گا کہ ایک لفظ کے لکھنے پر کتنی تبدیلیاں شعر کو سمجھانے کے لئے کہنی پڑتی ہیں۔ لفظ مرنے سے اور لفظ دیکھنے سے کتنا فرق غزل کے مفہوم پر ہے۔ اور لفظ امتحان کے بجائے دلیل کہنے سے کتنا فرق کہنے میں سمجھتے ہیں۔ اسی لئے غالب نے ہر ایک لفظ کو اپنے انداز میں ہی بیان کیا ہے۔ ہم اس پر کوئی بھی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ دلیلوں کو لفظ سے ہی جرہ کیا جا سکتا ہے۔

غزل کے مطلع اور مقطع میں غالب نے فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

شاعر غزل کے مطلع میں یہ کہتے ہیں کہ معشوق میرا ہر طریقے سے امتحان لیتی ہے اور میں امتحان میں حاضر ہوتا ہوں۔ معشوق اسی امتحان کو لینے کے لئے یہ کہہ رہی ہے کہ اگر میری معشوق سے ملاقات نہیں ہوئی تو اس کو ملاقات میرے مرنے کے بعد قبول ہے، یا مجھے کئی امتحانوں میں داخل کر کے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ پاکِ محبت کے امتحان میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ کئی طریقوں سے میرا امتحان لے کر آزمانے کی کوشش میں لگی ہے لیکن میں ہر بار اپنے امتحان میں مطلب پاکِ محبت کے امتحان میں کامیاب ہوتا ہوں اور کامیاب رہوں گا اس لئے میں یہی کہوں گا کہ جس طریقے سے آپ میرا امتحان لے رہی ہو مجھے اس میں بھی محبت کے آثار دیکھ کر تسلی محسوس ہوتی ہے۔

عشرت صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمر طبیعی نہ سہی

غزل کے مقطع میں شاعر فرماتے ہیں کہ میرے پاس عیش وعشرت کا سامان نہیں ہے لیکن میں ان عیش وعشرت کے سامان کو یہ سمجھتا ہوں جو میری محبوب امتحان لے رہی ہے۔ کبھی وہ یہ کہہ کر مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ملے لیکن میری جدائی پر وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اگر خدانخواستہ موت آجائے تو موت آنے کے بعد میری پاکِ محبت ضرور یاد آئے گی تو اُس وقت ضرور میری میت کو دیکھنے کے لئے حاضر ہو جائے گا لیکن میں ان باتوں کا خیال دل میں نہیں رکھتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں معشوق سے ملوں تو میں عیش وعشرت کا سامان مہیا کرتے ہوئے ملوں اور ان عیش وعشرت کے سامان کو دیکھ کر میری اس محبت کے انداز کو بہت ہی خوش نصیب سمجھ کر یہ کہے گی کہ مجھے ان چیزوں کو دیکھ کر غنیمت محسوس

ہوئی۔اگر اسے تسلی بخش خوشی محسوس نہیں ہوئی ہوگی تو میں اس طریقے سے معشوق کو نہیں ملنا چاہتا جس سے کہ میں یہ کہوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس وجہ سے آپ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرے مرنے کے بعد معشوق میرے پاس آکر میری میت پر نظر ڈالے۔ایسے الفاظ سے میں متفق نہیں ہوں۔میں پاک محبت کرتا ہوں لیکن پاک محبت خوش اسلوبی سے کرتا ہوں اور خوش اسلوبی سے پیش آکر اپنے معشوق کو عیش وعشرت کے سامان مہیا کرتا ہوں۔

اگر اس مقطع کو لفظ غالبؔ کے مطلب کے حوالے سے لکھیں تو میں یہ کہوں گا کہ ہمیں محبت میں بزدل نہیں بننا چاہئے اور محبت میں کبھی بھی یہ نہیں کہنا چاہئے کہ موت کے بعد ہم اپنے معشوق کا دیدار کریں گے،ایسے الفاظ سے کوئی فتحیابی نہیں ہوسکتی۔ہمیں عیش وعشرت کے طریقے سے پاک محبت میں پیش آنا چاہئے اور پیش آکر ہمیں اگر کبھی مصیبت کی گھڑی بھی دیکھنی پڑے ان آزمائشوں کو پار کرکے ہم فتحیابی میں ضرور محبت پاسکتے ہیں اور ہمیں فتحیابی کے لئے موت کے جامہ کو الگ رکھنا چاہئے۔ہمیں محبت کو فتح کرنے کے لئے ہمت سے کام لینا ہے اور بزدلی کی دیوار کو مسمار کرنا ہے۔

نہ ہوئی گر مرے+مرنے سے تسلی نہ سہی = نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

امتحاں اور بھی باقی ہو+تو یہ بھی نہ سہی = امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

عشرت صحبت خوباں ہی+غنیمت سمجھو = عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالبؔ اگر +عمر طبیعی نہ سہی = نہ ہوئی غالبؔ اگر عمر طبیعی نہ سہی

”نہ ہوئی گر مرے“

بہت سالوں تک عبدالرحمٰن نے اپنے بیٹے شوکت حسین کو ملک کے باہر بھیج کر تعلیم دلائی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد پھر اپنے ملک واپس آیا۔شوکت حسین نے جب اپنے باپ سے روزگار کے بارے میں بحث کی تو اس نے عبدالرحمٰن کو یہ بتایا کہ مجھے اس ملک میں نوکری مل

سکتی ہے لیکن اتنی ماہانہ تنخواہ میرے موافق نہیں ملے گی، اسی لئے میں اپنے ملک سے پھر باہر جانا چاہتا ہوں تاکہ دوسرے ملک میں مجھے ایسا روزگار فراہم ہو جائے جس سے کہ میں اچھی ماہانہ تنخواہ وصول کرسکوں۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن نے شوکت حسین کو بتایا کہ میں اس پر ناراض رہوں گا اگر اپنے ملک میں ماہانہ تنخواہ کم حاصل ہوتی ہے پھر بھی ہمیں اپنے ملک میں ہی اپنا کام انجام دینا چاہئے۔ کبھی کبھی ملک کی معاشی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ماہانہ تنخواہ کم ملتی ہے لیکن ہمیں ملک سے وفاداری کے لئے اپنا کام اور ہنر اپنے ملک میں ہی کرنا چاہئے۔ یہ سن کر شوکت حسین نے عبدالرحمٰن کا کہنا ٹھکرا کر دوسرے ملک اپنے روزگار کے لئے کاغذات بذریعہ ڈاک بھیجے۔ دس پندرہ دن کے بعد شوکت حسین کو دوسرے ملک سے روزگار کا خط موصول ہوا۔ شوکت حسین نے عبدالرحمٰن کو دوسرے ملک کے روزگار کا خط دکھا کر یہ کہا کہ میں اب دوسرے ملک میں اپنا روزگار حاصل کر کے وہیں سے اپنی ماہانہ تنخواہ کا کچھ حصہ آپ کو بھیجوں گا۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن شوکت حسین پر بہت ہی ناراض ہوا۔ لیکن ناراضگی کے باوجود شوکت حسین نے دوسرے ملک میں روزگار حاصل کرنے کے لئے رخصتی لیکر ہوائی اڈے کے لئے گھر سے نکلا۔ جب شوکت حسین گھر سے نکلا تو عبدالرحمٰن بہت ہی ناراض ہو کر تہہ دل سے اجازت نہ دے کر یہ کہنے لگا کہ خیر خدا آپ کو تندرست رکھے تاکہ اپنا کام یا روزگار کرتے رہو۔ آخر میں یہ کہہ کر اس سے رخصت لی ”نہ ہوئی گر مرے“ مطلب میرے گھر سے آپ کا کوئی تعلقات ہی نہ رہا، دوسرے ملک سے آپ کے احوال سن کر پریشانی میں مبتلا ہونا ہے لیکن جب شوکت حسین نہیں مانا پھر بھی عبدالرحمٰن غصے میں ہی اندرونی جذباتوں میں ہی رہا۔ اور بیرونی آفرین آفرین کر کے پھر ان الفاظ سے باتیں الگ ہوئیں۔ پھر ان الفاظ سے ”نہ ہوئی گر مرے“ یہ سن کر عبدالرحمٰن نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس گھر میں اب کوئی بھی نہیں ہے، اسی لئے میں ان الفاظ کو پھر دہراتا ہوں ”نہ ہوئی گر مرے“

”مرنے سے تسلی نہ سہی“

یہ سن کر عبدالرحمٰن کی بیوی نے ان باتوں پر شوکت حسین کی غیر حاضری میں اپنے خاوند کو بتایا کہ 'نہ ہوئی گر مرے' مطلب یہ کہا کہ یہ صحیح ہے کہ اگر ہمارے پاس شوکت حسین نہیں بیٹھا لیکن اب میں یہ سوچتی ہوں کہ جب ہم دونوں میں کسی کو موت آئے تو کیا اس وقت شوکت حسین کی زبان سے اظہار افسوس ظاہر ہوسکتا ہے کیا جب ہم دونوں میں سے کوئی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو کیا اس وقت شوکت حسین ہماری مزاج پرسی کر سکتا ہے۔ہم اس ملک میں وہ اس ملک میں۔مطلب عبدالرحمٰن کی بیوی نے کہا کہ اتنی دوری سے کہاں ممکن ہے اس کا حاضر ہونا اسی لئے میں پہلے یہ کہتی ہوں کہ ہمارے ''مرنے سے تسلی نہ سہی'' مطلب بیماری کے وقت یا موت کے وقت ہمیں شوکت حسین کا ہمدردانہ رویہ نہیں دیکھنا، نہ دیکھیں گے اسی لئے ہمیں صرف خط وکتاب اور ٹیلی فون سے یا انٹرنیٹ کے ذریعہ یا دوسرے وسائلوں کے ذریعہ شوکت حسین کے ساتھ ملاقات ہوسکتی ہے پھر بھی جسمانی طور پر ہمارے کمرے سے الگ ہے۔یہ بات سن کر عبدالرحمٰن نے اپنی بیوی کو بتایا کہ آج کل زمانہ ایسا ہی ہے لوگ ملک کے لئے احسان مند نہیں بلکہ اپنے خرچے اور روپیوں کے احسان مند ہیں۔اگر چہ شوکت حسین کو اس ملک میں کم تنخواہ حاصل بھی ہوئی لیکن اسے اپنے ہی ملک میں اپنا کام کرنا چاہئے۔خیر اس کی مرضی ہی نہیں اسی لئے آپ کا یہ کہنا صحیح ہے ''مرنے سے تسلی نہ سہی'' مطلب یہ ہے کہ ہمیں شوکت حسین کے ساتھ چوبیس گھنٹے رابطہ قائم ہوسکتا ہے لیکن جسمانی طور پر نہیں بلکہ زبانی طور پر اور تصویر کے ذریعہ، جسمانی طور وہ ہم سے تب تک غیر حاضر رہے گا جب تک نہ وہ اس ملک سے ہمارے پاس اس مکان میں بیٹھے۔اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ''مرنے سے تسلی نہ سہی'' مطلب جب بھی ہم دونوں میں کسی نہ کسی کی صحت میں گڑ بڑ محسوس ہو جائے یا دونوں میں سے کسی ایک کی موت ہو جائے اُس وقت ان کے ساتھ رابطہ ہوسکتا ہے تصویروں کے ذریعہ لیکن جسمانی طور پر نہیں، اسی لئے میں آپ کے اس لفظ سے متفق ہوں ''مرنے سے تسلی نہ سہی''۔مطلب ہمیں جسمانی طور پر شوکت حسین کے ذریعہ افسوس یا ردعمل نہیں سننا ہے بلکہ

تصویروں کے ذریعہ اور باتوں کے ذریعہ جسمانی طور پر نہیں۔ اسی لئے یہ صحیح ہے ''مرنے سے تسلی نہ سہی'' جب عبدالرحمٰن نے شوکت حسین کے تاثرات اپنی بیوی کو سنائے تو عبدالرحمٰن کی بیوی یہ کہنے لگی کہ آج کل کے زمانے میں اگر اپنا لڑکا اپنے ملک میں بھی روزگار کمانے لگتا ہے پھر بھی وہ اپنے ماں باپ کے تئیں اپنا ڈیرہ نہیں جماتا ہے وہ فوراً شادی کا چکر چلا کے اپنے والدین سے الگ رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ اسی لئے ہمیں خوش رہنا چاہئے کہ سماج میں ہماری عزت ہے ورنہ اسی ملک میں شوکت حسین روزگار کمانے بیٹھتا تو ہمیں ایسا ماحول دیکھنا پڑتا کہ لوگ یہ کہتے کہ ان کا لڑکا ان کے پاس نہیں بیٹھا ہے اس نے الگ ڈیرہ جمایا ہے ایسی باتوں سے سماج میں ہماری عزت نہیں رہتی۔ اسی لئے میں بہت ہی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ پہلے ہی شوکت حسین نے اس طریقے کا رجحان دکھایا وہ ملک سے باہر ہی اپنے روزگار کی تلاش میں رہا اور روزگار حاصل کیا۔ اس کی شادی کا بھی سلسلہ آنے والا ہے اور ہم اس وقت بھی کسی جھگڑے میں نہیں پڑیں گے۔ نہ ہم جھگڑا مول لیں گے جب بھی کوئی لڑکی والا ہمارے لڑکے کے رشتے کے چکر میں سوچے گا تو وہ فوراً اپنی لڑکی کو پیش کر کے یہ کہے گا کہ لڑکا الگ ہے اور اپنے والدین کے ساتھ واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور فوراً شادی کا سلسلہ انجام دے سکتے ہیں۔ اسی لئے شوکت حسین کا روزگار بہت ہی اچھا ہے اور اس روزگار سے ہمیں صدمہ ہوا اس بات کا لڑکا ہم سے الگ رہا وہ بھی ملک کے باہر۔ دوسرے مما لک جانے پر بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ خیر اس گھر اور اپنی حالت دیکھ کر میں عبدالرحمٰن صاحب کو یہ کہتی ہوں کہ 'مرنے سے تسلی نہ سہی'' مطلب ہمیں اپنے آگے کی داستانوں سے یہ حال دیکھ کر یہ کہنا ہے کہ اپنے بیٹے سے ہمارے لئے کوئی وفاداری کی گنجائش نہیں بلکہ تصویروں اور ٹیلی فون کے ذریعہ جسمانی طور پر ہم حاضر نہیں دیکھ سکتے۔ اسی لئے میں یہ بتاتی ہوں اور آپ بھی خود یہ الفاظ دہراتے ہو ''مرنے سے تسلی نہ سہی''

''امتحاں اور بھی باقی ہو''

جب شوکت حسین نے دوسرے ملک میں اپنا روزگار جمایا تو وہاں سے شوکت حسین نے اپنے گھر والوں سے ٹیلی فون کے ذریعہ اپنا رابطہ قائم رکھا اور انٹرنیٹ کے ذریعے اپنی اور اپنے ماں باپ کی تصویر انٹرنیٹ کے ذریعے دیکھی، یہ دیکھ کر ماں باپ کو اپنے اکلوتے لڑکے کو دیکھ کر تسلی ہوئی اور پیار محسوس ہوا، لیکن ساتھ ہی ساتھ دونوں عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی یہی محسوس کرنے لگے کہ جسمانی طور پر شوکت حسین غیر حاضر ہے۔ تصویر کے ذریعے شوکت حسین ہمارے گھر میں موجود ہے۔ اس طریقے سے دو تین سال گزر گئے۔ اب عبدالرحمٰن کسی بیماری میں مبتلا ہوا، خود عبدالرحمٰن کی بیوی اس کی خدمت کرنے لگی۔ لیکن دونوں صحت یاب نہیں ہوئے اور نوکر کو کام کاج کے لئے گھر میں رکھا۔ نوکر گھر کا کام نہیں کرتا بھی بلکہ صرف اپنی ماہانہ اجرت کے لئے کام کرتا رہا۔ عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی کو یہ محسوس ہوا کہ نوکر بھی گھر نہیں سنبھال سکا۔ لیکن کیا کریں دونوں نے شوکت حسین کی غیر حاضری محسوس کی اب دونوں نے یہ سوچا کہ کتنے سال تک شوکت حسین کو اس ملک سے دور رکھیں کیوں نہ شوکت حسین کی شادی کریں۔ اب دونوں نے اپنے اپنے رشتے داروں سے کہا کہ کسی کو اگر اپنی لڑکی کی شادی شوکت سے کرنے میں رضا مند ہے تو ہم رشتہ منظور کر کے شادی کی تاریخ مقرر کر دیتے ہیں۔ یہ سن کر تمام رشتہ داروں نے ایک لڑکی کی رضامندی عبدالرحمٰن کو اور اس کی گھر والی کو سنا کر دونوں کو رضا مند کیا، جب اس شادی کا سلسلہ شروع ہوا تو عبدالرحمٰن نے شوکت حسین کو سنایا کہ ایک لڑکی آپ کی شادی کے لئے رضا مند ہوئی ہے اور اب آپ قبول کریں تو ہم شادی کی تاریخ مقرر کریں۔ یہ سن کر شوکت حسین نے عبدالرحمٰن کو بتایا کہ دور ملک سے ایسی لڑکی کہاں اس ملک میں آسکتی ہے اور اس لڑکی کو اس ملک کے ماحول کے بارے میں کوئی واقفیت بھی نہیں ہوگی اور اس ملک کے لوگوں کی زبان بھی نہیں جانتی ہے اسی لئے میں دو تین سال کے بعد شادی کے لئے رضا مند ہو جاؤں گا جب میں اپنے ملک کو پھر واپس لوٹ کر اپنی شادی

کا چکر چلاؤں گا یہ سن کر عبدالرحمٰن نے لڑکی والوں کو شوکت حسین کی باتیں سنائی، لڑکی والے کہنے لگے کہ ہماری لڑکی کو بھی اس ملک کی زبان آتی ہے۔ وہ کافی پڑھی لکھی ہے یہ نہ سمجھنا لڑکی ناخواندہ ہے وہ آج کل کے ماحول کے مطابق رہتی ہے لیکن عبدالرحمٰن نے یہ سن کر بتایا کہ جب شوکت حسین کی رضامندی نہیں ہے تو میں اس چکر میں نہیں پھنسنے والا ہوں۔ ان سب دلیلوں پر عبدالرحمٰن نے اپنی بیوی کے ساتھ صلاح ومشورہ کے بعد دونوں اس حد تک پہنچے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ شوکت حسین نے وہاں کسی لڑکی کے ساتھ شادی کا چکر نہیں چلایا ہو۔ حتی کہ شوکت حسین کی عمر شادی کے لائق ہے لیکن شادی کے لئے رضامند نہیں۔ ہمیں ایسی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دینی ہے کیونکہ اگر ہم زور زبردستی سے شادی کریں تو پھر کئی پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑے گا اس وقت ہم دونوں مختلف بیماریوں کا سامنا کر رہے ہیں اور شادی کے بعد بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی لئے ہم بالکل خاموش رہیں گے اور شوکت حسین کی رضامندی کے بعد ہی کسی لڑکی والے کو ہاں یا نا کہہ سکتے ہیں اور ہم اس شادی کے بارے میں بھی شوکت حسین کے شک وشبہ پر نظر ثانی کریں گے، یہ سن کر عبدالرحمٰن نے بات کو اختتام تک پہنچایا اور کہنے لگا ''امتحاں اور بھی باقی ہو'' مطلب ہمیں شوکت حسین کے رشتے میں کئی مرحلوں پر سوچ کر ہی شادی کرنی ہے اسی لئے غیر ملک میں رہ کر شک وشبہ کے آثار سوچنے اور دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہی سچ ہے کہ ہمیں شوکت حسین کے چال چلن پر گہری سوچ کر کے ہی امتحان کی گھڑی کو دیکھنا ہے اسی لئے ہم یہی کہیں گے کہ اس کا ''امتحاں اور بھی باقی ہو'' مطلب ہمیں شک وشبہ کو دیکھ کر ہی اظہار کرنا ہے اور ہم نے کئی طریقوں سے شوکت حسین کو پڑھایا اور پڑھائی کے بعد وہ اپنے ملک کے لئے بے وفا نکلا۔ اپنے ملک میں نہیں قیام کیا بلکہ دوسرے ملک میں قیام کیا اسی لئے ہمیں اپنے مکان میں یہی کہنا ہے کہ شوکت حسین کے ''امتحاں اور بھی باقی ہو''

''تو یہ بھی نہ سہی''

جب عبدالرحمٰن اوراس کی بیوی نے یہ کہہ کر بات اختتام تک پہنچائی کہ شوکت حسین کے بارے میں امتحان اور بھی باقی ہو یہ سن کر دوسرے دن دونوں نے یہ کہا کہ ہم نے کتنی جدوجہد اور کتنا سرمایہ اپنے بیٹے کی پڑھائی پر لگا کر اپنی زندگی برباد کی، لیکن شوکت حسین ہمارے ساتھ ہر روز ہمارے کمرے میں آتا ہے لیکن حقیقت میں نہیں بلکہ تصویروں اور موبائل کے ذریعہ۔ وہ بھی ہمیں موبائل اور تصویروں کے ذریعے دیکھ کر دل کو تسلی دیتا ہے لیکن ہمیں ان باتوں سے کوئی بھی محبت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ جب دونوںؓ نے ایسی باتیں کہیں تو عبدالرحمٰن نے یہ مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم بھی دوسرے ملک جانے کے لئے کاغذات مکمل کریں اور ہم دونوں شوکت حسین کے پاس جائیں اور وہاں دوتین سال ٹھہر کر اس کے ماحول سے یا اس کی حرکتوں سے واقف ہو کر یہ کہیں کہ ہمیں امتحان ترک کرنا ہے وہ یہ کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شوکت حسین کو کسی لڑکی کے ساتھ اس ملک میں کوئی رشتہ تو نہیں ہے اسی لئے شوکت حسین اس ملک میں کم تنخواہ پانے سے انکار کر کے زیادہ تنخواہ پانے کے لئے اسی ملک میں روزگار حاصل کرتا ہے یہ بات سن کر دونوں نے یہی کہا کہ ہم دونوں شوکت حسین کے پاس جائیں گے اور دوتین سال یا دوتین مہینے اس کے پاس ٹھہر کر سب معلومات حاصل کریں گے۔ کیونکہ ہمیں شوکت حسین کی زندگی کو برباد نہیں کرنا ہے۔ دونوں متفق ہو کر کہنے لگے کہ ہم جائیں گے لیکن معاشی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے ہم نہیں جاسکتے۔ اب معاشی حالت دیکھ کر دونوں سوچنے لگے کہ ہمارے معاشی حالت کس طرح ایسی بن سکتی ہے کہ ہم اُس ملک میں جا کر شوکت حسین کے پاس ٹھہر جائیں اور اس کا رجحان دیکھیں یا اس کے ہر لمحہ ہر گھڑی کا امتحان روبرو لے سکیں ورنہ شوکت حسین ہمارے پاس جسمانی نہیں، بلکہ تصویروں کے ذریعے اور موبائل کے ذریعہ گھر میں موجود رہتا ہے۔ یہ سن کر دونوں نے مشورہ کیا معاشی حالت ہونے کی وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جاسکتے ہیں، کیونکہ ہماری معاشی حالت اتنی اچھی نہیں کہ ہم اس ملک میں جاسکیں کیونکہ ہم ایسی باتیں کرتے ہیں دونوں نے کر کے کہا ''تو یہ بھی نہ سہی'' مطلب ان

باتوں کو مان لیا کہ یہ بھی صحیح نہیں ہے ہم اس ملک میں کمزور معاشی حالت کی وجہ سے نہیں جاسکتے ۔اسی لئے اس بات کو اس عنوان سے ترک کر کے چپ چاپ اور کچھ سوچیں گے ''تو یہ بھی نہ سہی''

''عشرت صحبت خوباں ہی''

جب عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی نے یہ کہہ کر اپنی باتیں اختتام تک پہنچائی کہ وہ شوکت حسین کے پاس نہیں بیٹھ سکتے کیونکہ دوسرے ملک جانے کے لئے معاشی حالت کمزور ہیں اس کمزوری کے وجہ سے وہ نہیں جاسکتے ہیں ۔ یہ سوچتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس ایسے وسائل نہیں کہ ہم عیش وعشرت کے سامان سے مطمئن ہیں ،لیکن جب دونوں سوچنے لگے کہ ہم ایسی محنت کریں ہم اپنے فرزند شوکت حسین کو یہ نہیں کہیں گے کہ ماہانہ تنخواہ میں کچھ ادائیگی ہمارے لئے بھی بھیجنا اور اس ادائیگی کی رقم پر ہم عیش وعشرت نہیں کریں گے اور وہ جمع کر کے ہم اُس ملک میں جائیں گے ۔ یہ سوچ کر عبدالرحمٰن کی بیوی نے مان لیا ہم گھر میں اس وقت ... وعشرت کے سامان سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں ہمیں ایسی ایسی چیزیں استعمال کرنی چاہئے جس سے کہ ماہانہ آمدنی جمع ہوجائے اور اتنی رقم حاصل کرسکیں یا جمع ہوجائے جس رقم سے ہم دوسرے ملک شوکت حسین کے پاس جاسکیں ۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن نے بھی اپنی بیوی کی بات پر اقرار کیا۔اقرار کرتے ہوئے وہ یہ کہنے لگا کہ اس طریقے سے چند مہینوں کے لئے اپنے گھر میں گزارہ کرنا پڑے گا جس سے کہ ہمارے معاشی حالت ایسے بن جائیں اور ہم شوکت حسین کے ملک جاکر اسے خود دیکھیں وہ کس طرح کا کام انجام دیتا ہے۔اور ماہانہ تنخواہ کیسے اور کس محنت سے کماتا ہے ۔جبکہ شوکت حسین کی ماہانہ تنخواہ میں کچھ رقم موصول ہوتی ہے وہ ہماری مختلف بیماریوں کے علاج پر خرچ ہوتی ہے۔ان دونوں نے اب مان لیا کہ ہم گھر کے اخراجات ایسے کرئیں گے جس سے کہ ہم ایسی مالی حالت بنائیں کہ ہم شوکت حسین کے ملک جائیں اور خود شوکت حسین کا رجحان دیکھیں ۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن نے اپنی بیوی کو کہا کہ

''عشرت صحبت خوباں ہی'' مطلب عشرت کرنی ہے کسی حد تک جس سے کہ مالی حالت اتنی خراب نہ ہو جائے جتنی کرتے ہیں۔ ہمیں دو روٹیاں کھانی ہیں لیکن ایک ہی روٹی سے گزارہ کرنا ہے۔ ہمیں دو وقت دودھ پینے کے بجائے ایک ہی وقت دودھ پینا ہے۔ اسی لئے میں یہ بات اس بات کے آخر میں پہنچتا ہوں ''عشرت صحبت خوباں ہی''۔ مطلب دونوں نے عیش وعشرت کے اخراجات کم کر کے اپنی رقم کو بچانے کے طریقے اختیار کئے۔ اسی عنوان کے تحت اپنی رقم کو بچایا اور بچا بچا کر یہی کہنے لگے کہ ''عشرت صحبت خوباں ہی''

''غنیمت سمجھو''

عبدالرحمٰن اور ان کی بیوی نے اسی طریقے سے گھر کا گزارہ کیا۔ ایک دن ہمسایہ ان کے پاس آیا۔ آ کر ان کا کھانا پینا اور رہن سہن دیکھا۔ دیکھ کر اس کو ترس آنے لگا۔ اس نے ان دونوں کو کہا آپ صبح اور شام دودھ پیتے تھے۔ لیکن اب آپ ایک ہی وقت دودھ پیتے ہو۔ یہ دیکھ کر اس نے دونوں کو یہ کہا کہ آپ اس وقت بوڑھاپے کی زندگی بسر کر رہے ہو اس سے آپ کی صحت برباد ہو سکتی ہے کیوں اتنا پیسہ بچاتے ہو۔ دونوں کی حالت ایسی دیکھ کر اور یہ بتا کر اس ہمسایہ کو ترس آنے لگا اس نے اپنے گھر سے میاں بیوی کو چھ مہینے تک ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ دونوں کو ہمسایہ کے گھر سے کھانے پینے کے سہولیت میسر ہوئی۔ ایسی حالت ان کی گھر میں دیکھنے کو ملی۔ محسوس ہوا کہ شاید اپنے گھر کو انہوں نے سونے کے لئے رکھا ہے اور کھانے پینے کے لئے دوسرے کا ساتھ ملتا ہے۔ جب ایک دن ہمسایہ نے ان کو روٹی بھیجی تو کھا کر دونوں کہنے لگے ''غنیمت سمجھو'' مطلب دونوں یہ کہنے لگے کہ ہم نے پیسے بہت جمع کئے اور جمع کرنے کے بعد اب ہم دوسرے ملک میں بھی جا سکتے ہیں اور اپنے لڑکے کو روبرو بھی دیکھ سکتے ہیں اتنی مالی حالت اچھی ہونے کے بعد ہمسایہ نے کھانا پینا بھیجنا بند کیا اور اس ہمسایہ کو یہ محسوس ہوا کہ یہ لوگ پیسہ جمع کرتے ہیں اور میں بے وقوف بن کر ان کو کھانے پینے کی مدد دیتا ہوں۔ اس لئے یہ مدد ان کی مالی حالت کے لئے اچھی اور مجھے ثواب کوئی نہیں ملا۔ یہ کہہ کر

اس نے اپنے نوکر کو یہ حکم دیا کہ جن کو آپ کھانا پینا یہاں سے بھیجتے ہوان کو اب نہیں بھیجنا۔ جب عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی کو کھانا میسر ہی نہیں ہوا تو وہ انتظار کرتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ ''غنیمت سمجھو''۔ مطلب اگر آج ہمیں ہمسایہ کے ذریعے کھانا پینا میسر نہیں ہوا لیکن چھ مہینے تک ہمیں کھانا پینا میسر ہوا ہمیں اپنی مالی حالت بہت ہی بہترین پائی۔ اب ہماری مالی حالت اتنی ہے کہ ہم اپنے لڑکے پر دوسرے ملک جا کر پیسہ خرچ کر سکتے ہیں جب عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی نے گھر میں کھانا بنایا اور کھانا کھاتے ہوئے ہمسایہ کے کھانے پینے کی یاد آئی تو دونوں کہنے لگے ''غنیمت سمجھو''۔ مطلب چھ مہینے تک ہمیں ہمسایہ کی طرف سے کھانا پینا میسر ہوا اسی لئے ہمیشہ اس کھانے پینے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ **''غنیمت سمجھو''**

''نہ ہوئی غالب اگر''

جب عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی کی حالت بہت ہی بہترین ہوگئی اور دونوں کو محسوس ہوا کہ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہم دوسرے ملک بھی جا سکتے ہیں اور دوسرے کاموں پر بھی اس دولت کو خرچ کر سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر دونوں نے غیر ملک جانے کے لئے کاغذات بنائے اور دونوں اب دوسرے ملک جانے کے لئے تیار ہوئے اور حکومت کی طرف سے بھی رضا مندی کا حکم نامہ ملا۔ جب دونوں نے تیاری کی لیکن دونوں یہ کہنے لگے کہ ہمیں اسی لئے غیر ملک جانا پڑا تا کہ ہم اپنے لڑکے شوکت حسین کا چال چلن دیکھیں۔ یہ کہہ کر عبدالرحمٰن اپنے آپ پر ہنسنے لگا یہ دیکھ کر عبدالرحمٰن کی بیوی کہنے لگی آپ کیوں ہنستے ہو۔ اس کا جواب عبدالرحمٰن نے دیا ہمیں لڑکے کا چال چلن دیکھنا ہے اس کے بعد اس کی شادی کا چکر چلانا ہے لیکن ہمیں معلوم نہیں وہ اس ملک کا غالب تو نہیں بنا ہوگا۔ غالب نے ایک ساتھ پاک محبت کے طریقے پر معشوق سے محبت کی۔ آج تک کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ محبوبہ کون تھی مطلب سیدھی سادی عورت تھی یا گانے بجانے والی تھی یا پھر گھریلو تھی۔ اب تک ادب نواز دوستوں کو معلوم نہیں لیکن ان کی غزلوں سے اور ان کے مقطع سے ہمیں معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کس قسم کے معشوق

سے محبت کی۔ جس سے کہ وہ ایک مشہور شاعر دُنیا بھر کا غزل گو تسلیم کیا گیا۔ اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے شوکت حسین میں بھی ایسا طریقہ اُس ملک میں نہ ہو اور وہ وہاں پر غالب کے انداز میں ہو۔ میں اب خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتا ہوں کہ ہم دونوں کو اس ملک جا کر شوکت حسین کے پاس ٹھہر کر ہر ایک قسم کی معلومات میسر ہونے چاہئے اور غالب جیسی دلیل کی صورت نہیں دیکھنی چاہئے یہ سن کر عبدالرحمٰن کی گھر والی نے شوہر کی بات کو تسلیم کیا اور اُس ملک جانے کے لئے تیار ہو کر یہی کہنا ''نہ ہوئی غالب اگر''۔ مطلب غالب کی طرح عشق نہیں کیا ہوگا جذبہ عشق اپنے ملک کے ساتھ ہی ہونا چاہئے۔ جس سے کہ اپنے ملک کی ہی لڑکی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے۔ خواہ وہ دونوں اسی ملک میں روزگار کے دوران قیام کریں لیکن اپنی بیوی ملک کی ہونی چاہئے۔ اسی لئے دونوں نے غیر ملک جاتے ہوئے یہی کہا کہ ''نہ ہوئی غالب اگر''

''عمر طبیعی نہ سہی''

دونوں نے جہاز میں بیٹھ کر مشورہ کیا کہ اب ہمیں شوکت حسین کے پاس جا کر اس سے یہ کہنا ہے کہ واپس اپنے گھر آؤ۔ ہمیں کم اجرت کی تنخواہ ہی منظور ہے لیکن غیر ملک کی زیادہ اجرت منظور نہیں۔ اپنے ملک میں ہی اپنے نئے تجربے اور کاروبار کو دکھا کر ملک کی ترقی اور بہبودی اچھی ہوگی۔ ملک سے وفاداری کے لئے ہم دونوں شوکت حسین کو یہی کہیں گے کہ ہماری عمر کے تقاضے کے مطابق آپ اپنے ملک کو اپنی اجرت سے ہی، اپنی محنت سے ہی وفاداری دکھاؤ اور ہم بھی اپنے ملک کی اجرت سے ہی صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہیں گے کہ شوکت حسین آپ نے اپنے ملک میں ہی تعلیم و تربیت حاصل کی ہے۔ کیا اپنے ملک میں تربیت حاصل کرنے کے بعد آپ اپنی تربیت غیر ملک میں آزماؤ گے کیا وہ آپ سے تجربات حاصل کر کے ہمارے ملک کے لئے بے وفائی نہیں دکھا سکتے۔ حب الوطنی کا تصور یاد رکھ کر اور اعتبار رکھ کر اپنے ملک واپس آ کر اپنی سبھی تربیت اپنے ملک سے ہی وابستہ کرو۔

دونوں نے ایسی باتیں کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہم شوکت حسین کو یہ بھی کہیں گے کہ جب آپ اپنے ملک میں نہیں آؤ گے تو ہمارے مرتے وقت کون ہمارے پاس اپنا ہوگا۔ ہمیں کون بیماری کے وقت دیکھ بھال کریگا۔ ہماری عمر کے تقاضے کے مطابق اپنے ملک میں رہ کر ہماری دیکھ بھال کرنا تم پر لازم ہے۔ یہ کہہ کر دونوں نے مشورہ کیا کہ ہم شوکت حسین کو یہ کہیں گے کہ ہماری صحت پرانی صحت نہیں اب ہم تندرست بھی نہیں ہیں۔ تندرستی نہ ہونے کی وجہ سے ہم دونوں نے یہ سوچا کہ اب ہم آپ کا چہرہ اسی ملک میں دیکھیں گے اور معلوم نہیں کہ ہم کب اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ دونوں نے بھروسہ دلایا کہ یہ سن کر شوکت حسین کو ماں باپ پر ترس آسکتا ہے جس سے کہ وہ ہمارے ساتھ ہی اپنے ملک کی واپسی پر رضامند ہو جائے گا جب ہوائی جہاز کے ذریعہ شوکت حسین کے ملک دونوں پہنچے تو شوکت حسین نے ان کی عزت افزائی کی، لیکن اس کے باوجود دونوں نے شوکت حسین کو ان باتوں سے واقف کرایا۔ جن باتوں پر دونوں نے ہوائی جہاز میں مشورہ کیا تھا کہ ہم انہیں ایسی باتوں پر راضی کریں گے جن سے کہ وہ اپنے ملک واپس آنے کے لئے رضامند ہو جائے۔ یہ سن کر شوکت حسین نے رضامندی کا اظہار کیا اور کہا اپنے ماں باپ کے لئے اولاد کو کچھ بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں کی صحت اچھی نہیں ہے۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے مجھے اپنے ملک میں ہی اپنا دھندہ شروع کرنا ہے اور اپنے ملک میں ہی اپنے دھندے کے کارنامے دکھا کر ملک کے تئیں حب الوطنی کا جوش اپنے میں بھر کر ملک کا وفادار بننا ہے۔ یہ بات کہہ کر شوکت حسین نے آخر میں دونوں سے رضامندی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں پھر وہیں روزگار حاصل کروں گا خواہ ماہانہ اجرت کم ہی ملے لیکن ماں باپ اور اپنے ملک کی خدمت کے تئیں اپنا کام کروں گا۔ اسی لئے ''عمر طبیعی نہ سہی''۔ مطلب میں عمر کے تقاضے کے مطابق اس ملک میں کام کرسکتا ہوں لیکن ملک سے وفاداری کے لئے اور ملک سے حب الوطنی کے لئے میں ماہانہ اجرت کم تسلیم کر کے اور اپنے ماں باپ کی دیکھ بھال کے لئے واپس آؤں گا۔ اسی لئے میں ان لفظوں سے ''عمر طبیعی

نہ سہی" اس دلیل کو اختتام تک پہنچا کر اپنے ملک واپس جاتا ہوں۔
اگر میں اس دلیل کو افسانے کے طرز پر یا کہانی کے طور طریقے سے لکھوں تو میں یہ لکھوں "عمر طبیعی نہ سہی" یا میں یہ کہوں "وفادار اولاد"۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیں دار نے شفا پائی

غالب نے اس غزل کے مطلع اور مقطع میں یہ بیان کیا ہے کہ میں نے بہار دیکھی ہے مطلب خوشی کے سامان میسر ہوئے تھے اور پھر وہ سامان چھین لئے گئے۔ اب پھر وہ سامان میسر ہوئے جب سامان چھین لئے گئے اس وقت بہار کا رجحان ہی مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ مطلب غالب ہمیشہ ایسی ایسی باتیں اپنے شعر و شاعری میں بتا رہا ہے جس سے کہ وہ اپنی دکھ درد کی باتیں اپنے شعروں میں اپنے مطلع اور مقطع میں مختلف غزلوں میں بیان کرتا ہے پڑھنے والا بھی مطمئن ہوتا ہے لیکن تمام غزلوں کے شعروں میں خواہ وہ مطلع ہو مقطع ہو یا شعر ہو غالب نے عموماً کسی رجحان پر ہی بیان بازی کی ہے۔ میں مانتا ہوں جب اس بیان بازی کو ہم بحث و مباحثہ میں لاتے ہیں تو ہمیں ضرور اس بیان بازی کو قائدے دائرے کے تحت لانا ہے مطلب ہمیں یہ کہنا ہے کہ غزل کا مطلب عورتوں کے ساتھ باتیں کرنا۔ اسی لئے اگر میں ان باتوں کو مبرا کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے کسی تاریخ پر یہ مطلع اور مقطع اس غزل میں بیان کیا ہے۔ یہ غالب نے کسی خاص عورت کے یا معشوق کے بارے میں نہیں بیان کیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں۔

غالب نے پہلے لفظ 'بہار' اس کے بعد 'مہر و مہ' اس کے بعد 'شاہ دیں دار' ان لفظوں کو پڑھ کر پڑھنے والا خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ غزل نہیں ہے بلکہ یہ کسی کے بارے میں بیان یا تحریر

غالب نے کیا ہے۔ مطلب مطلع اور مقطع کو آپ پڑھ کر یہ کہیں گے کہ کوئی بادشاہ یا نواب ان دِنوں کسی بیماری میں مبتلا ہوا ہوگا اور اس کی حالت ایسی دیکھنی میں آئی ہوگی جس سے کہ تمام لوگوں نے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ یہ بیماری سے ٹھیک نہیں ہوسکتا ہے۔

ان دِنوں ایسے حکیم بھی اُبھرے ہیں جنہوں نے مردوں کو زندہ کر کے لوگوں کو حیران کیا ہے۔ اسی طرح سے جب بادشاہ کی حالت خراب ہوئی ہوگی تو کسی خاص حکیم نے ایسا علاج کیا ہوگا جس سے کہ بادشاہ یا نواب صحت یاب ہوگیا ہوگا۔ یہ دیکھ کر غالب نے ان شعروں کو لکھ کر بتایا۔

پہلے آپ یہ پڑھئے کہ خود غالب کہتا ہے کہ بہار آئی، مطلب بادشاہ ایسا بیمار رہا ہے کہ لوگوں کو امید نہیں تھی کہ وہ صحت یاب ہوسکتا ہے۔ اب صحتُ یاب ہوا ہے، اسی لئے غالب فرمانے لگے کہ اب پھر بہار آرہی ہے۔ مطلب بادشاہ صحت یاب ہو رہا ہے۔ جس کی امید لوگوں میں نہیں تھی اسی لئے مقطع کے آخر میں بیان کرتا ہے 'شاہ دیں دار نے شفا پائی' مطلب بیماری کی حالت میں نہیں ہے یہ بھی اندازہ ہے کہ بادشاہ اس دنیا میں رحمت حق ہوسکتا ہے۔ اسی لئے اب یہ پھر زندہ ہوا اور زندگی حکیموں نے بادشاہ کو دی جس سے حکیموں کا علاج کامیاب بیماری کو ٹھیک کرنے پر ثابت ہوا۔ تبھی تو غالب کہہ رہا ہے کہ اس کی بیماری پر لوگ افسوس کرنے لگے، افسوس کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں 'مہر و مہ کو' اگر وہ دیکھتے تھے لیکن دیکھنے کے وقت اپنی آنکھوں کو بند کرتے تھے اور خدا سے رجوع ہو کر یہ کہتے ہیں کہ بادشاہ صحیح سلامت پھر صحت یاب ہوجائے۔

اب رہا سوال اس مطلع اور مقطع میں ہم کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بادشاہ پر یا کسی نواب پر بھی غالب نے شعر لکھیں ہیں۔ وہ میں اس دلیل سے بیان کرتا ہوں کہ مطلع میں غالب نے یہ لکھا ہے ''پھر اس انداز سے بہار آئی'' مطلب یہ کہا ہے کہ بادشاہ بہت ہی بہترین لوگوں کے لئے رہا ہے اس کا نظام بہت ہی بہتر ہے اسی لئے جب بادشاہ صحت یاب ہوا تو ابتداء میں ہی

مطلع میں یہ لکھتا ہے کہ اب پھر وہی نظام بحال ہونے لگا جس نظام پر لوگوں کو رونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ مطلب اب بادشاہ پھر حکومت کے دروازے پر حاضری دے کر لوگوں کے لئے بھلائی کا کام انجام دیے گا اسی لئے لوگ اس کے نظام پر خوش ہوئے تھے اور جب یہ معلوم ہوا کہ بیمار ہے تو لوگ 'مہر ومہ' کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو بند کر کے یہ کہہ رہے تھے کہ ایسی روشنی اس وقت خوش نہیں محسوس ہوتی ہے کیونکہ ملک کا بادشاہ بیمار ہے۔ اسی لئے ہم سب یہ کہتے ہیں کہ کب وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ جب صحت یابی کے مناظر دیکھنے میں آئے تو غالب نے اسی لئے یہی کہا کہ ''پھر اس انداز سے بہار آئی'' مطلب پہلے جس طرح سے بادشاہ سرکاری کام انجام دیتا رہا اب اسی طریقے سے بادشاہ کام انجام دے گا اسی لئے غالب نے مطلع میں ہی اس بات کا اشارہ لکھا ہے۔

اگر میں غالب کے اس مطلع اور مقطع پر پھر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غزل لکھ کر یہ دلیل بیان کی ہے اسی لئے یہ تاریخی دور کے بارے میں مطلع اور مقطع میں اپنے تاثرات یا لوگوں کے تاثرات غزل کے طور طریقے سے بیان کئے ہیں۔ موجودہ دور کے ادبی محقق یہ بتا رہے ہیں کہ آج کل ہی اُردو شاعری میں غزل دوسرے انداز میں بیان کرتے ہیں اور میں ان سے اتفاق رکھتا ہوں لیکن ساتھ یہ بھی بیان کرتا ہوں کہ غالب کے اس مطلع اور مقطع سے ہمیں سبق سیکھنا چاہئے کہ غالب نے پہلے ہی اس طریقے کی غزلیں لکھیں جن سے کہ ہم بھی کہیں گے کہ آج کل کے رجحان کے دائرے میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں یہ نہیں بتانا ہے کہ آج کے دور میں ہی اس طریقے کی غزل اردو شاعر لکھتے ہیں، یہ بیان بازی پہلے سے ہی شاعروں میں موجود رہی ہے اور اپنے فن کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا ہے۔

غزل اور مقطع میں کسی بھی تبدیلی کو خارج از مکان سمجھ کر اور غزل کا وزن مفہوم بالکل سیدھا سادہ پڑھنے میں آتا ہے شاعر نے فارسی، عربی کا استعمال اس مطلع اور مقطع میں نہیں لکھا ہے بلکہ تاریخی منظر سے واقفیت دلائی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس دور میں کس قسم کے بادشاہ

حکومت کرتے رہے جن سے لوگ بہت ہی خوش نظر آتے تھے اور بادشاہ کی صحت یابی کے لئے کیا کچھ کہا کرتے رہے۔ جیسے کہ لوگ 'مہر و مہ' کو نہیں دیکھنا چاہتے کیونکہ ان میں فکر مندی بادشاہ کے لئے رہی اور آنکھیں بند کر کے بادشاہ کی صحت یابی کے لئے رجوع ہو کر 'مہر و مہ' کی روشنی کو خوش اسلوبی سے نہیں دیکھتے رہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

غزل کے ادبی دائرے میں یہ کہوں گا کہ غزل محبوب اور معشوق کی تفصیل کے بیان بازی میں پڑھتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غزل کا مفہوم اس دائرے میں لکھنا چاہئے اسی لئے۔

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق میں نے بہار دیکھی، میں بہار میں بہت ہی خوش رہا لیکن اب قدرت نے اس بہار کو چھینا، جس سے مجھے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سامنا کرتے ہوئے بہار کی جانب پھر وہی مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اے معشوق یہی سمجھنا کہ دنیا میں کبھی بہار بھی دیکھتے ہیں کبھی خزاں بھی دیکھتے ہیں جس طرح ہم زندگی میں بہار دیکھتے ہیں اس کے بعد خزاں دیکھتے ہیں چار موسموں کا رجحان مرتے دم تک دیکھتے ہیں۔ اسی طرح پھر بہار دیکھتے ہیں۔ وہیں بہار جب مجھے پھر محسوس ہونے لگی میں نے سوچا اے معشوق اسی انداز میں آج میں آفتاب اور چاند کو دیکھتا ہوں جس انداز میں میں نے بہار کے دوران دیکھے تبھی تو اے معشوق جب میری آپ سے ملاقات ہو جائے گی یا آپ مجھے کسی طرح سے مل جاؤ گی میں اس وقت یہی کہوں گا کہ بہار گئی تھی پھر واپس آئی۔ یہ بھی میں کہہ رہا ہوں کہ بہار چھینی جاتی ہے لیکن کافی جدوجہد کے بعد پھر بہار واپس آتی ہے۔ اسی لئے اے معشوق اگر آپ میری پاک محبت پر بھروسہ رکھتے ہو میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ کافی جدوجہد کے بعد اس بہار کو پھر واپس لاؤ۔ جس کے تناؤ سے حالات دیکھنے میں نہیں آئے۔

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیں دار نے شفا پائی

مطلع کو ہمیشہ غالب مقطع کے ساتھ جوڑتا ہے۔ مقطع کا واسطہ ہر ایک غزل میں غالب نے مطلع کی سوچ پر ہی لکھا ہے جیسے کہ غالب فرما رہے ہیں کہ مجھ سے بہار چھینی گئی اب پھر بہار میرے پاس آنے لگی بہار کو دیکھ کر مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہی چاند اور سورج دیکھتا ہوں جس چاند سورج کو میں نے بہار کے دوران دیکھا تھا اسی انداز کا ماحول دیکھ کر میں معشوق سے کہنا چاہتا ہوں کہ میں بہت ہی خوش ہوں دنیا بھر کے لوگ اتنے خوش نہیں ہوں گے جتنا میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ ایسی خوشی محسوس کرتا ہوں جس طرح ایک آدمی کسی بادشاہ سے ملاقات کر کے خوش ہوتا ہے۔ مطلب اسی لئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ بادشاہ کبھی بھی کسی آدمی سے بات نہیں کرتا۔ جب اس سے بادشاہ روبرو ملتا ہے تو وہ اتنا خوش دیکھنے میں آتا ہے اگر وہ بادشاہ سے ملنے سے پہلے کسی بیماری میں مبتلا ہوا ہوگا تو اس کو بادشاہ سے ملاقات کرنے پر بیماری کا درد دور ہو جاتا ہے۔ مطلب بادشاہ کو دیکھ کر اتنی خوشی آدمی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح سے اے معشوق جب میں اس دنیا میں غم اور فکروں میں مبتلا ہوں میں آپ کے ساتھ بہار کی طرح ہمیشہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں آپ کے ساتھ بہار کے انداز میں اس دنیا میں دیکھوں یا آپ مجھے دیکھو گے تو مجھے اتنی خوشی محسوس ہوگی جس طرح ایک بادشاہ کسی آدمی سے راستے میں ملاقات کرتا ہے۔ اسی طرح سے مجھے آپ کے ساتھ مل کر ایسی ہی خوشی کے مناظر دیکھنے میں آئیں گے۔

مقطع کے حساب سے یا قلمی نام کے دائرے میں مقطع کا تذکرہ لکھوں تو یہ کہوں گا غالب کہتے ہیں جب مجھے معشوق سے ملاقات ہوگی اور میں موسم بہار کو یاد کر کے ملاقات کو بہار ہی کے مناظر میں سمجھوں گا جب میں ایسے مناظر دیکھوں میں یہ سوچوں گا مجھے بہت مدت سے معشوق سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اب ملاقات ہونے کے بعد میں اپنی پاک محبت میں کامیاب ہوا اور میں فتحیاب رہا۔ اس فتحیابی سے میں اگر جدائی کے دوران کسی بیماری میں مبتلا بھی ہوا

ہوں لیکن ملاقات سے میری بیماری ختم ہوئی اور شفایابی کی حالت میں اپنی زندگی کو پایا اسی لئے میں اس ملاقات یا معشوق کے روبرو رہونے سے بہار محسوس کر کے فتحیابی کے مناظر دیکھتا ہوں اور فتحیابی کا دن مناتا ہوں۔

پھر اس انداز سے + بہار آئی = پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے + مہر و مہ تماشائی = کہ ہوئے مہرومہ تماشائی
کیوں نہ دنیا کو + ہو خوشی غالب = کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیں دار نے+ شفا پائی = شاہ دیں دار نے شفا پائی

''پھر اس انداز سے''

ایک ملک میں عوامی راج نافذ العمل نہ ہوکر شخصی راجُ کا ماحول دیکھنے میں آیا۔ بادشاہ بہت سے وزیروں سے صلاح ومشورہ لینے کے بعد ملک کی ترقی کے لئے تجویز تحریر کرتا رہا۔ اس کے ساتھ بادشاہ نے ایسے دانشور بھی صلاح ومشورہ کے لئے منتخب کئے تھے۔ خود ان کو چنا لوگوں کی طرف سے وہ دانشور نہیں چنے گئے۔ ملک میں سیاسی اُتھل پتھل دیکھنے میں نہیں آئی لیکن بری معاشی حالت ہونے کے وجہ سے ملک میں لوگ آزادی کی لہر میں نہیں دیکھتے تھے، وہاں لوگوں کی غربت زیادہ دیکھنے میں آئی لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ شخصی راج کیا ہے اور عوام راج کیا ہے۔ پھر بہت مدت کے بعد لوگوں کو اس بات کی توجہ کئی ایسے رہنماؤں نے دلائی جس سے لوگوں میں عوامی راج کے لئے جذبہ بیدار ہوا۔ بہت جدوجہد کے بعد لوگوں نے عوامی راج نافذ العمل کرایا لیکن لوگوں نے احترام کے لئے بادشاہ کا بھی عوامی راج میں وجود برقرار رکھا۔ جب عوامی راج چلتا رہا تو لوگوں کو دوسری مشکلات اس میں دیکھنے میں آئیں وہ یہ کہ کئی لوگوں کو ایوان بالا اور ایوان پائین کا نمائندہ منتخب کرنے کے بعد جب ان کا منتخب ہونے کا وقت ختم ہوتا تھا تو اس کے بعد وہ اپنے رشتہ داروں اور اپنے لڑکے لڑکیوں کو عوام کے ذریعے عوامی نمائندگی کے لئے عوام سے چنواتے تھے۔ مطلب وہ بھی ایوان بالا ور ایوان

پائین کے چنے ہوئے منتخب اراکین سمجھے جاتے تھے۔اس سے عوام میں غم وغصہ کی لہر عوامی راج کی پیدا ہونے لگی۔تب لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کر کے یہ رائے دی کہ شخصی راج اور عوامی راج میں کوئی فرق نہیں۔اگر کسی رکن کو ایک بار منتخب عوام کے ذریعے کرتے ہیں تو اس کے بعد سالہا سال اپنے رشتہ داروں کو عوام کے ذریعہ منتخب کر کے رکنیت حاصل کرتے ہیں۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک بادشاہی اور شخصی راج کا چلن ہے۔تب لوگوں نے اور عوامی رہنماؤں نے اکثریت کی رائے کے مطابق ایسی سہولیت پر ممنون قرار دیا۔اب لوگ محسوس کرنے لگے کہ شخصی راج کا بالکل صفایا ہوا۔اب کوئی بھی ایوان بالا اور ایون پائین کا اراکین ایک ہی دفعہ منتخب کیا جاتا تھا اور ان کے رشتہ دار اور گھر کے کنبوں کو اس سے مستحق قرار دیا جاتا رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ میں عوامی راج کے دور میں بہت سے سماجی فتنے ابھر آئے جن سے لوگ بہت ہی تنگ آگئے اگر چہ لوگ عوامی نمائندگی کے اراکین عوام کے ذریعہ ہی مطلب خود انتخاب کراتے رہے لیکن سماجی بدعتیں اور دوسرے کئی مسئلے پورے طریقے سے نیست ونابود نہیں ہوئے۔ایسی مشکلات پر لوگ اپنا ردعمل ظاہر کر کے بتا رہے ہیں کہ شخصی راج اور عوامی راج میں بھی ایسا ہی ناسور دیکھنے میں آیا۔لوگ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اگر چہ عوامی نمائندوں کے ذریعہ ان بدعتوں کے خلاف بہت سے قانون نافذ العمل کرائے گئے لیکن کچھ بھی اثر عوام میں دیکھنے میں نہیں آیا۔جب لوگوں کو سماجی بدعتوں کا سامنا کرنا پڑا تو عوام میں ان بدعتوں کے خلاف ایک آدمی رام لال کو سماجی بدعتوں کے لئے ایک عوامی رہنما یک رائے سے منتخب کیا گیا۔جب لوگوں نے اسے چنا تو چننے کے بعد ایک جلسے عام میں تمام لوگوں نے اس عوامی جلسے میں رام لال کو رام لال نہیں کہا بلکہ اس سے یہ کہا کہ ہمیں یہ محسوس نہیں ہونا چاہئے کہ ہندو ہے یا مسلمان، سکھ ہے یا عیسائی، ہمیں انسانیت کے ناطے ہر ایک کو عزت فراہم کرنی ہے۔اسی لئے تمام مذاہب کے عقیدت مندان کو اس نام پر منتخب کرنے کے بعد پکاریں گے جس سے کہ ہم وقتاً فوقتاً کئی عوامی جلسوں میں بلا کر سماجی بدعتوں کے خلاف آواز

اٹھانے پر اس کا ساتھ دیں گے اسی لئے جب بھی ہم کسی وقت جلسے عام پر بلائیں گے تو ہم اس نام سے انہیں پکاریں گے وہ ہے ''پھر اس انداز سے''۔ مطلب جب ہم اس نام سے ہر ایک جلسے عام میں بلائیں گے تو سماجی بدعتوں کے وقت لوگ جلسے عام میں محسوس کریں گے کہ یہ اس سماجی بدعت کا تدارک کریں گے اور اپنی تفصیلات عوام کے سامنے رکھ کر ہمیں احساس دلائیں گے کہ سماج میں کیسی کیسی بدعتیں ختم ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے ہم جب سننے سے ہی محسوس کریں گے کہ اب سماجی بدعت نہیں رہے گی تو اس وقت ہم یہی کہیں گے کہ ''پھر اس انداز سے''۔ مطلب اسی کے صلاح و مشورہ سے کوئی بدعت دیکھنے میں نہیں آئی اسی لئے اس نام کو سب نے سب منظور کر کے کہہ رہے ہیں کہ **''پھر اس انداز سے''**

''بہار آئی''

جب لوگوں نے پھر انداز کو عوامی جلسے میں اور عوامی لہر کے طور طریقے سے منتخب کیا تو کئی جلسوں میں عوامی ''پھر انداز سے'' جلسے عام میں کسی کسی بدعت کے لئے تدارک لوگوں کے ذریعہ کرایا لیکن پھر بھی لوگوں میں احساس دیکھنے میں نہیں آیا مطلب بہت سے لوگ جہیز کی بدعت نہیں ختم کر سکے۔ بہت سے لوگوں میں نشہ آور کی بدعتیں ابھی بھی موجود ہیں۔ ان پر بھی کوئی تدارک عوام کو دیکھنے میں نہیں آیا۔ تب لوگوں نے مختلف جلسے عوام میں پھر اس انداز سے اپنی شکایتیں کیں لیکن بہت تدارک کیا گیا لیکن سدھرنے کے آثار دیکھنے میں نہیں آئے۔ جیسے کہ ایک لڑکی کو سسرال سے جہیز کے لین دین پر جلایا گیا، جب ایسی باتیں لوگوں نے سنیں تو بہت ہی غم و غصہ دیکھنے میں آیا۔ کسی وقت ایسا بھی ہوا کسی لڑکے نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اپنے دو بچوں کی زندگی برباد کی۔ کسی آدمی نے اپنی بیوی کے زیور چرا کر ان روپیوں سے نشہ آور چیزیں لا کر دن رات نشے میں اپنی زندگی بسر کرتے دیکھا گیا۔ اسی طرح سے سماج میں بہت سے ایسے واقعات دیکھنے میں آئے جن سے لوگ عوامی حکومت پر بھی غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے اور اس کے ساتھ ہی پھر انداز سے بھی ناراض ہونے لگے اب ایسا ماحول

دیکھنے میں آیا لوگ کئی عوامی جلسوں میں شرکت کر کے پھر انداز سے ناراض ہونے لگے، مطلب جہاں جہاں پر بھی پھر اس انداز سے عوامی جلسے میں شریک ہوتا تھا وہاں پر لوگوں کی حاضری کم دیکھنے میں آنے لگی۔ اسی دوران لوگوں نے دوسرے آدمی کو اس تدارک پر اپنا رہنما بنایا۔ اسے یہ کہہ کر عوام نے منتخب کیا کہ ایک ہی آدمی مطلب ''پھر اس انداز سے'' سماجی بدعت ختم نہیں کر سکتا ہے۔ اسی لئے ہم نے نئے آدمی کو منتخب کیا اور منتخب کر کے ہم اسے اس نام سے ہر ایک جلسے عام میں بلائیں گے اور تاکہ لوگوں کو بھی یہ احساس ہوگا کہ ''پھر اس انداز سے'' بھی کام لیا جاتا ہے ،تجویز لوگوں کو دیتا ہوں اسی طرح دوسرا بھی عوامی بدعتوں کیلئے کام انجام دے گا اسی لئے لوگوں نے اس ''بہار آئی'' کے نام سے جلسے عام میں پکارا۔ مطلب جب لوگوں نے پہلے ''پھر اس انداز سے'' منتخب کیا تو کوئی فرق سماجی بدعتوں میں نہیں آیا۔ پھر لوگوں نے یہ سوچا کہ واحد ایک آدمی ان بدعتوں کو ختم کرنے کیلئے کیا کر سکتا ہے۔ اسی لئے لوگوں نے دوسرے آدمی کو ان بدعتوں کیلئے رہنما بنایا۔ اور اس نام سے ''بہار آئی'' کے نام پر جلسے عام پر بلایا کرتے رہے۔

''کہ ہوئے''

جب سماج میں عوامی حکومت کے دوران بھی بدترین سے بدترین حالات دیکھنے میں آئے تو لوگوں کے ذریعے تعاون دینے کے باوجود بھی سماجی بدعتیں ختم نہیں ہوئیں جیسے ایک امیر آدمی نے اپنی لڑکی کی شادی میں جہیز سے وداع کیا۔ اسی طرح لڑکے والے نے یہ جہیز پا کر بہت ہی خوش ہوئے اور دوسرے لڑکے والے ۔۔نے ایسا ہی جہیز دینے کے لئے لڑکی والے کو مجبور کیا۔ اسی طرح سے ایسے واقعات ملک میں رونما ہوئے اور اب دونوں نے مطلب ''پھر اس انداز سے'' اور ''بہار آئی'' نے ایسی تجویز تشکیل دی کہ سماج میں سماجی بدعتوں کے لئے برے حالات رونما نہیں ہو سکتے وہ یہ کہ جب کوئی بھی لڑکے ولڑکی والا اپنے بچوں کی شادی کے لئے چکر چلائیں گے تو انہیں پہلے ان دو رہنماؤں کو اطلاع کرنی ہے۔ اگر اطلاع نہیں کی گئی تو انہیں سماجی فتویٰ دیا جائے گا جس کے تحت انہیں ملک سے جلائے وطن کیا جا سکتا

ہے۔اسی لئے شادی کرنے سے پہلے انہیں ہم دونوں کو اطلاع دینی ہے۔جب لوگوں نے سنا تو انہوں نے بہت ہی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتانے لگے کہ جب بھی کوئی قانون شکنی کرتے ہوئے پایا جائے گا اسے پکڑنے کے لئے ہمیں خفیہ طور پر ان دو رہنماؤں کو بتانا ہے۔ اوران دو رہنماؤں کو اطلاع دینے کے لئے لوگوں سے صرف یہ لفظ کہا ہے کہ ''کہ ہوئے'' نام سے اس شخص کا پتہ ہمیں دلانا مطلب جب وہ ٹیلیفون سے ان دونوں کو رابطہ قائم کریں گے تو لوگوں کو اس گھر کا نام پتہ بتا کر یہ کہنا ہے ''کہ ہوئے'' جب ٹیلیفون پر ''کہ ہوئے'' بتائیں گے تو ان دونوں رہنماؤں کو سمجھ آئے گا کہ سماجی بدعت کسی نے جہیز سے لڑکی یا لڑکے کو آراستہ کرایا ہے۔اسی وقت یہ دونوں عوام کے ساتھ اس گھر میں داخل ہو کر سب کچھ لوٹ کھسوٹ کرکے اوران کی سب جائیداد کو عوامی جائیداد کے نام سے پکارا جائیگا اوران کے کنبے کے بڑے افراد کو جلائے وطن کیا جائیگا۔اگرچہ حکومت کے سربراہ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے تو ہم خود اس آدمی کو اپنے ساتھ ہی سرحد پار بھیجیں گے یہ سن کر عوام خوش ہوئی اورانہوں نے ''کہ ہوئے'' کے لفظ کو یاد کیا جب بھی ایسی بدعت دیکھنے میں آتی تو لوگ ''پھر اس انداز سے''،''بہار آئی سے'' رابطہ قائم کرکے ''کہ ہوئے'' واقعات سے ٹیلیفون کے ذریعہ روشناس کراتے رہے۔اس طرح سے لوگوں میں پچاس فی صدی فرق محسوس ہونے لگا۔اب لوگ تبصرہ کرنے لگے کہ دونوں نے اچھا اور بہترین سماجی بدعت کے لئے کام انجام دیا۔اسی لئے لوگ کہنے لگے کہ ہمیں صرف سماجی بدعتوں کے خلاف ٹیلیفون پر یہ لفظ یاد رکھنا ہے ''کہ ہوئے''

''مہرومہ تماشائی''

جب ایک دن لوگوں نے دونوں کو اطلاع دی کہ کسی لڑکی کو ملک کے کسی گاؤں میں جہیز کے واقعہ پر سسرالوں نے جلایا ہے۔یہ بات سن کر دونوں نے اظہار افسوس کیا۔اب تدارک کرنے کے لئے کچھ بھی نہ کرسکے لیکن دونوں نے ان کے جرم کے لئے عدالت عالیہ کے دروازے کھٹکھٹائے ،عدالتِ عالیہ نے ان دونوں رہنماؤں کی اس بات پر اپنا ردعمل کا اظہار

کرتے ہوئے بتایا کہ آپ صحیح ہیں کہ لڑکی کو جہیز کے معاملے پر سسرال میں جلایا گیا ہے، لیکن ہمیں اس کا تحریری طور پر اور شہادت کے ذریعہ ایسے مجرمانہ حرکت پر ثبوت ہونے چاہئیں تب تک عدالتِ عالیہ کوئی بھی فیصلہ نہیں سنا سکتی ہے۔ دونوں ''پھر اس انداز سے اور بہار آئی'' پریشانی میں مبتلا ہوئے۔ اسی لئے عوامی جلسے میں اس واقعہ پر دونوں نے ایسی تفصیلات عوام کے سامنے پیش کیں۔ دونوں نے حکومتِ عالیہ کے اہلکاروں کو بتایا کہ آپ کی بھی ان تدبیروں پر کچھ نہ کچھ عمل درآمد کرنا لازمی ہے۔ آپ کے تئیں پولیس کا بھی انتظام ہونا لازمی ہے اگرچہ اس معاملے میں پولیس نے اپنا قانون استعمال کیا ہوتا تو ان مجرمانہ حرکتوں پر عدالتِ عالیہ کا کوئی نہ کوئی فیصلہ عوام کو مل ہی جاتا۔ اسی لئے حکومت کے اہلکاروں سے درخواست کرتے ہوئے اور عوامی جلسے میں عوام کے ذریعے یہ تجویز منظور کرائی کہ جہیز کے معاملے میں عوام کا ساتھ دے کر جہیز کی بدعت کو نیست و نابود کریں۔ جب سرکار نے عوامی جلسے کا مطالبہ سنا تو حکومت کے اہلکاروں نے ایک ایسی تنظیم پولیس کے ذریعے منتخب کی اور انہیں قانونی طور پر سماج میں پھیلی بدعتوں کے خلاف اور مجرمانہ حرکت کرنے پر قانون کے دائرے میں عمل درآمد کرنے کے لئے سرکاری تنظیم منتخب کی جسکا نام ''مہرومہ تماشائی'' رکھا گیا۔ مطلب سرکاری تنظیم کے ذریعہ ان کو ایسے واقعات پر ''مہرومہ تماشائی'' کی طرح یہ دیکھنا ہے کہ کس نے سماجی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے، خاص کر جہیز کے واقعہ پر، اب ''مہرومہ تماشائی'' کا دفتر بہت ہی مشہور ہونے لگا۔ عوام نے یہ سن کر تبصرہ دیا اس دفتر کا نام اسی لئے سرکاری اہلکاروں نے رکھا ہے تاکہ 'مہرومہ' کو دُولہا دُلہن کے طریقے سے سمجھ کر عوام کہتی ہے کہ سماج کے لئے اور سماج میں نیا گھر بسانے کیلئے نئے پودے ابھرے ہیں اسی لئے انہیں ''تماشائی'' کہہ کر دیکھنے والے جو بزرگی کے دور میں ہوتے ہیں وہ یہ کہہ کر ان دونوں کو پکارتے ہیں ''تماشائی'' اسی لئے سرکاری اہلکاروں نے، سماجی بدعتوں کو ختم کرنے کے لئے ''پھر اس انداز سے اور بہار آئی کہ' عوامی مطالبات پر ''مہرومہ تماشائی'' کا دفتر منتخب کیا جس سے عوامی تدارک ان بد

رسموں پر ان کے ذریعے ہو سکتا ہے اور ہم ایسی سرکاری تنظیم سے بہت ہی خوش ہیں۔ ہم بھی جب کبھی ایسی بری رسم دیکھیں گے تو ہم پہلے ''دکھ ہوئے'' سے رابطہ کر کے اور ''مہر دمہ تماشائی'' سے اس فطرت کو نیست و نابود کریں گے۔

''کیوں نہ دنیا کو''

جب سماجی بدعت کے تدارک پر ایسی تنظیم دوسرے ملکوں نے سنی کہ کسی ملک میں سماجی بدعتوں کے خلاف سرکاری اور غیر سرکاری تنظیم منتخب کی گئی ہے تو باقی ملکوں کو جوش آیا اور یہ جوش دیکھ کر انہیں جذبہ محسوس ہوا کہ کیوں نہ ہم بھی اپنے اپنے ملکوں میں اس قسم کی تنظیم کو تشکیل نو دے کر اپنے ملکوں کی بہبودی کے لئے مقرر کریں۔ جس سے کہ سماجی بدعتوں پر کوئی فرق دیکھنے میں آئے گا۔ مطلب دنیا کے تمام لوگوں نے اپنے ملک میں سماجی بدعتوں کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں منتخب کیں۔ پھر بھی چوری چھپے سماجی بدعتیں نیست و نابود نہ ہو سکیں۔ ایسا دیکھ کر بھی بہت سے لوگوں میں غم وغصہ ابھی موجود ہے۔ مطلب جب ایسی بدعتیں ختم نہیں ہوئیں تو سماجی بدعت کو ابھارنے والے کہنے لگے ہم شادی دھوم دھام سے رچائیں گے ہم لڑکی کو جہیز دیں گے اور ہم لڑکے سے جہیز مانگیں گے ہمیں ان قانونوں سے وابستگی نہیں رکھنی ہے۔ ہم امیر لوگ ہیں جب ایسے عناصر نے دنیا بھر میں سماجی بدعتوں کو ختم نہیں کیا تو ایسے لوگ یہ کہہ کر سماجی بدعتوں کا کام انجام دے کر یہ کہنے لگے ''کیوں نہ دنیا کو''۔ مطلب یہ کہہ کر وہ سماجی بدعتوں کو ابھارنے لگے اور کہنے لگے کہ دنیا کے تمام ملکوں میں اس کے خلاف آواز اٹھی۔ مختلف قانون تشکیل نو دیئے گئے لیکن کچھ بھی اثر امیر لوگوں میں دیکھنے میں نہیں آیا اور غریب لوگوں کے لئے ایسا جامہ پہننے کے لئے رکھا۔ مانتے ہیں غریب ایسے کرنے سے پرہیز کریں گے پھر بھی کبھی کبھی غریبی کے سطح پر امیری کا رجحان دیکھ کر ایسی فطرت کئی لوگوں کو اختیار کرنی پڑتی ہے۔ انہیں بھی اس وقت غریبی کا دور یاد نہیں آتا ہے اور سماجی بدعتوں کو اُجاگر کر کے لوگوں کو خاص کر غریبوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ یہ کہہ

کر تیس فی صدی لوگوں نے کہا کہ ''کیوں نہ دنیا کو'' ایسا کام مختلف ملکوں کے لوگ انجام نہیں دیتے۔ وہ سماجی بدعتوں کے خلاف ہیں اسی لئے ہم پھر اس بات پر ایسے واقعات کو الگ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ''کیوں نہ دنیا کو''

''ہوخوشی غالب''

جب دنیا بھر کے ماحول پر لوگوں نے سماجی بدعتوں کے خلاف تبصرہ کرنا شروع کیا تو وہ یہ کہنے لگے کہ دراصل امیر لوگ ہی اپنی مالی حالت اچھی ہونے کے ناطے بری رسم اپنے سماج میں رائج کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم انہیں یہ کہتے ہیں کہ وہی سماج کے ناسور ہیں جس ناسور کو آج تک کسی نے دبایا ہی نہیں اور اس ناسور کو دیکھ کر کوئی بھی درد محسوس نہیں کرتا۔ ہاں اس ناسور کا درد ستر فی صدی لوگ محسوس کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی اور سماج میں ایسا ناسور بڑھتا ہے۔ اسی لئے بہت سے دانشوروں نے یہ کہہ کر اس بات کو اختتام تک پہنچایا کہ ہم نے دنیا بھر میں اس ناسور کو ختم کرنے کے لئے جدو جہد کی لیکن اس جدو جہد کو امیر آدمی ختم نہیں کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم تنگ آ کر بہت تھک گئے، تھک کر ہم نشے میں مبتلا ہوئے۔ یہ نہ سمجھنا ہم شراب پیتے ہیں ہم شراب پی کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ غالب کو شراب پی کر خوشی محسوس ہوتی تھی ہم ان لوگوں میں نہیں۔ ہم اسی لئے یہ نہیں کہیں گے کہ ''ہوخوشی غالب'' کیوں کہ ہم سماجی بدعتوں کو ختم کرنے کے لئے تلے ہوئے ہیں۔ ہم بہت سے دانشور دنیا میں ان بدعتوں کو ختم کرنے کے لئے دنیا بھر کے مما لک میں آپسی سمجھوتہ کرانا چاہتے ہیں جس سے لوگوں میں سماجی بدعتیں نیست و نابود ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس پر جب بھی ہم سوچتے ہیں، ہم شراب پی کر نہیں کہتے ہیں کہ کسی شاعر کا نام لیکر ہم یہ کہیں کہ ''ہوخوشی غالب''، جس اردو شاعر کو غزل لکھ کر یا نشہ آور چیز استعمال کر کے خوشی محسوس ہوتی رہی یا اپنی سوچ لوگوں میں بانٹ کر خوشی محسوس ہوتی رہی ہم بھی اسی طرح اپنا سجھاؤ سماجی بدعت کے خلاف لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ہم خوشی محسوس کریں گے کہ جیسے کہ غالب نے خوشی محسوس کر کے شاعری کے

ذریعہ بتایا ہے۔اسی لئے ہم یہ کہہ کر اپنے جذبات کو مرکوز کر کے اس لفظ کا حوالہ دیتے ہیں کہ
''ہو خوشی غالب''
''شاہ دیں دار نے''

جب لوگوں نے سماجی بدعتوں کے لئے ایسی باتیں کہیں تو اپنی تجاویز دے کر لوگوں کے سامنے کہا کہ سماج میں سماجی بدعتوں کے خلاف ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے اگر چہ حکومت کے اراکین بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ہمیں حکومت کے اراکین کے بغیر اپنے انداز سے بھی سماجی بدعتوں کو نیست و نابود کرنا چاہئے۔ہمیں جہیز یا باقی دیگر معاملات جو کہ سماج کو برباد کراتے ہیں ان کے لئے یک وقت آواز اٹھانی ہے اور اس آواز کو تا ابد بلند رکھنا ہے۔اسی لئے ہم ایسے امیر لوگوں کے خلاف ہیں جو کہ جہیز دے کر اپنی لڑکی کو سسرال پہنچاتے ہیں یا لڑکے سے جہیز چھین کر اسے گھر سے نکالتے ہیں یہ تصور عوام میں نہیں ہونا چاہئے۔عوام میں ایک غریب گھرانہ کی لڑکی ہی امیر گھرانے میں پہنچنی چاہئے جس سے کہ ایک غریب گھرانہ امیر آدمی کے ذریعہ اچھی معاشی حالت میں گزر کرے۔اسی لئے ہم نے بادشاہوں کے خلاف یعنی شخصی راج کے خلاف آج تک آواز اٹھا رہے ہیں اور شخصی راج کو نیست و نابود کرا کے عوامی راج کا ردعمل مختلف ملکوں کے سامنے لا کر عوامی حکومتیں تشکیل نو دیں۔جب لوگوں نے ایسی باتیں لوگوں کو بتائیں اور اپنا اس جذبہ سے سماجی لوگوں کے خلاف آواز اٹھائی تو ایک بادشاہ جو کہ پہلے ملک کا بادشاہ ہوا کرتا تھا جسے اپنا تخت چھوڑنا پڑا۔مطلب عوامی حکومت کی لہر چلنے لگی اس سے بادشاہ کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔اب وہ محل سے عوام کی طرح سیر سپاٹے کے لئے باہر نکلتا ہے۔جب اس نے ایسی بدعتیں سماج میں دیکھیں اور کئی واردات سماجی بدعتوں کے خلاف ملک میں دیکھیں تو غم میں مبتلا ہوا۔اس سے محسوس ہوا کہ میں نے اپنے دور میں اپنی لڑکی کو بھی جہیز دیا جس سے میرا اثر بھی سماج میں برا ہوا۔اسی طرح کئی ایسے شخصوں نے شخصی راج میں ایسے واقعات کئے ہوں گے۔مجھے اس وقت اس بات پر توجہ کسی وزیر نے نہیں کرائی

جس سے کہ میں ایسی فطرت کا تدارک کرتا اور دنیا کے تمام ممالک میں میری سلطنت پر خوشی محسوس ہوتی ۔ انہیں یہ خوشی محسوس ہوتی کہ اس نے سماجی بدعتوں کو اپنے ملک میں نیست و نابود کیا ۔ یہ سوچ کر بادشاہ نے ایک رسالہ کا مضمون اپنے محل خانے میں غور سے پڑھنے بیٹھا ۔ بادشاہ کا اپنا دور نہیں تھا کیونکہ بادشاہی چھین گئی تھی ۔ بادشاہ کو پتہ ہے میرے عوامی راج ملک میں اگر محل خانہ ابھی موجود ہے ۔ اسی محل خانے میں بادشاہ اپنا دن گزارتا ہے اور وہیں قیام کرتا ہے ۔ مطلب اس کا دور نہیں ہے پھر بھی بادشاہ کا ابھی تک لوگ عزت و احترام کرتے ہیں لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ اس کے کہنے پر حکومت کے اراکین کوئی تجویز بھی نہیں مانیں گے خیر بادشاہ ابھی بھی ہم لوگ زبانی کہتے ہیں لیکن دستخط کے بغیر اور حکومت کے بغیر محل کھانے میں رہنے والا بادشاہ یہ سن کر بہت ہی غم و غصہ میں نظر آیا جب اس نے ایک رسالے میں ایک ایسی نظم پڑھی جس نظم کا عنوان تھا 'جہیز ایک ناسور ہے' جس میں مصنف نے یہ تحریر کیا تھا کہ ایک لڑکی بہت ہی پڑھی لکھی سماج میں ابھری لیکن وہ غریب ماحول میں پلی بڑھی ۔ جب وہ سماج میں اچھی پڑھی لکھی لڑکی نکلی تو اس کی شادی اپنے سماج کے دائرے میں اسکی تعلیم کے برابر نہیں ہوئی ۔ مطلب ایسی تعلیم یافتہ لڑکا ہی ملا نہیں اور لڑکی شادی کے بغیر بہت سالوں تک رہی ۔ بعد میں کسی سے شادی کر کے اپنی زندگی بسر کی لیکن اس کے سسرال والوں نے اس کی تعلیم پر کوئی توجہ نہ دی ، نہ اس کی تعلیم کی کوئی قدر کی ۔ اس کے سسرال والے یہ سوچنے لگے کہ یہ لڑکی ناخواندہ ہے ، یہ ماحول دیکھ کر وہ پڑھی لکھی لڑکی کہنے لگی کہ میں نے کیوں پڑھا مجھے ناخواندگی کے ماحول میں ہی بہت سی تعزیت محسوس ہوئی اب یہ لڑکی سوچنے لگی کہ کیوں نہ میں اس سسرال سے بھی بھاگوں اور ایسے گاؤں یا شہر میں اپنی زندگی بسر کروں جہاں میں بہت سے واقعات لکھوں جو کہ کئی رسالوں میں چھاپے جائیں اور میں اپنی قلم کو ان بدعتوں کے خلاف لکھ کر لوگوں کو سمجھا کر یہ کہوں کہ سماج میں مختلف بدعتوں کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرنی چاہئے ۔ یہ کہہ کر لڑکی نے یہ بھی کہا کہ مجھے ناخواندگی کے ماحول سے اپنی پڑھائی کا ماحول الگ

رہا۔ مجھے معلوم نہیں ہوا کہ میری تعلیمی قابلیت دریا میں ڈوب جائے گی اور آخر میں مصنف نے اس ادارے کا نام 'پڑھائی میں ناخواندگی' رسالہ ترتیب دیا۔ بادشاہ نے جب ایسا اداریہ پڑھا تو اخبار والے سے ٹیلیفون کے ذریعے بات کر کے کہا کہ میں اس ملک کا بادشاہ رہا ہوں اگر اس وقت میرے ملک میں عوامی حکومت ہے پھر بھی میں عوام کے تئیں خدمت کرنے والا آدمی ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میری حکمرانی ختم ہوگئی میں حکمران نہیں لیکن عوامی حکومت میں بھی ایک عوامی خادم ہوں۔ اخبار کے صحافی کو یہ بتا کر کہا یہ جو اداریہ آپ نے اخبار میں چھپوایا ہے کیا یہ صحیح ہے میں یہ پڑھ کر بہت ہی غم وغصہ میں مبتلا ہوا۔ یہ سن کر اخبار کے صحافی نے بادشاہ کو بتایا کہ آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور میں بہت ہی خوش ہوا کہ آپ نے میرے رسالے کے اداریہ کو پڑھا۔ یہ سن کر رسالے کے مدیر نے بتایا ایسا اداریہ نہیں لکھا میں نے لکھ کر لوگوں میں جذبہ ابھارا۔ معلوم نہیں بادشاہ کو میرے ساتھ تعلقات رکھنے کے انداز اس طرح بھی ہوسکتے ہیں۔ اسی لئے میں اس بات پر یہ کہہ رہا ہوں کہ بادشاہ نے میرے رسالے کا اداریہ پڑھا لیکن معلوم نہیں کہ کیوں بادشاہ نے ٹیلیفون پر اس اداریہ کے بارے میں پوچھا، شاید میرے ساتھ تعلقات رکھنے کے لئے پوچھا ہوگا کیونکہ اب بادشاہ کو سلطنت ہے ہی نہیں۔ سلطنت نہ ہونے کی وجہ سے کئی صحافیوں کے ساتھ بھی اپنے تعلقات رکھنے چاہتا ہے تا کہ جو بھی جائیداد بادشاہ کی اس وقت ہے اس پر کوئی غلبہ نہ کرے اور اخبار کے ذریعہ صحافیوں کے ساتھ تعلقات رکھنا بہت ہی اچھا رہتا ہے اور صحافیوں کے ذریعہ جائیداد کا خیال میرے جاگیر پر ضرور رکھیں گے۔ اور میرے جاگیر کے خلاف کوئی اداریہ رسالے میں نہیں چھاپیں گے ایسی باتیں سوچ کر رسالہ کے مدیر صحافی نے سوچا اور کہا کہ خیر ''شاہ دیں دار نے'' میرے اداریہ کو پڑھا اور میرے رسالے کا بھی خیال آیا اور کئی لوگوں سے بادشاہ ملک میں باتیں کرتا ہی ہے اور میرا رسالہ بھی بادشاہ کی نگاہوں میں مشہور رہے گا۔ خیر میں اس شہرت پر اپنے رسالے کی یہ کہوں گا ''شاہ دیں دار نے''۔ مطلب ''شاہ دیں دار نے'' نے میرے رسالے کو پسند کیا اور پسند کر کے

ٹیلیفون پر رابطہ کیا اسی لئے میں اس بات کا نچوڑ دیے کر یہ کہوں گا کہ "شاہ دیں دار نے" "شفا پائی"

یہ سوچ کر رسالے کے مدیر اور صحافی نے سوچا اس عوامی دور میں میرے اخبار کو بھی مقبولت ہوئی لیکن شخصی راج میں نہیں۔ شخصی راج میں کہاں بادشاہ کو فرصت تھی میرے رسالے کا اداریہ پڑھ سکیں۔ وہ اپنی بیگمات اور وزیروں کے ساتھ بہت ہی مصروف رہتے۔ اس کو ملک میں پھیلی سماجی بدعتوں کا بھی پتہ نہیں۔ اگر شخصی راج میں سماجی بدعتوں کے بارے میں معلوم بھی ہوتا تو وہ ان باتوں کا تدارک نہیں کراتے۔ بادشاہ امیر آدمی ہوتے ہیں انہیں غریبوں کا رہن سہن معلوم ہی نہیں۔ اب میں عوام سے رجوع ہو کر یہ کہہ رہا ہوں کہ عوامی حکومت تشکیل ہونے پر ایک بادشاہ اپنی حکومت کھو کر ایک ایسے مدیر سے بات کرتا ہے جو کہ کبھی بادشاہ کے محل خانے میں نہیں پہنچ سکا۔ اگر شخصی راج میں بادشاہ نے ایسی بات ٹیلیفون پر کہی ہوتی تو میں ڈر کے مارے موت میں مبتلا ہوتا۔ میں یہ سوچتا کہ کیا بادشاہ نے اس اخبار کے اداریہ سے کچھ ایسا نہیں سوچا کہ میرے رسالے کو بند کر کے مجھ صحافی کو سزا دے گا لیکن عوامی حکومت میں ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ عوامی حکومت میں تمام لوگ یکساں قانون کی عزت کرتے ہیں۔ خیر میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ سماجی بدعتوں کا تذکرہ پڑھ کر محسوس ہوا کہ میں عوامی حکومت بیماری میں، کمزور طریقے سے چلاتا رہا۔ میں نے کئی کے مطالبات دفن کئے، میں نے کئی کی درخواست تہس نہس کیں۔ میں کسی کے ساتھ ٹھیک ڈھنگ سے پیش نہیں آیا۔ میں اپنے بادشاہی گمان کے ساتھ اس ملک میں پھرتا ہی رہا اور لوگوں کا خیال ہی اپنا ردعمل رہا یہ سوچ کر اداریہ کے مدیر نے یہ کہا کہ ان دنوں کی حکومت صحت یاب نہیں تھی لوگ عوامی حکومت پا کر بہت ہی خوشی ہوئے یہ سوچتے ہوئے صحافی دوسرے روز کے لئے رسالہ ترتیب دے رہا تھا رسالہ ترتیب دیتے ہوئے ایک قلمکار اس سے ملنے آیا۔ اسے اپنے اس اداریہ کے بارے میں واقف کرایا۔ جس اداریہ کو پڑھ کر بہت ہی متاثر ہوا۔ اس دلیل کو سن کر قلمکار نے ان باتوں پر

زور دے کے یہ بتایا کہ شکر کرو کہ آپ نے بادشاہ سے ٹیلیفون پر ایسی بات سنی، جبکہ عوامی حکومت ہے اور شخصی راج نہیں۔ اگر شخصی راج ہوتا تو آپ ٹیلیفون سن کر ہی بیمار ہو جاتے لیکن شکر اُس خدا کا کہ عوامی حکومت کے دوران بادشاہ نے آپ سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ آپ نے بیماری کے بدلے ''شفاء پائی''۔

اگر میں اس دلیل کا نچوڑ افسانہ یا کہانی میں تبدیل کر کے یہ عنوان لکھوں کہ ''شفا پائی'' یا سماجی بدعت''

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگ پیری ہے جوانی میری

غالب نے دیوانِ غالب میں مطلع اور مقطع اس غزل کا بہت ہی اچھے انداز میں بیان کیا ہے لیکن غالبؔ نے ہمیشہ اپنی غزلوں میں غم کا ہی اظہار کیا ہے غصے کو ہمیشہ بالائے طاق رکھا۔ ہنسی مذاق سے معشوق کی پاک محبت کا ذکر بیان کرتے ہوئے شرارت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے سنجیدہ مزاج سے بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ اسی طرح غالب نے اس مطلع اور مقطع میں یہ بیان کیا ہے کہ میرے بولنے پر ہر ایک شعر پر بہت سی دلیلیں لکھی جا سکتی ہیں۔ بہت سی کہانیاں تحریر ہو سکتی ہیں لیکن ان کی معشوق سے ملاقات ہو جائے گی تو اس وقت یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ کتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر اتنی باتیں کہیں کہ وہ ان باتوں پر غور کریں۔ میرے کہنے کا مطلب ہے وہ معشوق سے ملنا چاہتا ہے شرم کے مارے وہ اگر خدا نخواستہ مل ہی جائے اور یہ کہتا ہے کہ جب بھی معشوق ملے گا میں اسے کہانی سناؤں گا کہ آپ نے جدائی کے دوران کیا کیا ستم مجھ پر ڈھائے۔ جس سے شاعر کہتا ہے کہانی تحریر کر کے میں اسے زبانی سناؤں گا۔ جب معشوق طویل وقت کے لئے اس سے مل ہی جائے گی لیکن کہانی

ایک طویل داستان ہے۔ کہانی سنانے سے پہلے ہی بہتر یہی رہتا کہ غالب کو تھوڑی سی دلیل بتانی ہے۔ کہانی نہیں بتا سکتا ہے شاعر نے ردیف اور کافیہ کو پابندی میں لانے کے لئے ایسے مطلع اور مقطع کو بیان کیا ہے۔ میں دانشوروں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا جب آپ کسی دوست یا کسی رشتہ دار سے راستے میں ملو گے طویل وقت کے بعد آپ لوگ بھی زیادہ دیر تک باتوں میں مشغول نہیں رہو گے۔ آپ تھوڑی سی داستان بتانے میں رضامند رہو گے۔ اسی طرح سے غالب نے مطلع اور مقطع میں ردیف اور کافیہ کا بیان کر کے لفظ 'کہانی' کا استعمال کیا ہے۔ جیسے جوانی، دیوانی، روانی ایسے الفاظ۔ ویسے عموماً یہ شاعروں کا پہلے سے ہی اس قسم کا رجحان لکھنے میں آ ہی جاتا ہے۔ اسی طرح سے غالب نے یہ رجحان استعمال کر کے کافیہ میں کہانی، جوانی، دیوانی کا استعمال کیا ہے۔ اگر شاعر نے کہانی کے بجائے دلیل لکھی ہوتی تو وہ بہترین رہتا۔ دلیل زیادہ دیر تک نہیں بتاتے کیونکہ جلد بازی میں مختصر سی بات سن کر الوداع کرتے ہیں۔ اسی طرح سے اگر غالب کی معشوق سے ملاقات ہو ہی جاتی تو وہ زبانی کئی باتیں کہانی کے طور پر نہیں بتا سکتا ہے۔ بلکہ دلیل کے طور پر تھوڑی سی بات بتا کر دونوں الوداع کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ردیف اور کافیہ کو مرکوز کرنے کے لئے لفظ کہانی کا استعمال شاعر نے کیا ہے۔ جب میں دلیل کو ردیف اور کافیہ کے طور پر لکھوں تو مطلب اسی طریقے سے بیان کر سکتا ہوں اور کہہ بھی سکتا ہوں:

کب وہ سنتا ہے دلیل میری
اور پھر بات بتاؤں قلیل میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیری ہے شکیل میری

جب میں نے ان چار شعروں میں مطلب مطلع اور مقطع میں کافیہ کو تبدیل کر کے حرف ''دلیل'' میں مرکوز کیا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاعر نے صحیح کہا ہے کہ میں اپنے معشوق کو

زبانی کہانی سناؤں گا لیکن اگر ہم اس مطلع پر جو میں نے بیان کیا بحث کریں گے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ وہ میری دلیل کو جب سنے گا تو پھر میں وہ دلیل شرم کے مارے راستے میں دیر تک نہیں بتا سکتا۔ میں اگر ان کو دلیل بتاؤں تو میں قلیل طریقے سے مطلب کم وقت میں بتاؤں گا۔ جب میں مقطع پر بھی بحث کروں تو غالب نے خود کہا بوڑھاپے تک میری معشوق سے کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے میں تنگ ہو چکا ہوں۔ مطلب مجھے صحت کی گراوٹ محسوس ہونے پر وہ جوانی محسوس نہیں ہوتی ہے اور میں جب نیچے یا اوپر دیکھتا ہوں تو میں یہ سوچتا ہوں کہ جو میری جوانی تھی وہ بوڑھاپے تک معشوق نے جدائی سے برباد کر ڈالی ہے۔ اگر میں جوانی کے بجائے کافیہ میں شکیل بیان کروں تو اس لحاظ سے بھی میں اس طرح سے بیان کرتا ہوں کہ غالب کہہ رہے ہیں کہ بڑھاپا آ گیا، لیکن میں معشوق سے کبھی بھی ملا نہیں۔ جدائی میں رہ کر میں اس شکیل سے اس معشوق کو یہ کہوں گا کہ میری جو خوبصورت شکل رہی ہے وہ آپ کی جدائی سے بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ لفظ 'شکیل' کو ہم صورت کہتے ہیں مطلب حسین آدمی کو شکیل کہا کرتے ہیں، لیکن جب لفظ مقطع کے اوپر پہلے ہی یہ بیان کرتے ہیں 'کر دیا ضعف' ان الفاظ سے شکیل کا مطلب بڑھاپے میں بھی معنی کے انداز سے مطلب کہہ سکتے ہیں جیسے جب ہم خود یہ کہیں کہ میری شکل جو خوبصورت تھی، بڑھاپے میں کی حالت میں پہنچ کر تبدیل ہونے کے بعد یہ محسوس کرتی ہے کہ معشوق نے بڑھاپے تک مجھے دور رہ کر اس شکیل کو برباد کیا۔ مطلب میرا کہنے کا یہ ہے کہ غالب کو کہانی کے بجائے دلیل بیان کرنی تھی، کیوں کہ جب وہ خود مطلع اور مقطع میں یہ بیان کرتا ہے کہ بڑھاپے کے دور میں اسے محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی تک معشوق کی جدائی ہی دیکھی۔ مانتے ہیں کہ جدائی بڑھاپے تک دیکھ کر ایک کہانی کے طور پر بیان کر سکتے ہیں مطلب جوانی سے بڑھاپے تک ایک کہانی لکھ کر ایک کتاب کی صورت میں پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے میں مانتا ہوں کہ غالب نے مقطع اور مطلع کے دونوں مطلبوں کو جوڑ کر لفظ 'کہانی' کا استعمال صحیح کیا ہے لیکن جب میں لفظ 'پھر'

پڑھتا ہوں اس کا مطلب مطلع میں غالب کہہ رہے ہیں کہ کبھی خدانخواستہ اگر ملاقات ہو ہی جائے گی تو میں اسے زبانی اپنی کہانی سناؤں گا۔ اگر تنقیدی بیان لکھیں گے اور سنیں گے تو کہانی سنانے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ کتنی دیر تک غالبؔ کو معشوق سے ملاقات ہوگی۔ اس زمانے میں خود غالب حیا کا لفظ غزلوں میں بیان کرتا ہے کہ ان دِنوں حیا تھی مطلب مرد وعورت حیا کی وجہ سے راستے میں باتیں نہیں کرتے لیکن جب غالب کو ہی سنیں گے تو مطلب صاف ہے کہ غالب نے کہانی کو اس لئے استعمال کیا ہے کہ تا کہ غزل لکھی جائے اور بیان بازی معشوق کی محبوب کے بارے میں تشکیل دیں ورنہ غالب کو کہانی ردیف کا لفظ اور کافیہ کے لفظ میں کہانی کا استعمال ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے ہم یہ سمجھیں کہ غالب نے کئی غزلوں میں اپنی شاعری کو زیادہ گہرائی میں دکھانے کے لئے ردیف اور کافیہ میں غزل لکھنے کے لئے لفظ 'کہانی' کو بیان کیا ہے۔ ورنہ سیدھا سادہ یہی مطلب ہے کہ ہر غزل میں غالبؔ اپنے معشوق کے لئے مختلف طریقوں سے بیان بازی کر کے دُکھ کا اظہار کرتا ہے۔ اس بیان بازی سے پڑھنے والے بھی کچھ نہ کچھ سیکھ ہی جاتے ہیں۔ خیر عروج غالبؔ پر میں زیادہ بیان بازی نہیں کرنا چاہتا۔ میں پڑھنے والے کا یہ بھی خیال مرکوز کر رہا ہوں کہ شاعری بھی دوسرے طریقے سے دوسرے ردیف وکافیہ طریقے سے غالب کا ہی انداز بیان کر سکتے ہیں اور پڑھنے والے یہ کہتے ہیں کہ شاعر نے بہت اچھا لکھا ہے یہ نہیں سوچا کہ شاعری پہلے سے ہی کسی شاعر نے لکھی۔ لیکن ردیف کافیہ تبدیل کرنے سے یا لفظوں کو اِدھر اُدھر سجانے سے بڑے قلمکار نہیں بنتے بلکہ ان کی قلموں پر جانچ پڑتال کر کے یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ کسی شاعر کے خیال سے شاعری کو رریف کافیہ میں مرکوز کر کے نئے انداز میں بیان کیا ہے۔ جس طرح میں نے غالب کے ردیف اور کافیہ میں اور مطلع اور مقطع میں بیان کر کے قاری کو سمجھانے کے لئے بتایا ہے۔

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے معشوق نے اپنی پاک محبت میں دور رکھ کر بہت ہی غم وغصہ میں ڈال کر صدمہ پہنچایا ہے۔ کبھی بھی پاک محبت کے دائرے میں رہ کر معشوق مجھ سے ملتی ہی نہیں۔ میں نے بار بار اسے کسی طریقے سے ملنے کو کہا لیکن افسوس ہے وہ نہ مل سکی۔ اب جب کبھی بھی وہ مجھے مل ہی جائے گی میں اسے اپنے غموں کا ذخیرہ اور جدائی کے جذبات کہانی کے انداز میں بتاؤں گا۔ میں نے کہانی تحریر نہیں کی بلکہ میرے پاس کہانی کا انداز بیان موجود ہے اور اسی کو میں اس سے ملنے کے بعد زبانی ہی بتاؤں گا۔ میں اپنی بیتی ہوئی دلیل اور جدائی کے واقعات کہانی کے انداز میں اسے زبانی سناؤں گا۔ میرے پاس جدائی کے واقعات اتنے موجود ہیں کہ وہ کہانی کے طرز پر لکھ کر ایک داستان کی صورت میں پیش کر سکتا ہوں لیکن کم وقت ہونے کی وجہ سے میں معشوق سے ملوں گا اور لکھ کر نہیں بلکہ زبانی کہہ کر ہی بیان کروں گا۔ مطلب جب معشوق مجھے ملے ہی جائے گی تو میں اسے جدائی کی کہانی زبانی سناؤں گا جس سے اس میں ایسی بیداری محسوس ہو سکتی ہے جس سے کہ وہ خود یہ کہے گی کہ جدائی سے بہت ہی پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے میرے معشوق نے میرے الگ ہونے پر کہانی مرتب کی ہے اور اس کہانی کو مجھے مل کر ہی زبانی سنانا چاہتا ہے۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگ پیری ہے جوانی میری

مقطع میں مطلع کا بیان غالب اکٹھا کر کے یہ سنا رہا ہے کہ جب بڑھاپے کا دور آیا اور بڑھاپے تک میں نے بہت سی مشکلات اور آسانیاں بھی دیکھیں باوجود اس کے مجھے اپنے معشوق کے ساتھ کبھی بھی ملاقات ہوئی ہی نہیں۔ میں یہ بیان کر رہا ہوں کہ میں اپنی زندگی کی کہانی تحریر کر سکتا ہوں۔ جو بھی حالات مجھ پر گزرے ہیں میں اس پر کہانی بیان کر کے یہ کہوں گا کہ یہ ایک طویل داستان پڑھنے والے کے لئے پیش کر سکتا ہوں۔ اسی لئے غالب فرمارہے ہیں کہ اگر میری جوانی میں معشوق نے میرے پیروں کو زنجیروں میں گرفتار کر رکھا ہوتا

لیکن میں اس گرفتاری اور بڑھاپے کا دور بھی ملا کر ایک کہانی بنا سکتا ہوں۔ جب بھی معشوق کی ملاقات میرے سے ہوگی میں اس واقعہ پر اسے جوانی سے بڑھاپے تک اپنی کہانی زبانی سناؤں گا جس سے معشوق کو احساس ہو جائے کہ سچے طور پر بڑھاپے تک اپنی پاک محبت کے دائرے میں رہ کر میں نے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ اسی لئے جب بڑھاپے کا دور آیا تو کیوں نہ میں ان کہانیوں کو تحویل کر کے یہ بتاؤں کہ میں نے معشوق کی جدائی میں بہت سے بیان سن کر اسے کہانی میں مرکوز کیا ہے۔ اسی لئے مجھے بھی احساس ہوا کہ پاک محبت میں بہت سے واقعات رونما ہوا ہی کرتے ہیں۔

جب میں لفظ 'غالب' پر مطلع کے بارے میں بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالب نے مطلع کا مفہوم مقطع کے ساتھ جوڑ کر یہ بیان کیا ہے کہ اگر ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہی پڑے تو ہمیں بہادری سے ان مشکلات کا سامنا کرنا چاہئے۔ مانتے ہیں کہ مقابلہ کرتے ہوئے بڑھاپے کا دور بھی آ ہی جاتا ہے لیکن میں آسانی اور مشکلات کے دور کا سامنا کرتے ہوئے یہ کہوں کہ مجھے سبھی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے ایسا مصمم ارادہ دل میں رکھنا ہے کہ میں فتحیابی کے لئے کوشش کروں نہ کہ ہار کے لئے مجھے بڑھاپے تک مطلب جب سے انسان وجود میں آیا اور جب تک انسان زندہ ہے تب تک اسے مختلف مشکلات کا سامنا کرتے وقت یہ عزم لینا چاہئے کہ اسے ضرور فتحیابی کے راستے پر چلنا ہے۔ اور مشکلات کو مشکلات نہ کہہ کر ہمت سے فتحیابی حاصل کرنی ہے۔ اسی لئے مقطع میں یہی فرماتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ فتحیابی کا ہی پرچم لہرانا چاہئے اور فتحیابی کا مصمم ارادہ ہمیشہ دل سے کرنا چاہئے۔

کب وہ سنتا ہے + کہانی میری = کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی + زبانی میری = اور پھر وہ بھی زبانی میری
کر دیا ضعف نے + عاجز غالبؔ = کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگ پیری ہے + جوانی میری = ننگ پیری ہے جوانی میری

''کب وہ سنتا ہے''

شکیل الرحمٰن کی شادی کو بیس سال گزرے اور اس دوران کوئی بھی بچہ پیدا نہیں ہوا مطلب شادی کے بعد بھی صرف میاں بیوی رہے۔ اب شکیل الرحمٰن کو محسوس ہونے لگا کہ ہم دو ہیں اور میرے پاس کوئی اولاد نہیں ہے۔ اولاد کے بغیر رہ کر اس دولت کا کیا فائدہ۔ شکیل الرحمٰن پیشے سے ایک بڑے مشہور ڈاکٹر تھے جو بہت سے مریضوں کا علاج کر کے انہیں صحت یاب کیا کرتے تھے لیکن خود اپنی اولاد پیدا کرنے کے لئے علاج نہیں کر سکے۔ مطلب اتنا مشہور ڈاکٹر ہونے کے باوجود اولاد کے بغیر رہا۔ کئی آستانوں خواہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے ہوں یا دیگر مذہبوں کے ہوں جا کر نیاز کرتے لیکن بے اولاد ہی رہے۔ کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ یہ سوچ کر ایک دن خدا سے رجوعؑ ہو کر یہ کہنے لگا کہ اے خدا میں نے ایسے کون سے گناہ کئے ہیں کہ میرے پاس کوئی بھی اولاد نہیں ہے۔ یہ سوچ کر شکیل الرحمٰن نے اردگرد کے حالات دیکھ کر کہا کہ اگر کئی دوستوں کے پاس اولاد بھی ہے لیکن کئی پڑھتے نہیں کئی گونگے ہیں، کئی اندھے ہیں، کئی بہرے ہیں، ان اولاد کو دیکھ کر پریشانی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر بھی ان کے پاس اولاد ہے۔ شام کا وقت اپنی اولاد کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔ اگر چہ مجھے رات کو عورت کے ساتھ باتیں کرنے کا موقعہ ملتا ہے پھر بھی اولاد کے لئے ترستا ہوں۔ یہ سوچ کر شکیل الرحمٰن نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ آج ہم ایسے متبرک آستان میں اپنی حاضری دیں گے ممکن ہے ہمارے یہاں بھی اولاد ہو جائے۔ جواب دے کر شکیل الرحمٰن کی بیوی نے کہا کہ کتنے آستانوں کی حاضری دے کر ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ کتنے پیسے فقیروں اور خدا دوستوں کو دے کر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ یہ آپسی بیان بازی کر کے یہی حل نکلا کہ ہر ایک کا خالق خدا ہی ہے۔ یہ خدا ہی دینے والا ہے اور لینے والا ہے۔ لیکن خدا سے رجوع ہونے پر وہ ہماری دعا نہیں سنتا۔ یہ کہہ کر دونوں نے اپنی باتوں پر غور کر کے اس بات کو کہہ کر اختتام تک پہنچا کہ ''کب وہ سنتا ہے''۔ مطلب ہم نے بہت پیسے خرچ کئے فقیروں پر

برہمنوں پر مختلف مذہبی اداروں پر لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔اور پھر بھی اولاد کے بغیر اپنے کو دیکھ کر ہم دونوں یہی کہہ رہے ہیں کہ ”کب وہ سنتا ہے“

”کہانی میری“

ایک دن شکیل الرحمٰن اور اس کی بیوی گھر میں بیٹھے رہے اور کسی کام کے لئے نہیں نکلے۔ دونوں کے پاس کافی دولت ہونے کی وجہ سے انہیں زیادہ کمانے کی ضرورت ہی نہیں، پھر بھی دونوں اپنے اپنے کام میں نکلتے رہے اور الگ الگ کمائی کماتے رہے، مطلب شکیل الرحمٰن کی بیوی کسی سرکاری دفتر میں ملازمہ ہے اور خود شکیل الرحمٰن ایک مشہور ڈاکٹر ہے۔ جب دونوں گھر میں بیٹھے ہوئے تھے تو اچانک ایک آدمی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔شکیل الرحمٰن نے دروازہ کھولا اور اس آدمی نے شکیل الرحمٰن سے درخواست کی کہ انہیں ایک ہزار روپیہ کی حاجت ہے، شکیل الرحمٰن نے اس آدمی سے یہ کہا کہ ایک ہزار روپے کی کیوں ضرورت ہے۔شکیل الرحمٰن نے کہا میں آپ کی حاجت پوری کرتا ہوں لیکن مجھے یہ روپے دینے پر اعتراض ہے جب تک میں اس حاجت کی وجہ نہ جان لوں۔اس آدمی نے شکیل صاحب سے کہا کہ میں صبح گاؤں سے شہر کی طرف آیا آنے سے پہلے میں نے ATM سے تین سو روپیہ نکال کر یہ سوچا کہ دن کا خرچہ میں ٹھیک طرح سے کر سکتا ہوں لیکن اچانک ایسا واقعہ ہوا کہ میں نے تین سو روپے جیب میں رکھے اور جب میں بس سے یہاں پہنچا تو اچانک میں نے اپنی جیب سے دونوں گم پائے۔ اب میں گھر واپس جانے کے لئے پریشان ہوں اور میں وکیل کے پاس بھی نہیں پہنچ سکتا کیونکہ میرے پاس وکیل کو دینے کے لئے روپئے نہیں ہیں کیونکہ وہ میری زمین کا جھگڑا عدالت عالیہ میں میرے حق کے لئے لڑ رہا ہے۔یہ سن کر شکیل الرحمٰن نے کہا کہ اس آدمی کو کتنی پریشانی ہے اور اب وکیل کو فیس دینے کے بجائے اب یہ خود گاؤں واپس جانے کے لئے روپئے کے لئے پریشان ہو رہا ہے۔یہ سوچ کر شکیل الرحمٰن نے اس سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنا پتہ لکھے اور گھر پہنچنے کے بعد ان روپے کو ڈاک خانے کے ذریعہ پھر مجھے واپس کرے۔آدمی نے یہ بات سن کر اپنا پتہ شکیل الرحمٰن

صاحب کو دیا اور ایک ہزار روپئے شکیل صاحب سے وصول کیئے۔ اس کے بعد راستے میں اس نے گاؤں کے دوسرے آدمی کو یہی دلیل بتا کر کہا کہ میں وکیل کے پاس نہیں جاسکا اور میں واپس گھر جانا چاہتا ہوں، یہ دلیل سن کر اس آدمی نے کہا کہ ''کہانی میری''۔ مطلب مجھے بھی ایسا واقعہ آج ہی پیش آیا میں بھی آپ کی طرح یہی دلیل سنانا چاہتا ہوں اور میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ کے کہنے سے مجھے جواب با جواب ملا۔ مطلب آپ کو جو کہنا تھا وہ مجھے بھی کہنا تھا۔ اسی لئے بات کو ''کہانی میری'' کے طور پر دوسرے بندوں کو سنائیں گے۔

''اور پھر وہ بھی''

جب ان دونوں آدمیوں نے ایسی دلیل بتا کر یہ کہا کہ ہمارے روپئے جیب سے گم ہو گئے تو ایک نے کہا کہ میں نے کسی سے بھی ابھی تک روپئے اس طرح نہیں وصول کیئے جس طرح آپ نے شکیل الرحمٰن سے روپئے وصول کیئے۔ میں نے سیدھے سادے انداز میں ہی اُس آدمی کو بتایا کہ میرے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا جس سے میری جیب میں کچھ بھی نہیں رہا۔ اس کو میرے یہ کہنے سے احساس ہوا جس کے بعد اس نے ایک ہزار روپئے اپنی جیب سے دیئے۔ اس آدمی نے یہ کہا کہ شکیل الرحمٰن نے پتہ لیا ہے اور وہ کسی بھی وقت آپ سے روپئے تقاضہ کر سکتا ہے اس کے برعکس مجھے کوئی بھی ہزار کی وصولیابی پر کچھ نہیں کہے گا۔ یہ سن کر اس آدمی نے سوچا یہ کیا معاملہ ہوا شکیل احمد نے مجھ سے رسید کیوں لی۔ جب اس آدمی نے ایسی باتیں سنیں تو وہ آدمی شکیل الرحمٰن کے پاس گیا اور یہ کہنے لگا کہ میرا جیسا ہی واقعہ کسی آدمی کے ساتھ پیش آیا ہے اس کو بھی ایک ہزار روپئے وصول ہوئے لیکن اس پر کوئی پتہ وصولیابی کے وقت آدمی نے نہیں دیا۔ یہ سن کر شکیل احمد نے اس آدمی کو کہا روپئے دینے والے ایسے آدمی کا میں احترام نہیں کرتا۔ میں اس آدمی کا احترام کرتا ہوں جو کسی کی گذارش قانونی طور پر منظور کرے۔ یہ سن کر آدمی نے شکیل الرحمٰن سے کہا میرے ساتھ بھی ایسا ہی انصاف کرنا چاہئے۔ میں یہ ہزار روپئے آپ کو کیسے واپس کر سکتا ہوں، شکیل الرحمٰن نے یہ بات سن کر اس آدمی سے

کہا ایک تو آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کو ایک ہزار روپے کی حاجت ہے۔ میں نے دے دیئے لیکن اس انداز میں نہیں دیئے کہ آپ بھکاری ہو، آپ کو کیسے میں بھکاری تسلیم کروں۔ جبکہ آپ نے کہا کہ میرے پاس ATM کارڈ ہے اور میں عدالت عالیہ میں کسی کیس کی پیروی کے لئے جانا چاہتا تھا۔ دراصل آپ کو ایک ہزار روپے کا لالچ اس طرح سے محسوس ہوا جس طرح سے آپ کو اُس آدمی نے یہ کہا کہ مجھے بھی کسی نے ایک ہزار پیش کئے ہیں۔ میں نے کوئی پتہ نہیں دیا۔ جس طرح آپ نے شکیل الرحمٰن کو اپنا پتہ ہزار روپے وصول کرنے سے پہلے پیش کیا۔ یہ سن کر شکیل الرحمٰن کو محسوس ہوا اور کہنے لگا دراصل اس دنیا میں لالچ کی بنا پر ہی ایسے واقعات پیش آتے ہیں اور ایسی کہانی سنا کر لوگوں کو گمراہ کر کے بھکاری کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی لئے شکیل الرحمٰن نے اس آدمی کو غم وغصہ اور شرارت کے انداز میں کہا کہ آئندہ اس دروازے پر نہیں آنا ''اور پھر وہ بھی'' مطلب اس آدمی کو بھی نہیں اس دروازے پر لانا جس نے پتہ کے بغیر ایک ہزار روپے کسی آدمی سے حاصل کئے۔ آپ کو بھی لالچ یہی رہا کہ میں بھی اسی طرح ہزار روپے موصول کروں۔ لیکن میں نے اس طریقہ سے ہزار روپے نہیں دیئے۔ میں کسی بھی وقت ہزار روپے واپس لے سکتا ہوں۔ شکیل الرحمٰن کی باتیں سن کر اس آدمی نے کہا کہ میں اس دروازے پر کبھی بھی نہیں آؤں گا، جبکہ آپ مجھ سے ہزار روپے وصول کرنے کے لئے کہو گے میں ہزار روپیہ دینے والا نہیں ہوں۔ مطلب ''اور پھر وہ بھی'' کہنے کا یہ انداز ہے کہ شکیل الرحمٰن کو یہ کہا کہ جب اس آدمی نے پتہ کے بغیر ہزار روپے کسی آدمی سے لئے ہیں تو مجھے بھی ایسی ہی رعایت ملنی چاہیے۔ یہ بات سن کر پھر شکیل الرحمٰن نے کہا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں، مجھے آپ کی دلیل سننے کی فرصت نہیں ہے مجھے کئی بیماروں کا علاج کرنا ہے۔ میں ان کے صحت یابی کے لئے فکر مند ہوں۔ دفع ہو جاؤ ''اور پھر وہ بھی'' مطلب ڈاکٹر نے غصہ میں یہ کہا کہ جس آدمی کو پتہ کے بغیر ہزار روپے وصول ہوئے وہ بھی غیر قانونی طریقے سے، میں نے قانونی طریقے سے ایک ہزار روپے دیئے لیکن بہت ہی دلیل جرح کرنے کے بعد

میرے دماغ کو پریشانی میں مبتلا کیا اسی لئے جس آدمی نے ہزار روپے پتہ کے بغیر دیئے اسی لئے میں یہ لفظ کہہ کر اس آدمی کو دفع ہونے کا حکم دیتا ہوں **''اور پھر وہ بھی''**

''زبانی میری''

جب شکیل الرحمٰن نے اس آدمی کو اپنے نوکروں کے ذریعہ اپنے مکان سے دفع کیا تو نوکر کہنے لگے کہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن میں اتنا غصہ نہیں دیکھا جتنا کہ اس آدمی سے باتیں کرنے پر دیکھا۔ یہ کیا معاملہ ہے ہمیں سمجھ ہی نہیں آتا ہے۔ گھر کے تمام نوکروں نے ایک جلسہ کیا کہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کیوں اتنا غصے میں تھے تو تمام نوکروں کو ایک نوکر نے وہ سب باتیں سنائیں جس کی وجہ سے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کو غصے کی حالت میں دیکھا۔ تب تمام نوکروں نے یہ کہا کہ ہم ڈاکٹر صاحب سے ملیں گے اور کہیں گے کہ آپ کبھی ہمارے ساتھ ایسا غصہ نہیں دکھانا۔ جب تمام نوکر ڈاکٹر صاحب سے ملے تو ڈاکٹر صاحب نے سن کر نوکروں سے یہ کہا کہ آپ میرے گھر میں نوکر نہیں ہو میرے گھر میں آپ گھر کے افراد کی طرح ہو۔ آپ پر غصہ کرنے والا نہیں ہوں۔ میں نے اسی لئے اس آدمی پر غصہ ہوا کہ وہ ہزار روپے بغیر تحریر کے لینا چاہتا تھا مطلب کسی پتہ کے بغیر لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے پتہ لکھوا کر ہی ایک ہزار روپے دئے اور معلوم نہیں کہ اس نے ایک ہزار روپے لینے کی دلیل صحیح بتائی یا غلط۔ لیکن اس کی دلیل تحریری نہیں تھی بلکہ میں نے ایک ہزار روپے پتہ کے بنیاد پر ہی دئے۔ اب یہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ پتہ تو میں لکھوں گا نہیں اور یہ سوچنا کہ میں یہ واپس نہیں دے سکتا۔ اسی پر مجھے غصہ آیا اور میں نے بدسلوکی بھی کی، میں اسی لئے تحریر لے کر ہی پیسے کسی کو دیتا ہوں۔ میں زبانی طور پر امداد نہیں دیتا۔ صرف آپ کے ساتھ بات کرتا ہوں اور بچوں کی طرح اخلاق سے پیش آتا ہوں حتی کے میں اولاد کے بغیر ہوں میں آپ کو اولاد کی طرح سمجھتا ہوں۔ جو بھی میں آپ سے کہتا ہوں زبانی طور پر کہتا ہوں تحریری طور پر نہیں۔ اسی لئے میں آپ سے یہ کہوں گا کہ ''زبانی میری''۔ **مطلب موجودہ دور میں تجارت کا معاملہ تحریری طور پر انجام دیتے ہیں۔ زبانی طور پر بھروسہ مند**

آدمی کے ساتھ ہی انجام دیتے ہیں۔اسی لئے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اپنے نوکروں کو یہ کہہ کر اس بات کو اختتام تک پہنچا کر کہہ رہا کہ ”زبانی میری“۔مطلب میں آپ کے ساتھ ہر ایک کام زبانی کرتا ہوں۔اسی لئے ہمیشہ میری بات کو سمجھنا چاہئے ”زبانی میری“ نہ کہ تحریر سے۔

”کردیا ضعف نے“

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ملک میں مشہور ہوئے۔اس شہرت کی وجہ سے انہیں بہت سی ریاستوں میں لوگ چاہتے رہے۔کیونکہ کہ یہ خود مریض کا معالجہ کرنے کے بعد اسے مرض سے دور رکھ کر صحت یاب کرتے تھے۔آہستہ آہستہ شکیل الرحمٰن اتنے مشہور ہوئے کہ حکومت کے اہلکاروں کی زبان پر انہیں کا نام آیا کرتا تھا۔اسی دوران ملک کے کسی گاؤں میں ایک ایسی وبائی بیماری پھیلی جس کو قابو کرنے کے لئے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کو ہی تعینات کیا گیا۔حکومت نے اسے سرکاری حکم نامہ دے کر وہاں اس بیماری کو نیست ونابود کرنے کے لئے بھیجا۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی مرضی نہیں تھی لیکن اس کی بیوی نے بھی اسے اس گاؤں میں جانے کے لئے کہا تاکہ کسی مریض کے دل سے یہ دُعا نکلے کہ ہمارے گھر میں اولاد پیدا ہو سکے۔ان باتوں کا خیال کرتے ہوئے اُس گاؤں میں حاضری ہو کر لوگوں کی خدمت کی۔بہت سے مریضوں کو دیکھ کر ایک بوڑھے کو دیکھا۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کو یاد آیا کہ یہ بوڑھا وہی آدمی ہوگا جس نے مجھے آج سے آٹھ سال پہلے دھوکہ دے کر ایک ہزار روپئے لے کر بھاگ گیا۔حتی کے ہزار روپئے دینے سے پہلے پتہ بھی لکھ کر دیا لیکن پھر بھی اس نے ایک ہزار روپئے واپس نہیں کئے۔مریض کو دیکھ کر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے کہا کہ آپ کبھی شہر بھی آیا کرتے تھے۔اب بوڑھے نے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کو پہچانا اور اس نے کہا کہ میں وہی آدمی ہوں جس نے آپ سے ایک ہزار روپئے لئے تھے لیکن میں واپس ادا نہ کر سکا۔اس کیلئے میں معذرت چاہتا ہوں۔اب میں بیماری میں مبتلا ہو کر بڑھاپے کے دور میں پہنچا ہوں۔میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ میری بیماری کا ایسا علاج کریں کہ میں صحت یاب ہو جاؤں۔یہ سن کر

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اس آدمی کو کہا کہ آپ اب بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن اپنی کرتوتوں پر نہیں پچھتاتے ہو۔آپ نے میرے ساتھ ایسا برتاؤ کیا ہے جسے میں یاد کر کے یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ اس عمر میں اس کا خمیازہ اٹھا رہے ہو۔اگر چہ آپ ایک ہزار روپئے واپس نہ کر سکے پھر بھی آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ معاشی حالت کی وجہ سے میں ہزار روپئے واپس نہیں کر سکا۔جس کا پھل آپ کو بڑھاپے میں چھکنا پڑ رہا ہے۔خیر میں آپ سے ڈاکٹر ہونے کے ناطے کوئی بھی ضد نہیں کر سکتا بلکہ مجھے مریض کا علاج صحیح ڈھنگ سے کرنا ہے۔تاکہ مریض صحت یاب ہو جائے۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے علاج فراہم کیا اور وہ صحت یاب ہونے لگا۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے زیر اہتمام جو بھی اس گاؤں میں بیماری میں مبتلا ہوئے تمام صحت یاب ہوتے نظر آئے۔اب حکومت کی طرف سے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کو اس گاؤں میں لوگوں کی مشکلات کا سربراہ مقرر کیا گیا اور حکومت کی طرف سے یہ حکم نامہ بھی دیا گیا کہ شکیل الرحمٰن گاؤں کے لوگوں کا علاج معالجہ کرنے کے بعد گاؤں کے لوگوں کی مشکلات پر بھی مالی طور حکومت کے ایوانوں تک مراسلہ بھیج سکتا ہے۔جس مراسلے کو حکومت منظور کرنے کے بعد لوگوں کے مالی مشکلات بھی حل کی جا سکتی ہیں۔جب وہ آدمی جو بڑھاپے میں اب زندگی بسر کر رہا ہے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کو ملا اور یہ گزارش کی کہ اب میں آپ کے زیر علاج رہ کر صحت یاب ہوا ہوں، لیکن بوڑھاپے میں بہت ہی کمزوری محسوس کرتا ہوں۔اسی لئے میں بوڑھاپے سے تنگ آ گیا ہوں۔میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ مجھے دوائیوں کے ذریعہ پھر سے مجھے جوانی محسوس ہونے لگے۔ یہ سن کر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اس آدمی کو کہا کہ اگر آپ پھر سے جوان ہو جاؤ گے تو آپ وہی کام پھر سے شروع کرو گے جو آپ نے آٹھ سال پہلے کیا تھا۔کئی لوگوں کو فریب دے کر انکو لوٹنا شروع کر دو گے۔جس طرح آپ نے مجھ سے ایک ہزار روپئے آج سے آٹھ سال پہلے لئے۔بوڑھے نے جواب دیا کہ میں ایسا کام نہیں کروں گا۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے پھر یہ کہا آپ کے لئے کوئی ایسی دوائی دنیا بھر میں دستیاب نہیں ہے جس سے

بوڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کیا جا سکے۔اسی لئے میں آپ سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ جس طرح آپ اس وقت چلتے پھرتے ہو اسی میں خدا کا شکر کرو۔میں آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ ''کر دیا ضعف نے''۔مطلب آپ کو بوڑھاپے نے ان عادتوں سے دور کیا جن عادتوں سے آپ بہت ہی غلط کام کیا کرتے تھے۔یہ بھی خدا نے سزادی ہے کہ آپ نے جوانی میں جو کچھ کیا ہے اس کا جواب بوڑھاپے میں مل رہا ہے۔جیسے کہ آپ نے جعلسازی کا کام انجام دیا ہے اس کا بھی آپ کو بوڑھاپے میں خمیازہ اٹھانا پڑا ہے۔اسی لئے میں آپ کو علاج فراہم کرتے ہوئے ان باتوں سے ''کر دیا ضعف نے'' دور کرتا ہوں اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ اپنے دولت خانے میں جا کر آرام کیا کریں۔اب آپ کا آخری منزل پر جانے کا وقت آنے والا ہے خاموش رہیے۔یہ کہہ کر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے پھر یہ کہا کہ ''کر دیا ضعف نے''

''عاجز غالب''

جب اس آدمی نے ڈاکٹر سے ایسی باتیں سنیں تو سن کر ناراض بھی ہوا اور جوانی کے دور میں کئے ہوئے غلط کاموں پر پچھتانے لگا۔سوچنے لگا کہ کوئی بھی غلط کام کرنے کا انجام خود انسان کو مل ہی جاتا ہے۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے جب اس بوڑھے سے ایسی باتیں کہہ کر خود الگ ہوا تو ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے گاؤں کے بہت سے مدرسوں کا معائنہ کیا۔وہاں پر طلباء کی حالت اچھی نہیں دیکھی۔کئی طلباء کی اسکول کی وردی اچھی نہیں دیکھی۔دراصل گاؤں میں زیادہ تعداد میں غریب رہا کرتے ہیں۔اب شکیل الرحمٰن معاشی حالت دیکھ کر کہنے لگا کہ یہاں ایسی حالت ہے کہ جوان بھی بوڑھاپے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔مطلب یہاں کے مشکلات سے جوانی ختم ہو سکتی ہے۔جس سے کہ ہر ایک گاؤں والا بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔یہاں کے بھیڑ بکریوں کے لئے اچھی گھاس میسر نہیں۔ان کی معاشی حالت کو دیکھ کر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے گاؤں کے بارے میں اپنے خیالات تحریر کر کے حکومت کے ایوانوں تک پہنچائے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ حکومت کے ایوانوں تک پہنچا کر اس مراسلے کا نام اس مضمون سے لکھا ''عاجز

غالبؔ''۔مطلب یہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے کہا کہ یہاں کوئی شہری جوانی کے دور سے نہیں گزر سکتا ہے۔وہ جوانی کو مرکوز کر کے بوڑھاپے میں داخل ہو سکتا ہے۔جس طرح غالب نے ایک مصرعے میں فرمایا ہے کہ بوڑھاپا ہونے کے ناطے وہ بوڑھاپے سے عاجز ہوئے۔اس سے فتحیابی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ بوڑھا ہے۔بوڑھا کسی جوان کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا۔اسی لئے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے گاؤں کے معاشی حالت کے بارے میں مراسلے میں یہ لکھا''عاجز غالبؔ''۔مطلب گاؤں کی حالت بہت ہی بری ہے، جیسے کہ ایک مشہور شاعر نے اپنے شعر کے مصرعے میں یہ کہا کہ بوڑھاپا بہت ہی تنگ کرنے لگتا ہے۔اسی لئے مراسلے''عاجز غالبؔ'' کے نام سے تحریر کیا۔

''تنگ پیری ہے''

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے جب یہ مراسلہ حکومت کے ایوان تک پہنچایا، حکومت کے بڑے بڑے سربراہوں نے اس مراسلہ کو پڑھا اور پڑھ کر اس لفظ سے متاثر ہو کر کہنے لگے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے عاجز غالب اس مراسلے کا نام صحیح ٹھہرایا ہے کیوں کہ لوگ گاؤں میں، ہری بھری گھاس دیکھتے ہیں لیکن اس گھاس میں بھی کوئی نہ کوئی بیماری ہے جس سے وہاں کے مویشی جلد مرجاتے ہیں، جب حکومت کے اہلکاروں نے خود جا کر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے ساتھ گاؤں کا جائزہ لیا اور انہوں نے مختلف مدرسوں کی حالت بھی بری دیکھی دیکھ کر وہ یہ بھی کہنے لگے کہ یہاں غالب جیسے شاعر کی شاعری کون پڑھ سکتا ہے۔ہاں جب کسی کو ایسی کتاب پڑھنے کے لئے کہا جائے گا وہ کتاب عاجز غالب میں مرکوز ہو سکتی ہے۔مطلب پڑھتے ہوئے کمروں میں مختلف کیڑے مکوڑے ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کے ساتھ لڑائی کریں یا غالب کے شعر کو پڑھ کر سوچیں۔اسی لئے غالب کی پڑھائی کو مرکوز کر کے وہ یہی کہا کرے گا''عاجز غالب''اسی لئے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اپنے مراسلے میں صحیح بیان بازی کر کے اس مراسلے کا نام''عاجز غالب''تحریر کیا ہے۔یہ صحیح ہے۔جب ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے ساتھ گفتگو کر کے سرکاری

اہلکاروں نے یہ کہا کہ گاؤں کی حالت بہت ہی بدترین ہے۔اب ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کو گاؤں کی ذمہ داری سونپ نے کے بعد وہ اپنے گاؤں کے دورے کا مراسلہ بڑے اہلکار کو دے کر اپنے مراسلے کو اس انداز سے بیان کیا، اس مراسلے کا نام ''ننگ پیری ہے'' مطلب ان اہلکاروں نے اپنے مراسلہ میں یہ لکھا کہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا عاجز غالب صحیح ہے۔گاؤں کی حالت بہت ہی بری نظر آتی ہے۔اور یہ حالت اسی لئے رونما ہوئی ہے کہ وہاں کے لوگوں میں غربت کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔اگرچہ لوگ محنت کرتے ہیں لیکن برا ماحول ہونے کے ناطے انکی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔دراصل کیڑے مکوڑے اور دیگر چیزوں کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کی صحت خراب ہوئی ہے۔ہمیں ایسے بڑے ڈاکٹروں، اہلکاروں اور دیگر آدمیوں کو اس گاؤں میں تعینات کرنا ہے جو کہ اس گاؤں کی حالت صحت یابی کے ماحول میں تبدیل کریں۔اور لوگوں کی بری معاشی حالت اور ان کا رہن سہن اور ان کی غربت کو ٹھیک کیا جائے۔جس سے کہ ہم یہ نہیں کہیں کہ ''ننگ پیری ہے'' مطلب اس گاؤں میں میری ایسی حالت ہے کیوں کہ وہاں پر لوگوں میں ''ننگ پیری ہے'' غربت ہے یا غربت کے ہتھکنڈے میں قدرت نے قابو میں رکھا ہے اور اس طرح قابو میں رکھا ہے کہ وہاں بیٹھ کر صحت یابی تبدیل ہو کر بیماری میں مبتلا ہو سکتی ہے۔اسی لئے ہم اس مراسلے کا نام حکومت کے بڑے اہلکاروں کو ارسال کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ ''ننگ پیری ہے''

''جوانی میری''

جب ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور دوسرے اہلکاروں کا مراسلہ حکومت کے بڑے بڑے اہلکاروں نے پڑھا وہ پڑھ کر بہت ہی متاثر ہوئے۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اس مراسلے میں آدمی کی بھی مثال دی۔جس نے اس شہر میں آکر ایک ہزار روپیہ ٹھگ لئے تھے۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اس آدمی کو ٹھگ نہیں قرار دیا بلکہ یہ کہا کہ اس آدمی کو میں نے جب بڑھاپے میں دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس نے جوانی میں کیوں میرے سے ٹھگ بازی کی۔اسی ٹھگ بازی

کی وجہ سے تمام گاؤں کے لوگوں کی معاشی حالت بری ہے اور ایک ہزار ٹھگ کر اپنے گھر کی معاشی حالت کو سدھارا۔ اس مراسلے میں جب حکومت کے اہلکاروں نے ایسی مثالیں پڑھیں تو وہ بھی بہت متاثر ہوئے اور گاؤں کی حالت سدھارنے کے لئے حکومت کے اہلکاروں نے فوری توجہ دی اور حکم نافذ العمل ہونے کے لئے اپنے حکم نامے پر یہ لکھا ''جوانی میری''۔ مطلب انہوں نے سرکاری اہلکاروں کو کہا کہ یہ گاؤں ایسی بری حالت میں ہے کہ اگر کوئی جوان وہاں رہ کر گھر میں بیٹھ بھی جاتا ہے اور برے ماحول کی وجہ سے وہ بڑھاپے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بری معاشی حالت کی وجہ سے صحت یابی کے حالات ہی نہیں۔ مطلب کسی بھی طرح سے گاؤں میں ایسی حالت ہی نہیں کہ لوگ صحت یاب نظر آئیں۔ اسی لئے حکومت کے اہلکاروں نے حکم نامے پر ''جوانی میری'' کے نام سے حکم دیا گاؤں کی حالت فوری طور پر سدھرنی چاہئے تاکہ ہر کسی کو پھر سے نئی جوانی میسر ہو۔ گاؤں کی حالت ہر اعتبار سے سدھر کر ہی ہر ایک کو صحت یابی محسوس ہو سکتی ہے اور اس سے وہ لوگ یہ کہیں گے کہ ''جوانی میری'' مطلب ہم پھر جوانی میں داخل ہو کر گاؤں کی اچھی مالی حالت دیکھ کر خوش ہوئے ہیں۔

اگر میں اس دلیل کو کہانی کی صورت یا افسانے کے صورت میں قلم بند کروں تو میں اس لحاظ سے لکھوں ''جوانی میری'' یا ''میرے اصول'' کے عنوان تحریر کروں گا۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

غالب نے دیوانِ غالب میں ایسے مطلع اور مقطع کو اس انداز سے لکھا ہے کہ اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ چاروں مصرعے ہمیشہ یاد رہتے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کی زبان سے یہ مصرعے

ادا نہیں ہوتے بلکہ جنہوں نے غالب کو ٹھیک طرح سے پڑھا ہے انہیں کے دلوں میں یہ چار مصرعے تا ابد دل و دماغ میں رہتے ہیں مطلب کہنے کا میرا یہ ہے کہ پڑھنے میں چار مصرعے اتنے کہنے میں نہیں لگتے جتنا کہ ان کا مطلب نکال کے دل میں چسپاں ہمیشہ رہا کرتے ہیں۔ غالب نے آئینہ کم دفعہ شعر کے مصرعوں میں استعمال کیا ہے، لیکن اگر مجھ سے دیوانِ غالب کو پڑھ کر بڑے بڑے ادیب یہ کہیں گے کہ آپ نے ان سے کیا سکھا۔ میں انہیں یہ کہوں گا کہ میں نے صرف ردیف اور کافیہ جوڑنے کا ہنر دیکھا۔ بلکہ ہنر کے ساتھ میں نے بہت طریقے کی نصیحت بھی سیکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بار بار کئی ایسے لفظوں کو غالب کے شعر کے بہت سے مصرعوں میں کہا ہے، لیکن مجھے حیرانگی ہوتی ہے ان مصرعوں کا مفہوم بہت ہی الگ پڑھنے میں محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً غالب نے لفظ زخم کو شعر کے مصرعوں میں بیان کیا ہے۔ زخم کو شاعر نے بار بار دہرایا ہے لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ زخم شاعر نے ایک ہی مطلب کے لئے شعر میں بیان کیا ہے۔ اس سے ہزاروں مطلب نکال کر بیان کر سکتے ہیں۔ اگر چہ غالب کی شاعری زیادہ تر فارسی اور عربی لفظوں سے جوڑی ہوئی ہے پھر بھی بلند پایہ شاعری تصور کر سکتا ہوں۔ غالبؔ نے اسی طرح اوپر کے چار مصرعے بیان کئے ہیں، آئینہ کو معشوق کے ساتھ مشابہت دے کر بیان کیا ہے اور باقی لفظ 'واعظ برا کہے' اگر میں یہ کہوں کیوں نہ میں ان چار مصرعوں کو تبدیل کر کے اس طرح کہوں مطلب بھی وہی پڑھنے میں نکلے گا جو غالب نے کہا ہے۔ صرف مصرعے کے لفظوں کو اِدھر اُدھر کرنا ہے جیسے کہ

نہ دوں کیوں آئینہ کہ تماشا کہیں جسے
کہاں سے لاؤں ایسا کہ تجھ سا کہیں جسے
نہ مان غالبؔ برا جو واعظ برا کہے
کوئی ہے ایسا بھی کہ سب اچھا کہیں جسے؟

جب ان چار مصرعوں کو پڑھنے والے لفظوں کو اِدھر اُدھر کرنے سے مطلب ڈھونڈنے

لگے تو مطلب کی تلاش میں وہ غالب کے اپنے چار مصرعوں سے متفق نہیں ہوسکتے ۔ جیسے میں نے بیان کیا ہے ’نہ دوں کیوں آئینہ کہ تماشا کہیں جسے‘ مطلب یہ کہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں اپنے آئینہ کو اپنے معشوق کو کیوں پیش کروں ۔ اگر میں مَیں پیش کروں یا اس کو آئینہ دکھاؤں تو لوگ اس کو دیکھنے کے لئے تماش بین کی صورت میں بازار میں جمع ہوسکتے ہیں، لیکن اس کے برعکس اگر غالب کے اصلی مصرعے پر سوچیں تو اس نے صحیح انداز میں مصرعے کو لکھا ہے ’آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے‘ اب اپنے خیال میں انہیں مصرعوں سے صحیح بیان بازی پڑھنے والے کو محسوس ہوسکتی ہے ۔ میں اپنے معشوق کو کیوں بیان کروں وہ میرے لئے ایک آئینہ ہے ۔ ایک شکل ہے ایک صورت ہے، اسی لئے میں اسے یہی کہہ رہا ہوں کہ میں اپنے آئینہ کو پیش نہیں کرسکتا ۔ اگر پیش کروں تو ایک تماشہ کی صورت میں بازار میں نمودار ہوکر میری عزت لوگوں کے نگاہوں میں کم ہوجائے گی ۔ اسی لئے لفظوں کو ادھر اُدھر کرنے سے بھی شاعری کا مفہوم الگ ہوسکتا ہے ۔ اب میں پڑھنے والوں کو غالب کے اصلی مصرعوں کی طرف توجہ مرکوز کر کے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر ہم شعر لکھیں تو ہر ایک مصرعے میں مصرعوں کے طور طریقے سے بھی مطلب شاعر کے اندرونی خیالات اور جذبات سے الگ ہوسکتی ہے جبکہ ہم شعر کے مصرعوں کو ادھر اُدھر بیان کریں گے جیسے کہ میں نے غالب کے اصلی چار مصرعوں کو اسی صورت میں لکھا ۔ جس صورت میں غالب نے بیان کیا ہے لیکن میں نے ان چاروں مصرعوں کے لفظوں کے لحاظ سے ادھر اُدھر لکھ کر بیان کیا ہے ۔ لیکن ان چار مصرعوں کو ادھر اُدھر لفظوں کے ذریعہ کرنے سے بھی مفہوم الگ ہوسکتا ہے ۔ مطلب جو شاعر نے اندرونی جذبات شعر میں بیان کئے ہیں اور کرسکتے ہیں ۔ اسی لئے شاعر کے ہر ایک لفظ کا اپنا اپنا مفہوم ہوسکتا ہے ۔ جب کوئی نیا شاعر اپنی شاعری کسی استاد کو دکھاتا ہے تو وہ اُس کو استاد ہونے کے ناطے پہلے اس نئے شعر کو بہت طریقوں سے ستا کر اسے شاعری تسلیم نہیں کرتی ۔ کسی وقت اس نئے شاعر کو یہی استاد اس کے تلفظ کو اسی طرح سے ردو بدل لفظوں میں کرتا ہے ۔ جس طرح میں نے غالب

کے چار مصرعوں کے لفظوں میں ردوبدل کیا لیکن جب ہم کسی استاد کو کسی نئے شاعر کی اصلاح کرتے دیکھیں گے تو وہ اس نئے شاعر کا خیال اس طرح کے لفظوں میں ردوبدل کرنے سے اس کے خیالات کو الگ کر کے کرتا ہے۔ جس سے نئے شاعر کو اپنی شاعری کے لہجے اور سوچ میں ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ وہ استاد اسی لئے شاعری میں اصلاح کرتا ہے تاکہ وہ اپنی صلاحیت شاگرد کو دکھا کر یہ کہے کہ وہ بھی ایک بہت بڑا قلمکار ہے خیر اپنی اپنی سوچ اور اپنی اپنی دلیل۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالب اپنی غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ میرے جذبات معشوق کے تئیں صحیح ہیں۔ میں اپنی عزت کو لوگوں کے سامنے گرانا نہیں چاہتا ہوں نہ میں پاک محبت میں معشوق کی ہی عزت گرانے والا ہوں۔ اس پر میں اب یہ کہہ رہا ہوں کہ معشوق کی خدوخال کے بارے میں بہت سے دوست مجھے ہر روز یہ کہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس کی خدوخال نہیں بتاتے۔ مطلب اس کی صورت سے ہمیں واقف نہیں کراتے۔ یہ سن کر میں ان لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ کیسے میں ان کو اپنے معشوق کی صورت کے بارے میں بیان کروں یا ان کی صورت دکھاؤں کہ کیا وہ میرے معشوق کے تماش بین بنیں گے۔ میرے جذبات ان اصولوں کے خلاف ہیں۔ اسی لئے اب میں ان دوستوں اور رفیقوں سے یہ کہوں گا کہ میں ان کی صورت کی شناخت کیسے کراؤں اور لا کر آپ کو دکھاؤں اور خدانخواستہ جب وہ دوست میرے معشوق کو دیکھیں گے اور دیکھ کر یہ کہیں گے کہ یہ ایسا آئینہ ہے اس آئینہ کا کوئی شمار ہی نہیں۔ اور ایسی شکل شاعری کی بھی نہیں ہے مطلب معشوق کی بھی نہیں ہے۔ یہی کہیں گے کہ معشوق کی صورت اچھی ہے لیکن محبوب کی صورت اچھی نہیں ہے۔ ایسے تبصرہ پر بھی میں انہیں کیسے آئینہ دکھا سکتا ہوں اسی لئے میں ان باتوں پر جرح کرنے کے بعد یہی کہتا ہوں کہ میں انہیں کبھی بھی معشوق کا آئینہ نہیں دکھاؤں گا اور نہ ہی ان کو اس آئینہ سے واقف کراؤں گا۔ تبھی تو میں یہ کہہ رہا ہوں

کہ کس طرح میرے آئینہ کو دیکھنے کے لئے جذبات ابھارتے ہیں میں ان کے اصولوں کے خلاف ہوں۔

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

مقطع میں شاعر مطلع کا حوالہ دے کر بیان کرتا ہے کہ شاعر میں جذبہ اگر بہت سے لوگ اس قسم کا پیدا کرتے ہیں کہ معشوق کی تصویر دکھانا یا اس کے آئینے کے بارے میں اپنی نظر ڈالنا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میں اپنی پاک محبت کے اصولوں پر چلنے والا آدمی ہوں۔ میں اپنے معشوق کے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتاتا۔ میرے پاس خفیہ طور پر آئینہ موجود ہے لیکن اس آئینہ کو اپنے دوستوں کے سامنے نہیں بیان کرسکتا۔ اسی لئے ان جذبات پر چل کر اگر مجھے برا بھی کوئی کہے لیکن میں ان کی برائی کو لڑائی سے نہیں دوستی سے ہی دور کروں گا اور یہ کہوں گا کہ آپ چاہے کتنا ہی برا کہیے میں سن لوں گا۔ سن کر میں اس بات کی داد دے رہا ہوں کہ میں کسی کی شناخت نہیں کرسکتا۔ میں کسی کی صورت کو پوشیدہ رکھ کر یہ کہوں کہ میرے دل کے جذبات کسی کے احوال بتانے پر رضا نہیں ہیں، لیکن ان باتوں اور اصولوں کے باوجود کوئی دوست مجھے یہ کہہ کہ اس نے ان باتوں سے ہمیں ناراض کیا جن باتوں سے ہم نے اس پر دباؤ ڈالا۔ میں پاک محبت میں پردہ فاش کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں ایسا شاعر اور ایسے جذبات رکھنے والا قلمکار ہوں کہ میں کسی کی صورت حال پر کوئی بتصرہ نہیں کرسکتا اور اس صورت کی شناخت کرنے والا ہوں جس صورت کو دیکھنے کیلئے بہت سے لوگ ترستے ہیں اور جب میں ایسی بیان بازی کبھی کروں تو میرے معشوق کی صورت بازار میں تماشہ کے طور پر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اسی لئے شاعر مقطع میں فرماتا ہے کہ میرے جذبات کسی کے آئینے کو ٹھیس پہنچانے کے لئے نہیں ہیں۔ میں ہر ایک کے آئینہ کو عزت واحترام کے ساتھ انکی مخصوص جگہ پر ہی رکھنے والا آدمی ہوں۔

اگر میں لفظ غالب کے مطلب پر مقطع کا بیان کروں تو میں کہوں گا کہ غالب نے اپنے

مقطع میں مطلع کے لفظ سے یہ بیان کیا ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ کسی کے جذبات یا کسی کے راز کو بازار میں نہیں بیچنا چاہئے۔ ہر ایک کے جذبات اور خیالات پوشیدہ ہی رکھنے چاہئیں۔ اگر کوئی محبت کرتا ہے تو ہمیں اس محبت کو پوشیدہ طریقے سے انجام دینا چاہئے۔ اگر محبت میں کامیاب نہیں ہو سکے تو اس محبت کا راز فاش کرنے سے معشوق اور محبوب کی بدنامی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ میں کسی کو اپنے آئینے کی شناخت نہیں کراوں گا۔ میں آئینہ خفیہ رکھ کر ہی اپنے میں سکون محسوس کر کے دل کے جذبات میں تا ابد رکھوں گا لیکن میں یہ بھی احساس دلاتا ہوں اگر کوئی کسی معشوق کے ساتھ محبت کرے وہ محبت پاک محبت کے اصولوں پر ہونی چاہئے۔ ایسے اصول ہونے چاہئیں کہ ہمیں کسی کے جذبات سے کھیلنا نہیں چاہئے۔ جب ہم ان اصولوں پر چلیں گے تو پاک محبت میں کامیابی ضرور ہو سکتی ہے۔ انہیں اصولوں سے فتحیاب پاک محبت میں ہو سکتے ہیں۔ پاک محبت میں تب فتحیابی ہو سکتی ہے جب ایک دوسرے کی محبت کا رشتہ کسی تیسرے فریق کے بغیر ہو۔ اسی لحاظ سے پاک محبت میں فتحیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں + کہ تماشا کہیں جسے = آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

ایسا کہاں سے لاؤں + کہ تجھ سا کہیں جسے = ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالب برا نہ مان + جو واعظ برا کہے = غالب برا نہ مان جو اعظ برا کہے

ایسا بھی کوئی ہے + کہ سب اچھا کہیں جسے؟ = ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

"آئینہ کیوں نہ دوں"

سماج میں بدرسومات موجود ہیں جن سے بہت ہی برائی مرد و عورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی شادی کرتا ہے تو وہ جہیز کے بارے میں لڑکی والوں کو تنگ کرتا ہے جو کہ ایک بہت ہی بری رسم ہے۔ ہمیں ان رسموں سے الگ رہنا چاہئے۔ بری رسموں سے ہی بہت سی برائیاں سماج میں پنپتی ہیں اور بہت سی غلطیاں ہر ایک انسان کرتا ہے۔ اسی بری رسم کی وجہ سے نا جانے کتنے قتل و غارت مختلف رسالوں اور اخباروں میں پڑھنے میں آتے ہیں۔ حال ہی

میں مَیں نے کسی رسالے میں یہ پڑھا کہ ایک عورت جس کا نام رویندر کور ہے بہت ہی پڑھی لکھی تھی۔ اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے اسے کوئی بھی لڑکا سماج میں نہیں ملا۔ اسی انتظار میں وہ چالیس برس کی ہوگئی۔ یہ حال دیکھ کر بہت سے سماج سدھارکوں نے اسے بہت سے لڑکے دکھائے لیکن رویندر کور نے کسی بھی لڑکے کو مانا ہی نہیں۔ مطلب اس نے شادی کے بغیر چالیس سال کی زندگی اسی طرح گزار دی۔ ایسی حالت میں دیکھ کر اس سے سوالات پوچھے کہ آپ آگے کیا کرسکتی ہو۔ جب کہ آپ کی عمر بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تو آپ کے لئے بہت ہی دشوار کن حالت دیکھنے میں آئیں گے۔ یہ کہہ کر وہ مختلف سماج سدھارکوں سے کہنے لگی کہ مجھے کوئی بھی لڑکا میری تعلیمی قابلیت کے برابر کا ملا ہی نہیں میں کیا کروں۔ جب مختلف سماج سدھارکوں نے رویندر کور سے ایسی وجہ سنی تو انہوں نے ایک لڑکا سے جس کا نام بلبیر چند ہے کہا کہ آپ کسی طریقے سے اس لڑکی کو محبت کے جال میں پھنسانا۔ انہوں نے بلبیر چند کو بطور کیرایہ دار اس کے گھر میں رکھا، لیکن رویندر کور کو یہ سمجھ آیا کہ یہ کیرایہ دار نہیں ہے بلکہ سماج سدھارکوں نے میرے لئے یہی لڑکا شادی کے لئے ڈھونڈا ہے۔ رویندر کور اس کے بہت ہی قریب آنے لگی۔ اب ایسے حالات نمودار ہوئے کہ رویندر کور نے بھی اس سے شادی کرنے کے لئے رضامندی دکھائی اور شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد لوگوں نے بلبیر چند کو یہ کہا کہ ایک پڑھی لکھی امیر گھرانے کی لڑکی آپ کے ساتھ کیسے شادی کے لئے تیار ہوئی۔ بلبیر چند نے جواب دیا کہ یہ قسمت کی بات ہے جہاں خدا چاہے وہیں پہنچ سکتے ہیں، لیکن لوگوں نے حیرانگی ظاہر کر کے بتایا کہ بلبیر چند ایک سرکاری ملازم وہ بھی چپراسی۔ بلبیر چندر نے رویندر کور کو اپنے پیشے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ صرف یہ بات بتائی کہ وہ ایک سرکاری ملازم ہے۔ رویندر کور نے جب سنا کہ بلبیر چند ایک معمولی آدمی ہے اور سرکاری کام ایک چپراسی کی حیثیت سے کرتا ہے رویندر کور کو کوئی ٹھیس محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے لڑکے کو تسلیم کر کے ہی زندگی بسر کی اور دونوں میاں بیوی اب صحیح انداز سے اپنا گھر سنبھالنے لگے۔ لیکن

بہت سے پڑھے لکھے آدمیوں نے رویندر کور سے یہ کہا کہ اگر آپ سے اپنی پڑھائی کے حساب سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکے بھی شادی کے لئے رضا مند ہوئے تو آپ ان کو کیوں ٹھکراتی رہیں کیا وجہ ہے، رویندر کور نے انہیں جواب دیا کہ اگر آج کل کوئی لڑکا یا لڑکی پڑھا لکھا بھی ہو جہیز کے صورتحال سے دونوں شادی کے دائرے میں رضا مند ہوتے ہیں۔ میرے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ میں ان لڑکوں کو جہیز دے سکتی اور وہ مجھے شادی کے لئے رضا مند ہوتے۔ اسی لئے میں انہیں تسلیم نہیں کرتی، یہ بھی کہتی ہوں کہ آئندہ مجھے ایسی باتوں سے بحث ومباحثہ نہیں کرنا چاہیے۔ تبھی تو میں یہ بات ان لفظوں سے اختتام تک پہنچاتی ہوں ''آئینہ کیوں نہ دوں'' مطلب میں اپنی زندگی کیوں ان کو دوں جہاں مجھے بے عزتی کا سامنا کرنے پڑے۔ میں کہاں سے شادی کے لئے جہیز ان لڑکوں کو دوں۔ میں نے شادی کی رضا مندی ایک ایسے لڑکے سے کی جو کہ ناخواندگی کے طور طریقوں سے دفتر میں کام کرتا ہے۔ اور یہی ناخواند میری ہر وقت عزت واحترام کرے گا اور اسی لئے میں ان کو اپنا ''آئینہ کیوں نہ دوں'' مطلب میں اپنی عزت نہیں دینے والی میں اپنا چہرہ کسی کو پیش کرنے والی نہیں تبھی تو ان ہی الفاظ کو دہرا کر کہتی ہوں کہ ''آئینہ کیوں نہ دوں''

''کہ تماشا کہیں جسے''

جب شادی کے بعد رویندر کور اور بلبیر چند بازار میں گھومنے نکلتے تھے تو مختلف پڑھے لکھے لوگ ان کو دیکھ کر اپنے اپنے تاثرات کہتے تھے۔ کئی یہ کہتے تھے کہ بلبیر چند کی ایسی قسمت جاگی کہ ایک ایسی پڑھی لکھی عورت اس کے نصیب میں آئی، کہاں بلبیر چند اور کہاں رویندر کور۔ یہی تبصرہ ہمیشہ دونوں کا سڑک پر چلتے ہوئے کرتے رہے۔ ایک دن ایک آدمی نے کسی شخص سے ایسا ہی تبصرہ کیا۔ وہ شرارت میں اس آدمی سے کہنے لگا کہ ابھی تک ہمیں سماج کو سدھارنا نہیں آیا۔ جس سے کہ ہم کسی بھی ناخواندہ لڑکے کی ایسی صورت دیکھنے پر تبصرہ میں ڈوبتے ہیں۔ ایسی بات کبھی نہیں کہنی چاہیے اور نہ بتانی چاہیے۔ ان الفاظ سے قوم میں کوئی

روپئے موصول کرتا ہے کیا ایسے خیالات بتانے پر کوئی مکان حاصل ہوسکتا ہے، ہمیں ایسی باتیں کبھی نہیں بتانی چاہئے۔ ہمیں ایسی لڑکی کی عزت واحرام کرنا چاہئے۔ جس نے ایک غریب گھرانے کے لڑکے کو پناہ دے کر اور شادی منظور کر کے اس لڑکے کو اپنا بنا کر روپیوں سے امیری کے ماحول میں پال کر غربت کا ماحول تہس نہس کیا۔ ایسی لڑکی پر کبھی ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئے اور نہ ایسی باتیں سڑک پر اظہار کرنی چاہیے، یہ سن کر لوگوں نے اسے تعریف کے ماحول میں عزت فراہم کی اوراحترام بھی دیا۔ وہاں جس کسی آدمی نے اس آدمی کے ایسے خیالات سنے تو انہوں نے کہا کہ ''کہ تماشا کہیں جسے'' مطلب انہوں نے یہ کہا کہ اس شادی پر کئی بری رسمیں کرنے والوں نے ایک تماشہ کے طور پر اس شادی کو تصور اپنے خیالات کے جذبوں میں کھلونا بنایا ہے، ان آدمیوں کو کھلونا بنایا ہے جن آدمیوں کو اب محسوس ہورہا ہے کہ رویندر کور کے ساتھ شادی کی رضامندی کیوں نہیں کی۔ اسی لئے اب ان کے دلی جذبات سڑ رہے ہیں اور راستے میں جب میاں بیوی کو دیکھتے ہیں اور ایسے الفاظ کہہ کر لوگوں میں قوتِ برداشت نہیں ہے تو وہ ان جذبات کو یہ کہہ کر جواب دیتے ہیں ''کہ تماشا کہیں جسے'' مطلب اگر کوئی ان میاں بیوی پر برے جذبات کی تفصیل بتائیں کہ ہم ماننے والے نہیں، ہم تسلیم کرنے والے ہیں ہم یہ کہیں ''کہ تماشا کہیں جسے'' اگر انہیں تماشہ بھی کہیں لیکن ہم ان کے آپسی سمجھوتہ پر بہت ہی رضامند ہیں اور یہ کہہ کر اس بات کو اختتام تک پہنچایا پھر یہی لفظ دہرا کر بات ختم ہوئی ''کہ تماشا کہیں جسے''

''ایسا کہاں سے لاؤں''

ایک دن جب دونوں میاں بیوی راستے میں چل رہے تھے تو رویندر کور کے بڑا عہدیدار دفتر کا ملا۔ رویندر کو نے اپنی گاڑی ایسی جگہ پر روکی تھی جہاں پر دوسرے لوگوں نے بھی اپنی گاڑیاں روکی تھیں۔ رویندر کور کو بڑے عہدیدار کے ساتھ ملاقات کرتے وقت اس عہدیدار کی اس کے شوہر پر نظر پڑی وہ رویندر کور کو کہنے لگی کہ آپ نے شادی کی ہے رویندر کور نے جواب

دیاہاں میں نے شادی کی ہے یہی آپ کا خاوند ہے رویندر کور نے جواب دیا ہاں یہی میرا خاوند ہے اس کا نام بلبیر چند ہے۔ ہے تو کم پڑھا لکھا لیکن میرے لئے بہت ہی اچھا ہے میرے لئے آئینہ ہے اور میں اسے آئینہ کے طور طریقے سے دیکھ کر اپنے منھ کو سنوارتی ہوں اور راستے میں سنوار کر ہی چلتی ہوں۔ مانتی ہوں یہ لڑکا بڑے عہدے پر نہیں ہے لیکن سماج کے بری رسموں سے دور رہ کر ان کو ختم کرنے کے لئے میں نے ایسے لڑکے کو تسلیم کیا ہے۔ میں اگر پڑھی لکھی بھی ہوں لیکن اگر میں کسی پڑھے لکھے لڑکے سے شادی کر لیتی تو مجھے بری رسموں کے بنا پر اور جہیز کے بناء پر الگ ہونا پڑتا یا جہیز کے بنا پر مجھے خودکشی کرنے کا ماحول بھی دیکھنے کو ملتا۔ ان باتوں کو دور کرنے کے لئے میں نے اسی لڑکے کے ساتھ رضا مندی کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات سن کر بڑے عہدیدار نے رویندر کور کی تعریب کی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ اس بات پر رویندر کور نے عہدیدار کو جواب دیا ''ایسا کہاں سے لاؤں'' مطلب ایسے لڑکے کے علاوہ کون میرے لئے رضا مند رہتا جبکہ ہر ایک سماج میں جہیز کی بدعت موجود ہے۔ میں ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہوں جہیز کو جلا کر میں نے ایسے لڑکے کو ترجیح دی جو کہ جہیز کو الگ کر کے میرے ساتھ اچھی زندگی بسر کر سکتا ہے اس کے بعد رویندر کور نے اپنی گاڑی میں بلبیر چند کو بٹھا کر گاڑی کو چلایا اور چلاتے ہوئے عہدیدار کو یہ کہا ''ایسا کہاں سے لاؤں''

''کہ تجھ سا کہیں جسے''

جب بلبیر چند نے عہدیدار کے ساتھ رویندر کور سے ایسی دلیل سنی تو بلبیر چند نے رویندر کور سے کہا کہ میری پڑھائی کی آپ عزت نہیں کرتے۔ کیا میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور میری کم پڑھائی پر آپ کو بہت ہی غم ہے۔ یہ سن کر رویندر کور نے بلبیر چند سے کہا کہ میں آپ کو ہمیشہ کے لئے تسلیم کرتی ہوں اور مذہبی قانون کی وجہ سے اپنے شوہر کی عزت کرنا لازم ہے۔ اس لحاظ سے بھی آپ کی میں عزت اور احترام کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ میں یہ نہیں سوچتی

ہوں کہ آپ پڑھے لکھے نہیں ہو کیا آپ کی آنکھیں اور ہاتھ نہیں ہیں۔ ہاں ایک چیز کی کمی ہے وہ ہے کم تعلیم، لیکن میں یہ کم تعلیم تسلیم کرتی ہوں۔ ہمیشہ ایک پڑھے لکھے آدمی کو ناخواندہ کے ساتھ ہی اپنی زندگی بسر کرنی چاہئے تا کہ اس کو اپنے ماحول سے ناخواندگی کا جذبہ خواندگی میں مرکوز ہو جائے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم پڑھے لکھے ہیں اور ہم نے سند حاصل کی ہے۔ سند حاصل کرنے کے باوجود بھی ہم پڑھائی کے اصولوں پر نہیں چلتے ہیں۔ سند حاصل کرنا ہی تعلیم یافتہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ آپ کے پاس اگر تعلیم کی سند نہیں ہے لیکن آپ کے اخلاق جو میں نے شادی کے بعد دیکھے وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکے کے برابر ہیں۔ رویندر کور کی گاڑی اپنی گھر کے دروازے پر پہنچی اور باتیں کرتے ہوئے گھر کے بڑے دروازے کو کھول کر گاڑی کو گھر میں کھڑی کی۔ آخر میں رویندر کور نے بلبیر چند کو بتایا کہ میں آپ کو ہمیشہ کے لئے اپنا پیار اور اپنا سب کچھ دینے کے لئے رضامند ہوں۔ اور میں اب اس بات کو ان لفظوں سے ختم کرنا چاہتی ہوں ''کہ تجھ سا کہیں جسے'' مطلب جب میں نے آپ کو اپنا شوہر تسلیم کیا اور مذہبی طریقے سے بھی شادی رچائی تو میں کیسے آپ کی پڑھائی کا جائزہ لوں۔ میں آپ کے اخلاق اور تعلقات و جذبات کو تسلیم کر کے ہمیشہ کے لئے شوہر مانتی ہوں اور یہ کہہ کر آپ کو یہ بتاتی ہوں ''کہ تجھ سا کہیں جسے'' میں یہی کہہ رہی ہوں کہ میرے لئے ہمیشہ بلبیر چند ہی بلبیر چند ہے۔

''غالب برا نہ مان''

جب دونوں کی باتیں ہوئیں اور رویندر کور نے پھر ایک بار بلبیر چند کو کہا کہ آپ کی کم پڑھائی پر مجھے کوئی صدمہ نہیں ہے اور میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ بلبیر چند زیادہ تر اُردو کی کتابیں کمرے میں پڑھتا تھا۔ اسے انگریزی زبان سے واقفیت ہی نہیں تھی۔ بلبیر چند اُردو میں اتنا ماہر تھا کہ اس کے کئی افسانے اور تنقید ملک کے مختلف رسالوں میں چھپتے تھے۔ ایک دن رویندر کور نے اس کی تصویر کسی رسالے میں دیکھی دیکھ کر متاثر ہوئی اور بلبیر چند کو یہ بتایا کہ میں نے آپ کی تصویر کسی اچھے اردو رسالے میں دیکھی، لیکن دفتر والوں نے یہ کہا کہ آپ

کے شوہر کی تصویر اُردو رسالے میں چھپی ہے اور یہ بات کہی کہ ہم اُردو نہیں پڑھ سکتے۔ یہاں ایک پڑھنے والا ہے جو کہ بلبیر چند کی طرح اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ سن کر رویندر کور کو خوشی بھی محسوس ہوئی اور دفتر والوں کے کہنے سے غم بھی محسوس ہوا۔ وہ یہ کہ رویندر کور کہنے لگی کہ کیا چھوٹے عہدے پر بیٹھنے والے ہی اُردو کے ماہر ہیں اور بڑے عہدے پر بیٹھنے والے اردو زبان نہیں جانتے ہیں۔ سبھی نے اس آدمی کو بلایا جس کو دفتر میں اُردو زبان سے واقفیت تھی۔ اور انہوں نے بلبیر چند کے فوٹو پر لکھا ہوا مضمون پڑھنے کو کہا۔ جب اس آدمی نے مضمون پڑھا تو سب کے سب سن کر متاثر ہوئے اور بلبیر چند کی بہت تعریف کرنے لگے۔ جب رویندر کور گھر پہنچی تو بلبیر چند کو ان باتوں سے آگاہ کیا۔ بلبیر چند نے کہا کہ میرے پاس رسالہ ماہنا آتا ہے یہ بہت ہی مشہور رسالہ ہے۔ رویندر کور نے اب یہ گذارش کی کہ مجھے بھی اردو زبان سے واقفیت کراؤ۔ اس پر بلبیر چند نے کہا کہ کسی وقت میں آپ کو اس زبان سے واقفیت ضرور کراؤں گا۔ اسی دوران ڈاکیہ گھر آیا، ڈاکیہ نے ایک خط بلبیر چند کے حوالہ کیا۔ جب چند اس خط کو پڑھ رہا تھا تو رویندر کور بھی حاضر تھی۔ رویندر کور نے پوچھا کہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ بلبیر چند اس سے کہا کہ مجھے کسی ادبی ادارے سے اُردو اعزاز ملنے کی فرمائش آئی ہے۔ یہ اعزاز "غالبؔ برا نہ مان" کے نام سے دیا جائیگا اور اس اعزاز کے ساتھ ساتھ مجھے ایک لاکھ روپئے نقد دیا جائیں گے۔ رویندر کور یہ سن کر بہت ہی خوش ہوئی کہا کہ اس اعزاز کا نام کیوں "غالب برا نہ مان" رکھا گیا ہے۔ بلبیر چند نے رویندر کور کو بتایا کہ اس لئے اس اعزاز کا نام رکھا گیا ہے کیوں کہ میں نے آپ کے ساتھ شادی ایک معشوق اور محبوب کے انداز میں کی ہے۔ مطلب میں پہلے آپ کے ساتھ بطور کرایہ دار محبت کے اصول اپناتا۔ اس کے بعد آپ نے شادی کی رضامندی کا اظہار کیا۔ اسی لئے ان ادیبوں نے اس اعزاز کو ایسے نام سے رکھا ہے۔ "غالبؔ برا نہ مان"

"جو واعظ برا کہے"

یہ سن کر رویندر کور خوش ہوئی اور مسرت میں ڈوب کر اپنے شوہر بلبیر چند کو بتایا کہ اگر میں انگریزی زبان کی ماہر ہوں لیکن آپ اردو زبان کے بہت ہی مشہور ادیب ہو۔ادیب اس لئے کیونکہ کسی ادبی ادارے سے ایسا اعزاز موصول ہونا چھوٹی بات نہیں ہے۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔انہیں جذبات کے ساتھ بلبیر چند نے یہ کہا کہ مجھے آپ کے ساتھ جب راستے میں دیکھتے ہیں تو بہت سے اپنے اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔وہ آپ کی بات کرتے ہیں جب ہمیں دیکھتے ہیں۔ہاں میں مانتا ہوں کہ مجھ میں انگریزی زبان کی کمی ہے۔ورنہ اردو زبان کا ماہر ہوں تبھی تو کئی ادبی تنظیمیں میری قلم کا احترام کرتے ہیں۔اور میں نے اس قسم کا اعزاز پایا۔

یہ سن کر رویندر کور نے کہا کہ کسی برے الفاظ سے یہ نہیں سوچنا کہ ہم میں کوئی تناؤ ہے ہم تاابد آپسی محبت میں رہیں گے اور کبھی بھی ہم اپنے میاں بیوی والے تعلقات سے الگ نہیں ہوں گے۔اسی لئے میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ''جو واعظ برا کہے'' مطلب جو بھی ہماری محبت یا شادی کے بارے میں برا بھلا کہے اسے کہنے دو۔جمہوری دور میں کچھ مخالفت بھی کرتے ہیں اور کچھ تعریف بھی کرتے ہیں۔اسی لئے اس جمہوری نظام میں ایسی باتیں کر ہی لیتے ہیں میں ان باتوں کا اختتام تک پہنچا کر یہ کہتی ہوں کہ **''جو واعظ برا کہے''**

''ایسا بھی کوئی ہے''

جب خوشی اور مسرت بلبیر چند کو ملی تو اس نے سوچ کر یہ محسوس کیا کہ کس طرح میرا قلم وجود میں آیا اور ایک لاکھ روپیہ کا انعام حاصل کیا۔اس کے بعد کئی ادبی تنظیموں کی طرف سے بلبیر چند کو مبارکباد آنے لگی، کئی تنظیموں نے نشریات کے ذریعے بلبیر چند کو مبارکباد دی۔کئی نے دن بھر موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعہ مبارکباد دی۔اور تصویر کے ذریعے بھی بلبیر چند کو مبارکباد دے کر اسے احساس دلایا کہ بلبیر چند ایک قدآور شخصیت اردو زبان کے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ایسا ماحول دیکھ کر رویندر کور کہنے لگی کہ ''ایسا بھی کوئی ہے''۔مطلب جب رویندر

کور نے محسوس کیا کہ میں اس شادی سے خوش ہوں کیونکہ بلبیر چند انگریزی زبان کا ماہر نہیں ہے صرف یہ اردو زبان جانتا ہے۔ مانتی ہوں کہ اس کی ملازمت چھوٹے عہدے پر ہے پھر بھی اسے ایک عالمی ادیب کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اب میں یہ سوچتی ہوں کہ ''ایسا بھی کوئی ہے'' مطلب بہت سے لوگ اسے زبانی مبارکباد دے رہے ہیں اور بہت سے لوگ مختلف رسالوں میں مبارکباد لکھ کر دے رہے ہیں۔ اس بات پر اظہار کرتے ہوئے اب رویندر کور نے کہا کہ واقعی ''ایسا بھی کوئی ہے''

''کہ سب اچھا کہیں جسے؟''

جب رویندر کور اور بلبیر چند نے اپنی زندگی کے بیس سال ایک ساتھ گزار دیئے اور ان کے دو بچے بھی پیدا ہوئے اور دونوں بچوں کی پرورش کر کے ان بچوں کو بھی اچھی تعلیم دے کر اپنی زندگی اچھے طریقے سے بسر کرتے رہے۔ پھر بھی سماج میں ان باتوں میں جو باتیں ان کی شادی کے تبصرے پر کرتے رہے، کمی نہیں ہوئی۔ حتی کے بیس سال گزرنے کے بعد بھی لوگوں میں وہی جذبہ دیکھنے میں آیا، کہ وہ کبھی کبھی رویندر کور کو یہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے ناخواندہ کے ساتھ شادی رچائی ہے۔ اتنا اعزاز بلبیر چند کو حاصل ہونے کے باوجود بھی لوگوں میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی، لیکن سوچ کر رویندر کور نے بلبیر چند سے یہ کہا کہ ہمارے بچے اب اچھے تعلیم یافتہ ہوئے ہیں۔ لیکن ہم ان کی شادی کریں تو کچھ ایسے عناصر سماج میں رشتہ نہیں منظور کریں گے جن کے ذریعہ ہمیں طعنے سہنے پڑے۔ یہ سن کر رویندر کور نے بلبیر چند سے کہا کہ اس بات سے الگ سوچ رکھنا۔ ہمیں ایسا ضدی جذبہ سماج کے لئے نہیں رکھنا چاہئے۔ ہر ایک کے ساتھ بھائی بندی کا جذبہ رکھنا چاہئے۔ ہمارے بارے میں جو کچھ بھی کہے انہیں ان الفاظ سے ''کہ سب اچھا کہیں جسے؟'' کہنے دو مطلب ہر ایک کے بارے میں اپنے تاثرات بتانے ہیں کہنے دو۔ جمہوری نظام میں ایسے عناصر سماج میں دیکھنے میں آتے ہیں اسی لئے جو کچھ بھی کہیں کہنے دو اور یہ جذبہ رکھو ''**کہ سب اچھا کہیں جسے؟**''

اگر میں اس دلیل کو افسانے یا کہانی کے طرز پر تحریر کروں تو میں اس کا عنوان لکھوں گا ''کہ سب اچھا کہیں جسے؟'' یا ''رویندر کور کی شادی''

اب تک میں نے غالب کے بارے میں مختلف تاثرات بیان کئے اور غالب کے مطلع اور مقطع پر مختلف دلیلیں بھی لکھیں اور اس طرح سے کہانی یا افسانہ بیان کرنا ادیب کے لئے بہت ہی مشکل ہے۔ جس طرح میں نے غالب کے چار مصرعوں کو تقسیم کر کے دلیل لکھی۔ افسانے اور کہانیاں بھی تحریر ہو سکتی ہیں، لیکن عالمی اردو شاعروں اور ادیبوں نے اس طرح کا طریقہ نہیں اپنایا ہوگا میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ دوسری زبانیں بھی اس طرح کا طریقہ ضرور اپنائیں گی۔ باقی زبانوں میں بھی اس طریقے سے کسی نے کہانی یا افسانے بیان نہیں کئے ہوں گے۔ عالمی اُردو ادب کے دائرے میں میں نے یہ لکھا اور اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ غالب کے مطلع اور مقطع میں کس قسم کی بیان بازی ہے اور کس قسم کا پیغام بیان کیا ہے غالب نے۔ پیغام غالب کے رجحان میں میں نے اس طریقے کا ادب بیان کیا لوگ خاص کر پڑھنے والے حیران ہوں گے کہ یہ کیسے چاروں مصرعوں کے لفظ ملا کر ایک دلیل بنتی ہے اور اس دلیل کو کہانی یا افسانے کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں۔ اب میں اس طریقے کو دوسرے طریقے سے اپنا کر پڑھنے والوں کو یہ بتاؤں کہ کس طرح غالب کے چار مصرعوں کو الگ الگ کر کے ایک کہانی تحریر ہو سکتی ہے۔ غالب کے مطلع اور مقطع کو چار مصرعوں میں تقسیم کر کے کہانی بھی بن سکتی ہے، اس پر میں دو تین کہانیاں تحریر کر کے پڑھنے والوں کا رجحان دوسرے انداز میں بیان کر کے مرکوز کرتا ہوں۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نَے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم غالب
آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے؟

شاعر نے دیوانِ غالب میں اس مطلع اور مقطع کو غزل میں بیان کر کے اپنے معشوق کے غم و غصے کا اظہار بیان کیا ہے۔ عام طور پر ہم غالب کے زیادہ تر افسوس پر ہی بیان بازی کرتے ہیں جو کہ اس نے اپنی غزلوں میں لکھا ہے۔ غالب نے زیادہ تر فریاد، زخم، درد ایسے ایسے لفظوں سے غزل کے مصرعوں کو باندھ کر لوگوں کو سمجھایا ہے کہ اسے کتنے غم و غصے پاک محبت میں معشوق نے دیئے ہیں۔ جب ہم مطلع اور مقطع کو غور سے پڑھیں گے تب ہمیں اس بات کا احساس پڑھنے میں ضرور ہوگا کہ غالب نے چار مصرعوں میں زبان کو سادہ طریقے سے مطلب سادے الفاظ کا گھراؤ کر کے لکھا ہے۔ فریاد فارسی کا ہی لفظ ہے، نَے بھی فارسی سے وابستہ ہے کشمیری زبان میں بھی 'نَے' اس کو کہتے ہیں جس کھیت کے ساتھ ایسی زمین پائی جائے جس میں درخت کے بغیر کوئی چیز اُگتی نہیں اور اس کے اِردگرد پانی ہوتا ہے لیکن کبھی بھی ایسا پانی زمین میں جذب نہیں ہوتا۔ سمجھو ایک ایسا نالہ یا چشمہ جو کہ ظاہری طور پر چشمہ نہیں ہے بلکہ زمین کے کسی ٹکڑے پر چاروں طرف پانی ہے اور ساتھ ہی کھیت اور درخت بھی ہے لیکن ایسی زمین میں دھان نہیں اُگتا۔ اس لئے زمین کو کشمیری زبان میں 'نَے' بھی بولتے ہیں۔ کسی وقت پہاڑی ڈھلوان پر ایسے ٹکڑے کو بھی دیکھتے ہیں اور اس کو بھی 'نَے' کے نام سے پکارتے ہیں۔ کشمیری زبان میں پٹھان دور میں لفظ 'نَے' کا رجحان فارسی لفظوں کو کشمیری زبان میں لانے سے ہی پایا گیا ہے۔ اسی طرح سے غالب نے 'ہستی' کا بھی استعمال کیا ہے یہ بھی فارسی زبان کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، مطلب کہنے کا یہ ہے کہ غالبؔ نے دیوانِ غالب میں اُردو کی غزلیں تحریر کیں ہیں لیکن اُردو کا رجحان کم پا کر فارسی کے لفظوں کو ہی اتار چڑھاؤ میں پڑھتے ہیں۔ مانتے ہیں اگر فریاد کی جگہ غالب نے شکوہ استعمال کیا ہوتا، تو اس صورت میں بھی ہم وزن کا کم رجحان نہیں پاتے۔ اسی طرح سے اگر غالب نے 'نَے' کے بدلے ایسا لفظ استعمال کیا ہوتا جو اُردو زبان میں کہا کرتے ہیں لیکن زبان میں ایسے لفظ کو نہیں پا سکتے ہیں۔ اسی لئے حرف 'نَے' کا استعمال سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ نالہ کا استعمال بھی سوچ سمجھ کر کیا ہے، اسی لئے

میں اگران چار مصرعوں کو ایک لفظ کے تبدیل کرنے سے لکھوں تو اُردو زبان میں اپنی ہی زبان کا لفظ استعمال کرنے سے اردو کی وسعت دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ

شکوہ کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نَے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم غالب
آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے؟

جب ہم ان چار مصرعوں کو پڑھیں گے تو ہمیں غالب کے اصلی مطلع اور مقطع پر کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہو سکتی۔ مفہوم کے دائرے میں بھی وہی مطلب ہے جو مطلب غالب نے اپنے چار مصرعوں میں بیان کیا ہے۔ ہاں میں نے صرف فریاد کے بدلے شکوہ استعمال کیا ہے اسی طرح سے غالب کی شاعری میں بہت سے فارسی کے الفاظ پڑھ کر حیرانگی ہوتی ہے۔ کیونکہ اُردو کا رجحان کم نظر آتا ہے لیکن اگر ہم اُردو کا رجحان کم پاتے ہیں لیکن پھر بھی فارسی کے لفظوں سے غالب کی شاعری بلند پایہ کی شاعری عالمی اردو زبان میں تسلیم کی جاتی ہے۔ مانتے ہیں لفظوں کی کمی ہونے کی وجہ سے غالب نے اُردو کا رجحان کم پایا اور فارسی وعربی زبانوں کا استعمال کیا ہے۔ خیر غالب کی اپنی رائے اور اپنا خیال......

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نَے نہیں ہے

شاعر غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں میں نے آج تک بہت سے شکوے محبوب کے نام بیان کئے، لیکن ان میں کوئی وزن کے برابر ہے ہی نہیں، اب میں اس وزن کو کیسے پاسکوں کہ محبوب میرے شکوے سے کچھ نہ کچھ محسوس کرے۔ اگر میں کسی 'نَے' میں بیٹھوں وہاں پر شور وشرابہ ہے نہیں، اگر میں کسی نالے میں بیٹھوں وہاں پر شور وشرابہ پانی کا کانوں میں محسوس ہوتا ہے۔ اگر شور وشرابہ محبوب کے کانوں میں محسوس ہوتا تو مجھے پورا یقین ہوتا کہ معشوق میرے

شکوے کوضرور سنے گی لیکن میرے پاس نہ نالہ ہے نہ نَے ہے، اسی لئے میں شکوہ سنانے پر پابندنہیں ہوں۔ مطلب میں کسی کو بھی پاک محبت پر شکوہ نہیں سناتا ہوں۔ جس طرح نالے میں پانی کی آواز سنتے ہیں یا نَے میں بیٹھ کر خاموشی سے کچھ سوچتے ہیں یہ دونوں چیزیں مجھے میسر نہیں ہیں اور میں ان دونوں چیزوں کا استعمال نہیں کرنے والا ہوں۔ اسی لئے میرے شکوے کومعشوق کیسے سنے گی اور اسی لئے ان فریادوں کو میں نہ کہنے کے برابر تسلیم کرتا ہوں۔

ہستی ہے ، نہ کچھ عدم غالبؔ

آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے؟

غالب مقطع میں مطلع کا تذکرہ بیان کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ جب میں شکوہ دیکھتا ہوں یا شکوہ محسوس ہوتا ہے، میں کسی کو ان باتوں سے آگاہ نہیں کرسکتا ہوں۔ کیونکہ میں معشوق کی نظر میں ہستی نہیں ہوں۔ اگر میں کوئی ہستی ہی نہیں ہوں تو میں کیسے اپنے شکوے کسی کو سناؤں اور وہ سن کر ان شکوں کا ازالہ کریں۔ وجہ یہ ہے کہ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک نہ معشوق کو میرے دل کے بارے میں کچھ نہ کچھ خیالات ابھریں، وہ کیوں مجھے کسی طرح سے ہستی سمجھتی اور ہستی سمجھ کر کچھ بھی نہیں کسی کو کہتی۔ ہاں اگر میں کوئی ہستی نہیں ہوں تو شکوے کیسے ابھرتے، شکوے معشوق کو بھی ابھرے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی آپسی تناؤ ہے جس کی وجہ سے آپس میں شکوے ابھرے ہیں اور ان شکوں کا ازالہ کرنے کے لئے وہ کچھ نہ کچھ تدبیر سوچ ہی لیتی ہے، مطلب غالب کا کہنا ہے کہ وہ مجھے ہستی سمجھ کر ان شکوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے کہ پاک محبت میں کوئی دراڑ نہ دیکھنے میں آئے۔

اگر غالب کے لفظ کے مفہوم کے لحاظ سے مقطع کو لکھیں گے تو میں یہ کہوں کہ غالب کہتے ہیں اگر انسان کو اپنی پاک محبت میں شکوے بھی ابھریں گے تو ان شکوں پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہئے۔ توجہ کم رکھنے سے انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس دُنیا میں شکوے بھی ابھرتے ہیں اور دوستانہ تعلقات بھی ابھرتے ہیں ہمیں شکوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی پاک محبت میں قریبی

واسطہ ضرور لانا چاہئے، جس آدمی نے دل میں شکوہ نہیں رکھا وہ ہر ایک کام میں فتحیابی کر سکتا ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

ایک ملک میں لوگوں کو بہت سی سہولیات دستیاب ہیں۔ لوگوں کے پاس سالہا سال تک کھانے پینے کی چیزیں گھر پر موجود ہیں۔ جب لوگوں کو ہر چیز کی سہولیت میسر ہے تو سبھی گھر میں ہی بیٹھ کر اپنی سہولیات کا فائدہ اٹھائیں گے۔ کوئی بھی شہری اپنے کام کاج کے لئے نہیں نکلے گا۔ ہر کوئی کھانا کھانے کے بعد اپنے اپنے محلے والوں کے ساتھ بدکاری میں پھنس جائیگا۔ جب انہیں کام ہی نہیں ملا تو بدکاری کے کام انجام دیئے۔ آہستہ آہستہ عیش و عشرت کی سہولیات ختم ہونے لگیں اور پھر ایسا وقت آیا کہ لوگوں کے پاس کھانے پینے کی سہولیات ہی دستیاب نہیں ہوئیں، لیکن پھر بھی گھروں میں بیٹھ کر سوچنے لگے کہ یہ سہولیات کیسے ختم ہوئیں۔ سبھی یہ کہنے لگے کہ جب ہم نے کوئی بھی کام انجام نہیں دیا۔ ہم نے آگے کے لئے کچھ بھی نہیں گھر میں موجود رکھا۔ بھکاری بن گئے اور یہ نہیں سوچا کہ ہر وقت سہولیات موجود نہیں رہتیں۔ جب سبھی کو محسوس ہوا کہ اب ملک میں ان حالات کی وجہ سے قحط آنے والا ہے۔ قحط کو بچانے کے لئے ملک کے سربراہوں اور حکمرانوں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ دوسرے ملکوں میں جا کر اپنا روزگار کمائیں جس سے کہ وہ اپنے گھر والوں کو پال سکیں۔ حاکموں نے یہ بھی کہا کہ لوگ غلہ جمع کرنے میں مست رہے اور کوئی بھی کام انجام نہ دیا۔ انجام نہ دینے کی وجہ سے سب سہولیات ختم ہو گئیں اور آئندہ کے لئے کچھ بھی نہیں سوچا اور کوئی بھی دولت آئندہ کے لئے جمع نہیں کی اسی لئے ملک میں ایسے حالات دیکھنے پڑے۔ اب لوگ بیرونی ممالک میں جا کر کام کرنے لگے لیکن کام کرتے ہوئے دوسرے ملکوں میں یہ کہہ کر بیان بازی کی کہ ان کو اپنے ملک میں ایسے وسائل میسر نہیں ہیں جن سے کہ وہ وہاں ہی روزگار حاصل کریں۔ یہ سن کر ان ممالک کے حکمرانوں کو بھی ترس آنے لگا۔ خیر ملک کا نظام لوگوں کے ذریعہ ایسا ہی چلتا رہا۔

اب لوگوں نے اپنے ملک میں ایک ایسی تحریک منظم کی جو کہ حکمرانوں کے خلاف دیکھنے

میں آئی اور فریاد کری کہ حکمرانوں نے آج تک لوگوں کے بارے میں کسی بھی ترقی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ جس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیرونی ممالک میں کام کرتے ہیں۔ اپنے ملک میں مقیم اہل وعیال کے لئے دوسرے ملک سے روزی کما کر روزی روٹی کماتے ہیں۔ اس پر تمام لوگوں نے یہ کہہ کر بیان بازی کی کہ اپنے ملک کے باشندے بیرونی ملک میں جا کر اپنی روزی روٹی کمائیں گے۔ کیا ہمارے ملک میں ایسے وسائل نہیں ہیں جس سے کہ وہ اپنے ہی ملک میں روزگار حاصل کر کے اہل وعیال کو پال سکیں۔ حاکموں نے لوگوں کا احتجاج دیکھ کر یہ کہا کہ جب ہم نے لوگوں کو عیش وعشرت کے سامان میسر کئے تو لوگوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا۔ وہ پرانا ہی ذخیرہ کھاتے رہے، اور آگے کیلئے ذخیرہ کمانے کے لئے کچھ بھی نہیں سوچا۔ جس کی وجہ سے ایسی حالت ملک میں آج دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس پر لوگوں نے حکمرانوں کا کچھ بھی نہیں مانا۔ وہ ہر روز یہی احتجاج کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ 'فریاد کی کوئی لے نہیں ہے' مطلب ہم جو کہتے ہیں حکمران غور کیوں نہیں کرتے۔ کیوں نہیں انہوں نے یہ دیکھا، کیوں نہیں انہوں نے اس بات کی جانچ پڑتال کی کہ جب تمام ذخیرہ اندوزی کی چیزیں استعمال کرتے ہیں تو اس وقت حکمرانوں کو سوچنا چاہئے تھا کہ کتنے دن تک لوگوں کے پاس یہ موجود رہے گا۔ ہم حکمرانوں کے اس لفظ کو مٹاتے ہیں 'فریاد کی کوئی لے نہیں ہے' نہیں ہے۔ ہم اپنی فریاد ہر وقت حکمرانوں تک پہنچائیں گے۔

+ = نالہ پابند نَے نہیں ہے

جب لوگوں کا احتجاج زیادہ تعداد میں دیکھنے کو ملا تب بیرونی ممالک کے حکمرانوں کو اس تشویش کے بارے میں بیان بازی کرنے کو کہا۔ حکمرانوں نے غیر ملکیوں کو یہ کہہ کر چپ کرایا کہ انہیں ہمارے ملک میں کوئی دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے وہ ہمارے ملک کے 'نَے' کو استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے ملک میں جو بھی کیا کرتے ہیں اس پر کوئی بھی بیرونی ممالک دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر بیرونی ممالک نے یہ کہہ کر ملک کو جواب دیا کہ ہم

لوگوں کو راستے پر بھوکا مرتا دیکھتے ہیں، کوئی بھی روٹی نہیں کھاتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ملک کے اہلکاروں نے کہا کہ ان کے پاس کافی کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں لیکن انہوں نے ان چیزوں کو ناجائز طریقے سے استعمال کر کے ان چیزوں کو ختم کر دیا۔ یہ سن کر بیرونی مما لک نے کہا کہ پھر بھی ہمیں ان لوگوں کے تئیں ہمدردی دکھانی ہے لیکن انہوں نے غیر مما لک کو اس بات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو لوگوں کے حالات پر ترس آ ہی جاتا ہے لیکن آپ پھر بھی ہمارے ملک کے بارے میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ جب بیرونی ملکوں نے ایسا جواب پھر سنا تو وہ احتجاج کرنے والے لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ 'نالہ پابند نَے نہیں ہے' مطلب آپ احتجاج کرتے ہو۔ ہمیں بھی افسوس ہے کہ آپ کے ملک میں روزگار دستیاب نہیں ہے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن آپ احتجاج کرتے ہو اس احتجاج کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ جس احتجاج میں 'نَے' نہیں ہے۔ 'نَے' کا مطلب ہے سوز، کشمیری زبان میں 'مُرلی' بھی کہہ سکتے ہیں اسی لئے کشمیری زبان میں یہ کہتے ہیں کہ نَے 'وایاں' اسی طرح سے بیرونی مما لک نے کہا کہ کوئی بھی سربراہ لوگوں کے خاطر کچھ نہیں بولتا اسی لئے بیرونی مما لک یہ دیکھ کر کہتے ہیں کہ 'نالہ پابند' مطلب ہم آپ کے ملک کی حدود پار نہیں کر سکتے۔ اسی لئے ہم پابند ہیں آپ کے، نالہ ایک طرف ہمارا نالہ دوسری طرف آپ کا۔ اسی لئے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ 'نالہ پابند' تبھی تو بیرونی مما لک نے لوگوں کے احتجاج پر یہ کہہ کر لوگوں کو ہمدردی جتائی اور یہ بیان بازی کی کہ 'نالہ پابند نَے نہیں ہے'۔

+=ہستی ہے ، نہ کچھ عدم غالب

جب بیرونی مما لک سے جواب لوگوں کا موصول ہوا اور لوگوں نے یہ سوچا اپنے ملک میں ہمارے اہلکاروں کو کوئی بھی ہمدردی نہیں ہے ہم بھوکے مرتے ہیں، اور ہماری بھوک ملک کے حکمران نہیں مٹاتے ہیں۔ یہ سوچ کر لوگوں نے کہا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں، اگر ہم کچھ کماتے ہیں وہ بیرونی مما لک سے دولت حاصل کرتے ہیں اور اپنے اہل وعیال کو بھیجتے ہیں۔ تمام

لوگوں نے یہ کہہ کر آخر میں کہا کہ ہمیں کسی نہ کسی ہستی کو اپنی آواز بلند کرنے کے لئے بطور نمائندہ تسلیم کرنا چاہئے۔ جس سے کہ وہ لوگوں کی بہبودی اور مشکلات کے بارے میں اپنے ملک کے حکمرانوں اور بیرونی ملک کے حکمرانوں کو کہے۔ یہ سن کر لوگوں کو محسوس ہوا کہ مشورہ اچھا ہے۔ اور اس مشورے کے تحت لوگوں نے اپنے ملک میں جمہوری طریقے سے ایک نمائندہ کو منتخب کیا جو کہ لوگوں کی مشکلات اور اقتصادی بحران کے بارے میں بیرونی ملک کے حکمرانوں اور اپنے ملک کے حکمرانوں کو بتاتا رہا۔ مطلب ایک 'نئے' کے ذریعہ کسی کا ظلم بتا کر ہی ظلم کو مٹا سکتے ہیں۔ اسی طرح سے اس ملک نے سربراہ ڈھونڈ کر بہت سی مشکلات کم کرائی۔ اسی لئے لوگوں نے اس سرابرہ کو چن کر یہ کہا کہ ہم اس آدمی کو چنتے ہیں جو کہ ہماری آواز کو دنیا کے دیگر ممالک تک اور اپنے ملک کے حکمرانوں تک پہنچائے اور چناؤ کرنے کے بعد لوگوں نے یہ کہا کہ جس کو اکثریت نے چنا وہ ہستی ہے۔ اگر کچھ کمی بھی ہم پاتے ہیں لیکن ہستی کے ذریعہ ہر وہ کمی دور ہو سکتی ہے۔ تب لوگوں نے کہا کہ ہم نے پہلے اردو زبان میں ایک مصرعہ پڑھا ہے جس مصرعہ سے ہمیں آج اس ہستی کو چننے سے سبق ملتا ہے۔ مطلب کسی شاعر نے اردو زبان میں یہی کہا کہ 'ہستی ہے، نہ کچھ عدم غالب' مطلب اس شاعر نے فرمایا ہے کہ جب تک کسی ہستی کا وجود لوگوں میں نہیں ہوگا تب تک لوگوں کی مشکلات پر کوئی غور نہیں کر سکتا۔ اسی کے ذریعہ حکمرانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں کی مشکلات کیا کیا ہیں اور ان مشکلات کو کیسے دور کر سکتے ہیں تا کہ لوگوں کو کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔ اور بیرونی ملکوں کے حکمرانوں ایسے ظلم سے واقف نہ ہو جائیں۔ تا کہ بیرونی ممالک کے ذریعے اپنے ملک کے حکمران پر کوئی مداخلت نہ محسوس ہو جائے۔ اسی لئے تمام لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ 'ہستی ہے، نہ کچھ عدم غالب

+ = آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے؟

جب لوگوں نے ہستی کو اپنے آپ جمہوری طریقے سے منتخب کیا تب سے حکمران بھی ڈرنے لگے۔ اور حکمرانوں کو محسوس ہوا کہ لوگوں کی شکایتوں پر فوراً غور و خوض کرنا پڑے گا۔

ایک دن لوگوں نے اپنی ہستی کو جلسے عام میں یہ سنایا کہ انہیں بیروزگاری ملک میں ہے جس کی وجہ سے ہم دوسرے ممالک میں جا کر روزگار حاصل کرتے ہیں اور اسی کمائی سے اس ملک میں ہمارے اہل وعیال کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔لوگوں نے ہستی کو بتایا کہ ایسی مشکلات نہیں آنی چاہئیں جس سے کہ ہمیں روزگار کمانے کے لئے غیر ملکوں میں جانا پڑے۔کیا ہمیں اپنے ملک میں روزگار دستیاب نہیں ہوسکتا۔یہ بات سن کر ہستی نے بتایا کہ میں اہلکاروں کو بتاؤں گا کہ انہیں ایسے ایسے وسائل ملک میں ڈھونڈنے چاہئیں جس سے کہ بے روزگاری نیست ونابود ہوجائے۔اور یہ بھی ملک کے اہلکاروں کو بتایا کہ لوگوں کو ایسی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا چاہئے جس سے کہ وہ بیرونی ممالک جا کر اپنا روگار حاصل کریں۔اسی لئے لوگوں کو اپنے ہی ملک میں روزگار دستیاب ہونا چاہئے۔اس ہستی نے یہ بھی بتایا کہ اہلکاروں نے کیوں نہیں آج تک ملک کے لوگوں کے لئے ایسے ایسے وسائل ڈھونڈے کہ جس سے امن میں خلل محسوس نہ ہوسکے۔اس بات کا ذکر کرتے ہوئے اس ہستی نے جلسہ عام میں یہ مراسلہ حکمرانوں تک پہنچایا اور اس مراسلے میں یہ لفظ پہلے لکھا 'آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے؟' مطلب کیا ملک میں اتنے سالوں تک جمہوریت پانے کے باوجود ایسے وسائل نہیں ڈھونڈے جس سے کہ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک میں جا کر اپنا روزگار حاصل کرے اور اپنے اہل وعیال کو پالتے ہیں۔ایسے جمہوری ممالک کے لوگوں میں حب الوطنی کے جذبہ نہیں پا سکتے۔حب الوطنی کے جذبے کو پانے کے لئے دووقت کی روٹی اور کمانے کا ڈھنگ سبھی میں نہیں ہونا لازمی ہے۔

اب میں نے پڑھنے والے کو اپنی اس دلیل میں یہ بتایا کہ کس طرح غالب کے مطلع اور مقطع مطلب چاروں مصرعوں پر مشتمل دلیل تحریر ہوسکتی ہے۔اگرچہ یہ بہت ہی مشکل ہے لیکن چاروں مصرعوں کے نثر کو اکٹھا کر کے ایک دلیل لکھ کر کہانی کی صورت بن سکتی ہے۔اسی لئے اگر میں کہانی کو تحریر کروں تو میں یہ کہوں کہ 'افراہ تفریح کیوں' یا 'یہ کہوں 'نالہ پند لئے نہیں ہے'۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسارِ دوست
یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالبؔ زبس تکرار دوست

غالب کا مطلع اور مقطع اس غزل میں بہت ہی بہترین پڑھنے میں محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں دوہرانا نہیں چاہتا ہوں کہ غالب نے فارسی کا لہجہ اُردو زبان میں ہمیشہ کسی نہ کسی مصرعے میں استعمال کیا ہے۔ مطلب فارسی کا رجحان اردو زبان میں برقرار رکھا ہے۔ اسی طرح سے ان چار مصرعوں کو پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے مطلع اور مقطع کا بیان شاعری انداز میں بہت ہی بہترین لکھا ہے، لیکن مطلع کے دوسرے مصرعے میں شاعر نے 'شمع کشتہ' استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شاعر نے مقطع کے مصرعے میں الفاظ 'زبس، تکرار'' استعمال کئے ہیں۔ اگر عام آدمی یہ چاروں مصرعے پڑھنے بیٹھے گا تو وہ ان مصرعوں سے مطلب نہیں ٹھیک ڈھنگ سے بیان کرسکتا ہے۔ اسی طرح غالب نے سادہ شاعری بیان کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی کئی مشکل لفظ بھی استعمال کر کے پڑھنے والے کے لئے دشواریاں پیدا کیں۔ اگر غالبؔ نے ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے ہوتے تو شاعری کے اصولوں کے مطابق وزن کا اختلاف دیکھنے میں آ ہی جاتا۔ وزن کو برابر رکھنے کے لئے ان چار مصرعوں میں ایسے لفظوں کا بھی استعمال کرنا شاعر نے ضروری سمجھا۔ اگر ہم خط کے بدلے چٹھی استعمال کریں تو اس سے شاعری میں تناؤ پڑھنے میں آسکتا ہے، مطلب لفظ چٹھی وزن کے اعتبار سے باریک ہوسکتا ہے، اسی طرح غالب نے بازار دوست استعمال کیا ہے۔ مطلع اور مقطع کے تین مصرعوں میں بازار دوست لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن ردیف اور کافیہ کے وزن کے اعتبار سے ایسے الفاظ غالب کو لکھنے ہی تھے۔ میں نے پہلے اس کتاب میں کئی بار یہ استعمال کیا ہے کہ غالب نے ردیف اور کافیہ اپنی آمد کے دائرے میں استعمال کیا ہے۔ اگر میں بازار دوست کے

بدلے بازار یار استعمال کروں تو اس صورت میں چاروں مصرعوں کا وزن برقرار نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کے بجائے ہم 'یارِ بازار' استعمال کریں تو چاروں مصرعوں میں وزن کا اعتبار بھی الگ ہو سکتا ہے۔ اگر میں یار بازار کو اس طرح ان ہی لفظوں کے ذریعہ اس طریقے سے بیان کروں، پھر بھی شاعری کے اعتبار سے پڑھنے والا تسلیم کرے گا جیسے

خط سے ہوا ہے سرد جو یارِ بازار
دودِ شمع شاید خط یارِ بازار
غزل مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے شعر میں غالبؔ، یارِ بازار

اگر کوئی ان چار مصرعوں کو پڑھے گا تو اسے یہ محسوس نہیں ہوگا کہ یہ دیوانِ غالب کی غزل میں غالبؔ نے پہلے ہی لکھا ہے لیکن لفظوں کو اِدھر اُدھر کرنے سے نیا ردیف اور کافیہ بیان کیا ہے، لیکن پھر بھی پڑھنے والا غالب کے ایسے چارِ مصرعے منظور نہیں کرے گا، وہ یہ کہے گا کہ غالب کے چار مصرعے نہیں ہیں۔ کیوں کہ غالبؔ کی شاعری میں قدرتی رجحان لفظوں کو پڑھنے میں محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے آج کل کے کئی شاعر کسی شاعر کی غزل یا نظم پڑھ کر لفظوں کو اِدھر اُدھر بیان کر کے اپنا تصور چھاپ کر بازار میں پڑھنے والوں کے سامنے رکھتے ہیں، بہت سے پڑھنے والے بہت قسم کے خیالات پڑھ کر کہتے ہیں۔ خیر اُوپر کے چار مصرعوں کو جن کو میں نے بیان کیا ہے شاعری کے انداز میں نہیں تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ توجہ مجھے اس بحث پر مرکوز کرنی ہے کہ آمد کی شاعری ہی مقبول شاعری ہے۔ غالب میں آمد کا بیان ہے مطلب ہر ایک مصرعے میں پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ غالب میں قدرتی شاعری کا رجحان پڑھنے میں محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے غالب کی شاعری پر تنقید کرنا یا اصلاح کرنا یہ کسی نادان شخص کا کام ہے۔ ہمیں غور سے ہر ایک لفظ، ہر ایک مصرعہ پڑھ کر محسوس ہو جائے گا کہ غالب واضح طور پر ایک آمد قلم کی حیثیت رکھ کر شاعری کی بیان بازی ادب نواز دوستوں کے سامنے رکھ کر

اپنی شہرت پاتا ہے۔عالمی اردو میں غالب کا تصور ہی ابھی تک پڑھنے میں نہیں آتا ہے۔دنیا کے اردو غزل گو اور شاعر کو سنہرے الفاظ سے تاریخ کے ورقے میں پڑھتے ہیں۔خیر اپنا اپنا خیال اور اپنا اپنا تصور۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسارِ دوست

غزل کے مطلع میں شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے شاعری کی طرح خیال آکر خط لکھتے وقت آمد آیا۔جس طرح شاعری لکھتے وقت قدرتی الفاظ ذہن میں آتے ہیں اسی طرح خط لکھتے ہوئے میرے ذہن میں قدرتی الفاظ گونجتے ہیں۔لیکن جب اس خط کو بازار میں میرے کئی دوست پڑھیں گے وہ 'دودِ شمع کشتہ' کہہ کر اس کی تعریف کریں گے۔وہ یہ بھی کہیں گے کہ شاید یہ خط کسی دانشور نے تحریر کیا ہے، جس سے کہ تمام دوستوں کا خیال عجیب وغریب ہوسکتا ہے۔مطلب میں اپنے معشوق سے یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے آپ کے خیالات پر شاعری کی آمد بھی آرہی ہے اور آپ کے خیالات پر خط لکھتے وقت ایسا ہی تصور لکھنے میں ہورہا ہے۔اسی لئے آپ کے خیالات پر ایسا تصور ہورہا ہے کہ جو بھی کوئی دوست خط پڑھے گا تو وہ عجیب وغریب خیالات میں ڈوب کر یہ محسوس کریگا کہ معشوق کی تعریفوں کے لئے کیسا خط تحریر کیا گیا ہے اور میرے دوست حیران ہوجائیں گے۔اسی طرح سے اے معشوق آپ کے خط کا جواب یا آپ کو خط بھیجنے سے پاک محبت کا اثر کتنا ہوسکتا ہے۔جبکہ میرا دوست معشوق نہیں ہے۔تو ہی میری معشوق ہے میں ایک محبوب ہوں ان کو میرے خط سے اثر ہوجائے گا۔مجھے پوری توقع ہے آپ کو بھی میرے خط سے اثر انداز ہونا ضروری ہے۔

یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالبؔ زلیس تکرار دوست

میں نے بار بار اس کتاب میں یہ لکھا ہے کہ غالب کی غزل کا مطلع اور مقطع جواب دعویٰ

کے منظر میں پڑھ کر پڑھنے والا محسوس کرتا ہے۔اسی طرح سے غالب غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ جب میرے خط کو پڑھ کر کئی دوست متاثر ہوئے تو کیا میری معشوق میرے اس خط کو پڑھ کر متاثر نہیں ہوسکتی۔ ہاں جب میں انہیں خط میں یہ بھی لکھوں کہ جو غزل میں لکھتا ہوں جس غزل کو آمد کے ذریعے پیش کرتا ہوں۔ میں ہر وقت غزل کو پسند کرتا ہوں۔غزل کو اسی لئے پسند کرتا ہوں کہ ان کا خیال مجھے آپ کے ہر ایک خیال پر ابھرتا ہے۔ مطلب تب میں غزل لکھ سکتا ہوں جب تک آپکے ساتھ پیار کا رشتہ نہ ہو یا آپ کے ساتھ مجھے الگ زندگی بسر کرنے کا خیال نہ آئے۔انہیں خیالات کو اپنے خیال میں لکھ کر تحریر کرتا ہوں۔اسی لئے غالب مطلع میں فرماتے ہیں کہ میں یہ غزل آپ کے خیالات پر ہی بیان کرتا ہوں اور آپ کے خیالات پر ہی غزل کی آمد دن بدن اپنے دماغ میں ابھرتی ہے اور ابھرنے کے بعد میں خط کی طرح اسے بیان کر کے قلم بند کرتا ہوں۔اب غالب فرماتے ہیں کہ جب مجھے غزل لکھنے کا شوق آتا ہے میں آپ کے خیالات پر ہی یہ شوق پورا کرتا ہوں، کبھی کبھی مجھے پاک محبت میں محبت کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور کبھی کبھی آپسی ٹکراؤ کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔دونوں مناظر اپنے دل و دماغ میں رکھ کر غزل کی صورت میں ادب نواز دوستوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔اسی لئے میں اس غزل کو تسلیم کرنے کے لئے اپنے قلمی نام سے تحریر کرتا ہوں۔اور سب کے سب پڑھنے والے یہ تاثرات لکھتے ہیں کہ معشوق کے بیان بازی پر غالب نے نئی غزل تحریر کی ہے۔اور شوق سے وہ پڑھنے کے لئے تیار ہوکر متاثر میرے غزل سے ہوتے ہیں۔مانتا ہوں میری غزل میں ٹکراؤ بھی ہوتا ہے اس ٹکراؤ کو میں شاعری کے انداز میں بیان کرتے ہوئے آپ کے واقعات پر صحیح رجحان پڑھنے والے کے خیالوں میں ڈالتا ہوں۔اسی لئے اے معشوق اگر آپ کے ساتھ میرے ایسے تعلقات نہیں ہوتے تو غزل تحریر ہی نہیں ہوسکتی۔یہ آپ سے پاک محبت کرنے کی وجہ سے ہی ہوسکتے ہیں۔

میں مقطع کے حوالے سے یہ بات کہتا ہوں کہ غالب مقطع میں فرماتے ہیں کہ سب کچھ

لین دین معشوق کے ساتھ وابستگی سے ہی شاعری ابھرتی ہے اور خط لکھنے کا رجحان بھی ابھرتا ہے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر لکھنے والے کو معشوق کے ساتھ اپنے تصور پر فتحیابی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ہمیں فتحیابی کرنے کے لئے پاک محبت کے اصول اپنا کر شاعری کا ذوق بھی رکھنا ضروری ہے۔ اور پاک محبت میں شاعری لکھنے کا ذوق بھی آسکتا ہے۔ اسی لئے پاک محبت کرنے سے فتحیابی ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست

جب ادبی حلقوں میں غالب کے بعد ان کی شاعری پر مختلف ادبی تنظیموں میں بحث ہوئی تو بہت سے ادبی تنظیموں نے غالب کی قلم پر اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ حتی کہ تنقید نگاروں نے بھی غالب کی شاعری پر ایسی ایسی باتیں کہیں جو آج تک کسی تنقید نگار نے کسی دوسرے غزل گو کے بارے میں ایسی بات نہیں پڑھی۔ غالب کی وفات کے بعد ان کا کلام ادبی تنظیم، غیرِ ادبی تنظیم کے اداروں میں بہت مشہور ہونے لگا۔ اگر چہ میں مانتا ہوں کہ غالب کی شاعری میں اتنا اثر نہیں ہے جتنا کہ میر کی شاعری میں ہے۔ غالب کی شاعری میں اُردو زبان کے لفظ بہت کم پڑھنے میں آتے ہیں۔ اور زیادہ تر فارسی اور عربی کے الفاظ پڑھنے میں آتے ہیں۔ خیر بہت سے شاعر سوچنے لگے کہ ہم بھی غالبؔ جیسے قد آور شخصیت کے برابر اپنا مقام بنائیں۔ بہت سے لوگوں نے بار بار کوشش کی لیکن آج تک ایسے قد آور شخصیت کا مقابلہ کوئی نہیں کر پایا۔ جب ہم غالب کی شاعری پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے غالبؔ زندہ ہے۔ غالب نے ڈیڑھ سو سال پہلے غزلیں لکھیں۔ وہ آج کل بھی سننے میں آتی ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے جیسے غالبؔ زندہ ہے۔ خیر ایک ادبی تنظیم میں بہت سے شاعروں نے غالبؔ کی تعریف کرتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ اب کوئی بھی غالبؔ جیسی شخصیت اُردو زبان میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر بہت سے شاعروں کو محسوس ہوا کہ غالبؔ غالبؔ ہے۔ یہ سن کر کسی ادیب نے ان ادیبوں کو کہا کہ میں زندہ ہوں مجھے غالبؔ سمجھنا۔ میں غالبؔ جیسی شاعری کروں گا اور کر کے رہوں گا۔ تب ان ادب نواز دوستوں نے اس پر اپنا ردِعمل استعمال کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو غالبؔ

نہیں تسلیم کریں گے بلکہ آپ کے خیالات غالبؔ جیسے ہیں ہم آپ کو آج سے اس ادبی محفل میں غالبؔ کے نام سے پکاریں گے۔ جب اس نے سنا تو مجھے اپنا تخلص غالبؔ ہی رکھنا ہے اور اب وہ اس ادبی تنظیم میں غلام محمد غالبؔ کے نام سے تسلیم کئے گئے۔ بہت بار ادبی تنظیموں میں مختلف اوقات میں اپنی غزلیں بیان کیں ۔ بیان کرتے ہوئے ادب نواز دوستوں نے تنقید نگار کو بتایا ہے کہ کیا یہ صحیح غالب ہے۔ تنقید نگاروں نے جواب دیا کہ ہم کوشش لکھیں گے مطلب غالب کی غزلوں کا رجحان اپنے آپ پیدا کرنے کے بعد غالب کے تصور میں اپنے آپ کو کہنا چاہتے ہیں۔ کیوں نہ ہم اس کا نام کوشش غالبؔ رکھیں ۔ یہ بات تمام ادیبوں نے تسلیم کی اور کوشش غالب کے نام سے ہی اب ہر ایک بزم میں اس کو غزل پڑھنے کے لئے کہا کرتے رہے۔

کوشش غالب کا نام رکھا تو یہ خود بہت سی کوشش کرتا رہا کہ میں غالب بنوں۔ اس نے غالب کی تاریخ سنی اور پڑھی تھی۔ اسی لئے بہت سی لڑکیوں سے محبت کرنے لگا۔ کئی لڑکیوں نے اسے پولیس کیج والے کر کے جیل بھیجا۔ پھر بھی اپنی مہم سے باز نہ آیا۔ اس کی سوچ میں یہ آیا کہ غالب کئی کے ساتھ محبت کا سلوک کر کے شاعری کرتا تھا لیکن کوشش غالب اس طرح کا رجحان اپنا کر کامیاب نہیں ہوا۔ اب ایک بار کوشش غالب نے ایک عورت کے نام چٹھی تحریر کی اور اس عورت نے وہ چٹھی پڑھی پڑھ کر اسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص کوشش غالب بہت سی عورتوں کو ایسے خط بھیجتا ہے جو کہ بدتمیزی کے برابر مانا جاتا ہے۔ تو اس عورت نے راستے میں دوستوں کے سامنے کوشش غالب کی بے عزتی کر کے کہا کہ آپ کو کیسے خط بھیجنے کی جرأت ہوئی، کیا میں آپ کی معشوقہ ہوں۔ اور یہ سن کر کوشش غالب خاموش رہا لیکن سر بازار دوستوں کے سامنے اس عورت نے کوشش غالب کی مار پیٹ کر کے شرمندہ کیا۔ یہ ماحول دیکھ کر خود کوشش غالب کے ہی مطلع پر پہلا مصرعہ بیان کیا ہے۔ 'آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست' مطلب کہنے کا یہ کوشش غالب کو محسوس ہوا کہ مجھے ایسا کام نہیں کرنا چاہئے۔ ایسے کام سے مجھے سر بازار میں بے عزت ہونا پڑا ۔ یہ کہہ کر اور سوچ کر کوشش غالب نے ایسی باتیں کرنے سے خود کو روکا۔

+ = دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسارِ دوست

جب کوشش غالب نے اپنی بے عزتی ہر روز بازار میں ہوتی ہوئی دیکھی تو لوگ بھی اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے، لیکن کوشش غالب نے غالب جیسی پوشاک پہن کر گھومنا شروع کر دیا جس پر لوگ ہنستے رہے۔ اور دکاندار کو یہ کہہ کر ہنساتے تھے کہ اس آدمی کا غالب کے شعروں سے دماغ منتشر ہوا ہے۔ مطلب نادان بنا ہے اب اس نادانی کو ختم کرنے کے لئے کسی ادبی تنظیم نے اس کا قلمی نام 'کوشش غالب' رکھا ہے پھر بھی یہ غالب کی پوشاک پہن کر کہہ رہا ہے کہ میں بھی غالب ہوں لیکن ادبی تنظیموں نے واحد غالب نام نہیں رکھا بلکہ 'کوشش غالب' رکھا۔ دکانداروں نے یہ حال دیکھ کر کوشش غالب کو بلا کر یہ کہا کہ آپ کو کسی بھی ادبی تنظیم میں اپنے ادبی فن پارے نہیں پڑھنے چاہئے۔ وہ لوگ آپ کو طعنے دے کر اور اس نام سے پکار کر آپ کو پاگل بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر کوشش غالب نے محسوس کیا کہ واقعی یہ سچ ہے۔ پھر خود سوچنے لگا کہ غالب نے بھی بہت سے خط لکھے۔ ان خطوں کا مجمع بہت بار چھاپا گیا اور بہت سے لوگ ان خطوط کو پڑھتے رہے۔ میں نے بھی خط تحریر کیا لیکن میرے خط کو پڑھنے پر عورت نے مجھے جنجل زدی کی اور پولیس کے حوالے کر کے تھانے میں رکھا۔ یہ سوچ کر غالب نے پھر یہ کہا کہ 'دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسارِ دوست' یہ پڑھ کر لفظ 'کوشش غالب' کے دماغ میں ابھرا اور کہا اس پر کیوں نہیں ہنگامہ غالب کے دور میں ہوا ہے۔ مطلب اس نے کوئی ایسی بے عزتی کا رخ اختیار نہیں کیا جس سے کہ اس کو جنجل زدگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی لئے میں لکھے ہوئے خطوں کا خود جائزہ پڑھنے سے لے لوں گا۔ کیونکہ میرے خط سے کیوں عورت غصے میں دیکھنے میں آئی۔ جبکہ میرے میں کچھ غلطی بھی نہ تھی۔ یہ کہہ کر کوشش غالب نے کہا کہ صحیح غالب کے مصرعے میں یہ ہے 'دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسارِ دوست' مطلب اسی شعر سے تمام لوگ غالب سے زیادہ دوستی اختیار کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس جب میں بھی اسی طریقے کا نمونہ ادب نواز دوستوں کو دکھاتا ہوں تو وہ مجھے آفرین کہتے

ہیں۔لیکن اس کے برعکس یہ (قلمی فن پارہ) دکھاتا ہوں تو عورتیں مجھے پولیس کے حوالے کر کے جیل بھیجتی ہیں۔اسی لئے میں کوشش غالب کا نام نہیں رکھوں۔اور سیدھی سادی زندگی بسر کروں۔تبھی تو میں یہ کہوں کہ 'دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسارِ دوست' مطلب یہ اصلی غالب کے قلم میں موجود رہا ہے اور لوگ آج تک پڑھتے ہیں۔میری قلم کے فن پارے کو لوگ پسند نہیں کریں گے مجھ میں کچھ نہ کچھ غلطی ہو گی جس کی وجہ سے مجھے عورت نے پولیس کے حوالے کر کے جیل بھیجا۔تبھی تو میں اس لفظ کو احترام کی نگاہوں سے ہمیشہ زبان پر رکھوں گا۔

+ = یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ

جب کوشش غالب کے دل میں ایسا خیال آیا اور ادبی تنظیموں کے ساتھ اپنی وابستگی بالکل ترک کی ان کے ساتھ اپنی قلم کا واسطہ نہیں رکھا۔اب ادبی تنظیمیں یہ کہنے لگیں کہ 'تھا تو شاعر لیکن زیادہ نقل غالب کے خیالوں پر ہی منحصر تھی۔اسی لئے ہم نے کوشش غالب کو نام سے پکارا، لیکن افسوس ہے کہ غالب اس طرح کا بدتمیزی نہیں کرنے والا شاعر ہے جس طرح کوشش غالب نے بدتمیزی اختیار کی اور اس بدتمیزی سے ہماری تمام ادبی تنظیموں کی عزت ملیا میٹ ہو گئی۔اب اسی لئے بہت سی تنظیموں کو دعوت نامہ بھیجیں گے اور انہیں کوشش غالب کے اخلاق اور قلمی رجحان پر اپنے اپنے تاثرات بیان کریں گے۔یہ سن کر ادبی تنظیم نے دوسری تنظیموں کو بھی بلایا اور کوشش غالب پر بحث و مباحثہ کا دور شروع ہوا۔آخر میں اتفاق رائے سے قرارداد پیش کی گئی۔جس قرارداد کے تحت تمام ادبی تنظیموں نے یہ کہہ کر لوگوں کو کہا کوشش غالب غالب کے قلم سے متاثر ہوا ہے۔خود غالب بننا چاہتا ہے۔اسی لئے ہم نے اس کا قلمی نام کوشش غالب رکھا، لیکن بہت سے رسالوں میں ہم نے یہ خبر پڑھی کہ کوشش غالب نے بہت سے بری حرکتیں انجام دی ہیں جس کی وجہ سے پولیس نے دو تین بار گرفتار بھی کیا ہے۔ہم اب لوگوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ یہ نہیں سوچیں کہ وہ کسی ادبی تنظیم کا رکن ہے۔وہ ایک غالب کا نقل نویس ہے اسی لئے ہماری اس کے ساتھ کوئی وابستگی نہیں ہے۔نہ ہم اس کے

ساتھ کوئی وابستگی قائم کریں گے۔صرف وہ ہماری تنظیم میں آکر یہ مصرعہ ہمیشہ دہراتا ہے۔'یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ' مطلب غالب کے مصرعوں کو پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے یہ مصرعہ خود تحریر کیا ہے۔حال ہی میں اس نے کسی ادبی تنظیم میں یہ مصرعہ مشاعرے میں بیان کیا' یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ' جب بہت سے اُردو رسالوں میں یہ بات چھپی تب سے لوگوں نے بھی کوشش غالب کا احترام نہیں کیا۔حتیٰ کہ کوشش غالب کے کپڑے غالب جیسی پوشاک دیکھنے میں آئی۔اسی لئے لوگ دیکھ کر یہ محسوس کررہے تھے کہ شاید غالب آیا ہے، لیکن دیکھ کر پھر دکاندار اور بازار کے لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ نہیں یہ اصلی غالب نہیں ہے بلکہ کوشش غالب ہے۔ کسی وقت کوئی دوکاندار خالی یا بے کار بیٹھا ہوتا تو وہ اپنا خالی وقت کوشش غالب، کی باتیں سن کر نکالتا تھا۔ایک دن کسی دکاندار نے کوشش غالب کو یہ کہا کہ ارے ہمیں کوئی غالب کا مصرعہ ہی سناؤ جس سے ہمارا دل بہت ہی خوشی محسوس کرے۔تو کوشش غالب نے اسی مصرعہ کو پھر دہرایا۔ یہ سن کر بازار کے لوگ اور دکاندار محسوس کرنے لگے کہ کتنی محبت اور کتنا دماغی توازن غالب کے تئیں کوشش غالب کو حاصل ہوا ہے۔یہ بھی کہنے لگے کہ اے خدا شاید غالب کی غزلوں کا دیوانہ ہوا ہے یا غالب نے اس کو دیوانہ کیا ہے۔سبھی دکاندار کہنے لگے کہ' یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ'

+ = ہے دریف شعر میں غالب زلیس تکرار دوست

جب بازار کے دوکانداروں نے کوشش غالب کو بار بار بازار میں دیکھا اور وہ اسے اپنا خالی وقت اس کی باتوں سے ہی نکالا کرتے تھے۔آخر کار کوشش غالب کو جب ادبی تنظیموں نے دعوت نامہ دیا نہیں اور نہ کسی محفل میں شعروشاعری کہنے کیلئے بلایا ہی نہیں، کوشش غالب بہت ہی منتشر ہونے لگا اور سوچنے لگا کہ مجھے ادبی تنظیمیں شاعری کہنے کیلئے نہیں بلاتی ہیں۔ اسی سوچ پر کوشش غالب نے ملک کے بہت سے سرکاری رکنوں کے ساتھ مل کر اپنی شکایت دائر کی۔سرکاری اہلکاروں نے کوشش غالب کی شکایت پڑھی لیکن وہ یہ کہنے لگے کہ ہم شاعر

لوگ نہیں ہیں نہ ہم ادب نواز دوست ہیں اور نہ ہم مصنف ہیں ہم کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوشش غالب ایک شاعر ہے یا یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس میں غالب کے تصور کا دباؤ اپنے دماغ میں موجود ہے۔ حکومت کے حکمرانوں نے یہ کہہ کر اس یادداشت کو جلا دیا اور کہا شاعر لوگ کونسی غالب کی شاعری پر اپنے تاثرات خود دے سکتے ہیں۔ ہم کوشش غالب کی شاعری پر کوئی بھی تفصیل نہیں لکھ سکتے ہیں۔۔ آخر کار جب کوشش غالب کو کسی بھی تنظیم سے یا سرکاری تنظیم سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی تو کوشش غالب نے اپنا دماغی توازن کھو دیا۔ دماغی توازان کھونے کے بعد لوگوں کو محسوس ہوا کہ اب کوشش غالب سر عام گالیاں نکالتا ہے۔ پتھر پھینکتا ہے۔ انہوں نے اس کو اپنے اوپر قابو پانے کے لئے پاگل خانے میں داخل کرایا۔ اور پاگل خانے میں جب کوشش غالب کو داخل کیا گیا تو وہ وہاں اپنے آپ یہ کہنے لگا کہ 'ہے ردیف شعر میں غالب زلیس تکرار دوست' مطلب اس مصرعے کو اسی لئے دہراتا رہا تا کہ لوگ مجھے غالب کے نام سے پکاریں لیکن یہ مصرعہ بھی اس کی اپنی قلم کا نہیں، یہ مصرعہ اصلی غالب کا ہے یہ سن کر تمام ادیب اور عام شہری کہنے لگے کہ اس میں شاعری کا کوئی اپنا رجحان ہی نہیں ہے اور کیسے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے انداز میں مطلب یہ غالب کی قلم کو اپنی قلم سمجھتا ہے اور ان ادبی تنظیموں نے اس کا قلمی نام کوشش غالب غلط رکھا ہے۔ ان کو ایسے نام سے پکارنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ جس قلمی نام سے حوصلہ افزائی ہونے کی وجہ سے دماغی توازن کھونا پڑا۔ مطلب ہمیں حوصلہ افزائی کرنی چاہئے لیکن پہلے حوصلہ دینے والے کو یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا یہ اس کام کے حوصلے کے لائق ہے پھر اسے کسی اچھے نام سے پکار سکتے ہیں۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

غالب نے مطلع اور مقطع میں بہت ہی بہترین غزل تحریر کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی معشوق کی جدائی سے یا اس سے الگ رہنے سے غم کے زخم بھی خوب لگے ہیں۔ زخم تب ہی ہوسکتا ہے جب تک انسان کو چوٹ نہ لگ جائے۔ چوٹ لگنے کے بعد زخم ٹھیک ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس زخم کا مرہم پٹی کر کے علاج کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے تصور میں ضرور معشوق کے ساتھ وابستگی ہے۔ زخم اسی لئے استعمال کیا ہے کیونکہ غالب کو اپنے معشوق کے ساتھ کوئی تناؤ کا ماحول پیدا ہوا ہے۔ جس سے اپنے معشوق سے الگ رہ کر اپنی زندگی ٹھیک سے بسر نہ کرسکا۔ ہمیشہ اپنے معشوق کو یاد کرتا رہا جس یاد سے غالب کو قدرتی شاعری کا رجحان بننے لگا۔ اسی لئے ہم زخم کو بھی ایک اہم ستون شاعری کا غالب کے خیالات میں تسلیم کریں گے، اگر زخم کے بدلے کسی اور لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو اس سے غالب کا رجحان سمجھ نہیں آسکتا۔ کسی وقت شاعر اس لفظ کو شاعری میں استعمال کرسکتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو سمجھ آجائے کہ لفظ کس لئے استعمال کیا ہے۔ اگر 'زخم' کے بدلے 'یار' لکھتے تو لفظ 'رفو' استعمال میں نہیں لاتے۔ زخم کا واسطہ لفظ رَفو سے ہو کر مصرعے کا تھوڑا سا مطلب سمجھتے ہیں اور زخم ظاہر ہوتا ہے۔ کئی لوگ زخم کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کیسے ظاہر ہوا۔ مطلب چوٹ کیسے آئی، کیسے پھوڑا ظاہر ہوا۔ اس طرح کی باتیں کہنے سے مریض تنگ ہوجاتا ہے اور وہ آخر میں تنگ آکر سوال کرنے والے کو یہ کہتا ہے کہ یہ زخم قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ اسی لئے لفظ قسمت کو غالب نے مصرعے میں استعمال کیا ہے۔ مطلب زخم ظاہر ہوا ہے اپنی قسمت کی وجہ سے۔ کئی کہتے ہیں کہ زخم سے عمر میں فرق پڑسکتا ہے جب درد زیادہ محسوس ہو اور ٹھیک نہ ہو تو بہت سے لوگ زخم کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ زخم ظاہر ہونے سے اب عمر کم ہونے کا امکان ہے۔ مقطع کے مصرعے میں بھی لفظ عمر کا استعمال غالب نے کیا ہے۔ کئی بار زخم ٹھیک ہوتا ہے تو انسان صحت یاب ہو کر یہ کہتا ہے کہ حیرانگی کی بات ہے زخم ٹھیک ہوگیا۔ اسی لئے غالب نے مقطع کے آخری مصرعے میں لفظ 'حسرت' کا بھی استعمال کیا ہے۔ کبھی زخم کو دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ زخم ٹھیک نہیں ہوا،

جس کی وجہ سے لوگ زخم پر نظر ڈال کر یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ زخمی جو ہے بت جیسا ہے۔اور غالب نے بت کا استعمال بھی مقطع کے مصرعے میں استعمال کیا ہے۔

مختصر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابتدائی مطلع میں غالب نے لفظ زخم کا استعمال کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کن کن لفظوں کا استعمال مطلع میں لفظ زخم سے وابستگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لفظ بھی غالب نے بیان بازی میں لکھے۔اسی لئے غالب کی ہر ایک غزل میں خواہ وہ مطلع ہو مقطع ہو، یا شعر ہو، سبھی مصرعوں کو پڑھ کر مصرعے پر لفظ ،لفظ پر جوابِ دعویٰ بیان کیا ہے۔ایسی بیان بازی شاعری میں لکھنا بہت ہی مشکل ہے۔اسی لئے غالب کا عروج عالمی سطح پر بہت ہی بلند پایہ رہا ہے اور رہے گا۔کیوں نہ میں اس طرح سے بھی غالب کے ان چار مصرعوں کو بیان کروں اور پڑھنے والوں کا رجحان مرکوز کر کے یہ کہوں کہ ایسے چار مصرعوں سے بھی غالب کے مفہوم اس کی شاعری کے مطابق نہیں نکال سکتے ہیں۔جیسے

جس بیمار کی ہوسکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو اللہ اُسے قسمت میں عدو کی
صد حیف کیا ناکام کہ اک عمر سے غالب
تعجب میں رہے یک بت عربدہ جو کی

میں نے زخم کے بدلے لفظ 'بیمار' استعمال کیا۔بیمار کا جوڑ لفظ 'رفو' سے کر کے یہ کہا کہ جب کوئی آدمی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو ہر ایک حکیم اسے ٹھیک کرنے کے لئے اپنی اپنی تدبیر بتاتا ہے۔اسی لئے لفظ رفو کو حکیم کے ساتھ مشابہت دی ہے۔اب دوسرے مصرعے میں میں نے 'یارب' کے بدلے 'اللہ' کا استعمال کیا ہے۔اللہ اسی لئے استعمال کیا ہے کہ میں خدا سے کہتا ہوں کہ مجھے حکیم نے کچھ تدبیر بتائی ہے لیکن اس تدبیر کے بارے میں خدا ہی جانتا ہے کہ میری قسمت میں وہ تدبیر عمل درآمد ہوسکتی ہے یا نہیں۔مطلب میں حکیم کے کہنے کے مطابق صحت یاب ہوسکتا ہوں یا نہیں۔اسی طرح سے میں نے تیسرے مصرعے میں خدا سے رجوع

ہو کر یہ بتایا کہ اے خدا کن کن نے مختلف تدبیروں سے خوشحال زندگی بسر کی ہے۔ کیا آپ بھی مجھے حکیم کی تدبیر سے صحت یاب کر سکتے ہو۔ چوتھے مصرعے میں اس تدبیر کے لئے لفظ حسرت کا استعمال تسلیم کر کے یہ بتایا کہ اگر بیماری ٹھیک نہیں ہو سکتی تو مجھے بہت سے دوست اور ہمسایہ یا لوگ مزاج پرسی کے وقت یہ بتائیں گے کہ یہ ایک بت کی طرح ہے۔ جسے دیکھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بیماری سے صحت یاب نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے جب لوگ آخری میں مجھ سے الگ ہو جائیں گے تو وہ میرے بت پر یہی کہیں گے کہ تعجب ہے خدا نے ابھی تک اسے صحت یاب نہیں کیا اور بت کی طرح ہم اس بیمار کو دیکھتے ہیں۔

اسی لئے میں نے پہلے یہی کہا کہ غالب کے لفظ سے ہی بیان بازی مطلع اور مقطع میں لکھ کر تنقید نگار لکھتا ہے۔ جس طرح میں نے پہلے لفظ زخم کے بارے میں بیان کیا ہے۔ کہ یہ سب مطلع اور مقطع کا رجحان لفظ زخم کے ساتھ میل کھاتا ہے۔ اسی طرح سے زخم کے بجائے میں نے لفظ بیماری کا استعمال کیا اور میں نے اس بیماری کے ساتھ باقی لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ جیسے تعجب، اللہ، ایسے الفاظ استعمال کر کے لفظ بیماری کے ساتھ واسطہ کر کے پڑھنے والے کو سمجھایا کہ غالب نے لفظ کے لحاظ سے ہی باقی لفظوں کو جوڑ کر غزل کی بیان بازی دیوان غالب میں بیان کی ہے۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

شاعر اپنی غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی کپڑا اجل یا پھٹ جاتا ہے تو اس کی شکل بدصورت ہو جاتی ہے۔ اس بدصورتی کو ٹھیک کرنے کے لئے اس کپڑے کو رفو کرنے والے کے حوالے کر کے کہتے ہیں کہ اسے ایسا ہی کپڑا دیکھنے میں آنا چاہئے جیسا تھا۔ مطلب اسے رفو کر کے کپڑے کے زدے کو نہیں دیکھنا چاہئے۔ جب بھی اس کپڑے کو پہنیں گے تو زدہ نہیں دیکھنا چاہئے۔ اسی طرح سے غالب نے معشوق سے یہ شکوہ کیا ہے کہ آپ مجھ سے الگ

ہو گئی ہیں آپ مجھ سے جدا ہوئیں ۔اس جدائی سے متاثر ہو کر مجھے زخم ظاہر ہوا۔ جس زخم کو میں کسی رفو کرنے والے کے حوالے کرنا چاہتا ہوں ۔ اب حکیم کے بجائے غالب نے رفو لفظ استعمال کیا ہے، رفو کو حکیم کہہ کر یہ کہا ہے کہ زخم حکیم ہی ٹھیک کرسکتا ہے جب میں اس زخم کو دکھاؤں تو وہ حکیم اس زخم کی مرہم پٹی کر کے رفو کی صورت میں دکھانے کی کوشش کرے گا لیکن اس زخم کو خدا کے رحم وکرم پر ہی چھوڑتا ہوں ۔اگر خدا چاہے تو زخم ٹھیک ہوسکتا ہے اگر حکیم علاج ومعالجہ کرے اور اگر خدا نہ چاہے تو زخم کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتا ہے۔ مطلب شاعر کا کہنا ہے کہ کیسی حکیم کے ہاتھ میں وہ تدبیر نہیں ہے جس سے بیمار ٹھیک ہوسکتا ہے۔ اسی طرح زخم کو ٹھیک کرنے کے لئے خدا کے پاس ہی تدبیر ہے۔ اگر اسی تدبیر کو استعمال کر کے حکیم علاج فراہم کرے گا لیکن فراہم کرنے کے باوجود یہ خدا پر ہی منحصر ہے کیا یہ زخم ٹھیک ہوسکتا ہے یا نہیں اسی لئے میں خدا سے رجوع ہو کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میری قسمت کو بگاڑنے والے اور بنانے والے آپ ہی ہو۔ اسی لئے اس زخم کو ٹھیک کرنے والا خدا ہی ہے اے معشوق آپ کی دراڑ سے اگر زخم میں مبتلا ہوا لیکن اس زخم کو ٹھیک کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اے معشوق اگر آپ نے اتنا تناؤ نہیں پیدا کیا ہوتا تو مجھے زخم ظاہر ہی نہیں ہوتا ۔ خیر اللہ تعالیٰ نے ہی میری قسمت میں زخم لکھا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ رفو کی طرح سے اس زخم کو ٹھیک کرے یا نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی قسمت کا چکر ہے۔

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

غالب غزل کے مقطع میں مطلع کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اے معشوق عمر میں بہت سے آدمیوں کو مختلف قسم کے زخم ظاہر ہوتے ہیں اور یہ زخم کئی واقعات کے بنا پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اسی طرح سے جب آپ نے مجھ سے الگ رہنے کا ذکر کیا اور ان جذبات سے مجھ پر زخم ظاہر ہوا تو اسے دیکھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اتنی عمر آپ کی ہوئی ہے کہ ابھی تک اس زخم کو

ٹھیک نہ کر سکے اور ہم یہ زخم دیکھ کر حسرت میں ڈوبے ہیں۔ اور ڈوب کر اس زخم کو دیکھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ بت کی طرح دیکھنے میں آتا ہے۔ مطلب اے معشوق آپ کی مجھ سے جدائی کی وجہ سے زخم ظاہر ہوا اور اس جدائی پر بہت سے دوست مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے میں حیران ہوتا ہوں میں حسرت میں رہتا ہوں اور سوچتا ہوں آپ یہ زخم کب ٹھیک کروگے جس سے کہ میرے دوسرے دوست یہ نہ کہیں کہ اس زخم کا علاج ہی نہیں کیا اور اس زخم کو بت کی طرح ظاہر کیا۔ اے معشوق آپ کے پاس ہی زخموں کا علاج ہے اور زخم کو ٹھیک کرنے کے لئے آپ ہی رفو ہیں۔ آپ کے پاس میری تدبیر کا علاج ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ زخم کو ٹھیک کرنے کی تدبیر کچھ نہ کچھ ڈھونڈ ہی لوگے۔

لفظ غالب کے مطلب کے مطابق میں اس مقطع میں یہ بیان کرتا ہوں کہ غالب نے یہ کہا ہے کہ جب بھی ہم کبھی مشکلات کا سامنا کر کے ان میں ڈوبینگے تو ہمیں مشکلات کا سامنا بہادری سے کرنا چاہئے۔ جو مشکلات کا سامنا بہادری سے کرتا ہے وہی آدمی فتحیابی حاصل کر کے معشوق اور محبوب کے ساتھ قریبی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

جس زخم کی ہوسکتی ہو تدبیر رفو کی

جب عالمگیر سطح پر جنگ نمودار ہوئی تو بہت سے ممالک نے امن میں اپنا کاروبار کرنے کی تلقین کی کہ لوگ جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں، کسی بڑے سائنسدان اور ادیب نے یہ بیان کیا جنگ سے آپسی تناؤ پیدا ہو کر لوگوں کی معاشی حالت برباد ہوتی ہے۔ جتنی ترقی مختلف ملکوں نے کی ہے جنگ کے آثار سے ملک برباد ہوسکتا ہے۔ تمام ملکوں نے سائنسدان اور دانشور کے ان بیانوں پر متفق رائے پائی اور خود لوگ یہ کہنے لگے کہ کیوں ہم جنگ کے تناؤ میں رہیں گے اور جنگ سے کیا فائدہ ہوسکتا۔ ہمیں جتنا فائدہ جنگ کے بغیر مل سکتا ہے اتنا جنگ کرنے سے نہیں ملتا ہے، لیکن یہ بات ان ممالک نے نہیں کی جن کو یہ معلوم تھا کہ ہم جنگ کر کے ہی فتحیابی کریں گے اور اپنے ملک میں عزت واحترام پائیں گے۔ جب عالمی جنگ

رونما ہوئی تو ایسے ملک کو شکست کھانی پڑی جس ملک نے ایسے خیالات رکھے تھے کہ وہ عالمی جنگ میں جیتیں گے۔ آخر کار وہی ہار کر عالمی خجل زدگی دیکھنے میں آئے۔ تب لوگوں نے یہ محسوس کیا اور اس ملک کو یہ کہہ کر بتایا کہ ہم نے پہلے ہی یہ درخواست کی تھی کہ جنگ سے دور رہا کریں لیکن نہ ماننے کی وجہ سے ملک میں بربادی کے مناظر دیکھنے میں آئے۔ جب اس ملک میں معاشی حالت برباد ہوتے ہوئے دیکھی گئی تو بہت سے فوجی جنگ کرنے سے زخمی ہوئے ان میں مختلف زخم ظاہر ہوئے۔ یہ زخم انہیں مختلف ہتھیاروں کا سامنا کرتے وقت ظاہر ہوئے تھے۔ ان زخموں کا علاج ہی میسر نہ ہوا کیونکہ ملک کی معاشی حالت بہت خراب ہو گئے تھے۔ دوائی غیر ملکوں سے آرہی تھی لیکن پھر بھی دوائی کار آمد نہ ہونے کی وجہ سے زخمی لوگ دوسرے ملکوں میں علاج معالجے کے لئے گئے۔ انہوں نے دوسرے ملکوں میں پناہ لیکر ان ملکوں سے درخواست کی کہ ہمارے ملک میں زخموں کا علاج فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے زخموں کا علاج کریں۔ تمام ملکوں میں انسانیت کے طور پر ان زخمیوں کو علاج کیا۔ علاج کر کے بہت سے زخمی صحت یاب ہوئے اور بہت سے زخموں میں ہی مبتلا رہے۔ زخموں میں مبتلا ہونے والے شخص بھکاری بن گئے کیونکہ وہ مزدوری کرنے کے لائق نہیں رہے، کئی ممالک میں پناہ گزیں ایسے زخمی بھکاری دیکھنے میں آئے۔ جب بھی کوئی ان کو امداد فراہم کرتے دیکھا گیا وہ یہی کہہ رہے تھا کہ یہ گھمنڈی ملک کے باشندہ ہے جس نے جنگ لڑی تھا۔ ان کے زخم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے۔ اسی لئے ایسے شخص اپنا کام کاج نہیں کر سکتے۔ کام کاج نہ کرنے کی وجہ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہوئے۔ ان بھکاریوں کو پیسے دے کر یا کئی ایسی امداد دے کر لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ گھمنڈی ملک کے ایسے اشخاص جو بالکل جنگ سے برباد ہوئے اور اسی لئے یہ کہہ رہے ہیں کہ سب تدبیریں اس اللہ ہی کی طرف سے ہے جس کو چاہے تندرست رکھے۔ ورنہ ایک ہزار زخمیوں میں دو سو زخمی ٹھیک نہیں ہوئے یہ خدا کی ہی مرضی سے ہوا۔ حالانکہ دونوں کو ہی ایسے زخم ظاہر ہوئے۔ مطلب ایک ہزار میں سے دو سو بندے زخمی ہی رہے اور صحت

یاب نہیں ہوئے۔ یہ دیکھ کر تمام ممالک نے ان لوگوں کو امداد فراہم کی اگر چہ بھیک مانگنے کے لئے مختلف ملکوں میں پناہ لے کر گئے ہیں پھر بھی ان ممالک نے امداد دے کر انہیں ٹھیک حالت میں دیکھنے کے لئے خدا سے رجوع ہوتے رہے۔ جب تمام ممالک انہیں اپنے ملکوں میں امداد دیتے رہے تو یہ لفظ بھی کہتے رہے۔ 'جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی' مطلب امداد دے کر لوگوں کا تبصرہ یہی رہا کہ دیکھو بہت سے زخمی ٹھیک ہوئے اور بہت سے نہیں۔ جو ٹھیک نہیں ہوئے وہ کام کاج کیلئے ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے ان کی حالت دیکھ کر ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ 'حکیم کہا' کیا ان زخموں کے لئے آپ کے پاس کوئی تدبیر نہیں جس سے کہ یہ بندے بھیک مانگنے کے لئے مختلف ممالک میں دیکھنے میں آتے ہیں اور انہی لوگوں نے پناہ لی ہے۔ یہ کہہ کر یہی لفظ بار بار دہراتے تھے 'جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی'۔

+ =لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

جب ان زخمیوں کو مختلف ممالک میں بھیک مانگتے دیکھا گیا تو لوگوں نے یہ کہا کہ ہمیں محکمہ صحت کے ذریعے یہ اطلاع فراہم ہونی چاہئے کہ کیا یہ زخم دوسرے صحت یاب لوگوں میں تو نہیں پھیل سکتے۔ یہ بات سن کر مختلف ملکوں کے ماہرین صحت نے لوگوں کو بتایا کہ یہ زخم صحت یاب آدمی کو ظاہر نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ پھیلنے والی بیماری نہیں ہے۔ یہ زخم گولیوں سے، بموں سے اور مختلف ہتھیاروں سے ان لوگوں کو ظاہر ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم یہ لکھ کر دیتے ہیں کہ یہ کوئی پھیلنے والی بیماری نہیں۔ اس پر دانشور قوموں نے اپنا تبصرہ دے کر بتایا کہ یہ خدا کی طرف سے ایک نصیحت ہے ہمیں کبھی جنگ نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں امن کے ماحول میں اپنے ملکوں میں کاروبار کرنا چاہئے اور امن کا پرچم ہی لہرا کر دن گزارنا چاہئے۔ یہ تبصرہ پڑھ کر لوگوں نے یہی کہا کہ یہ سچ ہے یہ زخم نہیں ہیں یہ ایسی نصیحت ہے جو ان زخمیوں کو دیکھ کر ہمیں فراہم ہوتی ہے اور ہم اپنے ملک میں یا کسی ہمسایہ ملک کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے۔ جنگ سے دور رہیں گے۔ زر، زن اور زمین کے حصول کے لئے ہم جنگ سے دور رہیں گے۔ ہم ملک میں

قتل وغارت بالکل نہیں کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی قتل وغارت برداشت کریں گے یہ کہہ کر اطمینان ہوا کہ یہ زخم صحت یاب لوگوں میں پھیلنے والے نہیں ہیں۔ صرف یہ زخم نصیحت کے لئے موجود ہیں۔ اسی لئے اس نصیحت کو بار بار دیکھیں گے اور دیکھ کر یہی کہیں کہ 'لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی' مطلب جب ہم ان زخمیوں کو علاج کے باوجود ٹھیک نہیں دیکھتے ہیں ہم یہی کہیں گے کہ ان کے قسمت میں خدا نے ایسا ہی لکھا ہے اور زخم برقرار ہے۔ اگر بھیک مانگتے ہیں پھر بھی خدا نے انہیں زخمی حالت میں مختلف مما لک میں لوگوں کی نصیحت کے لئے پناہ گزیں کیا ہے۔ تب تمام مما لک نے ان زخمی لوگوں سے یہ کہا کہ آپ کو امن سے ہی کام کرنا چاہئے۔ اپنے ملک میں تعمیرات اور مختلف ترقی 'کے بارے میں غور وفکر کرنی چاہئے۔ ان زخموں کی وجہ سے آپ لڑائی جھگڑے سے دور رہ سکتے ہیں۔ اسی لئے خدا نے انہیں مختلف مما لک میں بطور نصیحت پناہ گزیں کیا ہے۔ یہ پڑھ کر لوگوں میں اس مصرعے کا جذبہ پھر بڑھنے لگا 'لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی'۔

+=صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

جب عالمی اُردو زبان کا اجلاس طلب کیا انہیں ان زخموں کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ زخم ٹھیک نہ ہونے پر ایسے لوگ تندرست نہیں ہوتے۔ تو عالمی اُردو اجلاس والوں نے اس پر تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ اُردو زبان میں مختلف بیماریوں کا علاج ومعالجہ فراہم ہے۔ لیکن آج کل اردو زبان کا وجود عالمی سطح پر کم پایا جاتا ہے۔ ورنہ بہت سے حکیموں اور ڈاکٹروں نے اسی زبان میں مختلف زخموں کے بارے میں تدبیر لکھی ہے۔ بہت سے مریض ایسے بھی ہیں جن کے زخم دس سال کے بعد ٹھیک ہوئے ہیں جنہوں نے اردو زبان میں ہی ان زخموں کے بارے میں تدبیر پڑھی تھی ان پر تجربہ کر کے ان زخموں کے علاج فراہم ہوئے۔ لیکن تمام اردو ماہروں نے یہ کہہ کر ان زخمیوں کے بارے میں بتایا کہ ہماری زبان میں علاج ہے لیکن پڑھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ کتابیں موجود ہیں لیکن پڑھنے والا کوئی نہیں، اسی لئے ہم بھی اُردو زبان

کو نہیں جانتے۔ جب ہم اردو زبان کو پڑھیں تو ہم ضرور ان زخموں کا علاج ڈھونڈ لیں گے اور تجربہ کر کے یہ دکھائیں گے کہ اسی زبان میں ان زخمیوں کا علاج موجود ہے۔ انہوں نے ایسا تذکرہ بھی لکھا کہ حکیم اجمل خان جیسے حکیم اور غالب نے بھی اردو کے مشہور شاعر اور عالمی سطح کے غزل گو مرزا اسد اللہ غالب نے زخمیوں کے بارے میں بہت سی تدبیریں اپنی غزل کے شعروں میں مطلع اور مقطع میں بیان کیا ہے لیکن پڑھنے والے ان پر داد دے کر ان زخمیوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اس بات کو ایسا مراسلہ بھیج کر واپس کرتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ 'صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب'۔ مطلب یہ جب لوگ اُردو زبان سے دور ہوئے اور اسے نہیں پڑھا۔ جس کا رجحان عالمی سطح میں کم ہوتا جا رہا ہے اسی لئے ہم اُردو زبان میں ہی ان زخموں کا علاج پڑھ سکتے تھے لیکن کیا کریں کہ ہم خود اردو زبان نہیں پڑھتے۔ آخری میں ہم اس مصرعے سے بات کو ختم کرتے ہیں 'صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب'۔

+ =حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

جب ان زخمیوں کے بارے میں مختلف لوگوں نے اپنی رائے دی تو انہوں نے یہی تبصرہ کیا کہ سب کچھ کرنے والی ذات خدا کی ہی ہے تبھی تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ایک ہزار زخمیوں میں سے صرف دو سو زخمی ٹھیک نہیں ہوئے۔ دراصل ان زخمیوں کو خدا نے مختلف ممالک میں نصیحت کے لئے پناہ گزین کیا ہے۔ جس سے کہ کوئی ملک جنگ کے لئے رضامند نہ ہو۔ مانتے ہیں کہ مختلف زبانوں میں ان کا علاج فراہم ہو سکتا ہے لیکن ان زبانوں کے ماہر موجود نہیں ہیں، صرف ہم خدا سے رجوع ہو کر یہی کہیں گے کہ ان زخمیوں کو دیکھ کر ہم یہی محسوس کرتے ہیں کہ ایک ہزار میں سے دو سو زخمی دیکھنے میں آئے ہیں اور باقی صحت یاب ہو کر اپنے اپنے کاروبار میں مست ہیں اور اپنی مستی میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم میں کوئی زخم نہیں۔ لیکن خدا نے ان کو نصیحت کے لئے مختلف ملکوں میں پناہ گزیں کیا ہے تاکہ ان سے نصیحت حاصل کی جائے۔ اسی لئے تمام لوگ یہ کہنے لگے کہ حسرت ہے کہ یہ زخمی ایک بت کی طرح ہمیں نصیحت فراہم

کرنے کیلئے دیکھنے میں آتے ہیں اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جنگ سے الگ دور رہیں۔ اسی لئے ہم ان زخمیوں کو امداد دے کر یہی کہیں گے کہ 'حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی'۔ مطلب یہ حسرت بھری داستان جنگ کے کارناموں کی وجہ سے بنی ہے اسی لئے اس حسرت بھری داستان کا خاتمہ کرنے کے لئے ہمیں امن کے کارنامے انجام دینے چاہئیں۔ اسی لئے اس دلیل کو آخری مرحلہ میں لکھ کر کہتا ہوں 'حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی'۔

اگر میں ان چار مصرعوں پر مشتمل اس کہانی یا دلیل یا افسانے کو عنوان کے لحاظ سے بیان کروں تو میں کہوں گا کہ 'جنگ بربادی' یا 'کیسا زخم'۔

میں نے غزل کے مطلع اور مقطع پر چار مصرعے والے شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی سوچ سے افسانہ دلیل بھی تحریر کیا۔ آج تک چار مصرعے پر کسی نے افسانہ شاعری کے لفظوں کے طریقے سے نہیں لکھا ہے، لیکن مطلع کے ایک مصرعے پر بہت سارے ادیبوں، افسانہ نگاروں نے مضمون اور افسانے بھی لکھیں ہیں۔ اسی لئے میں نے پڑھنے والوں کے لئے چھ، سات نمونے پیش کئے ہیں۔ خیر پڑھنے کے بعد محققوں کے اپنی رائے اور اپنا تبصرہ ضرور معلوم ہو جائے گا۔ اب میں محققوں کے تبصرے لکھنے اور سننے کا انتظار کرتا ہوں۔

غالب نے غزلوں میں لفظ 'بزم' اور لفظ 'زخم' کو اپنے مختلف شعروں میں بیان کیا ہے۔ اگر میں تمام لفظوں کو الگ کر کے بیان کروں تو میں نے دیوانِ غالب میں غالب کی غزلوں پر زیادہ تعداد لفظ 'بزم' اور لفظ 'زخم' پڑھا۔ مطلب ان لفظوں پر مختلف تفصیلات بتانے کے بعد مختلف شعروں میں ان لفظوں کو اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے۔ ان لفظوں کو پڑھ کر مجھے اس بات کا خیال آیا کہ غالب نے شاید محبت جسے ہم پاک محبت بھی کہہ سکتے ہیں، کسی گانے بجانے والی کے ساتھ کی ہوگی۔ اسی لئے غالب نے الفاظ 'بزم، زخم' مختلف غزلوں کے شعروں میں بیان کیے ہیں۔ یہ بھی دعویٰ سے میں نہیں لکھ سکتا بلکہ مجھے یہی خیال آیا کہ غالب نے کسی گانے بجانے والی عورت کے ساتھ اپنے رشتے قائم کئے تھے، ممکن ہے گانے بجانے والی ایسی عورت جس کا نواب خاندان سے تعلق ہو یا کسی ایسے امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والی یہ عورت یا لڑکی جسے غالب نے پوشیدہ رکھا ہے، لیکن غالب نے تعداد ان دو لفظوں کی غزلوں میں زیادہ استعمال کی ہے۔ مانتے ہیں الفاظ 'پھول، دریا، پہاڑ' کا استعمال بار بار کیا ہے لیکن بزم کو زیادہ تعداد میں استعمال کیا گیا ہے۔

میں نے اس ضمن میں ایک غالب کے مشہور نقاد سے بات کی جس نے بہت سے خیالات غالب کے بارے میں کتاب کے ذریعہ بیان کئے ہیں۔ جن کا نام کرشن کمار توؔر ہے جن کو تحقیق غالب پر ایوان غالب (غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی) نے غالب کے اعزاز سے

نوازا گیا۔ کیونکہ انہوں نے غالبؔ پر تحقیقی کتاب تحریر کی تھی۔ انہیں سے میں نے ۱۱رنومبر ۲۰۱۴ء کو اپنے موبائل پر رابطہ قائم کیا۔ اُن کو میں نے یہ بتایا کہ کیا آج تک غالب کے معشوق کے بارے میں غالب پر تحقیقات کرنے والوں نے کچھ بتایا ہے۔ تو ان کا جواب تھا کہ کسی نے ابھی تک ان کی معشوقہ کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا ہے۔ اسی لئے میں نے جب دیوانِ غالب میں لفظ 'بزم' پڑھا تو میری نظر اس شعر پر پڑی۔ غور سے پڑھنے پر یہ خیال آیا کہ مندرجہ ذیل شعر لکھ کر اپنی تفصیل بیان کروں۔

دور چشم بد تری بزم طرب سے ، واہ واہ

نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

یہ پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ نغمہ تب بیان کر سکتے ہیں جب ساز کے ساتھ گایا جائے۔ غالب نے بیان نغمہ کیا ہے لیکن اگر غور سے سوچیں گے تو غالب نے بزم میں اس بات کا بھی احساس نہیں دلایا ہے کہ اس نے کبھی بزم میں نہ ہی شرکت کی اور نہ ہی صدارت کی۔ اس بات کا بھی احساس پڑھنے پر نہیں ملتا ہے کہ بزم کا استعمال غالبؔ نے مختلف شعروں میں کیوں کیا ہے۔ بار بار بزم دہرانے سے ہی کچھ نہ کچھ معلوم ہو ہی جاتا ہے۔

'بزم' کے بارے میں اگر کچھ لکھنا ہو تو ہم کہیں گے کہ لفظ 'بزم' کا ذکر شاعری محفل میں ہوتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں بزم شعر، مطلب شاعر اپنے شعروں سے بزم میں رونق لائیں گے اور بزم میں دوسرے شاعروں کو سن کر اپنے خیالات سے واقف کرائیں گے۔ دوسرا یہ کہ 'بزم' لفظ فارسی زبان سے ماخوذ ہے۔ اگر محفل کے ساتھ ہم جوڑتے تو یہ اردو لفظ ہے، بزم اور محفل میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن بزم لفظ ساز کے ساتھ وابستہ ہے جیسے کہ بزم ساز، بزم ساز کا مطلب جب کوئی گانے بجانے والا کسی محفل میں اپنی غزلوں کو ساز کے ذریعہ سناتا ہے اور ان کے سننے کے لئے دعوت نامے پیش کئے جاتے ہیں۔ جس میں ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ کسی مشہور گانے بجانے والے کو یا کسی مشہور غزل گو کو اپنا کلام سنانا ہے۔ ایسی محفل کو منعقد کرنے

کے لئے ہم یہ لکھتے ہیں کہ بزم ساز۔ مطلب بزم میں ساز کے ذریعہ گانے بجانے کے ذریعہ گیت گائیں گے۔ بزم اگر چہ فارسی لفظ ہے، محفل اردو لفظ ہے لیکن غالب نے بزم زور زبردستی سے اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے۔تب بیان کیا ہے جب غالب کئی بزم میں شرکت کر کے زیادہ اس گانے بجانے والی عورت سے متاثر ہوئے۔اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ گانے بجانے والی کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی، لیکن میں اپنی سوچ اور جرح کر کے صحیح بتاؤں گا کہ غالب کی معشوق گانے بجانے والی عورت ہے۔ مانتے ہیں کہ غالب نے بزم کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے۔اس کی کیا وجہ ہے۔ وجہ یہی ہے کہ غالب جب کبھی مختلف بزم میں شریک ہوتے رہے تو ایک ہی بار انہوں نے اُس بزم میں ایسی گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کو دیکھا ہوگا جس کے گانے بجانے سے غالب متاثر ہوئے ہوں اور اسی کی فریاد کے لئے لفظ بزم کا استعمال مختلف غزلوں کے شعروں میں بار بار بیان کیا ہے۔اس لفظ کا ذکر غالب نے بہت بار استعمال کیا ہے، بجائے اس کے غالب نے اور دوسرے لفظوں کو استعمال نہیں کیا۔ ہاں دل یا آنکھ جیسے الفاظ بھی غزل میں بیان کرنے پڑتے ہیں جن کی وابستگی معشوق کی تعریفوں کے ساتھ میل کھاتی ہے۔

اب میں اس شعر کو اوپر والے شعر سے وابستہ کر کے تذکرہ اس طرح کرتا ہوں:۔

دور چشم بد تری بزم طرب سے ، واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

غالبؔ نے غزل میں ایسا شعر بیان کیا ہے کہ جس میں خود غالبؔ فرماتے ہیں کہ نغمہ بہت ہی پسند آیا۔ بزم میں لفظ 'نغمہ' ساز کے ساتھ گایا جاتا ہے ورنہ غالبؔ کو نظم یا غزل کہنی تھی۔نغمہ کا مطلب یہی ہے کہ غالب ایسی بزم میں بیٹھا ہے جہاں پر نغمہ سنتے ہیں۔نغمہ کا مطلب یہی ہے کہ وہاں ساز کی محفل ہے جہاں رجوع ہو کر غالب اپنا تذکرہ اس شعر میں کرتے ہیں۔ جب میں نغمہ سن کر متاثر ہوا تو میں نے یہی کہا کہ ایسی آواز پر ان کو کوئی کچھ نہ کہے، مطلب آنکھوں

سے دیکھ کر کبھی کوئی بات بتانا ٹھیک نہیں رہتا۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ 'دور چشم بد' کا مطلب یہی ہے کہ کسی کی نظر نہ لگے دور سے دیکھو۔ اور ایسے نغمے ہر روز بزم میں سننے چاہئیں۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ نغمہ سننے سے میں متاثر اتنا ہوا کہ میں بار بار ''واہ واہ'' کہہ کر بزم میں گرجنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ ایک ہی نغمہ سننے سے دل نہیں بھرتا بلکہ ہزار نغمے سننے چاہئیں۔ مطلب میں بہت سے نغمے سننا چاہتا ہوں تاکہ میں اور واہ واہ کہہ کر بزم کو آراستہ کروں۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ غالب کا رجحان کسی گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ ہی رہا ہے ورنہ اس سے اگر شاعری کے ساتھ تعلقات رہتے یا کسی شاعر کا کلام سنا ہوتا تو وہ بزم کے بجائے محفل کا لفظ استعمال کرتا۔ جیسے کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ 'بزم طرب سے' مطلب غالب فرماتے ہیں کہ بزم کی طرف سے بھی اس نغمے کے سننے پر ہر کوئی واہ واہ کر بیٹھا ہے۔ کاش اور بہت سے نغمے سنتا، مطلب یہی ہے کہ غالب یہ نغمے سن کر اس معشوق سے متاثر رہا ہوگا۔ اسی لئے لفظ بزم کا بیان بار بار غزلوں میں کیا ہے۔ اگر چہ محقق میری بات پر متفق نہیں ہے تو میں دوسرے اور شعر جو لفظ بزم کے ساتھ وابستہ ہیں، بیان کرتا ہوں۔

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ وفساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

پہلے میں نے یہ کہا کہ غالب نغمہ سن کر جب متاثر ہوئے تو قریبی تعلقات اس نغمہ گانے والی کے ساتھ رہا، جسے معشوق کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ نغمہ سننے کے بعد بار بار اس بزم کو غالب نے دہرایا مطلب اس کی آواز سے متاثر ہوا۔ متاثر ہو کر اور کسی بزم میں پھر غالب شریک ہوئے، مطلب اس بزم میں خود حاضر ہو کر کہا کہ اس نغمہ کی یاد آ رہی ہے اور یہ شعر اس بزم پر لکھا۔ اور کہا کہ مجھے اس بزم کی یاد آ رہی ہے جس میں وہ نغمہ سنانے والی عورت یا لڑکی موجود تھی اور اس کے نغمے سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔ اب میں دوسرے بزم میں شریک ہو کے یہ شعر لکھتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ اس بزم میں آج پھر وہ نغمہ یاد آ رہا ہے اور نغمہ کی آواز

کانوں میں گرجتی جس کی وجہ سے مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ آج اسکی غیر حاضری پر فتنہ وفساد ہونے کا ڈر ستا رہا ہے۔اسی لئے اس فتنے کو دور کرنے کے لئے اس بزم میں شریک رہوں گا لیکن عید کی رسم نہیں دیکھ کر غم میں مبتلا ہوں۔ مطلب اس دن اس بزم میں شراب کا استعمال کروں گا جس سے کہ مجھے وہ نغمہ یاد نہیں آئے گا۔ کیونکہ ہر کسی بزم میں ایسا نغمہ سنانے والا کوئی دیکھنے میں نہیں آتا جو میرے دل کو متاثر کرے۔اسی لئے بزم میں اس نغمے کو دُہرائے بغیر میں سکون سے نہیں بیٹھوں گا اور میں سکون حاصل کرنے کے لئے شراب کا استعمال کروں گا۔ میں نے شراب کے بارے میں بھی اس کتاب میں تذکرہ کیا ہے لیکن میں نے یہ بات کہی ہے کہ غالب نے شراب کا استعمال نہیں کیا ہوگا اور شراب کا استعمال اُس نغمے کی آواز پر بھی کیا ہوگا کیونکہ بزم دہرانے پر مختلف غم محسوس ہونے لگے ہوں گے۔اگر چہ غالب نے بزم لفظ کا استعمال نہیں کیا ہوتا تو غالب کبھی اُس نغمے کو یاد کر کے بزم میں شریک ہو کر لفظ 'آج' کا استعمال نہیں کرتے۔مطلب وہ بزم بار بار یاد آنے پر آج کا استعمال اُس بزم سے مشابہت پر شعر بیان کیا ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

غالب اپنی غزلوں کو بہت سی بزموں میں شریک ہو کر لوگوں کو واقف کراتا رہا لیکن اس بات کا احساس پڑھنے والے کو نہیں دلاتا کہ اس کو واقعی کسی گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ محبت کا رشتے ہے جو کہ خفیہ ہے۔ تبھی تو میں نے پہلے کہا بزم کا استعمال بار بار کر کے بتاتے ہیں کہ اب میں دوسری محفل میں شریک ہوا ہوں، یہاں حاضر ہو کر مجھے اپنے نئے کلام سے ادیبوں کو واقفیت کرانی ہے۔انہیں اپنی شاعری سے روشناس کرانا ہے بتا کر اس محفل کے بارے میں شعر سنا کر کہتے ہیں "**بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل**" مجھے اُس بزم کی بار بار یاد آرہی ہے جس بزم میں نغمہ سنا، اب میں نغمہ بزم میں نہیں سنتا اور اسی نغمے کی تفصیل پر اس

محفل میں حاضر ہونے کے بعد یہ بتا رہا ہوں کہ بزم میں پھول بھی تھے، نالہ دل شاعروں نے بزم میں اپنے معشوق کے بارے میں فریاد کری۔ لیکن وہ چراغ جس چراغ کو اُس بزم میں پایا جس بزم میں میں نے نغمہ سنا اُس محفل کو یاد کر کے میں اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ ''جو تری بزم سے نکلا'' مطلب اس نغمے سے میں زیادہ متاثر ہوا۔ میں نے اپنا دل اس نغمہ سننے والے کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں جو اُس بزم میں آواز سنی جس نغمے سے میں متاثر ہوا اور میں نے دِل بھی اُن کو پیش کیا۔ اب جو وہ آواز تھی اُس آواز سے میں پریشانی میں مبتلا رہا۔ اِسی لئے میں یہ شعر لکھ کر خفیہ بتا رہا ہوں کہ اُس گانے بجانے والی عورت یا لڑکی نے مجھے پریشانی میں مبتلا کیا۔ اسی لئے غالب اِس بزم میں پریشاں کا استعمال بیان کرتے ہیں۔ مطلب اُس بزم سے متاثر ہوا ہے جس بزم میں نغمہ سنا ہے۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوۂ گل واں بساط صحبت احباب تھا

جب میں نے اس بات کا ذکر کیا کہ غالب کا معشوق گانے بجانے میں ماہر رہا ہے اور وہ خود اس کے گانے سے مختلف بزم میں متاثر رہے ہیں۔ غالبؔ بزم میں شریک ہوتا رہا لیکن اِس بات کا احساس پڑھنے والے کو اور محفلوں میں غزل سننے والوں کو نہیں ہوا جس سے کہ انہیں معلوم ہوتا کہ گانے بجانے والی کے ساتھ شاعر کے دِلی تعلقات ہیں لیکن عام طور پر شاعر شعر لکھتے ہیں۔ وہ کسی خاص بات کے ساتھ وابستہ ضرور رہتا ہے اِسی لئے میں یہ لکھتا ہوں کہ جب اُس بزم میں غالب حاضر رہے تو شاعر کو بزم میں کچھ نیا کلام سنانا ہے۔ جس سے کہ شاعر اور سامعین دونوں ہی متاثر رہیں۔ جب غالب نے اس بزم میں کچھ سنایا تو لوگ متاثر ہوئے۔ اس کے بعد غالب نے غزل میں اس شعر میں اُس بات کی پھر فریاد کی جس بزم میں نغمہ سنا اور نغمے سے متاثر ہوئے۔ اسی پر یہ شعر میرے خیال میں بزم کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ لفظ تھا سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی بزم کا ذکر غالب پھر کرتا ہے اگر لفظ 'تھا' نہیں ہوتا تو میں اُس بزم

کا ذکر اِس کے ساتھ نہیں وابستہ کرتا۔ اسی لئے میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ گانے بجانے والے سے متاثر ہو کر اُس کا نغمہ سن کر غالب فرما رہے ہیں کہ میرے دِل، میرے نفس کو سکون حاصل نہیں ہوا۔ میں اُس نغمے سے متاثر رہا ہوں جو میں نے بزم میں سنا، وہ بزم کبھی بھی میرے لئے دوبارہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اُس گانا بجانے والی بزم میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے میرے دل کو اُس بزم کی یاد بار بار دِلاتی ہے۔ اسی لئے اگر اُس بزم کے ساتھ جس بزم سے میرے دل کی وابستگی رہی اس کو نہیں پایا، اگر چہ وہاں پر جلوہ گل تھے مطلب بزم میں بہت سے ایسے شاعر بھی تھے جن کی میں نے بار بار تعریف کی اور اتنی اچھی بزم منعقد ہوئی کہ جلوۂ گل بھی نہیں دیکھ سکے۔ مگر صحبت احباب تھا۔ مجھے بچپن کی یاد نے پھر اُس بزم کے ساتھ وابستہ کیا۔ جس بزم سے مجھے بہت ہی قربت تھی۔ اگر اس بزم میں مَیں نے ہر ایک چیز کو پایا لیکن سکون دل نہیں پایا۔ دل میں سکون ہی نہیں رہا میں اُسی بزم کو بار بار یاد کرتا ہوں اور اُسی نغمہ کو بار بار سننا چاہتا ہوں۔ جس نغمے پر میں نے اپنا دل اس گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کو پیش کیا ہے۔

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

میں نے پہلے ہی بیان کیا کہ نغمہ سن کر اُس گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ غالبؔ کا واسطہ رہا ہے۔ جس سے اُس نے اپنا دل اس کو پیش کیا تھا۔ لیکن ایک ہی بار غالب نے ایسی بزم میں دیکھا ہے۔ بار بار نہ دیکھنے کی وجہ سے ہر بزم میں اپنے مختلف شعروں میں ان کا تصور دُہراتا ہے۔ جیسے کہ شاعر فرماتے ہیں کہ 'حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں' مطلب غالبؔ فرماتے ہیں کہ میں حیران ہوں کہ اس جیسی بزم دیکھنے کو ملتی نہیں ہے۔ جس بزم میں میں نے اپنا دِل پیش کیا ہے۔ اُن کو بھی معلوم ہے کہ اُس نے مجھے دِل پیش کیا ہے۔ اسی لئے وہ بھی کسی بزم میں اب نظر نہیں آتی۔ حتیٰ کہ میں مختلف بزم میں حاضر ہوتا ہوں لیکن میں حیران ہوں تیرے نغمے سے متاثر تو بہت ہوئے۔ وہ متاثر ہونے والے بھی آپ کے گانے

بجانے کو آپ کے ساتھ ساز کو یاد کرتے ہیں۔ کیا وہ ان کانوں سے اُس آواز کو دوبارہ نہیں سن سکتے۔ میں حیران ہوں میں نے کوشش کی بہت بار کہ بزم میں آپ کو دیکھوں لیکن نہیں دیکھ سکا۔ اسی لئے میں زیادہ تر بزم میں شریک رہا اور آپ کا نغمہ ہی بھول بیٹھا لیکن مجھے کان ستاتے ہیں اور میرا خیال ستاتا ہے اسی ستانے کی وجہ سے میں بار بارم بزم میں پیش ہوتا ہوں۔ حیران ہوں کہ کسی کو آپ کے نغمے یاد نہیں آتے۔ مَیں نے سوچا میں جب بزم میں شریک ہوؤں گا تو بہت سے لوگ آپ کی فرمائش پر کسی نہ کسی بزم میں بلائیں گے اور میں آپ کا پھر نغمہ سنوں۔ اب میں حسرت میں ہوں کہ کسی بزم میں آپ کے خیالات نہیں سنے۔ اس کا مطلب 'گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے' جب میں نے آپ کی آواز نہیں سنی تو میں آپ کو گلدستہ اپنی نظروں سے پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ بزم میں شریک نہیں ہو۔ آپ کی غیر حاضری میں یہ گلدستہ کسی کے ذریعے پیش نہیں کر سکتا ہوں۔ جس کی وجہ سے بہت سی بیکار باتیں وجود میں آ کر آپ کی اور میری عزت میں گراوٹ لا سکتی ہیں۔ اسی لئے میں دِل سے ہی اس نغمے کو سننے پر گلدستہ پیش کرتا ہوں وہ بھی اپنی نگاہوں کے ذریعے جب کہ میں نے آپ کی حاضری ابھی تک کسی بزم میں نہیں پائی ہے۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جب میں اُس بزم میں شریک ہوا میں نے آپ کے نغمے سنے جسے سن کر بہت ہی متاثر ہوا۔ واہ واہ بھی کہا۔ لیکن میں جب آپ کی کسی بزم میں حاضری نہیں دیکھتا تو میں آپ کا خیال اور تصور اور آپ کی آواز دل میں کانوں میں اور آنکھوں سے دہراتا ہوں۔ اسی لئے میں پریشانی میں مبتلا رہتا ہوں۔ پریشان ہو کر جب اس بزم میں بیٹھا جس بزم میں مجھے شاعروں کے ساتھ کلام سنانا ہے اور میں بھی ان کا کلام سننا چاہتا ہوں لیکن دل کا سکون ہے ہی نہیں۔ میں آپ کے نغمہ سے متاثر رہا مطلب گا۔ نے بجانے سے متاثر رہا اور میں نے دِل اپنا پیش کیا

ہے۔ تبھی تو غالب فرماتے ہیں جب غیر حاضر دیکھا میں سوچنے لگا کہ اے گانے بجانے والی اور نغمہ سے متاثر کرنے والی میں اسی لئے ساقی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھتا ہوں اور اپنے خیالات کو الگ کرنے کیلیے اپنی توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے میں شراب کا استعمال کرتا ہوں۔ اب میرے لئے یہ ادبی بزم شراب کی بزم میں تبدیل ہوئی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ محقق لوگ یہ بات تسلیم کریں گے کہ اسی نغمے کے سننے پر غالب کو شراب کا استعمال بار بار اس بزم میں کرنا پڑا ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کریں گے کہ غالب 'اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟' مطلب جس بزم میں پہلے غالب حاضر ہوا وہاں پر شراب کا لفظ ہی نہیں بیان کیا ہے، شراب کا لفظ اس وقت بیان کیا ہے جب غالب کو وہ نغمہ پھر سننے میں نہیں آیا مطلب اُس گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کو کسی اور بزم میں گانا بجاتے نہیں دیکھا۔ اسی لئے یہی کہہ رہا ہے جب میں نے 'اُس بزم میں' کا حوالہ دیا مطلب جس بزم میں نغمہ سنا۔ جہاں جام کا استعمال نہیں ہوا مطلب شراب وہاں پیتے نہیں تھے، جب دوسرے بزم میں غالب شریک رہا اُس بزم میں شراب پینے کا انتظام بھی دیکھا۔ اسی لئے اُس گانے بجانے والی کا خیال رکھ کر کہنے لگا وہ پاکیزہ عورت تھی جہاں پر گانا بجا۔ نے کے وقت شراب کا استعمال نہیں ہوا۔ یہاں میں اسی لئے شراب کا استعمال کرتا ہوں اور اِس بزم میں شراب بھی میسر ہے اسی لئے میں اُن کے خیالات کو مرکوز کرنے کے لئے شراب کا استعمال کرتا ہوں۔ میں محققوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تب غالب شراب کا لفظ استعمال نہیں کرتے جب غالب نے فرمایا اُس بزم کا حوالہ۔ مطلب گانے بجانے والی کا ہی حوالہ دے رہا ہے۔ حوالہ دے کر میں یہ ثابت کرتا ہوں کہ غالب کو گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ ہی قریبی واسطہ رہا ہے اور اپنا دل بھی پیش کیا ہے۔ جیسے کہ 'ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں' مطلب اگر اُس نغمے سے میں متاثر رہا ہوں میں نے واہ واہ کہا اور اپنا دل بھی پیش کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گانا بجانے والی نواب کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے یا پھر کسی امیر گھرانے سے۔ تبھی تو غالب فرماتے ہیں کہ مجھے اگر گانا

بجانے والی سے ملاقات نہیں ہوئی ہے لیکن میرا دل اُس کے ساتھ وابستہ رہا اور اُس کی وابستگی بھی میرے ساتھ رہی ہے۔ اُسی بزم میں جس بزم میں میں نے ان کو دیکھا اور نغمہ گایا۔ اسی لئے اب یہی کہہ رہے ہیں کہ جب میں اس بزم میں شراب کا استعمال کروں کیا پتہ ہے کہ ان امیروں نے اس شراب میں کچھ ایسی ملاوٹ کی ہوگی جس سے کہ میں مر سکتا ہوں اور اُس گانے والی کے ساتھ رشتہ ترک ہو جائے گا۔ اور ایسی دلیل بھی لوگوں میں رونما نہیں ہوسکتی لیکن میں اس زہر کو بھی پی کر خدا کے لئے اُس گانے والی عورت سے واسطہ رکھا ہے۔ جس سے کہ میں نے بہت ساری بزموں میں شریک رہا لیکن میں نے کسی بھی بزم میں اُن کو نغمے سنانے کے بعد نہیں پایا۔ اسی لئے میرے خیال میں دوسرے مصرعے میں بیان کیا ہے کہ ’ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں‘۔

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

جب میں نے اس بات کا ذکر غالب کے شعروں میں ہی بیان کیا ہے غالب کا قریبی واسطہ گانے بجانے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ رہا ہے اور ممکن ہے کہ رشتہ بھی رہا ہوگا لیکن انہوں نے بیان نہیں کیا کیونکہ عام طور پر بزم میں شاعر ہی بیٹھتے ہیں اور وہ کلام سن کر متاثر ہو کر نہیں بتا سکے کہ غالب کا واسطہ کسی گانے بجانے والی کے ساتھ ہے اور اسی لئے ان کی شاعری مقبول عام ہوئی ہے۔ وہ لوگ حوالے دیتے لیکن گانے بجانے والی عورت یا لڑکی ایک امیر گھرانے کی ہونے کے ناطے بیان نہیں کیا ہوگا اور اسی لئے انہوں نے ایسی بات کو بتانے سے انکار کیا ہوگا۔ کیونکہ شاعروں نے اس لفظ کو مختلف شعروں میں پڑھ کر اور مختلف بزم میں سن کر محسوس کیا ہوگا کہ کسی خاص شخص کا اشارہ لفظ بزم سنا کر کرتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوگا کہ غالب بہت ہی بلند پایہ شاعر ہے ہم ایسی باتیں کیوں سرعام کہیں گے اور ممکن ہے کہ امیر لوگوں کی عورت یا لڑکی ہونے کی ناطے انہیں کوئی قتل نہ کرے۔ اسی لئے بزم میں بیٹھ کر اس راز کو فاش

دوسرے شاعروں نے نہیں کیا ہوگا۔ تبھی تو غالب فرماتے ہیں 'میں اس بزم میں کام آؤں' مطلب میں نے جب انہیں بزم میں دیکھا ہی نہیں اُن کی یادداشت کے لئے میں ہر ایک بزم میں حاضر رہا، لیکن بزم ادب میں شریک رہا، غالب نے اس کے ساتھ بزم کا حوالہ دیا۔ پہلا ادبی بزم، دوسرا جس بزم میں شراب کا استعمال کیا کرتے ہیں۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں اور مطلب یہی کہ جب میں نے اُس گانے بجانے والی کو ادبی بزم میں نہیں دیکھا تو دل ودماغ منتشر رہا اب میں اُس بزم میں شریک ہوا ہوں جہاں ساقی شراب پلاتا ہے میں اسی لئے شریک ہوا ہوں تاکہ اُس دُکھ کو ختم کروں یا اپنی یادداشت کو منتشر کرنے کے لئے شراب کا استعمال کروں ورنہ مجھے ادبی بزم میں ہی بیٹھ کر اپنے گھر جانا تھا لیکن نہیں جاؤں گا کیونکہ وہ نغمہ گانے والی عورت کو کسی بھی بزم میں نہیں دیکھا۔ جس نے میرے دل کو متاثر کیا ہے۔ تبھی تو غالب نے 'یوں تشنہ کام آؤں' مطلب جب میں اُس گانے بجانے والی کے کام نہیں آیا اس نے بے وفائی کی میں نے بہت سی غزلیں لکھیں مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میری غزلوں کو گا کر لوگوں کو متاثر کرتی ہے، میرے کام ہی وہ گانے بجانے والی نہیں آئی۔ اب میں شراب کا استعمال کرتا ہوں۔ 'گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا' اسی لئے میں پڑھنے والے کو اس مصرعے سے پورا یقین دلاتا ہوں تبھی تو غالب نے اس مصرعے میں یہ بیان کیا ہے کہ اگر چہ میری اُس گانے بجانے والی سے کوئی بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ جب میری ملاقات پہلے بزم میں ہوئی اس کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوئی، اگر ملاقات ہوتی تو میں ساقی کے پاس کیوں جاتا۔ میرا ساقی کے ساتھ کونسا رشتہ ہے۔ میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ دراصل اس کے یاد نے میرے دل کو ستایا ہے۔ اور اس نغمہ سے میں بہت ہی متاثر ہوا ہوں تبھی تو میں پھر بیان کرتا ہوں کہ ساقی کے ساتھ مجھے اسی نے وابستہ کیا اور اسی کا گناہ ہے۔ کیوں مجھے نغمہ سنا کر دل کو پریشانی میں مبتلا کیا۔ اور میں نے اپنے دل کو پیش کیا۔ یہی وجہ تھی کہ غالب نے کہا کہ ساقی کے ساتھ میرا کوئی واسطہ نہیں تھا یہ واسطہ اسی نغمہ سے ہوا جس نغمہ سے میں اُس بزم میں متاثر

رہا ہوں۔

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزم خیال میکدۂ بے خروش ہے

میں نے اس بات کا احساس پہلے ہی کرایا کہ غالب کو شراب کی عادت نہیں تھی۔ وہ بہت ساری بزوں میں شریک ہو کر اپنی غزل سناتا تھے جس سے سننے والے متاثر ہوتے تھے، لیکن کسی خاص محفل میں جس کا ذکر میں نے پہلے ہی بیان کیا ہے جس بزم میں غالب نے نغمہ سنا ہے جس نغمہ پر غالب نے واہ واہ کی، اُسی نغمہ سے متاثر ہو کر وہ اپنا دِل پیش کرتا ہے۔ مطلب پاک محبت ہوئی ہے لیکن کئی وجوہات کی بنا پر پھر وہ نغمہ سنانے کے لئے بزم میں نہیں حاضر ہوئی، اُن کو دیکھنے کے لئے غالب بہت ہی پریشان رہے۔ اسی لئے میں یہ ان مندرجہ ذیل مصرعوں سے پڑھنے والے کو ثبوت پیش کرتا ہوں کہ غالب نے شراب کا استعمال نہیں کیا۔ وہ مجبور ہوا جب اُسے اُس نغمہ گانے والی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ غالب فرماتے ہیں کہ **'دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست'** کہ مجھے ساقی کا دیدار کرنے کا واسطہ کیا تھا۔ مجھے ساقی سے نہیں ملتا نہ اس کا دیدار کرتا لیکن وجہ یہ ہوئی کہ میں نے جب اپنے دل سے اس نغمہ کو یاد کیا جو کہ کسی بزم میں گایا گیا جس نے میرے دل کو متاثر کیا، کسی بھی بزم میں اُن کو حاضر ہی نہیں پایا، حاضر نہ ہونے کی وجہ سے میں اب شراب پینے کے لئے شراب کی بزم میں جا کر بیٹھتا ہوں اور پی کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ کسی کی یاد سے میں متاثر ہو کر نادان بن جاتا ہوں اور یہ نادانی ساقی کی وجہ سے ہے۔ ساقی کے کارناموں سے میں شراب میں مست رہا اور اس نغمہ کی یاد میرے سے معطل ہوگئی لیکن افسوس ہے 'بزم خیال میں بے ہوش رہا' اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ میں اُس بزم میں جاتا ہوں لیکن وہاں میں غزل سناتا ہوں سننے والے میری غزل سے متاثر ہوتے ہیں لیکن کیا کہوں میں اُن کو اُس بزم کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا دِل ہی دل میں افسوس کر کے بزم خیال مطلب شاعروں کی بزم میں بیٹھ کر میں زیادہ تر شراب کی بزم کا خیال

کرتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ بزم خیال سے جدا ہو کر شراب کی بزم میں بیٹھوں اور بیٹھ کر اُس نغمہ کو الگ کروں جو کہ میں نے بزم میں سنا، جب انہیں دیکھا ہی نہیں اسی لئے ان کی یاد کو معطل کرنے کے لئے میں بزم خیال میں شریک ہونے کے بعد بزم میکدۂ میں شریک ہوا۔ مجھے شراب سے کوئی واسطہ نہیں تھا افسوس ہے کہ مجھے بزم خیال میں ہی ایسا واسطہ اُس نغمے کے سننے سے رہا جس نغمے کو ابھی تک دوسری بزم میں نہیں گایا۔

نالۂ دل میں، شب، اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزم وصل غیر گو بے تاب تھا

میں نے پہلے اِس کتاب میں یہ بیان کیا کہ شاعر کی توجہ شراب پر زیادہ نہیں رہی بلکہ شراب کو اسنے دوسرے طریقے سے بیان کی ہے لیکن جب میں نے دیوانِ غالب کی تمام غزلیں پڑھیں تو پڑھ کر مجھے غالب کے کئی ایسے شعر غزلوں میں پڑھ کر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ غالب کے تعلقات گانے بجانے والی سے ہی رہا اور یہ پھر دہراتا ہوں کیونکہ اس شعر کو جو کہ اس نے دیوانِ غالب میں لفظ 'بزم' کے ساتھ کہہ کر پھر بیان کیا ہے کہ میں اس بزم کے ساتھ وابستہ رہا ہوں اور اس بزم میں میں نے اپنا دل اُس کو پیش کیا جس سے میں بدکاروں میں پھنس کر پریشان رہا ہوں۔ جیسے کہ **'نالۂ دل میں، شب، اندازِ اثر نایاب تھا'**۔ جب میں نے انہیں بزم میں دیکھا ہی نہیں تب میں نے یہ سوچا میرا ان کا اثر رہا ہی نہیں کیونکہ ہر ایک بزم میں غیر حاضر پا کر میں نے سوچا وہ نغمہ میرے لئے الگ کیا گیا ہے جب میں نے بزم میں نہیں پایا اور میں سوچنے لگا وہ نغمہ نایاب ہے۔ اسی لئے آہ وزاری دل سے کرتا رہا اور رات بھر سوچتا رہا کہ میں کسی بزم میں انہیں حاضر دیکھوں تو میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ رات بھر انہیں یاد نہیں ستاتی اور یہ نہیں سوچتے ہیں کہ داد دینے والے کو میں پھر دیکھوں لیکن نہیں دیکھتا جس کی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ وہ بزم میں غیر حاضر رہ کر نایاب ہے۔ اور دستیاب ہی نہیں۔ **"تھا سپندِ بزم وصل غیر گو بے تاب تھا'** جب میں بزم سے الگ رہا مطلب بزم میں غزل پیش کی

شاعروں کے ساتھ باتیں بھی کیں اور اب مجھے اُن کا خیال شب میں آتا رہا کیونکہ بزم اختتام پذیر ہونے کے بعد میں جب گھر جاتا ہوں تو مجھے اُس نغمہ کی یاد ستاتی رہتی اور میں اُس نغمے سے وصل نہیں کر سکا، مطلب میں نے اُس نغمہ کو پھر بزم میں نہیں سنا۔ نہ سننے کی وجہ سے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کتنی تاب میں کروں اور کتنے دنوں میں نغمہ نہیں سنوں۔ جس نغمے کو میں نے ایک ہی بزم میں سنا اور نغمہ سنانے والے کو دیکھا جس کو دل میں نے پیش کیا لیکن کیا کہوں کہ وہ میرے وصل میں ہے ہی نہیں اور کیا اس کو میری بیتابی کا تصور نہیں ہے۔ اور اس کو میرے لئے خواب بھی دستیاب نہیں ہے کیا وہ میرے وصل کے لئے بزم میں نہیں آئے گی اور نہ ہی کوئی نیا نغمہ سنائیگی۔ افسوس ہے کہ میں یہ سوچ کر کہتا ہوں کہ میرے لئے وصل ہے ہی نہیں۔

بزم مے، وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا؟

شیشے میں نبض پری، پنہاں ہے موج بادہ سے

جب میں نے یہ بیان پہلے کیا کہ جس بزم میں نغمہ غالب نے سنا اور اس نغمہ پر واہ واہ کر کے تعریف کی بزم میں شریک ہونے کے باوجود نہیں دیکھا اور اسی نغمہ کو دہراتے ہوئے غالب فرماتے ہیں کہ مجھے اس نغمہ کے ساتھ بہت ہی دل کا لگاؤ رہا ہے۔ لیکن میں اس کو نہیں دیکھتا ہوں۔ کیا وجہ ہے۔ ان وجوہات کا اپنے آپ جائزہ لے کر یہی کہنے لگا کہ اُس نغمہ کو میں کسی اور بزم میں نہیں دیکھوں گا اسی لئے میں اُس بزم کو یاد کر کے یہ کہوں گا کہ جب مجھے ادبی بزم میں شاعر لوگ بلاتے ہیں میں غزل پڑھتا ہوں لیکن مجھے بزم کے ماحول میں وحشت کا احساس ہوتا ہے، جب وہ میرے کلام کو سنتے ہیں سن کر ان کے چشمے متاثر رہتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ کیا شاعری اچھی غالب کی ہے، داد دے کر میں انہیں یہ نہیں بتاتا ہوں کہ مجھے اس نغمہ کی یاد ستاتی ہے جس نغمہ کو ایک بزم میں سنا اور میں نے اپنے دل کو پیش کیا۔ لیکن باوجود اس کے مجھے اس کا اثر ہے لیکن ان پر میرا اثر شاید نہیں ہے۔ میں ہر ایک شعر میں ان کی آواز کو دہراتا ہوں اسی لئے لفظ بزم کو دہرا کر یہ کہہ رہا ہوں کہ اس بزم میں اس کے بغیر میں وحشت

محسوس کر رہا ہوں اور اندازہ لگا تا ہوں کہ میرے خیال میں اس کی جو آنکھیں ہیں کسی کے ساتھ وابستہ ہونے سے مست رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں کہ جب اس نے مجھے اس بزم میں دیکھا اور اس وقت اس کے اور میرے چشمے متاثر رہے اسی لئے میں یہ پھر دہراتا ہوں 'بزم مے، **وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا؟**' مطلب میں جب ان کے چشموں سے دور رہا وہ بھی میرے چشموں سے دور رہا، میں اس بزم کی آنکھوں کو دہرانے کے لئے میکدہ میں حاضری دے کر مے کا استعمال کرتا ہوں۔ اس سے مجھے ایسے ہی چشمے دیکھنے کو ملتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ ان چشموں کو دیکھ کر اب وہ نغمہ میرے پاس ہے۔ مطلب کہنے کا ہے کہ اس نغمے سے مجھے دل کا واسطہ رہا اور دل بھی پیش کیا لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ ابھی تک دیکھا ہی نہیں اور اس وقت بزم میں چشمے کا حال کس طرح دیکھا گیا۔ اسی طرح میں ان چشموں کو پھر دیکھنا چاہتا ہوں اسی لئے میں میکدہ میں شراب پی کر ایسا چشمہ ڈھونڈتا ہوں۔ میرے خیال میں بزم مے کا استعمال غالب نے اسی لئے کیا ہے اور کہا ہے کہ میں اب بزم ادب میں نہیں شریک ہوں اور بزم ادب سے الگ ہونے کے بعد میں 'بزم مے' میں ہی حاضری دیتا ہوں۔ اور ادب کے ساتھ اسی لئے الگ رہا کیوں کہ وہ نغمہ جو میں نے بزم میں سنا وہ میں نے کسی اور بزم میں نہیں سنا۔ تبھی تو میں اُس کی یاد کو بھولنے کے لئے اور مجھے بزم ادب میں بیٹھ کر اس کے خیال سے غزل کہنے پر تناؤ پیدا ہوا ہوتا ہے کیونکہ یاد ہمیشہ بزم ادب میں ہی آتی ہے۔ '**شیشے میں نبض پری، پنہاں ہے موج بادہ سے**' میں نے جب اس بات کا حوالہ دیا کہ بزم ادب میں نہیں غالب زیادہ حاضر رہتا ہے بلکہ بزم مے میں ہی حاضر دیتا ہے اسی لئے اس مصرعے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ جب میں مے خانے میں بیٹھتا ہوں میں اُس نغمہ کی اِس طرح سے نبض دیکھتا ہوں جس طرح شیشے کو دیکھ کر ہم تصویر دیکھتے ہیں۔ شیشے میں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ پری کی نبض ہے اور اس شیشے کو نغمے کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں جس نغمے کو میں نے کسی خاص بزم میں دیکھا اور پھر ایسا نغمہ دوسرے بزم میں نہیں سنا۔ اسی لئے اس کا

تصور دل میں رکھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے شراب کے شیشے کو دیکھ کر اس کی نبض محسوس ہوتی ہے اور میں اپنی شراب میں مست رہتا ہوں اور ان کی یاد الگ رکھتا ہوں۔

اُس کی بزم آرائیاں سن کر، دل رنجور، یاں
مثل نقش مدعاے غیر بیٹھا جائے ہے

میں نے پہلے پیغام بزم نام اسی لئے رکھا تا کہ پڑھنے والے کو یہ سمجھاؤں کہ غالب کی معشوقہ گانے بجانے یا گانا سننے کی شوقین تھی، جس شعر کو میں نے پہلے ہی اس مقصد کے لئے لکھا۔ اُسی کے ساتھ باقی لفظ 'بزم' کا واستہ رکھ کر پڑھنے والے کو سمجھایا تا کہ وہ میری بات پر مطمئن رہے۔ مختلف رائے دینے والے بھی اُردو میں موجود ہیں۔ کیا وہ میری رائے سے متفق ہیں۔ لیکن میں یہ دعویٰ اس شعر کے ساتھ منسوب کر کے باقی شعروں کے ساتھ واسطہ رکھ کر صحیح کہہ رہا ہوں۔ میں اب اسی بات کو اوپر کے شعر کے حساب سے یہ کہوں گا کہ غالب ہر ایک بزم میں موجود رہ کر بھی اسے وہ معشوقہ کبھی نہیں دوسرے بزم میں ملی۔ جس کے لئے غالب نے کافی کوشش کی اور غزل کے بہت سے شعروں میں لفظ ب 'بزم' کو لکھ کر اپنے دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے بتایا میں نے اس نغمہ کہنے والی اور نغمہ سننے والی کے ساتھ اتنا لگاؤ ہوا کہ میں نے اپنی زندگی شراب میں مست رکھی۔ اور اس کی وجہ سے میں بدنام ہوا اور مجھے کوئی بھی عزت مذہبی رسموں میں لوگوں کے ذریعہ نہیں ملتی ہے۔ لیکن یہ عزت اسی لئے ختم ہوگئی کیونکہ میں نے اس کا چہرہ ہی دوسری بزم میں نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ بہت کوشش کی اُس کا چہرہ بھی بزم میں نہیں دیکھا نہ وہ کبھی حاضر بزم میں رہی۔ اب میں مختصر یہ کہہ رہا ہوں کہ اُس کو بھی شوق ہوگا کسی بزم میں شریک ہونے کا اور وہ بھی میرے لئے ترستی ہوگی اور مجھے بھی اس بزم میں دیکھنا چاہتی ہوگی، لیکن مجھے اس بزم میں اجازت ہی نہیں ہوگی مانتا ہوں وہ بزم بہت ہی آراستہ ہوگی، مطلب اس کو سجایا ہوا ہوگا لیکن میں دل سے رنجور ہوں۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ "اُس کی بزم آرائیاں سن کر، دل رنجور، یاں" اسی لئے اُس کا لفظ اِس لفظ شعر میں بیان کیا ہے غالب

نے باقی لفظ بزم میں اُس کا حوالہ نہیں دیا ہے اِس مصرعے میں اُس کا حوالہ دے کر صاف بیان پڑھنے میں پڑھنے والوں کو محسوس ہو جائے گا کہ وہی بزم جس میں لفظ 'نغمہ' کا غالب نے استعمال کیا ہے۔ مطلب گانا بجانے والی یا گانے سننے کا شوق رکھنے والی عورت ہی غالب کی معشوقہ ہے۔ اِس بات کا اِس مصرعے سے بھی اظہار ہوتا ہے۔

ہاں غالب اِس شعر کے دوسرے مصرعے میں بیان کرتا ہے جب وہ مجھے بزم میں غیر حاضر پائے گی حتی کہ اُس نے بزم میں اسی لئے آراستہ ہوئی ہوگی تا کہ غالب کا دیدار کروں وہ گانا سننے یا میرے گانے کو سنانے کے لئے بیٹھیں۔ لیکن غالب فرماتے ہیں کہ مجھے شک ہے کہ وہاں کسی دوسرے کو میری جگہ پر حاضری دینی ہوگی تا کہ لڑکی کے گھر والے میرے حاضری پر تناؤ پیدا کر کے نفرت بھری نگاہوں سے نہ دیکھیں۔ اسی لئے غالب نے کہا 'مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے' مطلب کسی غیر کو میرے بجائے حاضر رکھ کر اس بزم میں مجھے معشوق کے ساتھ تناؤ میں رکھ کر میری نفرت کو ابھاریں گے اور مجھے کہاں پھر اُس معشوق کے ساتھ ملنے کا موقعہ فراہم ہوگا۔ مطلب مجھے لفظ بزم سے ہی معلوم ہوا ہے کہ غالب کی معشوق صحیح ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کی وجہ سے غالب نے بہت دفعہ مختلف غزلوں کے شعروں میں بزم کا استعمال کیا ہے۔ میں نے پہلے ہی اس بات کی تفصیل دی۔ اس بات کی تفصیل میں اب مندرجہ ذیل مطلع اور مقطع سے کرتا ہوں جس کی میں نے پہلے ہی تشبیہ کی ہے۔ لیکن اُس سے تشبیہ کر کے یہ بتاؤں کہ غالب نغمہ محبت نغمہ کے ساتھ پڑھنے والوں کو سمجھاؤں کہ غالب کا واسطہ امیر گھرانے سے رہا ہے، یا شہنشاہ یا شاہی خاندان سے بھی تعلق ہوسکتا ہے۔

پھر اُس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہ دیں دار نے شفا پائی

اگر اُوپر کے مطلع اور مقطع سے ہمیں اس بات کا ثبوت یا حوالہ ملتا ہے کہ غالب کی معشوقہ ایک امیر گھرانے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اُسے گھر والوں نے پابندی عائد کی اور وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتی، کیونکہ معشوقہ کے گھر والوں نے سنا ہوا ہوگا کہ اُن کی لڑکی یا عورت کو کسی شاعر کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہیں۔ اسی لئے کسی خاص بزم میں غالب نے سنا ہوگا اُس لڑکی کو نغمہ پیش کرنے کی بزم میں حاضر ہو کر پابندی عائد کی گئی ہے۔ جس نغمہ سے غالب کا لگاؤ بھرپور رہا لیکن میں یہ دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کیا نغمہ گایا گیا یا نغمہ سنایا گیا یا نغمے کو معشوقہ نے محبوب کو سنایا۔ صرف مصرعے میں غالب نے نغمہ بیان کیا ہے، اس بات پر گہری سوچ کرنی پڑے گی لیکن صحیح طور پر اُسی وقت معشوقہ کی ملاقات غالب سے اُسی بزم میں ہوئی ہے جس کا حوالہ لفظ 'نغمے' سے کیا ہے جبکہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی معشوقہ کو پابندی عائد کی گئی اور کسی بزم میں حاضر نہ ہوئی۔ جب بزم میں حاضر نہ ہوئی تو غالب کو زیادہ شاعری اُبھرنے لگی اور غالب نے بزم میں ہی بار بار غزل کے شعروں میں زیادہ بیان بازی شروع کی، لیکن اب پڑھنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ بات غلط ہے اِس بات کو صحیح یا درست اس مطلع اور مقطع سے مشابہت دے کہ بتاؤں گا 'پھر اُس انداز سے بہار آئی' مطلب شاعر کو پورا یقین ہوا ہے کہ معشوقہ کو کسی نہ کسی طریقے سے گھر سے باہر جانے کی اجازت ملی ہے۔ تبھی تو کہہ رہے ہیں 'کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی' مطلب کہنے کا یہ ہے جب شہزادی یا امیر گھرانے کی لڑکی گھر سے باہر نکلے گی تو بہت سے اسے دیکھیں گے دیکھ کر حیران ہو جائیں گے اور اس بات کا اظہار آپس میں کریں گے اتنے عرصہ تک یہ گھر میں خفیہ طور پر رہی تھی، کیا وجہ ہے کہ تبھی تو غالب مقطع میں اس بات کا حوالہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ 'کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ' مطلب اب غالب فرماتے ہیں کہ جب سبھی کو خوشی محسوس ہو جائے گی شہزادی یا امیر گھرانے کی لڑکی کو آج گھر والوں نے رہا کیا۔ جس پر بہت سے لوگ مختلف تبصرہ کریں گے لیکن اس پر غالب فرماتے ہیں کہ میں کیا بتا سکتا ہوں میں دوسروں کو یہ نہیں بتا سکتا ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ دل کا لگاؤ اور

قریبی محبت ہوئی ہے جس کی وجہ سے اِس کو گھر سے باہر جانے پر پابندی عائد کی گئی۔ تو مجھے اس پابندی پر بہت ہی غم ہے تو میں کیسے خوشی میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔ تبھی تو میں یہ کہوں کہ 'شاہ دیں دار نے شفا پائی' مطلب غالب فرماتے ہیں کہ میں ایسے حالات دیکھ کر یہی کہوں گا کہ شہزادی یا امیر گھرانے کے لڑکوں کو میری محبت پر گھر سے جانے کے لئے پابندی عائد کی گئی۔ کونسی فتح اس شاہ نے پائی جس نے میری معشوقہ کو گھر سے باہر جانے کی پابندی عائد کی۔ اُس نے اس طریقہ سے کونسی صحت یابی حاصل کی اور میری معشوقہ کو کمرے میں بند کر کے بیمار کی طرح بیماری میں مبتلا کیا۔ اسی لئے میں اُس معشوقہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں اگرچہ لوگ خوشیاں منائیں گے لیکن میں اپنی خفیہ محبت اپنے پاس ہی تا ابد رکھوں گا اور تفصیل نہیں بتاؤں گا۔ اسی لئے یہ مطلع اور مقطع غالب نے لفظ 'بزم' کے ساتھ ہی وابستہ کر کے غزل میں تحریر کیا ہے۔ جس مطلع اور مقطع سے ہمیں ثبوت ملتا ہے۔ اچھا خیر بات کو الگ رکھتے ہیں اب دوسرا ثبوت میں دوسرے مطلع اور مقطع میں بیان کرتا ہوں۔ مندرجہ ذیل مطلع اور مقطع کے پڑھنے سے میں قانون کے مفہوم کے دائرے میں وضاحت کروں گا بلکہ میں وضاحت لفظ 'بزم' کے ساتھ جوڑ کر اس طرح کرتا ہوں۔

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

جب غالب نے لفظ 'بزم' میں لفظ 'نغمہ' سے ہمیں اس بات کی طرف توجہ مرکوز کی کہ اُس کی معشوقہ کا واسطہ نغمے سے بزم میں ہوا ہے۔ تو پھر غالب نے بہت سی غزلیں تحریر کیں لیکن بیان بازی کرتا رہا۔ اسی پر غالب نے ایک دِن یہ بھی سنا کہ اس کی معشوقہ کے گھر والے کسی اور گھر میں رکھنے کی خفیہ مہم چلا رہے ہیں۔ یہ سن کر غالب نے ایک غزل تحریر کی ہوگی، جس

غزل کے مطلع اور مقطع میں بیان کرنے لگے کہ شہزادی یا امیر گھرانے کی لڑکی کو جب چار دیواری میں بند کیا گیا سب کے سب یہ شکایت کرنے لگے کہ اے شہنشاہ سب لوگ یہی شکایت کرتے ہیں کہ شہزادی کو یا امیر گھرانے کی لڑکی کو گھر والوں نے کس بات پر گھر میں بند کر کے قیدی بنایا ہے۔ تب بادشاہ نے یا امیر لڑکی کے گھر والوں نے یہ بتایا کہ اُسے پھر قید خانے سے چھوڑ کر کسی رشتے دار کے پاس رکھا۔ وہاں پر وہ قید خانے کی طرح اپنی زندگی نہیں بسر کرے گی۔ اس بات پر غالب مطلع میں کہتے ہیں کہ **'حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے'** میں جب سنا کہ شاہ نے محبوب کے لئے یا معشوقہ کے لئے اجازت فراہم کی ہے کہ وہ کسی سخنور کے ساتھ بات کر سکتی ہے اور اس طریقے سے ہم اُس کی پھر سے آزمائش کریں گے اور اس کے چال چلن پر تبصرہ کریں گے۔ اسی پر غالب نے دوسرے مصرعے پر یہ کہا **'چمن میں خوش نوایاں چمن کی آزمائش ہے'** اس آزمائش سے ایک پرندہ کو یا ایک پھول کو چمن میں رکھ کر سیلانی باغ میں اپنے اپنے تاثرات بیان کریں گے وہ یہ کہیں گے کہ یہ جو معشوق لڑکی ہے جس کو گھر والوں نے گھر سے دوسرے گھر بھیج کر آزادی سے رہنے کی اجازت دی ہے۔ تو وہاں پر سیلانیوں کا یا ہمسایوں کا یہی ردعمل رہے گا کہ یہ ایک پرندہ ہے جس کو پھول کی طرح باغ میں رکھا ہے، لیکن پھر بھی پرندہ بتا کر یہی کہیں گے کہ یہ ایک پھول بھی ہے۔ پھول اس وجہ سے کہ لوگ چہرہ دیکھیں گے دیکھ کر اپنے ردعمل کا اظہار کریں گے اور پرندہ اسی لئے ہے یہ اُس گھر کے پنجرے میں بند رہا اور یہاں لوگوں کو دیکھنے کے لئے باغ میں رکھ کر آزاد رکھا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ پرندہ ہی ہے اور یہ اُڑ کر یا اسے اڑا کر اسی گھر میں جانا ہے۔ جس گھر سے آئی ہے اور پھر قید خانے میں رہنا ہے، یہ آزادی سماج کے لوگوں کو دکھانے کے لئے ہے تا کہ کوئی دوسرے طریقے سے ردعمل کا اظہار نہ کریں۔ جب غالب نے غزل میں مطلع بیان کیا تب اس نے اپنا تبصرہ اپنے مقطع میں اس مطلع کے بارے میں یوں بیان کیا کہ جب اتنی پابندی غالب کی معشوقہ پر عائد کی گئی تو غالب نے مطلع میں اس پر اپنا تبصرہ کیا اور خود کہنے لگے کہ اتنی پابندی

کے باوجود شہزادی یا وہ لڑکی جس نے بزم میں میرے دل کو پیش کیا اور میں نے بھی اپنا دل اُس کو پیش کیا۔ اب اس ردعمل پر اُس پر بہت سی پابندیاں عائد کی گئیں ہیں، جس کی وجہ سے وہ مجھ سے کبھی بھی ملاقات نہیں کرسکتی ہے۔ اب اُسے تھوڑی سی رعایت ملی ہے لیکن اس رعایت کے باوجود وہ کسی بزم میں میرے ساتھ ملاقات نہیں کرسکتی ہے کیونکہ وہ میری کسی بزم میں حاضر نہیں ہوسکتی اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ مطلع میں اُسے تھوڑی سی رعایت ملی ہے لیکن باوجود اس کے وہ کسی نہ کسی طریقے سے میرے گھر ضرور آئے گی اور مجھ سے ملاقات ضرور ہوگی۔ تبھی تو غالب فرماتے ہیں کہ 'نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے' مطلب اس کے ملنے کے لئے اتنی پابندیاں رکھ کر بھی فتنہ اٹھانے سے کچھ نہیں حاصل ہوسکتا ہے باوجود کہ اس کے وہ میرے دل کے ساتھ ساتھ ہے۔ اگر اُس کے گھر والوں نے آزمائش کے طور پر دوسرے مقام پر رکھا وہاں پر بھی وہ میرے دل کے لئے تڑپ رہی ہوگی ان حالات کے باوجود مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی میری محبت کا امتحان لے کر آزماء رہی ہوگی، لیکن ہم دونوں اس امتحان میں کامیاب ہوں گے اور ضرور وہ میرے گھر میں آئے گی اور میں اسے مل کر اپنے سب دکھ درد بتا کر اُس بزم کے بارے میں بات کہوں گا جس بزم میں مجھے دل کا لگاؤ اس کے ساتھ ہوا ہے۔ اور اس کو بھی میرا لگاؤ اسی بزم میں ہوا ہے۔

اب محقق اس بات کی طرف توجہ مرکوز کریں گے کہ یہ بات اور یہ جرح صحیح ہے اگر صحیح نہیں ہے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لفظ 'شاہ' کو کس بات پر غالب کو غزل میں لکھنا پڑا۔ نہ ہی شاہی خاندان کے ساتھ اُس کی معشوقہ سے وابستہ ہے خواہ وہ گانے بجانے والی نغمہ سنانے والی یا نغمہ تحریر کرنے والی ہو لیکن میں اپنی سوچ کے حساب سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی معشوقہ انہیں سے وابستہ ہے۔ ورنہ محققوں کو بتانا پڑے گا مطلع میں دو تین بار لفظ 'شاہ' کا استعمال کرنا کیوں پڑا۔ اس بات کی طرف توجہ خود غالب مرکوز کرتا ہے جس کو میں نے پڑھنے والوں کے لئے بتایا۔ جس پر تھوڑی سی بحث بھی ہوئی۔ میں کسی تنقید نگار یا کسی ایسے محقق کا

حوالہ نہیں دیتا ہوں، جنہوں نے غالب پر بہت سے تبصرے کئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے آج تک غالب کی معشوقہ کے بارے میں کوئی بھی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی ردعمل کا اظہار نہیں کیا ہے کہ معشوقہ کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور کونسی چیز اسے پسند تھی میں نے اس بات کا خیال غالب کے شعروں کے ذریعے ہی مرکوز کیا۔

اب اس بات کا بھی حوالہ دیتا ہوں جس سے ہمیں صحیح بات کا اندازہ ملتا ہے کہ غالب نے جب بزم میں معشوقہ کو دیکھا اُس کے بعد بہت بار اُسی بزم کے بارے میں مختلف غزلوں کے شعروں میں لفظ 'بزم' سے ہی اس بات کو دہرایا وہ بزم مجھے پھر نہیں دیکھنے میں آئی۔ جس بزم میں معشوق کو دیکھا اور اسی پر ہزار بار مختلف شعروں میں دہرا کر لفظ 'بزم' کو پڑھنے والوں کی توجہ اپنی معشوقہ سے ہی الگ ہونے پر کیا ہے۔

اس بات کا حوالہ میں لفظ 'زخم' کے ساتھ جوڑ کر لکھ رہا ہوں کہ غالب نے لفظ بزم کو دہرا کر لفظِ زخم پر اسی بات پر توجہ مرکوز کی ہے کہ بزم میں جب ایک بار ملاقات ہوئی اُس کے بعد ملاقات نہ ہونے پر مختلف زخم ابھرنے لگے، جن زخموں کو میں نے مختلف غزلوں کے شعروں میں بیان کیا ہے۔

زخم کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی مرہم پٹی کرنی ہو۔ زخم ایک واقعہ ہے، ایک تذکرہ ہے جس میں لفظ زخم کا استعمال کیا ہے، جیسے اسرائیل، لبنان یا دوسرے ملکوں کے ساتھ آپسی تناؤ دیکھنے میں آتا ہے اور وہاں کے لوگوں میں آپسی محبت نہیں پائی جاتی، ان لوگوں میں آپسی تناؤ ہی ایک زخم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس زخم کو ٹھیک کرنے کے لئے مختلف دانشور باہمی سمجھوتہ کراتے ہیں لیکن اس سمجھوتہ سے کسی حد تک بیماری دور رہتی ہے لیکن زخم زخم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی طرح سے غالب نے جب بزم میں معشوقہ کو دیکھا اور پھر کبھی اُسے دوسری بزم میں نہیں دیکھا تو اس پر غالب کو زخم نمودار ہوا۔ جن زخموں کو اپنی غزلوں کے مختلف شعروں میں بیان کیا ہے اور بیان بازی کرتا رہا۔ مطلب زخم کو ایک تناؤ کے لحاظ سے بیان کیا ہے یا الگ

ہونے سے اپنی داستان لفظ زخم میں تشکیل دے کہ غزل میں بیان میں بازی کی ہے۔ جیسے

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور، مرے تن میں
ہوا ہے تار اشک یاس، رشتہ چشم سوزن میں

جب میں نے اس بات پر جرح کی کہ غالب کی معشوقہ امیر خاندان سے تعلق رکھنے والی ہے اور اس بات پر بھی جرح کا حوالہ دیا کہ معشوقہ گانے بجانے والی یا گانے سننے کی شوقین ہے اور خود غالب اپنے شعر کے مصرعے میں پڑھنے والے کو مرکوز لفظ نغمہ سے بیان کر کے اس بزم کا واقعہ بیان کرتا ہے جس بزم میں اُس نے اُس سے ملاقات کی اور ایک دوسرے کو دل پیش کیا۔ اسی پر بیان کرتے ہوئے غالب کو پھر دوسری بار موقعہ ہی فراہم نہ ہوا اور وہ معشوقہ بزم میں پھر شامل نہیں ہوئی، جس پر میں نے یہ بھی بیان کیا کہ ممکن ہے کہ ان کے گھر والوں نے غالب کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کچھ سنا ہوگا تبھی تو اس کے لئے کئی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے بزم میں غالب معشوقہ کو حاضر نہیں دیکھتا، تبھی تو نہ حاضر ہونے کی وجہ سے غالب کو صدمہ محسوس ہوا، جس صدمے سے اس نے لفظ زخم کا استعمال مختلف غزلوں میں مختلف شعروں میں بیان کیا ہے۔ جیسے غالب فرماتے ہیں 'نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور، مرے تن میں' مطلب میں نے پہلے کہا کہ تجربہ زخم پر غالب نے بیان کیا ہے اُس نے لفظ 'زخم' کو ایک حادثہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ جب معشوقہ بزم میں نہیں ملی تو کہنے لگا کہ مجھے الگ دیکھ کر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے الگ ہونے سے زخم نمودار ہوا ہے اور میرے اس زخم پر کوئی بھی مرہم پٹی نہیں کر سکتا۔ لیکن جب کوئی مجھے بزم میں بتا رہا ہے کہ آپ کس بات پر سنجیدہ بیٹھے ہو اور کچھ بھی بتانے سے انکار کیا کرتے ہو میں اُسے اپنے زخم کے بارے میں واقف نہیں کراتا اور کہتا ہوں کہ نہیں ہے زخم کوئی، مطلب کوئی صدمہ نہیں ہے، اندر ہی اندر کہہ رہا ہوں کہ کیا بتاؤں کہ میرے تن سے اُس بزم کی یاد ہمیشہ ظاہر ہوتی ہے جب میں کسی بھی بزم میں اُس نغمہ کو نہیں سنایا۔ جب حاضر دیکھتا ہوں تو اپنے زخم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا اور درد سہتا

رہتا ہوں۔ باہر سے یہی کہتا ہوں کہ تن میرا ٹھیک ہے۔ اسی لئے غالبؔ فرماتے ہیں کہ میری آنکھوں میں آگ لگی ہوئی ہے، مطلب روتا ہوں یہ رونا کوئی دیکھنے والا محسوس کرتا ہے لیکن آنسو نہیں بہاتا۔ آنسو نظر نہیں آتے۔ صرف میری آنکھوں کی جلن دیکھتے ہیں مطلب میری آنکھیں چشم سوزن میں تبدیل ہوئی ہیں۔ یہی دیکھ کر میری بزم میں کئی تحقیقات کر رہیں کہ غالب صاحب یہ چشم سوزن کس وجہ سے ہے۔ میں انہیں یہ نہیں بتاتا کہ کسی بزم میں میرے دل کا سودا ہوا ہے۔ جس سودے کو میں کسی دکان سے خرید نہیں سکتا ہوں نہ وہ دکان میں موجود ہے۔ تبھی تو وہ میری آنکھیں دیکھ کر بتا رہے ہیں لیکن میں اپنی صورتحال سے انہیں آگاہ نہیں کرتا ہوں۔

اگر لفظ 'زخم' کی جرح میں کرتا ہوں لیکن پڑھنے والے کو خود بخود معلوم ہوتا ہے کہ لفظ زخم کو لفظ 'بزم' میں معشوق کو غیر حاضری پر ہی شاعر نے بیان کیا ہے۔ جیسے

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا

زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

جب بزم میں غالب اپنا کلام پڑھتا ہے تو اُس کی آنکھیں ہمیشہ چشم سوزن کی حالت میں میں نظر آتی ہیں۔ جب اُن کے دوست چشم سوزن میں آنکھیں دیکھتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ غالب صاحب آپ کی آنکھیں ایسی نظر آتی ہیں۔ پہلے میں نے یہ بات بتائی کہ اُس بزم میں جب دوسری ملاقات معشوقہ کے ساتھ ہوئی ہی نہیں تب تو اُس کی آنکھیں چشم سوزن ہوئیں۔ اسی لئے دوستوں کو غالب واقعات سے واقف نہیں کراتا ہے لیکن غالب کے دوستوں کو ایسی آنکھیں دیکھنے سے صدمہ محسوس ہوتا ہے۔ تبھی تو فرماتے ہیں کہ **'دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا'** غالب صاحب آپ کی آنکھوں میں چشم سوزن کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آپ اس بات پر ہمیں تفصیل سے کچھ نہیں بتاتے، کیا آپ کے دل میں یا جسم کے کسی حصہ پر کوئی زخم نمودار ہوا ہے اور ہمیں بتاتے نہیں ہو۔ یہ سن کر غالب فرماتے ہیں

کہ 'زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا' جس طرح ناخن کو اگر کاٹو نہیں تو بڑھ جاتے ہیں اسی طرح زخم جب نمودار ہوتا ہے تو اس میں درد کی داستان بڑھ ہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی چیز پر یا کسی خاص بات پر انسان کی توجہ مرکوز ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ اُسے باعمل کرنے کیلئے بہت سی کوششیں کرتا ہے۔ عمل میں نہ لانے کی وجہ سے غم نمودار ہوتا ہے، اسی طرح زخم ایسا نمودار ہوا جس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ بتانے سے کوئی بھی علاج فراہم نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ زخم ہے اسی لئے آنکھوں میں آگ جیسا دوستوں کو دیکھنے میں آتا ہے لیکن میں اپنے زخم سے واقف نہیں کروں گا وہ زخم یہ ہے کہ میں نے بزم میں اُس نغمہ کو دوسری بار نہیں سنایا جس کیلئے میں نے بار بار بزم کے بارے میں مختلف شعروں میں تذکرہ بیان کیا ہے۔ جب غالب کی اس داستان سے ہمیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ لفظ 'زخم' کو لفظ 'بزم' کے ساتھ وابستہ کر کے بیان بازی کی ہے لفظ زخم پر جرح کر کے یہی پڑھنے والے کو محسوس ہوسکتا ہے کہ غالبؔ کو بزم میں نغمہ کو غیر حاضر پانے پر ہی زخم نمودار ہوئے ہیں اسی لئے لفظ زخم بھی بہت بار مختلف شعروں میں لکھ کر غزلوں میں بتایا ہے۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے

پُر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

جب میں نے اپنے معشوق کو کسی بھی بزم میں حاضر نہیں دیکھا تو مجھے بہت صدمہ محسوس ہوا، میں نے اس وجہ سے شراب کا استعمال کیا اور یہ سوچا کہ شراب پینے سے میں اُس بزم کا واقعہ پھر نہیں دہراؤں گا نہ دہرانے کی وجہ سے میں نے 'نغمہ' کو شراب کا استعمال کرنے کے باوجود مجھے اُس بزم کی یاد دِل سے معطل نہیں ہوئی جس بزم میں نغمہ موجود رہی۔ اسی لئے میں اب شراب پی کر بھی تنگ آچکا اور شراب سے بھی کچھ حاصل ہی نہیں ہوا۔ نغمہ کی یاد ہمیشہ ہر وقت ستاتی ہے۔ اب میں اس ستانے کو الگ کرنے کے لئے یہ سوچتا ہوں کہ میں 'مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے' مطلب میں کسی ایسے باغ میں بیٹھنا چاہتا ہوں جہاں مجھے

سکون ملے اور نغمہ کی بزم میں یاد ہی کھو بیٹھوں، لیکن کس نشاط میں بیٹھوں وہاں پر مجھے پھولوں کو دیکھ کر پھر بزم نغمہ کی یاد آنے لگی لیکن میں نشاط میں بیٹھوں گا لیکن کیا کروں مجھے پھولوں کو دیکھ کر بھی 'بزم نغمہ' یاد آہی جائے گی۔ اسی لئے غالب کہتے ہیں کہ اگر میں اب 'بزم نغمہ' کو یاد نہیں کروں، میں وہاں بیٹھوں لیکن 'پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا' جب میں پھول کو دیکھوں تو میرے خیال میں زخم نمودار ہو سکتا ہے۔ زخم اس بات کا کہ مجھے نغمہ یاد آئے گی اور یہ کہوں گا کہ میرے خیال میں وہ بھی اس باغ میں موجود ہونی چاہئے اور دونوں گل کو دیکھ کر اچھے جذبات میں دل سے خوش ہو جاتے، لیکن باوجود اس کے وہ 'بزم نغمہ' موجود ہی نہیں ہے تو پھول کو دیکھنے سے یا نشاط میں پھولوں کو دیکھ کر ہی مجھے وہی زخم نمودار ہو جائے گا جس بزم میں میں نے نغمہ کو دیکھا اور دیکھنے سے مجھے زخم نمودار ہوا، اور پھولوں کو دیکھنے سے مجھے 'بزم نغمہ' کی یاد پر زخم نمودار ہوا غالب کہہ رہے ہیں کہ میں 'بزم نغمہ' کا خیال پھولوں کے ساتھ بھی وابستہ کر کے اپنا زخم موجود ہے اور اس زخم کو کبھی الگ نہیں رکھ سکتا ہوں حتی کہ نشاط میں حاضر ہونے کے باوجود بھی مجھے بزم نغمہ کی یاد آ کر ویرانی ہی ویرانی کے مناظر دیکھنے میں آئیں گے۔

میں لفظ 'زخم' کو اسی لئے لفظ 'بزم' کے ساتھ مرکوز کرتا ہوں اور جرح کر کے یہ ثابت کرتا ہوں کہ غالب کی معشوقہ 'بزم نغمہ' ہی ہے، جس کو دوسری بزم میں غالب نے نہیں دیکھا حتی کے غالب نے بہت ساری بزموں میں شرکت کی لیکن 'بزم نغمہ' کو غیر حاضر پایا اسی لئے غالب پھر ایک بار لفظ 'زخم' میں یہ بیان کرتا ہے۔

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی ، یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

میں نے پہلے پیغام بزم کے ساتھ لفظ 'زخم' کو وابستہ کر کے جرح کرتا ہوں کہ غالبؔ کو بزم نغمہ کے ساتھ ہی اپنی محبت کا واسطہ رہا ہے۔ ابھی تک کسی محقق نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بیان کیا ہے لیکن میرے خیال میں لفظ زخم کو شعروں میں غالب نے اسی لئے بار بار

لکھا ہے کیونکہ اُسے بزم نغمہ کا احوال ہمیشہ یاد آتا رہا اور اُسی پر لفظ بزم کے بارے میں بار بار شعروں میں بہت سی دلیل بیان کی ہے، لیکن زخم اسی لئے نمودار ہوئے جبکہ انہیں کسی بزم میں بزم نغمہ کے ساتھ ملاقات نہیں ہوئی تبھی تو شاعر فرمارہے ہیں میرے غم پر کسی نے کچھ نہیں کہا کئی دوستوں نے اگر کہا بھی ہوگا میں نے انہیں اس دلیل سے واقف نہیں کرایا جیسا کہ 'زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی، یارب' جیسے کہ مجھے بزم نغمہ سے بہت سے صدمے پہنچے اور ان صدموں کا مقابلہ کرتا رہا جس کی وجہ سے مجھے ایک قسم کا زخم نمودار ہوا جس کی وجہ سے میں اپنے اس غم کا اظہار خدا سے رجوع ہوکر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں اپنا زخم کسی کو نہیں دکھاتا ہوں اگرچہ مجھے درد بھی محسوس ہوتا ہے میں اس درد کو اپنے دل میں محبت کی طرح رکھ کر برداشت کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر غالب کہہ رہے ہیں کہ مجھے بزم میں زیادہ تر اس بات کا رجحان نہیں دیکھنے میں آیا کہ میں بزم نغمہ کو پھر کئی بزم میں دیکھوں باوجود اس کے میں ان سے اب یہ کہہ رہا ہوں 'تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا' مطلب آپ نے اپنی بزم میں مجھے دیدار کرایا لیکن اس دیدار سے مجھے زخم بھی نمودار ہوئے اور آپ کے دیدار سے تیر لگا، جس تیر کے لگنے سے مجھے زخم نمودار ہوا۔ اتنی کشش اتنی محبت آپ سے ہوئی کہ ابھی تک اس زخم کو کوئی بھی حکیم ٹھیک نہیں کرسکا لیکن اس تیر سے مجھے افسوس بھری داستان ملی، وہ یہ کہ تب سے میں نے کسی بھی بزم میں غیر حاضری نہیں پائی اور میں متواتر ہر ایک بزم میں حاضر رہا لیکن افسوس ہے بزم نغمہ کو نہیں حاضر دیکھا۔ یہ کہہ کر بہت سی بار غالب نے مختلف غزلوں کے شعر میں اسی طرح سے بیان بازی کی ہے لیکن پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ زخم لفظ اسی لئے بار بار دہرایا ہے تاکہ پڑھنے والے کو محسوس ہوجائے کہ کیوں غالب نے لفظ زخم کو بیان بازی میں لکھا ہے۔ جیسے غالب خود بخود کہہ رہا ہے کہ اتنا دہرا کے بھی میرے بہت سے شوق دل میں پیدا ہونے لگے جس شوق سے میں نے پھر لفظ زخم کو دہرا کر یہ بیان کیا۔

شق ہوگیا ہے سینہ، خوشا لذت فراغ

تکلیف پردہ داری زخم جگر کی

اسی لئے غالب فرمارہے ہیں جب میں کئی بزم میں شرکت کرتا رہا مجھے بزم نغمہ کے ساتھ کوئی بھی واسطہ نہ ملنے کی وجہ سے شک وشبہ پیدا ہوگیا اور مجھے دل میں اتنی لذت محسوس نہیں ہوئی کہ جتنی لذت مجھے بزم نغمہ کے وقت اس بزم میں محسوس ہوئی اور میں اسی لذت کو دہرا کر زخم میں مبتلا رہا اور اب میں یہ کہہ رہوں 'شق ہوگیا ہے سینہ، خوشا لذت فراغ' جب مجھے زیادہ دل کا لگاؤ محسوس ہوا مجھے زخم نمودار ہوا اور اب میں اس زخم کو بار بار دیکھ کر یہی سوچتا ہوں کہ مجھے شک ہے کہ میری بزم نغمہ کو میرے اس اظہار سے دو حصوں میں بانٹا گیا ہے تا کہ مجھے آئندہ کسی بزم میں ایسی لذت نہ محسوس ہو جائے جیسے کہ بزم نغمہ میں مجھے محسوس ہوئی اسی لئے اب دو گروہوں میں بزم کو بانٹا گیا ہے۔شاید بزم نغمہ کو کسی دوسری بزم میں شرکت کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔اور میں اس بزم میں موجود نہیں رہتا ہوں تبھی تو پردہ داری ہے اور پردے میں ہی ساری سازشیں دیکھنے میں آتی ہیں۔اسی لئے میرے انداز میں دو ٹکڑوں میں بزم کو بانٹا گیا ہے۔ایک بزم میں میں حاضر ہوتا ہوں اور دوسری بزم میں بزم نغمہ حاضر ہوتی ہے، لیکن میرے جگر کو اس کی غیر حاضری سے بہت تکلیف ہوتی ہے جس کی وجہ سے میرے زخم برقرار رہتے ہیں اور کوئی بھی مرہم پٹی در کا نہیں ہوسکتی۔غالب ہمیشہ دہرا کر یہ کہہ رہا ہے کہ بزم نغمہ کو بزم میں دیکھ کر میں نے کتنی تکلیفوں کا سامنا کیا۔

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا

لذت ریش جگر عرق نمکداں ہونا

جب غالب زخم اور اس کا درد بھی ٹھیک نہ کر سکا تو اس بیان بازی پر غالب خود اپنے مختلف شعروں میں یہی بیان بازی کرتا رہا کہ بزم محفل میں ہی مجھے زخم نمودار ہوا، اسی لئے اس تمنا سے مجھے کیا کیا صدمے ہوئے کہ 'عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا' میری تمنا یہی رہی کہ میں بزم نغمہ کو بار بار بزم میں دیکھوں لیکن وہ تمنا پوری نہ ہونے کی وجہ سے میری عیش وعشرت ہی برباد

ہوگئی، دل میں دُکھ بھری داستان ابھرنے سے میری عشرت میں زخم ابھر کر یہی تمنا تھی کہ میں ان زخموں کی مرہم پٹی کیسے کروں۔ میں ان زخموا،کو دبانا چاہتا ہوں لیکن نہیں دب سکتے ہیں میں ہر ایک بزم میں اپنا کلام سناتا ہوں لیکن اس وقت ان زخموں کو غائب کرنے کی کوشش کرتا رہا اور کسی غیر کو واقف نہیں کراتا ہوں کہ مجھے آپ کی بزم میں یا کسی اور کی بزم میں بلا کر بزم نغمہ کی شرکت ہونے کے بعد تا ابد جدا کیا ہے۔اسی جدائی کے سلسلے میں مجھے'لذت ریش جگر عرق نمکداں ہونا' مجھے جو بھی لذت شاعری کہنے میں تھی وہ لذت بزم نغمہ کے بغیر نہیں ہے کیوں اسی لذت سے میں نے اب کئی شعر تفصیل کر کے بزم میں سنائے لیکن اس لذت سے میرے جگر میں اتنی گرمی محسوس ہوتی ہے میں کسی ایسے شربت کو پینا چاہتا ہوں جس سے مجھے ان زخموں پر لذت محسوس ہو جائے۔لیکن تب لذت محسوس ہوسکتی ہے جب کہ میں بزم نغمہ کو دیکھوں میں شربت پینے کے باوجود بزم نغمہ کے بغیر صحت یاب نہیں ہوسکتا۔اسی لئے مجھے صدمہ بزم سے ابھر کر زخم نمودار ہوئے اور ان زخموں کا کوئی علاج فراہم نہیں ہوسکتا ہے۔

چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

ابھی تک میں نے لفظ 'بزم' اور لفظ 'زخم' کو الگ الگ باتوں میں بیان کر کے غالب کی غزلوں کے مختلف شعروں میں یہ جرح بیان بازی میں کرتا رہا کہ کیا غالب کو پاک محبت کسی شہزادی سے یا کسی امیر گھرانے کے لڑکی سے ہوئی ہے۔ میں نے غالب کی غزلوں کے شعروں سے ہی بیان کیا جو کہ کتاب میں لکھا ہے لیکن اتنا کچھ جرح کر کے میں یہ بتا سکتا ہوں کہ غالب کو جب اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے بزم نغمہ سے ملاقات ہوئی وہ بھی کسی بزم میں، لیکن اس ملاقات کے بعد کسی نے دیکھا ہوگا تو اسی وجہ سے اُس شہزادی یا امیر لڑکی کو کسی بزم میں جانے سے روک کر رکھا گیا۔اسی لئے میں نے اس بات کا احساس بھی اس کتاب میں پڑھنے والے کو بتایا ہے کہ اسی لئے غالب نے مختلف شعروں میں لفظ بزم اور لفظ 'زخم'

استعمال کیا ہے اور بزم میں نے بزم نغمہ کے ساتھ جرح کر کے پڑھنے والوں کو اس بات کی طرف توجہ مرکوز کی کہ انہیں کے شعروں کے مطابق صحیح بیان کیا ہے کہ غالب کو کسی نغمہ گانے والی نغمہ سننے والی یا نغمہ لکھنے والی کے ساتھ پاک محبت ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بیان کرتا ہوں کہ غالب سے جب ملاقات ہی نہیں ہوئی تب اُس سے ان جذبات پر رجوع لفظ بزم میں بیان کر کے اور اپنا واویلا لفظ زخم کے ساتھ جوڑ کر صدمے غزلوں کے مختلف شعروں میں بیان کئے ہیں۔ جیسے کہ 'چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے' مطلب یہی جب میں نے بار بار کوشش کی کہ مجھے بزم نغمہ سے ملاقات کسی نہ کسی بزم میں ہو جائے لیکن نہ ہوئی۔ افسوس ہے کہ مجھے اس نے چھوڑا لیکن میں نے نہیں چھوڑا، اس بات کا احساس اس مصرعہ میں بیان کر کے یہی کہتا ہے کہ میں عاشق حبیب ہوں اسی لئے مُجھے کوئی بھی وصل بزم نغمہ کے ساتھ نہیں ہوا۔ تب بھی تو 'دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک' میں جب ان باتوں پر زخم نمودار دیکھتا ہوں مطلب ان باتوں سے زخم نمودار ہوا ہے یہ دیکھ کر۔

جب ان زخموں کو بزم نغمہ بھی دیکھے گی تو اُسے احساس ہوگا کہ ان پر ابھی تک غالب نے نمک نہیں چھڑکا ہے۔ نمک کا مطلب ہے ان زخموں کو ٹھیک کرنے کے لئے کسی اور بزم نغمہ سے اپنا رشتہ ناطہ نہیں جوڑا ہے اسی لئے یہ زخم جوں کے توں ہے۔ ان کی پرورش مجھے کرنی ہے لیکن میں کئی حالات کے وجہ سے ان زخموں کی پرورش نہ کر سکی۔ اب اس بات کا احساس غالب کو خود بتا رہے ہیں کہ اگر مجھے کبھی ملاقات بزم نغمہ سے ہو ہی جائے تو اس وقت وہ ملاقات بہت ہی مشکل آثار میں دیکھنے کو ملی گے۔ اس کے ساتھ ہی اِن زخموں کو نمک چھڑکنے کی کوشش بھی کریں گے لیکن وہ کوشش میں اس کے برابر کہوں کہ 'یہ اعضا نمک ہے۔ اسی لئے مجھے کسی بھی بزم میں ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے مختلف زخم نمودار ہوئے ہیں جن کے بیان میں اور کسی کو دکھانے میں رضامند نہیں ہوں صرف درد کو اپنے پاس ہی رکھ کر ان کی مرہم پٹی باتوں سے اور توجہ مرکوز کرنے سے ہی کرتا ہوں۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے

ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام

غالب نے کسی بھی غزل کے شعر میں لفظ محفل کا استعمال نہیں کیا ہے۔ ہاں خاص کسی شعر میں 'محفل' کو استعمال کیا ہے وہ بھی کم تعداد میں زیادہ لفظ 'بزم' ہی پڑھنے میں آتے ہیں۔ اب میں یہ تحقیق کر کے اپنی رائے لکھتا ہوں اسی لئے بزم کو غالب نے مختلف غزلوں کے شعروں میں بیان کیا ہے کیونکہ اُسے بزم نغمہ سے ملاقات بزم میں ہی ہوئی ہے۔ میں نے بزم نغمہ اسی لئے لکھا کہ بار بار میں یہ نہیں لکھ سکا جو میں نے پہلے بیان میں لکھا ہے کہ غالب کو دل کا لگاؤ کسی بزم میں شہزادی یا امیر گھرانے کی لڑکی سے ہوا ہے جو کہ آج تک کسی تنقید نگار یا محقق نے نہیں لکھا ہے۔ میں اس کی بیان بازی اور ان کے ہی شعروں پر جرح کر کے اس بات کی طرف توجہ کر کے پڑھنے والوں کو بتایا ہے کہ بزم میں ہی غالب کو محبت ہوئی ہے لیکن وہ شعر پہلے ہی پیغام بزم میں بیان کیا ہے اس کا واسطہ باقی مختلف غزلوں کے شعروں کے ساتھ لفظ 'بزم' کو جرح کر کے بیان کیا ہے لیکن جب میں نے دیوان غالب گہرائی سے پڑھا اور میں نے لفظ محفل ان کی غزلوں میں بہت ہی کم پائے میرا خیال ہے۔ اسی لئے غالب نے اس لفظ 'محفل' جو اوپر شعر میں لکھا ہوا ہے اسی لئے بیان کیا ہے کہ کیونکہ غالب کو کسی وجہ سے شاعری کی محفلوں میں اور بزم میں نہیں بلایا کرتے تھے۔ ویسے اگر ہم بزم اور محفل کا مفہوم پڑھیں گے تو دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، بزم فارسی کا لفظ ہے اور محفل اردو کا لفظ ہے۔ اس میں کوئی بھی فرق نہیں ہے لیکن کسی وقت غالب کو کسی دن یا کسی خاص تقریب پر یا غیر تقریب پر بلایا گیا ہے، تبھی تو غالب نے لفظ 'محفل' کا استعمال کیا ہے ممکن ہے اس وقت غالب کو دعوت نامے میں یہ بیان بازی کی ہوگی، کہ آپ کو اس محفل میں ضرور شرکت کرنی ہے اور محفل کو گرم کرنے کے لئے آپ کی غزل سے ہم متاثر ہوں گے اور رہتے بھی ہیں۔ اسی لئے اس یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے لفظ 'محفل' کا استعمال کیا ہوگا یا یہ سوچنے میں آسکتا ہے غالب نے سوچا ہوگا کہ مجھے بزم

میں بھی اب کم بلاتے ہیں اور محفل میں بھی کئی ادبی تنظیمیں نہیں بلاتی ہیں۔ اسی لئے محفل کے نام سے دعوت نامہ پڑھ کر شعر میں لفظ 'محفل' کو دہرا کر بیان کیا ہوگا کیوں کہ زیادہ تران دنوں بڑے امیر آدمی، شہنشاہ اور نواب محفل منعقد کرتے رہے۔ محفل میں زیادہ تر شراب کا ہونا لازمی پایا جاتا تھا۔ تبھی تو غالب نے اس شعر میں الفاظ 'پیغام، جام' کا استعمال کیا ہے۔ لفظ پیغام کو میرے خیال میں اسی لئے شعر میں لکھا ہے کیونکہ اس محفل میں بہت سے امیر آدمیوں نے یا بادشاہ نے یا لوگوں نے غالب کو کوئی غزل کہنے کے لئے دعوت دی ہوگی، اسی لئے غالب فرما رہے ہیں 'غیر لیں محفل میں بوسے جام کے' تبھی تو غالب نے فرمایا ہے کہ مجھے شراب پینے کے لئے محفل میں بلایا ہے میں مانتا ہوں کہ مجھے اس محفل کو اپنی غزل سے گرم کرنا ہے مطلب مجھے اس محفل میں ایسی ایسی غزلیں کہنی ہیں جس سے سننے والوں کو اس محفل کا رجحان بہت ہی اچھا سننے میں آئے اور خود وہ بھی متاثر میری قلم پر رہیں لیکن اس کے ساتھ ہی غالب نے یہ بھی کہا کہ میں محفل میں تب سے حاضر نہیں ہوا ہوں جب سے کسی بزم میں بزم نغمہ سے مجھے محبت ہوئی، لیکن وہ کبھی بھی اُس بزم کے بعد مجھے نظر نہیں آئی میں نے بہت سے شعروں میں یہ بیان کیا ہے کہ مختلف بزم میں حاضر ہو کر بھی انہیں غیر حاضر پایا لیکن اس بات کی طرف توجہ محفل میں شاعر نہیں کر سکتا۔ یہ اندر کی بات ہے اس بات کو سوچ کر غالب نے شراب پی ہے اور یہ کہنے لگا کہ تب سے میں محفل میں نہیں آتا ہوں جب سے مجھے کوئی شکوہ محسوس ہوا اور جام پینے کے بعد بھی میں کوئی پیغام نہیں سناتا، لیکن میرے خیال میں غالب کو کسی دباؤ کے تحت بولنے کے لئے محفل میں کہا ہوگا۔ اس دباؤ کی وجہ سے الفاظ پیغام اور جام کو ملا کر یہی کہہ رہے ہیں کہ مجھے شکوہ اس بات کا ہے کہ کسی بزم میں مجھے محبت کے آثار نظر آئے لیکن وہ آثار جوں کہ توں رہ کر مجھے زخم بھی نمودار ہوئے اور بہت بار لفظ 'بزم' کے بارے میں بہت سی دلیلیں جرح کیں جو کہ بزم نغمہ کے ساتھ ملتی ہیں۔ اسی لئے میں محفل میں حاضرین کی طرف اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کرتا ہوں کہ آپ بھی اپنا اپنا جام ہاتھ میں رکھ کر لطف

اٹھاتے ہولیکن میں اس محفل میں اس کی صرف بو سے ہی مزہ چکھتا ہوں کیونکہ مجھے ہوش وحواس میں محفل میں پیغام دینا ہے۔ پیغام یہی مجھے اس دن سے جس دن سے بزم نغمہ مجھ سے کسی بزم میں الگ ہوئی ہے میں ہوش وحواس میں پیغام کیا سناؤں۔ مجھے پی کر بھی پیغام سننے کا دل نہیں چاہتا۔ میں اپنے نشے میں ہوں، اسی بزم کی بنا پر جس بزم میں مجھے بزم نغمہ سے ملاقات ہوئی اور پھر دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی، اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ میں پیغام ان جام پینے والوں کے سامنے نہیں بتا سکتا ہوں کیونکہ مجھے خود بھی صدمہ ہے اور آپ بھی مجھے شوق سے بلا کر اس محفل میں پیغام سنانے کے لئے مجبور کرتے ہیں لیکن میں مجبوری کی وجہ سے اس بات پر توجہ مرکوز کرتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا ہوں میرے پیغام میں اچھی باتیں ہیں۔ مانتا ہوں کہ میں نے جام کا استعمال کیا ہے اور اسی لئے کیا ہے کہ میں بزم نغمہ کے لئے تشنہ لب ہوں اور میں اُسی کو پیغام سنانے کیلئے رضامند ہوں لیکن میں آپ کو کیسے پیغام سنا سکتا ہوں۔ جبکہ مجھے زخم کافی نمودار ہوئے لیکن جام کے استعمال سے ان سب جذبات کی طرف توجہ مرکوز ہونے کے بعد تھوڑا سا آرام محسوس ہو ہی جاتا ہے لیکن میں نے اس شعر میں بھی یہی بتایا کہ غالب نے پیغام اور جام کا استعمال محفل میں اسی لئے کیا ہے کیونکہ غالب کو ان دنوں کی بڑی شخصیتیں محفل کو آراستہ کرنے کیلئے بلاتے رہیں لیکن غالب ایک خوددار شخصیت کی طرح محفل میں کم جایا کرتے تھے۔ اسی لئے لفظ محفل کو غزلوں کے مختلف اشعار میں کم استعمال کیا ہے۔ لفظ بزم کو اسی لئے استعمال کیا ہے کیونکہ انہیں بزم نغمہ کا رجحان بزم کو شعر میں لکھنے سے اپنی محبت کے جذبات میں فرق محسوس ہوتا ہے، اب میں اس بات کی طرف بھی توجہ مرکوز کرتا ہوں کہ غالب نے اپنی شاعری میں عربی اور فارسی کا استعمال زیادہ کیا ممکن ہے فارسی کا لفظ بزم ہے اسی لئے بزم کو فارسی لفظ ہونے کی وجہ سے شعروں میں استعمال کیا ہوگا۔ کیونکہ غالب نے عام طور پر اُردو زبان میں فارسی کا ہی لفظ استعمال کیا ہے اگرچہ اردو زبان ایک لشکر زبان ہے لیکن لشکر ہونے کی وجہ سے ہم بہت سی زبانوں کے لفظ اردو میں لکھ سکتے ہیں لیکن

غالب نے اس بات کو الگ رکھ کر صرف فارسی اور عربی کے لفظ اپنی غزلوں اور خطوط غالب میں زیادہ استعمال کیے ہیں۔ اسی لئے غالب نے یہ بھی کہا ہوگا کہ 'ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام' مطلب کہنے کا یہ ہے کہ غالب اتنا غم زدہ ہونے کے ناطے محفل کو ٹھکرا کر یہ بتا رہا ہے میں بزم نغمہ کے لئے تشنہ لب ہوں میں کیسے آپ لوگوں کو اس محفل میں پیغام سناؤں گا، اگر آپ مجھے پر زیادہ دباؤ بھی ڈالتے ہو لیکن میں جام کا استعمال کروں گا لیکن میں پیغام نہیں سناؤں گا کیونکہ مجھے اس کی یاد میں پینے سے تھوڑا سا فرق محسوس کر سکتا ہوں لیکن اس کی یاد پینے کے باوجود بھی کم نہیں ہو سکتی۔ میں دہرا کے پیغام محفل میں نہیں کہہ سکوں گا۔ یہ بھی میں کہتا ہوں کہ آپ اس وقت سب کے سب جام پینے میں مصروف ہو اور پینے کے بعد جب آپ میرا پیغام سنو گے تو آپ کو کوئی جذبہ ہی محسوس نہیں ہوگا اسی لئے میں جام اور پیغام کو اس محفل میں ان باتوں سے الگ رکھنا چاہتا ہوں کہ میں کوئی بھی پیغام نہیں بتا سکتا ہوں۔

یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب کو ادبی بزم میں کم بلایا کرتے تھے۔ ممکن ہے بزم نغمہ کا واقعہ انکشاف ہونے کے بعد کئی قلمکاروں نے غالب سے نفرت کا جذبہ اپنایا ہوگا یا اس بات کی طرف توجہ ان امیر لوگوں یا شہزادے یا شاہ نے ادیبوں کو مرکوز کیا ہوگا اور یہ بتایا ہوگا کہ غالب نے محبت کا اندازہ اپنے شعروں میں بیان کیا ہے، اس کے لکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی محبت کا اثر انداز بیان اپنے شعروں میں موجود ہے۔ انہوں نے یہ بھی سنا ہوگا کہ کسی خاص لڑکی یا عورت کے ساتھ محبت ہوئی ہے۔ جب کئی سنجیدہ شاعروں نے یہ سنا ہوگا تو انہوں نے بھی غالب کو زیادہ محفلوں اور بزم میں نہیں بلایا ہوگا کیونکہ انہیں غالب سے اس بات پر بھی نفرت پیدا ہوئی ہوگی، کیونکہ غالب نے شادی کی تھی اور یہ بھی کہا ہوگا کہ ایک شادی شدہ آدمی اس طرح کا کلام لکھ کر شاعری کا جذبہ بہت ہی غلط لوگوں کو سناتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کو خود کئی صدموں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا مطلب اُس کی اولاد اس دُنیا سے چل بسی، اُس پر بھی ان کو رنج و غم دیکھنا پڑا اور اس رنج و غم پر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب غزل گو دُنیا کا بن

گیا ہو کیونکہ اُس نے اسی رنج وغم کو مختلف غزلوں میں بیان کیا ہے کیونکہ شاعری میں عام طور پر غم اور غصہ ہی غالب کی غزلوں میں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ مانتے ہیں کہ معشوق کے ساتھ وابستگی یا جدائی لیکن خود بھی وہ غمگین اور مصیبت زدگان ہوئے، مصیبت زدہ ان واقعوں پر ہوئے ان کے فرزند اس دنیا سے چل بسے اور ایسا صدمہ پہنچنے پر بھی غزل لکھتے رہے۔ میں یہ نہیں دعویٰ سے کہہ سکتا کہ اس نے بزم نغمہ پر ہی شاعری لکھی ہوگی لیکن جب کسی آدمی کو کسی بات پر بدنامی ہو جاتی ہے تو اس بدنامی کو کبھی پردہ میں نہیں رکھتا بلکہ اس بدنامی پر زیادہ توجہ مرکوز کر کے اس آدمی کو مشکلات میں ڈال کر عزت کا مقام سماج میں گرہی جاتا ہے۔

جب بہت سے ادیبوں نے غالب کے دور میں غالب کے ساتھ اچھا سلوک نہیں رکھا تو ممکن ہے غالب کو بزم نغمہ پر ہی نفرت کی پوشاک پہنائی گئی لیکن پھر بھی غالب لوگوں کے دلوں میں مشہور رہا ہے۔ اس کا لوگ احترام کرتے رہے اگرچہ ہم خطوط غالب کو پڑھیں گے تو غالب غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک رکھنے والا شاعر ہے، غالب نے ہمیشہ انسان پرستی کا پہلو اپنی قلم سے برقرار رکھا ہے لیکن جب ہم دیوان غالب کو پڑھتے ہیں تو ہمیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب کو کسی کے ساتھ قریبی رشتہ قریبی محبت کے آثار پڑھنے میں آتے ہیں۔ انہیں قریبی رشتوں کو میں نے مندرجہ ذیل شعر سے تحقیق کر کے اور سوچ کے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ لفظ 'نغمہ' کو دوسرے مصرعے میں غالب نے کیوں استعمال کیا ہے۔

دور چشم بد تری بزم طرب سے، واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

مجھے تحقیق کر کے اور سوچ کر یہی محسوس ہوا کہ غالب کو کسی شہزادی یا امیر گھرانے کی لڑکی یا کسی اور کے ساتھ محبت کا رشتہ ہے۔ اسی لئے نغمہ لفظ اس مصرعے میں استعمال کیا ہے۔ میں نے اس بات کا احساس پہلے ہی پیغام بزم میں بتایا ہے اور پیغام بزم میں لفظ 'بزم' کے تمام اشعار اس کے ساتھ وابستہ کر کے اس بات کا ثبوت دِلایا کہ غالب کو کسی نغمہ گانے والی یا نغمہ

سننے والی یا نغمہ لکھنی والی کے ساتھ محبت کا رشتہ رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر تحقیق پڑھنے والوں کے لیئے کی لیکن اب اُردو ادب کے محققوں کی رائے طلب کر کے وہ بیان کر سکتے ہیں کہ کس حد تک میری رائے اور میری سوچ صحیح ہے لیکن میں نے اپنے طور سے اس بات کا اندازہ اس مصرعے سے جرح کر کے بتایا۔

جب میں نے اس بات کا احساس بھی دلایا کہ جب ایسی محبت کا پردہ فاش ہوا تو لڑکی یا عورت کے گھر والوں نے بہت سے حربے استعمال کر کے ادیبوں اور شاعروں کے دائرے میں رہ کر غالب کیلئے نفرت کا ماحول پیدا کیا لیکن غالب نے اپنی قلم کو کبھی الگ نہیں کیا۔ غیر ادبی لوگ غالب کو شعر سنانے کے لئے ہمیشہ بلاتے رہے اور ان کی شاعری پر داد دیتے رہے۔ پھر بھی غالب بہت ہی مشہور اُس دور میں رہا ہے، اگر چہ میں خطوط غالب کا ذکر کروں تو غالب نے اس میں اپنا صدمے اور غموں کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی محبت کی وجہ سے غالب کو صدمے اور دکھ سہنے پڑے جو کہ خطوط غالب کے کسی کسی خط سے معلوم ہوتا ہے۔

جب بہت سے ادیبوں نے غالب کے ساتھ تعلقات منقطع کئے تو پھر غالب نے اپنی ہمت کو قلم کے ذریعہ قائم رکھی اور ان کی غزلوں کو تمام لوگ تسلیم کرتے رہے اور آفرین کے الفاظ سے شاعری عروج پر پہنچی۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کا احساس میں اس طرح توجہ مرکوز کرتا ہوں جب غالب کی ایسی محبت کا رشتے فاش ہوا تو ممکن ہے لڑکی یا عورت کے گھر والوں نے کئی ادیبوں، شاعروں کو غالب کے کلام پر اپنے تاثرات بیان کرنے کے لئے کہا ہوگا۔ اسی لئے میں اس بات کا ثبوت غالب کے مندرجہ ذیل چار مصرعوں سے دیتا ہوں۔ یہ شعر غالب نے دیوان غالب میں بیان کیے ہیں جس میں غالب نے مان لیا ہے کہ میر سے اوپر شاعر تسلیم کیا۔ شاعر نے راز فاش کیا استاد سے بھی اوپر کہتا ہوں۔

اب اسی لئے غالب نے استاد تسلیم کیا ہوگیا کیونکہ غالب کی پاک محبت جس عورت یا

لڑکی کے ساتھ رہی ہے اُن کے گھر والوں یا رشتہ داروں نے کسی ایسے شاعر کو غالب کے کلام پر اپنے تاثرات لکھنے کو کہا ہوگا۔ جب اُس شاعر نے غالب کا کلام پڑھا ہوگا تب اُس نے اپنی یہی رائے دی ہوگی یا کسی صدمے یا محبت پر شعروشاعری بیان کی گئی ہے اور اسی پر زیادہ کلام شاعر کا تحریر ہوا ہے۔

جب ایسے تاثرات کسی شاعر نے بتائے ہوں گے تو اُس کے بعد غالب سے پاک محبت کرنے والے فرد نے غالب کو اس بات پر آگاہ کیا ہوگا اس سے یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کبھی کبھی خفیہ ملاقات پاک محبت کے فرد سے کیا کرتا تھا۔ جب پاک محبت فرد نے اس کو کسی شاعر کے تاثرات پر غالب کی شاعری پر آگاہ کیا ہوگا تو غالب نے سوچا ہوگا کہ میر کو میری قلم کی اصلی حقیقت معلوم ہوئی ہے۔ تبھی تو پاک محبت میں بزم نغمہ اور کسی بزم میں حاضر ہی نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ کسی شاعر نے میری شاعری پر داد دے کر پردہ فاش کیا ہے۔ تبھی تو میں یہ کہہ کر لکھ رہا ہوں کہ غالب کے ان چار مصرعوں سے اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ غالب نے اسی لئے میر کے تاثرات اپنے مقطع میں بیان کیے ہیں۔ جیسے 'ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا' اس کا مطلب جب کسی شاعر نے غالب کی شاعری پر اُس کی پاک محبت کے فرد کو آگاہ کیا ہوگا تو غالب کے کسی بھی بزم میں بزم نغمہ حاضر ہی نہیں ہوئی۔ اس تبصرے پر غالب نے یہ بتایا ہوگا کہ اس میں تاخیر ہوئی کیونکہ کسی شاعر نے میری شاعری پر بحث ومباحثہ ان کے ساتھ کیا ہوگا جس کی لڑکی یا عورت کے ساتھ پاک محبت ہے۔ تبھی تو غالب نے اس مصرعے کا بیان غزل کے مطلع میں ایسا لکھا ہے۔ دوسرے مصرعے سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ جیسے 'آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا' جب غالب کو محبت کرنے والی عورت یا لڑکی نے اس بات سے آگاہ کیا تو دوسرے مصرعے میں اس مصرے کا جواب دعویٰ میں غالب خود فرماتے ہیں کہ آپ اسی لئے کسی بزم میں نہیں آتے کیونکہ کسی غیر نے میری شاعری کا پردہ فاش کیا ہے۔ اس بات کا احساس مقطع میں ہی غالب فرماتے ہیں کہ اُس نے بزم نغمہ سے محبت کی لیکن اب کئی

بندشیں بزم میں آنے کے لئے عائد کی گئی ہیں کیونکہ کسی نے میری شاعری پر تبصرہ اُن لوگوں کو بیان کیا ہے جس کی وجہ سے اُنہیں پابندی عائد کی گئی ہے اور کسی بھی بزم میں حاضر نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیئے غالب مقطع میں خود فرماتے ہیں کہ جیسے ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب مطلب مجھے میر نے شاعری پر تعریف کی لیکن میری محبت کا پردہ فاش کرنے والے شاعر نے میر سے بھی اوپر کلام موجود ہے۔ جب کسی شاعر کلام پر تبصرہ کرتا ہے تو اس تبصرے پر میں یہ شعر مرکوز کر کے انہیں جواب دے دوں گا اگر تم میرے استاد نہیں ہو لیکن میں آپ کا احترام کرتا ہوں، لیکن کسی زمانے میں جب میرا نام مشہور ہو جائے گا اور میری تصنیف پر سب لوگ تحقیق کریں گے تو اس وقت میں یہی کہوں گا کہ مجھے اتنی شاعری کن باتوں سے اُبھری اور آپ میری شاعری کا احترام کیا کرتے ہو جس احترام پر میں یہی لکھتا ہوں کہ اگر چہ میری پاک محبت پر تبصرہ اُن لوگوں کو نہیں تفصیل کوئی شاعر بتاتے تو مجھے کیسے اتنی شاعری کا جذبہ ابھر جاتا، اسی لئے کسی شاعر کے کہنے پر میرے معشوق کو کئی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے میں کسی شاعر کو ہی یہ کہہ کر اپنے مقطع میں فرماتا ہوں۔ جب اس بات کا پردہ فاش ہوگا تو لوگ یہی کہیں گے کہ اُس شاعر کے طرز بیان سے اور اُس شاعر کے ٹکراؤ سے اور اُس شاعر کی تفصیل سے غالب عروج پر دُنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی لئے میرے خیال میں شاعر کو میر جیسے غالب نے اپنے مقطع میں بیان کیا ہے۔ اسی لئے میرے خیال میں غالب نے ایسا مصرعہ مقطع میں بیان کیا ہے' کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی سے بھی اوپر تھا' مطلب میری اس پاک محبت پر اور میرے اس کلام پر تبصرہ کرنے والے نے صحیح باتیں پردہ فاش کیں، جس کو میں دعویٰ سے کہہ رہا ہوں کہ جب میں وجود میں نہیں ہوں گا اور میرا کلام وجود میں ہوگا اور اس وقت یہ سوچیں گے کہ پاک محبت میں غالب کی کیوں دراڑ پیدا ہوئی جس کیلئے وہ ادبی حلقوں میں کم حاضر رہے لیکن جب میرے کلام کا لوگ احترام کریں گے اور گنگنائیں گے تو میں ان کو یہ کہوں گا کہ میر سے بھی اوپر کے تاثرات میری غزلوں میں ایسی چھاپ پڑھی اب میں مقطع

میں میرؔ کو بھی عزت فراہم کرتا ہوں جو کہ مجھ سے پہلے ایک مشہور غزل گو اردو زبان میں رہے۔ انہوں نے ہی میری ہر ایک غزل پر تاثرات اُس معشوق کے گھر والوں کو بتائے جس سے کہ میں بزم نغمہ سے الگ رہا لیکن میرے خیال میں غالب اپنے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انہیں میری غزل یا غزلوں کا مطلب معلوم ہوا۔ تبھی تو میرؔ سے بھی اوپر کے بارے میں غالب نے اپنی شاعری میں بیان مطلع اور مقطع میں کیا ہے۔

جبکہ میں نے بزم نغمہ اور ایسے شعر کے متعلق بیان کیا اور جرح کر کے غالب کے شعروں کے ساتھ پھر بھی کئی ادیبوں نے یہ سوال بھی اٹھائے ہیں کہ پاک محبت میں دل، آنکھ، کان اور زبان کا رجحان اس شعر کے مصرعے سے ملنا چاہیئے۔ تب تو کچھ نہ کچھ پڑھنے والے کو احساس ہوسکتا ہے کہ مصنف نے صحیح انداز بیان کتاب میں لکھا ہے۔ وہ یہ کہ ہم پہلے اس شعر کو لکھتے ہیں۔

دور چشم بد تری بزم طرب سے ، واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

اوپر کے شعر سے میں نے اب تک بہت دلیلوں پر جرح کر کے یہ تفصیل بتائی کہ میرے خیال میں غالبؔ کی محبت کا واسطہ گانے بجانے والی نغمہ تحریر کرنے والی یا نغمہ سننے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ ہے۔ اب میں ان دو مصرعوں کا حوالہ غالب کی غزل کے اس مقطع اور مطلع کے ساتھ وابستہ کر کے بیان جرح کرتا ہوں۔

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل و شکوہ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

جب میں اس مطلع اور مقطع کو پڑھتا ہوں تو میرا بیان اس نغمہ کے ساتھ جوڑ ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ شاعر فرماتے ہیں میں نے جب بزم میں اُس نغمہ کو سنا یا نغمہ نام والی عورت ہو یا لڑکی ہو رُجحان دیکھا تو مجھے بزم میں بہت ہی لگاؤ محسوس ہوا۔ تبھی تو میں نے مختلف غزل اِنہیں کے نام پر لکھیں جن کو کسی نے آج تک نہیں سمجھا نہ ان کو میری پاک محبت معلوم ہی نہیں تھی لیکن میرؔ نے یہ سب کچھ بتا کے میری قلم میں خلل پیدا کیا۔ تبھی تو غالب فرماتے ہیں کہ ''بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی'' میں جب الگ رہا تو میرے دِل میں محبت کے ستم کی لرزش پیدا ہوئی۔ اس لرزش سے مجھے خون کی کشش اُس بزم کی یاد آنے لگی جس بزم میں نغمہ کو حاضر دیکھا۔ میں جب اسی خیال میں ڈوبتا ہوں اور شام کے وقت ''سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی'' جب میں اسی خیال میں رات کو سوتا ہوں میں اُس کو دور کی نگاہوں سے اُن کی نگاہوں کو چوکیدار کی طرح پہرہ دے کر ان کی آنکھوں کو ایک راکھی کی صورت میں چوکیداری کا کام کرتا ہوں ، یہ کہہ کر غالب مانتا ہے کہ ''مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل وشکوہ ہجراں'' کہتا ہے کہ اسی ہجر سے میرے دل میں شوق ہے کہ کب میں اُس نغمہ کے ساتھ واسطہ کر کے وصل کی رات گزاروں اور ''خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی'' مطلب خدا کے واسطے میں اسے الگ ہونے کے واقعات بھی کہوں اور الگ میں کیا کیا گزرا وہ بھی بیان کروں جبکہ اُس نغمہ کے ساتھ میری ملاقات کسی بزم یا کسی جگہ ہو جائے گی تو اُسی وقت میں ہر ایک نظریہ الگ بیان کر کے اس سے یہ صاف کہوں کہ میرے اپنے دل کا رجحان آپ کے دل کے رجحان کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا آپ کے دل کا رجحان صحیح میرے دل کے رجحان کے ساتھ ہے۔ ان باتوں کا میں تب اظہار کر سکتا ہوں جب نغمہ مجھے کسی نہ کسی طریقے سے وصل کی صورت میں سامنے نظر آئے گی۔

جب میں نے دِل کے بارے میں مصرعے کا حوالہ دیا لیکن عام طور پر غزل میں آنکھ، دِل، زباں اور کان جیسے لفظوں پر شعر تحریر کر کے غزل کا رُجحان دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے

کہ غزل عورتوں کے سامنے باتیں کرنے کے مشابہت ہے۔اسی لئے میں نے پہلے دِل کو بزم نغمہ کے ساتھ وابستہ کیا۔اب میں آنکھ کو بھی وابستہ کر کے یہ بیان کرتا ہوں کہ غالب نے بزم نغمہ پر ہی شاعری کا رُجحان پایا ہے اور قلم کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔جیسے کہ'' آنکھیں کفک سے اس کی لگا کر چاک برابر ہم بھی ہوئے'' مطلب جب میں نے بزم نغمہ کے بارے میں اپنا دل پیش کیا اور بیان بازی بھی مختلف شعروں میں کی تو ساتھ ہی ساتھ غالب فرمارہے ہیں کہ مجھے آنکھ کے بارے میں بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔بتانے سے پہلے میں پھر بزم نغمہ سے رجوع ہو کر یہ بتارہا ہوں کہ جب آپ مجھے اُس بزم میں ملی تو مجھے آپ کی آنکھیں دیکھ کر دِل میں ایسا رجحان پیدا ہوا میں نے سوچا میں اپنے دل کو چاک چاک کر کے آپ کے سپرد کروں، لیکن میں نے یہ خیال ترک کیا، ترک کرتے ہوئے مجھے اس بات کا رجحان پیدا ہونے لگا کہ میں نے ابھی تک مہندی کی رات سے ہی آپ کے نام پر نہیں منعقد کی ہے۔اسی لئے میں مہندی کا رنگ آپ کے پاؤں تک کیسے ملوں اور مل کر آپ کو یہ محسوس ہو جائے کہ حقیقت میں غالب کو نغمہ کے ساتھ وابستگی ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چہ میں اس مہندی کو آپ کے پاؤں میں لگاؤں تو بہت سے لوگ اسے دیکھ کر کیا کیا تفصیل بتائیں گے ممکن ہے کہ وہ آپ کے اور میرے درمیان کا سمجھوتہ یا محبت یا اپنی آپس کی دراڑ فاش کر کے دونوں کی بدنامی کرنے پر امادہ ہوں گے۔تبھی تو غالب نے فرمایا'' مہندی کے رنگ ان پاؤں نے تو بہتوں کو پامال کیا'' مطلب شاعر فرماتے ہیں کہ مہندی کو پاؤں میں دیکھنے سے لوگی یہی تفصیل بتاتے ہیں کہ لڑکی کی شادی ہوئی ہے یا شادی کے کچھ دن ہیں۔اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ بزم نغمہ سے میں بزم میں ہی ملا۔دل بھی نچھاور کیا لیکن مہندی کی رات الگ نہیں منا سکتے ہیں۔ مہندی کی رات سے ہی آپ کا دل اور میرا دل قریب آسکتا ہے لیکن بزم نغمہ کئی وجوہاتوں کی وجہ سے دل یا مہندی کا رنگ نہیں آپس میں لگا سکتے ہیں۔اس شعر سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بزم نغمہ اس وقت شادی شدہ نہیں ہے کیونکہ غالب نے مہندی کا حوالہ دینے سے یہ صاف ظاہر

کیا ہے کہ میں نے مہندی کی رات گزاری ہے۔ اب آپ کو میری مہندی کی رات گزارنی ہے۔ اسی لئے اگر آپ میرے دل کیلئے مہندی ملنے پر مجبور ہو جائیں گی تو بازار میں بدنامی ہونے کا امکان ہے۔ اسی لئے میں بزم نغمہ کا آنکھوں سے ہی تصور کرنا چاہتا ہوں اور دل میں ہی مہندی کا جذبہ رکھ کر الگ محبت کو پال کر پاک محبت کے دائرہ میں سنبھال کر رکھتا ہوں۔

میں نے کئی ایسے لفظوں کو بیان سے غالبؔ کے ہی تصور پر جرح کیا اور بزم نغمہ کا واسطہ غالب کے ساتھ قریب بتا کر اور کئی انہیں کے شعروں پر جرح کر کے یہ ثابت کیا کہ غالب کو بزم نغمہ کے ساتھ ہی اپنے دِل کا لگاؤ تھا۔ جیسے کہ غالب نے خود کہا کہ میں بزم نغمہ سے الگ آدمی ہوں لیکن پھر بھی میں غیر نہیں ہوں میں اُن کے جذبات کا احترام کر کے اپنے جذبات میں منتقل کر کے پاک محبت کا دائرہ وسیع رکھ کر اپنی قربانی بھی دینے کے لئے تیار ہوں" کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا" اگر چہ آپ نے میرے یا میرے دل کو ایک غیر فرد سمجھا لیکن میں اس بات کا شکوہ نہیں کرنے والا ہوں۔ اپنے دل میں شکوہ مستقل طور پر قائم نہیں رکھنے والا لیکن آپ کسی کو میرے دِل کے بارے میں اپنے تاثرات نہیں بتاتے۔ اسی طرح سے میں یہ بھی دعویٰ سے کہہ رہا ہوں کہ "بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" مطلب میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ صرف آپ آنکھوں سے دیکھتے رہو بالکل چپ چاپ رہو کسی وقت جب ہم دونوں کا وصل ہو جائے گا تو اُس وقت ہم آمنے سامنے یہ کہیں گے کہ ہم آج تک چپ رہے۔ چپ چاپ رہنے کا مطلب یہی ہم نے اپنی پاک محبت کے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہیں کہا ہے۔

بزم نغمہ کی وارداتوں اور حادثات پر غالب نے بہت سے شعروں میں مختلف بیان بازی کی ہے لیکن اس بیان کو ہم درست بھی پاتے ہیں اسی لئے کہ بہت سے شاعروں نے یہ بتایا ہے کہ جب انہیں کسی کے ساتھ پاک محبت کا واسطہ ہوتا ہے تو ان کا کلام عروج پر پہنچ سکتا ہے۔ یہی بات سن کر مجھے ان شاعروں کی یاد آ کر یہی کہتا ہوں کہ انہوں نے صحیح بتایا ہے کہ جیسے

کہ غالب فرما رہے ہیں کہ جب میرے دوست نے دشمنوں سے رابطہ کیا اور رابطہ قائم کرنے کے باوجود اس نے انہیں اصلیت پاک محبت کے بارے میں نہیں بتائی نہ وہ راز فاش کیا، تبھی تو غالب فرما رہے ہیں کہ ''دوست دارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم!'' فرما رہے ہیں دوست جو ہوتے ہیں وہ اپنے کچھ خیالات سننے کے لئے حاضر ہوتے ہیں تاکہ معلومات کئی وسیلوں سے ہو ہی جائے۔ اسی لئے غالب کہتے ہیں کہ بزم نغمہ نے پہلے ہی سوچا ہے کہ یہ جو دوست میرے ساتھ دوستی رکھتے ہیں وہ دوست نہیں ہیں بلکہ وہ دشمن کا کام انجام دیتے ہیں وہ یہ کہ میرا راز سننے کے لئے دوستی قائم کرتے ہیں لیکن میں انہیں اپنے دل کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے رضامند نہیں ہوتا لیکن کئی ایسے عناصر نے ان کو دوستی کے طریقوں سے میرے ساتھ کام انجام دینے کو کہا ہوگا لیکن میں نے ان کی دوستی اندر ہی اندر دشمنی میں بدل کر کچھ نہیں کہا۔ اسی لئے غالب فرما رہے ہیں کہ ''آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا'' کہ جب انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوا تو بزم نغمہ نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی، تو افسوس کر کے ہی بزم نغمہ سے واسطہ الگ کیا کیونکہ انہیں یہ معلوم تھا کہ بزم نغمہ کے ساتھ دوستی رکھ کر کسی کا اثر خود بخود بتائے گی لیکن افسوس ہے کہ بزم نغمہ نے انہیں کچھ بتانے سے انکار کیا، اسی لئے میں بزم نغمہ کے ساتھ پاک محبت کے اصولوں پر تاابد کاربند رہوں گا۔

●●●

''اسدؔ اور غالبؔ''

پیغامِ بزم میں غالب کے قلمی نام پر بحث

بزمِ نغمہ کے ساتھ گہرے رشتے

اسد کے نام شاعر کا مجموعہ ''شبستانِ بہار''

میں نے پہلے اس بات کا انکشاف کیا کے غالبؔ کو کسی گانے والی یا گانا سننے والی یا گانا تحریر کرنے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ خاص رشتہ رہا۔ وہ میں نے غالب کے شعروں پر جرح کر کے بیان کیا ہے۔ اب یہ بات محقق اور تاریخ داں کو اپنی رائے تحریر کرنی چاہئے کہ آپ مری توجہ، میرا خیال، میری تحقیق صحیح ہے میں نے اپنی تحقیق میں اس بات کو بتایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے غالبؔ کے دوسرے تخلص پر کوئی بحث نہیں کی، غالبؔ اور میرؔ اپنے زمانے کے بلند پایہ شاعر اُردو زبان میں تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن میرؔ نے خود کئی ادبی محفلوں میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اگر غالبؔ نے استاد کو تسلیم کیا تو یہ بہت ہی بلند پایہ شاعر اُردو زبان میں تسلیم کیے جائیں گے۔ لیکن غالبؔ نے آج تک کسی بھی اُستاد کو تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ استاد کے بغیر ہی اپنی قلم کو دنیا کی تمام زبانوں میں مشہور کیا ہے۔ لیکن مجھے اب اس بات کا بھی خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ کے بارے میں اگر میرؔ نے یہ بات بتائی تو اس وقت غالب کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اس کا مطلب غالبؔ میں دس سال کی عمر سے ہی شاعری کا رجحان رہا ہے۔ ایک بلند پایہ اُردو شاعر نے غالبؔ کے بچپن کے دور کا ذکر کیا ہے۔ اب غالب کی پاک محبت

کے بارے میں بیان بازی اس کتاب میں لکھی ہے لیکن غالبؔ کے دوسرے تخلص پر بیان بازی نہیں کی۔ میں اسد کے تخلص کے نام پر بیان بازی اور جرح بھی کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر غالبؔ نے پہلے اسدؔ تخلص رکھا تو میں محققوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس دور میں کوئی دوسرا اسدؔ نامی شاعر اپنا کلام نہیں لکھتا رہا اور اس کلام کو کسی نے نہیں پڑھا ہوگا یا بزم نغمہ کے ساتھ پاک محبت کے اصولوں پر کار بند رہ کر غالبؔ کے شعروں کا جب راز فاش ہوا تو اس وقت محبوبہ کے گھر والوں نے اس کے کلام کو ضبط کیا ہوگا یا جلایا گیا ہوگا۔ تو اس دوران قلمی نام اسدؔ رکھا یہ بھی ممکن ہے۔ دوسری بات اگر ہم غالبؔ اور اسدؔ کے مقطع پر غزلیں پڑھتے ہیں تو پڑھ کر ہماری اس بات پر توجہ مرکوز ہوتی ہے اور سوچتے ہیں کہ شاید یہ دُو قسم کے کلام ہیں۔ اگر چہ خیالات غالب کے ہیں تو اسدؔ کے خیالات پر دو قسم کی رائے غزلوں میں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اسد پر ایک جذبہ ہے اور غالبؔ پر دوسرا جذبہ ہے۔ مانتے ہیں کسی ناسازگار حالات کی وجہ سے شاعر نے اپنے قلمی نام کو تبدیل کر کے غالبؔ کا نام رکھا ہوگا۔ لیکن اسدؔ کے قلمی نام پر شک محسوس ہوتا ہے اور پڑھنے والا سوچتا ہے شاید یہ غالبؔ کا کلام نہیں ہے۔ ان غزلوں میں بہت فرق پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے۔

جیسے کہ

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ! غمخوارِ جانِ دردمند آیا

پہلے ہم اس مقطع کو پڑھ کر یہ کہیں گے کہ شاعر کے مقطع میں مفہوم کیا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے آج تک کسی نے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ اور مجھے کسی بھی ادبی ادارے کی طرف سے کوئی بھی تحفہ نہیں نوازا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ہم غزل کے دائرے میں تشبیہ کریں گے تو میں اس مقطع کو اس طرح سے تشبیہ کرتا ہوں۔

شاعر فرماتے ہیں کہ اے معشوق آپ سے پاک محبت کی وجہ سے میرے جگر میں بہت

سے داغ نمودار ہوئے۔ ان داغوں کو اگر میں کسی کو دکھاؤں تو اس وقت دیکھنے والا یہی کہے گا کہ اس پر کیا تحفہ معشوق نے آج تک آپ کو دیا ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہیں گے کہ اگرچہ آپ کو کوئی تحفہ نہیں ملا ہے تو آپ کی نیک نیتی پر ہم مبارک باد دیتے ہیں کہ آپ کا درد محبت میں اتنا رہا ہے کہ آپ کے جگر میں داغ نمودار ہوئے ہیں۔ اسی لئے ان کو دیکھ کر ہم آپ کو ہیرا بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔

تاریخ کو پڑھ کر ہمیں اس دور کا معلوم نہیں ہوتا کہ کن کن شاعروں کو اُس دور میں انعامات سے نوازا گیا ہے، ممکن ہے کہ اسدؔ نام کا کوئی شاعر ان دنوں مشہور رہا ہو۔ جس کو ہیرے کا تحفہ دیا ہوگا جس پر خود اسدؔ مبارک باد تحفہ تسلیم کرتے ہوئے دیتے ہیں جیسے کہ اس مقطع میں مبارکباد کا بھی لفظ پڑھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ "جانِ دردمند آیا" مطلب میرے لئے یہ تحفہ ان دردمندوں نے پیش کیا جن کو میرے درد کا احساس ہوا کہ شاعر تحفہ کا مستحق ہے۔

لیکن یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر غالبؔ نے قلمی نام پہلے اسدؔ رکھا تو اس سے مقطع میں یہ بیان بازی نہیں لکھنی چاہئے تھی کیونکہ اسدؔ کے نام پر نمونۂ کلام بہت ہی کم پڑھتے ہیں۔ اگرچہ نمونۂ کلام زیادہ تعداد میں پڑھتے تو ہمیں یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی کہ شاعر کو کسی ادبی مجلس میں یا کسی ایوان میں ہیرے کا تحفہ دیا گیا ہے۔ اس بات کا بھی ذکر نہیں صرف مقطع میں شاعر بیان کرتا ہے کہ شاعر کو بہت خوشی ہے کہ اس کے درمندوں نے انکی غمخواری کرتے ہوئے ہیرے کا تحفہ پیش کیا ہے۔

اگر ہم اس مقطع کو شاعری کے اعتبار سے بحث کریں گے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر نے ان دنوں کی رسم مقطع میں بیان کی ہے۔ مطلب ان دنوں لوگوں کو ہیرے کے تحفے بھی پیش کیا کرتے تھے۔ اور جس سے کہ لوگ بہت ہی خوش ہو کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔

لیکن جب ہم ادبی اعتبار سے اس مقطع کو پڑھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اس میں زیادہ اُردو کے الفاظ بیان کئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے الفاظ بھی بیان کئے ہیں

جوان دِنوں اُردو زبان میں لکھتے اور پڑھتے رہے۔ جیسے کہ ''الماس''۔ اگر چہ میں اس مقطع کو اِس طرح سے بیان کروں جیسے

جراحت تحفہ، ہیرا تحفہ، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسؔد! غم یارِ جانِ دردمند آیا

اس طرح لکھنے سے اور ایسے الفاظ تبدیل کرنے سے مقطع میں وزن کے اعتبار سے ہچکچاہٹ پڑھنے میں محسوس ہوسکتی ہے۔ خیر آپ دیوانِ غالب میں غالبؔ کے مقطع کو غور سے پڑھیں اور پڑھ کر آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ غالبؔ کی شاعری میں شک وشبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ جب کہ ہم اسؔد کا تخلص غزلوں میں پڑھتے ہیں۔ بہت بڑا فرق پڑھنے والے کو پڑھنے میں محسوس ہوسکتا ہے۔ اگر چہ ہم اسؔد کے قلمی نام پر اسی شعر کو غور سے پڑھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو انعام سے نوازا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ پاکِ محبت میں غالبؔ کی شاعری پہلے اسؔد کے نام سے ہی مقبول عام ہوئی ہے۔ لیکن راز فاش ہونے کے بعد اسے جلایا گیا ہے یا اس کلام کو تہس نہس کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ دانوں کے حوالے سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ طویل عرصے کی بات ہے۔ یہ کوئی دوسو سال کی بات نہیں ہے اسی لئے تاریخ داں اس پر خاموش ابھی تک رہے ہیں۔ ورنہ میں نے تاریخ کا حوالہ بھی بیان کیا ہوتا۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

پیغام بزم میں پہلے میں نے اس بات کی وضاحت کی کہ غالبؔ کو بزم میں حاضر ہو کر ہی کسی کے ساتھ پاک محبت ہوئی ہے اور اس کا انکشاف کسی شاعر نے کیا ہے۔ مانتے ہیں اُن دِنوں کئی بڑے شاعر بھی غالبؔ سے اوپر تسلیم کیے جاتے رہے لیکن میں نے اس بات کی وضاحت پہلے کی ہے کہ غالبؔ نے زیادہ تر بزم لفظ پر بہت سے شعر بیان کیے ہیں اور جن شعروں پر جرح کر کے پڑھنے والے کی توجہ مرکوز کر کے یہ بتایا کہ غالبؔ کے تعلقات کسی

گانے بجانے والی یا گانے سننے والی یا گانا لکھنے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ رہا ہے۔اسی لئے مطلع میں شاعر بیان کرتا ہے لفظِ راز اور لفظ ساز۔

شاعر فرماتے ہیں کہ میں جب بھی صبح بیدار ہوتا ہوں مجھے بیداری میں وہ پوشیدہ بات محروم نہیں کرتی جو میں نے پردہ میں ساز سنا اُس ساز کو بار بار کانوں میں گنگنانے کی لہر محسوس کرتا ہوں لیکن اُس گانے والے کا یا گانا سننے کا یا گانا تحریر کرنے والے کا نام نہیں بتا سکتا۔میں وہ حجاب میں ہمیشہ رکھتا ہوں، کیونکہ میں اس کو پردے میں اسی لئے رکھتا ہوں تاکہ کوئی ایسی باتوں سے واقف نہ ہو جائے۔

اسدؔ نے اپنے دور میں تاریخی شعر بیان کیا ہے۔شاعر فرماتا ہے کہ ان دِنوں ڈرامہ اسٹیج پر ہوا کرتے تھے۔اسی طرح سے کوئی گانا اگر کسی بزم میں سُناتے تھے ان دِنوں وہ بھی اسٹیج پر پردے میں ہی سناتے تھے۔جیسے کہ غالب نے لفظ حجاب اور پردہ استعمال کیا ہے،ممکن ہے شاعر کسی محفل میں بیٹھے ہیں اور گانا سننے کے بعد انہیں پھر گھر میں صبح سویرے ایسے گانے کو کانوں میں آواز محسوس ہوئی۔محسوس ہو کر اس کو شعر میں بیان کر کے غزل کی صورت میں مطلع میں بیان کیا ہوگا۔اور گانا سننے سے ہی ایسا مطلع تحریر کیا ہوگا۔

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

جب ہم اس غزل کے مقطع پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو یہ پڑھتے ہیں کہ اسدؔ فرماتے مجھے غم محسوس ہوا،غم اس بات پر محسوس ہوا جب میں معشوق سے الگ تھلگ رہا اور ہر ایک کوشش میں بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن میں نے ایسے حال میں کسی کو کوئی راز نہیں بتایا اور ہر ایک بات پوشیدہ رکھی۔پوشیدہ رکھ کر میں نے اپنے سینے میں غم اظہار کیا لیکن کسی کو واقف نہیں کرایا۔

اگرچہ میں اس غزل کے مطلع اور مقطع پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ غالبؔ کے قلمی نام پر غزل بہت ہی بہترین لکھی گئی ہے لیکن اسدؔ کے نام پر یہ الگ پڑھنے میں محسوس ہو رہی ہے۔وہ یہ

غالبؔ کی غزلوں میں ہم ایسے واقعات نہیں پڑھتے ہیں۔ خیر یہ شاعر کا خیال ہے ابتدائی دور کی شاعری ہے اور ابتدائی دور میں ایسی قلم شاعری میں پڑھنے والے کو محسوس ہوتی ہی ہے۔

لیکن اسدؔ نے اس شعر میں تاریخی دور کا آغاز تحریر کیا ہے وہ یہ کہ مقطع میں فرمایا ہے کہ ان دنوں اسٹیج پر گانا بجانا سنتے تھے اور ایک ایک گانے والے کا گانا سن کر پردہ میں سامعین کی فرمائش پر خوش رکھتے تھے۔ اسی لئے تاریخی دور کو مقطع میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ ان دِنوں اگر کسی کی فرمائش پر گانا نہیں سناتے تو اس وقت تاراج مطلب برباد کے منظر دیکھنے میں آتے رہے۔ مطلب لوگ شور مچاتے اور مجبور کرتے تھے کہ وہی گانا سننے کے لئے فرمائش کرتے تھے۔ ورنہ وہ غم وغصہ کا اظہار کرتے تھے لیکن اس مقطع میں شاعر کے مفہوم کے لحاظ سے اگر میں سوچوں تو میں کہوں گا اسد کے لفظی معنی شیر کے ہیں۔ اگر نیک آدمی کو کئی ستم دیکھنے بھی پڑھیں گے تو وہ کوئی تصور برباد دیکھ کر اسے گہرے راز میں رکھ کر کسی کو آگاہ نہیں کرے گا اور اپنی نیک عادتوں کی وجہ سے وہ راز کو پوشیدہ رکھے گا۔ مطلب اسدؔ کے نام پر شاعر نے یہ مقطع میں صحیح بیان بازی کی ہے۔

جب ہم غالبؔ کے مقطع پر سوچتے ہیں یا پڑھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ کہاں غالبؔ اور کہاں اسدؔ۔ مطلب کہنے کا ممکن ہے اسد کے نام پر شاعری بہت ہی کم گہرے انداز کی پڑھنے میں محسوس ہوتی ہے۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرتے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

شاعر اس غزل میں فرماتے ہیں اگر میں کسی غم کے بارے میں کسی دوست کو واقف کراؤں تو مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اسی لئے میں اپنے غم کے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ میں اس غم کو زخم کے طور پر اپنے پاس ہی برداشت کروں گا۔ جیسے کہ ایک آدمی اُنگلیوں بڑھتے ناخن نہیں کاٹتا ہے جن کی وجہ سے اس کو بہت تکلیف ہوسکتی ہے۔ اسی طرح

سے یہ زخم برقرار رکھ کر یہی اصول اپناؤں گا۔کسی دوست کو واقف نہیں کراؤں گا۔

اگر چہ میں اس مطلع کے بارے میں یہ کہوں کہ اسدؔ کے گھریلو حالات اچھے نہیں رہے جس میں بہت سے غموں کا سامنا کرنا پڑا۔اسی لئے اسدؔ کے نام پر غالبؔ نے یہ مقطع بیان کیا ہے۔ممکن ہے محبت کا راز فاش ہونے پر گھر والوں نے گھر میں ستم ڈھایا ہو جن کی وجہ سے وہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔اسی لئے اسدؔ کے نام پر اس مطلع کو غزل کی صورت میں لکھ کر پڑھنے والے کے لئے تحریر کرتا ہے۔

ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت، اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھاویں گے کیا؟

مطلع کی بیان بازی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسدؔ کے نام پر شاعر فرماتا ہے کہ مجھے بہت سے گھریلوں ستم کی وجہ سے زخم سہنے پڑے۔اسدؔ کے نام پر کسی لڑکی یا عورت سے پاک محبت کی وجہ سے گھر والے ایسے رشتے منظور نہیں کرتے۔اس بری حرکت پر اسدؔ کو گھر میں بہت سے صدمے برداشت کرنے پڑے ہیں۔اب معشوق کو بتا رہا ہے کہ اے معشوق اگر میں دِلّی سے کسی اور ریاست میں جا کر پناہ مانگوں یا وہاں ٹھہروں تو کیسے اپنی زندگی بسر کر سکتا ہوں کیونکہ قحط کا دور ہے اور قحط کے دور میں دِلّی سے باہر رہ کر میں وہاں کیا کھا سکتا ہوں۔اے معشوق آپ ہی بتایئے کہ مجھے آپ کے رشتے کی وجہ سے گھر میں بہت سے ستم برداشت کرنے پڑے ہیں۔ان ستموں کا مقابلہ کرنا ہے دوسری طرف قحط کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔

اگر چہ اس مقطع کو غور سے پڑھیں گے تو میں یہ کہوں گا کہ شاعر نے ان دِنوں کی تاریخ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جیسے کہ اسدؔ خود فرما رہا ہے کہ ان دِنوں دِلّی میں قحط پڑا ہے اور اس وقت کے دور میں کھانے پینے کی چیزیں دستیاب نہیں ہوتیں اور لوگ بہت سی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔تاریخی لحاظ سے اس مقطع کو سنہری الفاظ سے بھی درج کر سکتے ہیں اور تاریخی داں کے لئے غالبؔ کا یہ مقطع ایک بیان بطور شہادت ہے۔

میں نے پہلے ہی کہا کہ غالبؔ کو کسی گانے بجانے والی، گانے سننے والی، گانے تحریر کرنے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ گہرے رشتے رہے ہیں۔ جن رشتوں کی وجہ سے غالبؔ کو گھریلو حالت میں بہت ہی غصہ وغم گھر والوں کے ذریعے برداشت کرنے پڑے اوران کا سامنا کرنا پڑا۔ اِن حالات کو الگ کرنے کے لئے شاعر کی اتنی اچھی معاشی حالت نہیں تھی کہ وہ دِلّی سے باہر کسی اور ریاست میں اپنا قیام کر سکے۔

اب میں اوپر کے تینوں غزلوں کے مقطع اور مطلع کے شعروں کو اسؔد کے تخلص کے نام سے پیغام بزم کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں۔

پہلے شاعر نے اسدؔ تخلص استعمال کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے الماس جیسا تحفہ ملا ہے جس پر مجھے بہت مبارکباد دیتے ہیں لیکن میں پڑھنے والے کی توجہ مرکوز اس بات پر کرتا ہوں کہ غالبؔ نے بزم نغمہ پر ہی یہ مقطع بیان کیا ہے۔ مانتے ہیں کہ ان دنوں غالبؔ نے اسد تخلص (قلمی نام) رکھا تھا۔ کیونکہ شاعر فرمارہے ہیں کہ مجھے ہیرے سے بھی بہترین تحفہ بزم نغمہ کے نغمے سے ہی ملا ہے اور جو کوئی بھی مجھے بزم نغمہ کے ساتھ دیکھتا ہے تو وہ مجھے اسدؔ نام سے مبارکباد دیتا ہے اور میں مبارکباد دینے والوں کو دردمند سمجھتا ہوں لیکن افسوس ہے کہ مجھے داغِ جگر بھی محسوس ہوتا ہے وہ اس بات پر کیا اسداللہ خان اسدؔ اس پاک محبت میں کامیاب ہوسکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

دوسرے چار شعروں میں اسداللہ خان اسدؔ بیان کرتے ہیں کہ میرا راز میرے پاس ہی ہے اگرچہ مجھے بزم نغمہ کے ساتھ محبت کا واسطہ ہے۔ میں وہ محبت الگ نہیں کرنا چاہتا ہوں اور میں اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا ہوں۔ اگرچہ مجھے بہت سے رنج وغم برداشت کرنے پڑیں پھر بھی میں اِس معشوق سے محروم نہیں ہوؤں گا۔ میں اس معشوق کی محبت پردہ میں ہی رکھنے والا ہوں۔ اسدؔ نے بیان کیا ہے کہ بزم نغمہ کے ہی بارے میں کہتا ہے کہ کیونکہ شعر میں لفظ ''حجاب ہے پردہ ہے ساز کا'' کا استعمال کیا ہے مطلب ان دِنوں ڈرامہ اسٹیج پر دکھاتے تھے اور

ان دِنوں ٹیلیویژن کا رجحان ہی نہیں تھا۔لوگ زیادہ تر اسٹیج پر ہی ڈرامہ دیکھتے تھے ممکن ہے بزم نغمہ وہاں پر حاضر ہوئی ہوگی اور گانا گانے کے لئے یا گانا سننے کے لئے آئی ہوگی۔ اسی لئے شاعر نے ساز کا لفظ استعمال کیا ہے اور حجاب کا لفظ اسی لئے استعمال کیا ہے کیونکہ ان دِنوں ڈرامہ اسٹیج پر دکھاتے تھے اور پردہ میں ہی رہ کر کردار سازی سے لوگوں کو واقف کراتے تھے۔ مانتے ہیں کہ ان دِنوں عورتیں زیادہ کردار سازی نہیں کرتی تھیں لیکن ممکن ہے کہ بزم نغمہ بھی کوئی کردار کررہی ہوگی یا وہ گانا گانے کے لئے حاضر ہوئی ہوگی تبھی تو اسدؔ فرما رہے ہیں کہ میں اس ساز کو پوشیدہ رکھتا ہوں مطلب حجاب اور پردے میں رکھ کر کسی کو نہیں بتا سکتا ہوں۔ مانتے ہیں کہ ان دِنوں عورتوں کا کردار مرد ہی کیا کرتے تھے لیکن تاریخ داں اس دور کے بارے میں یہ نہیں بتاتے ہیں کہ ان دنوں عورتیں شاعری بھی کیا کرتی تھیں یا عورتیں گانا بھی لوگوں کو سناتی تھیں اس بات کا ذکر تاریخ دانوں کے ذریعہ معلوم ہوسکتا ہے۔

جبکہ اسدؔ کا رجحان بزم نغمہ کے ساتھ رہا تو مقطع میں اسد فرما رہا ہے کہ اگر یہ راز فاش ہوا تو میری کوشش برباد ہوسکتی ہے اور مجھے اس راز پر بہت سے لوگ حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس مقطع میں ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ''تاراج کاوش اور گہرہائے راز'' تاراج کا مطلب ہے برباد کاوش یا کوشش اسی لئے اسدؔ فرما رہے ہیں کہ مجھے ایسے راز سے کسی کو واقف نہیں کرانا ہے۔ اور واقف ہونے پر بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا اور مجھے ایسی پاک محبت میں کوشش جاری رکھنی ہے۔

اب چار شعروں میں اسداللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں کہ مجھے اس پاک محبت کی وجہ سے بہت ہی رنج وغم ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ غمگین رہتا ہوں اور غمگین دیکھ کر مجھے دوست ہمیشہ کہتے ہیں کہ آپ غمگین کیوں رہتے ہو۔ اسدؔ ایسا راز فاش کرنے والا نہیں ہے وہ اس کے بجائے راز کو اپنے اندر رکھ کر زخم پیدا کرتا ہے۔ اسدؔ فرما رہے ہیں کہ میں اس غم میں ایسا ڈوبا ہوں کہ میں اپنے ناخن بھی نہیں کاٹتا کیونکہ میرے پاس بزم نغمہ کا زخم ہے جس کے اُبھرنے سے مجھے

ناخن کاٹنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔اسی لئے اسد نے الفاظ زخم اور ناخن کا استعمال مقطع میں کیا ہے۔اسد یہ فرمارہے ہیں کہ مجھے دِلّی سے باہر جانا چاہئے کیونکہ اب مجھے بزم نغمہ کے ساتھ قریبی وابستگی ہوئی ہے جس کی وجہ سے مجھے گھر میں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔اسی لئے میں اس حقارت کو الفت بھی سمجھتا ہوں اور غم بھی سمجھتا ہوں اب میں اس محبت کو ختم کرنے کے لئے دِلّی سے باہر جانا چاہتا ہوں لیکن قحط ہونے کے سبب میں دلی سے باہر نہیں جا سکتا۔دلی سے باہر جا کر مجھے روزگار ملنا چاہئے۔اگر روزگار ملا ہی نہیں تو مجھے کھانے پینے کے سامان کہاں سے میسر ہونگے۔

ممکن ہے کہ اسد نے بزم نغمہ کے ساتھ اپنا تعلق ختم کرنے کے لئے دِلی سے باہر جانے کے لئے رضامندی ظاہر کی ہوگی لیکن قحط کی وجہ سے دلی سے باہر نہ جا سکا۔

اسدؔ! ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو، پشت خار اپنا

مقطع میں اسد فرمارہے ہیں کہ مجھے پاک محبت میں اب اپنی زندگی فقیر کی طرح گزارنی پڑیگی کیونکہ مجھے بزم نغمہ کے مژگان سے پشت خار بننا پڑا لیکن میں اب اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔جو کام مجھے کرنا ہے بہر حال وہ کرنا ہی ہے۔لیکن اسد فرمارہے ہیں کہ میں جب کامیاب ہی نہیں ہوا تو مجھے فقیری کی راہ پر اپنے کام انجام دینے پڑیں گے۔

اب میں اس مقطع پر بحث کر کے یہ بتا رہا ہوں کہ اسد اللہ خان اسد کو عموماً نیک ہی نیک سب کہا کرتے تھے۔مطلب نیک آدمی لوگوں کی نظروں میں تسلیم کیا جاتا رہا لیکن دل کے لگاؤ سے بزم نغمہ کو الگ نہ کر سکا۔اسی لئے اسد نے سوچا کیوں نہ میں اپنی عزت کو بحال کرنے کے لئے بزم نغمہ سے اپنا رابطہ منقطع کردوں اور فقیری کی راہ پر چلوں لیکن میں ایسا بھی کام انجام نہیں دے سکتا کیونکہ میری آنکھوں میں مژگان اور پشت خار کے الفاظ سمائے ہوئے ہیں مطلب مجھے کسی عورت کو یا لڑکی کو دیکھ کر بزم نغمہ یاد آئے گی جس سے میں یہ کہوں گا کہ وہ پشت

خار ہے۔اسی لئے فقیری میں آنکھوں کے ذریعہ کام انجام نہیں دے سکتا۔اسی لئے پیغام بزم میں اسد کے قلمی نام پر شعر فرما رہے ہیں کہ مجھے کسی بزم میں بزم نغمہ نے پریشانی میں مبتلا کیا ہے اور فقیری کی راہ میں کاربند نہیں رہ سکتا ہوں۔

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغِ مہہ، مُہر وہاں ہو جائے گا

اسداللہ خان اسدؔ مقطع میں بیان کرتے ہیں کہ میں رات کو اکیلا سو کر محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کسی نے الگ کیا ہے اور جس الگ ہونے سے مجھے تکلیف محسوس ہوتی ہے جس طرح شام کے وقت چاند کو دیکھ کر مختلف قسم کے رنگ دیکھنے میں آتے ہیں۔اسی طرح سے مجھے رات کو مختلف قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں کیونکہ میرے پاس معشوق نہیں ہے۔میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھ سے معشوق کیوں الگ ہو گیا ہے اور میں کیوں اس سے الگ ہوا ہوں۔

میں اس غزل کے مطلع پر بزم نغمہ کا واسطہ جرح نہیں کر سکتا۔پیغام بزم کے ساتھ وابستہ کیا ہے کہ اسد کے قلمی نام سے بزم نغمہ کے بارے میں ہی بیان بازی کی ہے۔

فائدہ کیا ؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ!

دوستی ناداں کی ہے ، جی کا زیاں ہو جائے گا

اسداللہ خان اسدؔ غزل کے مقطع میں کہتے ہیں اپنے عاشق سے الگ ہو کر میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے ایسے دوستی پاک محبت میں کیوں کی۔جب مجھے اس دوستی میں معشوق نادان سمجھ کر میری زندگی کو ضائع کرتی ہے۔مطلب میں معشوق سے محبت کے ساتھ پیش آتا ہوں لیکن اس کے باوجود غم و رنج مجھے برداشت کرنے ہیں کیونکہ وہ میری سوچ کے بارے میں کچھ بھی نہیں فکر مند رہا کرتی۔

پیغام بزم کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اسدؔ پیغام بزم میں یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے بزم نغمہ کے ساتھ دوستی ہوئی ہے لیکن ابھی اس دوستی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں

کیونکہ ابھی تک ان کی سوچ میں میرا خیال ہی تصور میں نہیں آتا ہے۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اسداللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ میرے دل کو کتنے شوق معشوق کے بارے میں ہے لیکن میں ایسے شوق کو پورا نہ کر سکا۔ مجھے شکوہ اور گلہ ہے اس بات کا کہ مجھے اس سوچ سے اضطراب کا دریا نمودار ہوا۔ میں اب الگ ہونے سے اس سوچ پر محور ہا جس کی وجہ سے اضطرابِ دریا نمودار ہوا۔

اگر میں پیغام بزم کے بارے میں یہ کہوں کہ اسدؔ نے بزم نغمہ کے تصور پر یہ بات کہی ہے کیونکہ میں مانتا ہوں کہ اسدؔ کو کسی بزم میں یا کسی ڈرامہ کے اسٹیج پر بزم نغمہ کے ساتھ دل کی وابستگی رہی لیکن اس وابستگی سے اسدؔ کو کوئی جواب ہی موصول نہیں ہوا۔ اسی لئے جواب کے موصول ہونے پر یا موصول ہونے تک وہ اسی سوج میں محو رہ کر اضطرابِ دریا میں ڈوبتا رہا۔ ممکن ہے کہ بزم نغمہ اسدؔ کے رشتے میں لڑکی یا عورت ہوگی۔ میں نے جرح کرنے کے لئے فرضی نام بزم نغمہ رکھا تاکہ پڑھنے والے کو مصنف کے ذریعے جرح کرتے وقت کوئی مشکل درپیش نہ ہو۔

فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ!
جفا میں اس کی، ہے انداز کا فرما کا

اسداللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں کہ دنیا کو دیکھ کر بس معشوق کو ہمیشہ یاد کرتا ہوں لیکن دور رہا ہوں مجھے کوئی وفا نہیں بلکہ جفا ہے۔ لیکن اس پر کون غور کر سکتا ہے کیونکہ میں ہر ایک بات کو پوشیدہ رکھتا ہوں لیکن کبھی مجھے کوئی یہ کہے کہ آپ کیوں نہیں اپنے تاثرات زندگی کے بارے میں پیش کرتے ہو لیکن میں اس وقت یہ کہوں گا کہ میں فلک کو دیکھ کر بزم نغمہ کو ہمیشہ یاد کرتا ہوں۔ اسداللہ خان اسدؔ نے اس مقطع میں صحیح بات دہرائی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فارسی

کے الفاظ کو استعمال کر کے اردو الفاظ بہت ہی کم استعمال کئے ہیں جیسے فلک اور جفا۔ اگر چہ میں اس مقطع کو اسدؔ کے نام پر ہی اس طریقے سے لکھوں۔

دنیا کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
بے وفا میں اس کی ہے، انداز کا فرما کا

اگر پڑھنے والے اس مقطع کو پڑھیں گے تو وہ صحیح مقطع کہیں گے لیکن اس میں وزن بالکل الگ ہے۔ اسی لئے اسدؔ نے دُنیا کے بدلے فلک کا استعمال کیا ہے۔ اور بے وفا کے بدلے جفا کا استعمال کیا ہے۔ مجھے اب پیغام بزم کے حوالے سے یہ بھی ضرور کہنا ہے کہ اسد نے شاعری میں اگر فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں تو اُردو کے اس مقطع کو وزن کے دائرے میں لانے کے لئے استعمال کیا ہوگا۔ مانتے ہیں کہ اسدؔ کا بھی مقطع کا رجحان آمد کے طریقے سے ہے۔ مطلب قدرتی شاعری ہے۔

وہ مری چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بے ربطی عنواں سمجھا

اسد اللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں کہ میں چین سے نہیں بیٹھنے والا ہوں جب سکون سے نہیں بیٹھا تو قدرتی غم میں مبتلا ہو سکتا ہوں اگر میں غم کو دور کروں لیکن مجھے ہمیشہ اسکی یاد آتی رہے گی۔ اسی لئے میں اس کا خیال اپنے دل میں رکھ کر چین سے دن نہیں گزارتا ہوں۔ مجھے جب معشوق کا دیدار ہی نہیں ہوا جس کی وجہ سے میں نے اب خفیہ طور پر کچھ خطوط مرتب کئے ہیں لیکن ان خطوط کا نام میں انہی کے عنوان سے لکھنا چاہتا ہوں اور وہی مناسب سمجھتا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان خطوط کو وہ پڑھ کر کیا مجھے سکون دلا سکتی ہے؟ خدا ہی جانتا ہے۔

اگر میں اسے پیغام بزم کے حوالے سے بحث کروں تو میں یہی کہوں گا کہ اسد بزم نغمہ پر پاک محبت کرنے پر ہی سکون سے نہیں بیٹھا۔ جس کی وجہ سے غم میں مبتلا ہوا اور غم کو پناہ دی۔ اب اس غم کو دور کرنے کے لئے وہ خفیہ طور سے بزم نغمہ کو خطوط بھیجنا چاہتا ہے۔ لیکن ان خطوط کا عنوان ہی نہیں

لکھ سکتا ہے اور عنوان سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کس عنوان سے میں بزم نغمہ کو خطوط تحریر کروں۔

دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسدؔ!
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

اسداللہ خان اسدؔ اپنے غزل کے مقطع میں فرمار ہے ہیں کہ میں نے اپنے انداز سے معشوق کو دل پیش کیا ہے لیکن اس دل سے وفاداری نہیں کرسکتی۔ وہ اس طرح جس طرح ہم کافر کو کبھی بھی مسلمان تسلیم نہیں کر سکتے اسی طرح سے معشوق نے میرے ساتھ وفاداری نہیں کی۔ اگرچہ میں ایک نیک وفادار آدمی ہوں لیکن اب میں معشوق کو وفادار نہیں سمجھوں گا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آئندہ یہ میری غلطی ہوگی کہ اس کو وفادار سمجھوں کیونکہ ایک کافر کو مسلمان سمجھنا غلط بات ہے۔ اب میں اس بات کی تشبیہ دینا چاہتا ہوں کہ کیا اسداللہ خان اسدؔ نے معشوق کو کافر سمجھا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہتا ہوں کہ ممکن ہے عاشق غیر مسلم بھی ہوسکتی ہے۔ تبھی تو خود اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر یہ کہا ہے کہ اسد کی غلطی ہے کسی کو کافر سمجھ کر مسلمان سمجھنا۔ اگرچہ میں تنقید کے زاویہ سے اس مقطع پر بحث کروں تو اسدؔ نے مقطع کو صحیح بیان بازی نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس نے غیر مسلم کا ذکر کیا ہے پھر غیر مسلم ہی معشوق تسلیم کی ہے۔

اگرچہ میں پیغام بزم کے حوالے سے یہ لکھوں کہ اسدؔ کا قریبی واسطہ بزم نغمہ کے ساتھ رہا ہے۔ میں نے ہزار بار اس کتاب میں پڑھنے والے کو بتایا کہ اسدؔ کو پاک محبت کسی گانے بجانے والی یا گانے سننے والی یا گانا تحریر کرنے والی عورت یا لڑکی کے ساتھ ہے۔ لیکن پیغام بزم کے حوالے سے اس مقطع پر یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ غالبؔ کا معشوق غیر مسلم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اسدؔ نے کافر، مسلمان وفادار کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

اسداللہ خان اسدؔ فرمار ہے ہیں کہ ابھی میری آنکھوں میں آنسو برقرار ہیں۔ وہ اس بات

پر جب میں معشوق کو یاد کرتا ہوں تو مجھے آنکھوں میں وہی آنسو نمودار ہوتے ہیں۔ اور میں اپنے دل سے یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کے دل کی یاد پر فریاد بہت بار یاد آ رہی ہے۔ مطلب معشوق کو اپنے کچھ شکوے بتانا چاہتا ہوں لیکن کیسے بتاؤں کیونکہ میری اس سے کوئی بھی ملاقات ہو ہی نہیں پاتی اور نہ ہوئی ہے۔ صرف میں نے ان کو کسی بزم میں دیکھا ہے اسی لئے وہی چہرہ یاد کر کے میں آنسو بہار ہا ہوں لیکن میں ان آنسوؤں کا حال کس کو سناؤں اور فریاد کس کو سناؤں۔

اگر پیغام بزم کے حوالے سے یہ بحث کریں کہ اسدؔ نے بزم نغمہ کے نام پر ہی یہ مقطع لکھا ہے تو پھر اسد یہ نہیں بتا تا کہ اسے ان کو دیکھنے پر آنسو آتے ہیں۔ مطلب اسدؔ نے بزم نغمہ کو دیکھا ہے لیکن دیکھنے سے ہی اور دل کو پیش کرنے سے ہی آنسو آ رہے ہیں۔ مطلب بزم نغمہ سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ صرف اپنے دلوں میں اپنے خیالات بدستور قائم ہیں۔ الگ ہونے کی سوچ ہی رہا ہے یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ پیغام بزم کے حوالے سے بزم نغمہ سے کوئی بات اسدؔ نے کی ہے یا نہیں۔ صرف دیکھنے سے پاک محبت برقرار رہی ہے۔ وہ اسی غزل کے مقطع سے معلوم ہوسکتا ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ!
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مقطع میں فرما رہے ہیں کہ میں نے معشوق سے بات کرنے کی جدوجہد کی لیکن جواب میں معشوق نے میرے ساتھ رابطہ قائم نہیں کرنا چاہا۔ کیونکہ اسد خود فرما رہا ہے کہ اگرچہ میں معشوق سے بات کروں معلوم نہیں مجھے پتھر سے مار ڈالنے کی سازش کی جائے اور اسد کے سر پر چوٹ لگ جائے۔ اسی لئے خود مقطع کے ان لفظوں سے معلوم ہوتا ہے مطلب لفظ "لڑکپن، سنگ اور سر یاد آیا" اسی لئے پیغام بزم کے حوالے سے مَیں یہ دعویٰ سے کہہ رہا ہوں کہ مقطع کے لحاظ سے اسدؔ نے معشوق کے ساتھ کوئی رابطہ قائم نہیں کیا ہے بلکہ دور سے ہی چہرے کو دکھایا ہے کیونکہ مقطع کے مطابق اسدؔ کو وہی دیدار یاد آ کر رونا آتا ہے

کیونکہ اسد خود فرما رہے ہیں کہ مجھے ان کی ملاقات سے کوئی بھی فریاد دل میں موجود نہیں رہے گی لیکن میں اس بات پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ اسدؔ نے صرف معشوق کو دیکھا ہے اور کوئی بھی ملاقات بات کرنے کیلئے نہیں ہوئی ہے۔

لب خشک در تشنگی مرُدگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آرزوگاں کا

اسداللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں کہ ملاقات معشوق سے کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میں معشوق سے بات کروں ممکن ہے کہ وہ مجھے خجلزدگی میں مبتلا نہ کرے اسی لئے میں اس توجہ کو الگ کرکے کیوں نہ اپنے دل کو زیارت کے تسلسل میں رکھوں تاکہ میں اس غم سے دور ہو جاؤں۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر اس غزل کے مطلع کو گہرے انداز سے سوچیں تو اسدؔ کا معشوق کے ساتھ واسطہ نہ رہنے کی وجہ سے اب اسدؔ زیارت کی طرف اپنا دل و دماغ رجوع کرنا چاہتا ہے اور دل کے آرزو زیارت کرنے کی جس سے غم کو دور کرنا چاہتا ہے۔ مطلب اب اسد معشوق سے الگ ہونا چاہتا ہے اور اپنا دل و دماغ مذہبی کاموں میں لگانا چاہتا ہے۔

پیغام بزم کے دائرے میں میں اس بات کی طرف توجہ پڑھنے والے کو مرکوز کرتا ہوں کہ اسدؔاللہ خان اسد اب خدا کا ہی نام لینا چاہتا ہے کیونکہ محبت میں ناکامیاب ہونے کے سبب اپنا رجحان مذہبی کارناموں میں ہی لگانا چاہتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس غزل کو گہرائی سے پڑھیں گے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسدؔ نے اس مطلع کو تاریخی انداز میں بھی بیان کیا ہے۔ مطلب ان دنوں لوگ زیارت کرتے رہے۔ اپنے مذہبی رسومات کو انجام خوش اسلوبی سے کرتے رہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان دنوں غم کو دور کرنے کے لئے زیارت کو ہی ترجیح دیتے رہے۔ اور زیارت پر توجہ زیادہ تر لوگ دیتے رہے۔

جاری تھی اسدؔ! داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

اسد اللہ خان اسدؔ کے مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جگر کے داغ کسی کو نہیں دکھانا چاہتے ہیں کیونکہ آگ کے دھواں کو دیکھ کر لرزنے لگے اور اس آگ کے دھواں کو ختم کرنے کے لئے کوئی سمندر بھی نظر نہیں آتا۔ مطلب اسدؔ میں اتنے داغ نمودار ہوئے جن کو دیکھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی آگ ہے جس کا دھواں سمندر کے مانند نظر آتا ہے۔ اسی لئے اسد فرماتے ہیں کہ جس طرح سمندر کو دیکھتے ہیں اسی طرح مجھے سمندر سے اور محبت کی تفصیل پر اتنے زخم اور داغ جگر میں نمودار ہوئے۔ یہ معشوق کی بے وفائی اور بے تلخی سے نمودار ہوئے۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں اس مقطع پر بحث کروں تو اسدؔ مقطع میں فرمارہے ہیں کہ معشوق کی بے وفائی سے جگر میں داغ نمودار ہوئے لیکن اگر میں ادبی نظریہ سے اس مقطع پر بحث کروں تو اسدؔ نے آتش کا استعمال کیا ہے لیکن آتش کو سمندر کے ساتھ بھی وابستہ کیا ہے۔ مانتے ہیں کہ آگ کو سمندر کے پانی سے بھی بجھا سکتے ہیں لیکن اسدؔ نے مقطع میں اپنی قلم کا رجحان بلند پایہ رکھنے کے لئے ''آتش کدہ اور جاگیر'' کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اسدؔ تخلص کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی صحیح کہا ہے کہ ایک نیک آدمی داغ برداشت کرسکتا ہے اور صبر و تحمل سے کام لیتا ہے اور کبھی بھی اپنی مشکلات سے کسی کو واقف نہیں کراتا ہے۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

اسد اللہ خان اسدؔ فرمارہے ہیں کہ مجھے معشوق کے ناز و نخرے برداشت کرنے پڑے لیکن یہ سوچ میری بالکل درہم برہم ہوئی کیونکہ نیاز مندی سے میں نے معشوق سے عرض کیا تھا لیکن میں اس عرضداشت کا قابل ہی نہیں۔ کیونکہ معشوق کے ناز و نخرے میرے دل کے ساتھ قریب نہیں رہے۔ اسی لئے میں اس عرض کو الگ کر کے یہ بیان کرتا ہوں کہ معشوق بالکل مجھ سے الگ رہنا چاہتی ہے۔

اگر پیغام بزم کے حوالے سے اس غزل کے مطلع پر سوچیں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ اسدؔ کی معشوق

سے محبت کامیاب نہیں ہوئی۔ جس پر یہ مطلع تحریر کیا ہے کیونکہ اسدؔ نے نیاز مندی سے عرض بھی کیا اور دل کو پیش بھی کیا لیکن معشوق کے جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیاز مند کو الگ کرنا چاہتی ہے۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا ، مگر اسدؔ !

جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا

اسد اللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں کہ اگرچہ مجھے غزل کے مطلع میں معشوق نے میری عرضی کو نہیں تسلیم کیا میں نیاز مند بھی بنا لیکن نیاز مند کو بھی مسترد کیا لیکن میں معشوق سے اپنا عشق برقرار رکھ کر اپنی زندگی کو داد دینے کے لئے ہمیشہ معشوق کے ساتھ وابستہ رہتا ہوں۔ میں نہیں ڈرنے والا ہوں مجھے عشق میں کوئی ڈر نہیں محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی شکوہ کر رہا ہوں کہ مجھے ناز تھا کہ معشوق میرے دل کے خاطر کچھ نہ کچھ جواب دے گی۔ لیکن جواب ہی موصول نہیں ہوا۔ میں تب تک داد دینے والا محبوب ہوں جب تک نہ معشوق کا کوئی جواب موصول ہو جائے۔

اگر پیغام بزم کے حوالے سے مقطع پر سوچیں گے تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسدؔ کو معشوق کے ساتھ گہرا رشتہ رہا لیکن صرف چہرہ دیکھنے اور باتوں کے تسلسل میں نہیں رہا ہے۔ اسی لئے اسدؔ فرما رہا ہے بیدادِ عشق اور معشوق کا واویلا ''دل پہ ناز'' کے لفظ سے استعمال کیا کرتا ہے۔

رشک کہتا ہے کہ ''اس کا غیر سے اخلاص حیف!''

عقل کہتی ہے کہ ''وہ بے مہر کس کا آشنا!''

اسد اللہ خان اسدؔ اس غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ میرے معشوق کے ساتھ جب تعلقات ہوئے ہی نہیں صرف چہرہ دیکھنے سے اور ان کا گانا سننے سے یا ان کا گانا تحریر کرنے سے یا ان کے گانا سننے کے لئے حاضر ہونے سے مجھے اپنا رشک یہ بتا رہا ہے کہ افسوس کرنا چاہئے کہ وہ اپنا نہیں بلکہ غیر ہے۔ یہ بھی ساتھ ساتھ کہنا چاہئے کہ معشوق جب چاہتی ہی نہیں اور افسوس بھی نہیں کرتی ہے۔ تو پھر کیوں میں اس کے لئے افسوس کروں۔ اب مجھے اس بات پر رشک آتا ہے۔

بزم کے حوالے سے اگر اس مقطع پر بحث کریں گے تو ہم کہیں گے کہ اسد کسی وقت رشک کہتا ہے کسی وقت آشنا کہتا ہے۔ کسی وقت غیر کہتا ہے۔ مطلب معشوق کے ساتھ گہرے تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے مطلع کو غزل میں تحریر کیا اگر چہ معشوق کے ساتھ تعلقات نہیں ہیں پھر بھی ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ اسد کو جدائی سے ہی غزل کے مطلع کا آمد فراہم ہوا۔

کوہ کن، نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد !

سنگ سے سر مار کر ، ہووے نہ پیدا آشنا

اسد اللہ خان اسد فرما رہے ہیں جب میرے معشوق سے تعلقات رہے تو میں نے سوچا کہ میں پہاڑ کے ڈھلان پر بیٹھوں اور وہاں پر مٹھائی کھا کر یہ کہوں کہ میرا دل ایک پتھر کی طرح ہے لیکن میں کبھی کم ہمت ہونے والا نہیں ہوں۔ میں ایک نیک آدمی ہوں اور نیکی والے کسی کام کو ادھورا نہیں چھوڑتا چاہے مجھے پہاڑ کی ڈھلان پر بیٹھنا پڑے لیکن پہاڑ کے ڈھلان پر بھی بیٹھ کر میں مٹھاس کھا کر اپنا قیام کر سکتا ہوں۔ میں ہر ایک کا احترام کرنے والا نہیں ہوں لیکن اگر خدانخواستہ محبت میں دراڑ پیدا ہوئی تو میں اس پہاڑ کی ڈھلان پر بیٹھوں اور بیٹھ کر مٹھاس کھا کر یہ کہوں کہ کسی کو پتھر مار رہے ہیں اور پتھر مار کر بہت سے لوگ افسوس کر رہے ہیں کہ مطلب مجھے محبت کی دراڑ پر کوئی بھی سنگ سار نہیں کر سکتا ہے اور نہ میرے سر کو پھاڑ سکتے ہے۔ میں نیک آدمی ہوں میں یہ کہنے والا آدمی ہوں کہ مجھے معشوق سے وابستگی ہے لیکن میں اس وابستگی کو دور سے ہی دیکھنے والا آدمی ہوں جس طرح پہاڑ کی ڈھلان پر ہم بستیوں کے نظارے دیکھتے ہیں اسی طرح سے میں دل کو پہاڑ کی ڈھلان سمجھ کر معشوق کا تماشہ دیکھ رہا ہوں ساتھ ہی ساتھ میں اپنی عزت اور احترام برقرار رکھتا ہوں میں کبھی بھی برے اخلاق سے معشوق سے پیش نہیں آیا۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں یہ کہوں کہ شاعر نے ''کوہ کن، تمثال شیریں'' کا استعمال کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ''سنگ، سر مار کر'' کا استعمال کیا ہے اس کا مطلب یہی ہے

کہ وہ معشوق کی عزت واحترام کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہے مطلب اگر معشوق پر کوئی پتھر بھی پھینکے یا وہ کسی پر پتھر بھی پھینکے میں کوہ کن میں بیٹھ کر تماشہ بین کی طرح دیکھوں گا لیکن اسدؔ نے صاف ظاہر کیا ہے کہ وہ پاک محبت میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا ہے لیکن روبرو کامیاب ہوا ہے۔ بات کرنے پر ڈرنے لگتا ہے اسی لئے پیغام بزم کے حوالے سے ہم یہ سکتے ہیں کہ معشوق پر مطلع اور مقطع اسی لئے تحریر کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو یہ سمجھ آئے کہ پاک محبت میں دراڑ ہو یا نہ ہو پھر بھی شاعری کا اندازہ اپنی قلم سے بیان کیا ہے۔

سرمۂ مفت نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ ہے چشم خریدار پہ احساں میرا

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں اے معشوق میں آپ کو دیکھ کر بہت ہی متاثر ہوتا ہوں۔ میری نظر جب آپ پر پڑتی ہے تو مفت ہی پڑتی ہے لیکن میری قیمت اپنی آنکھیں دیکھ کر ادا کرتی ہو۔ مطلب میری آنکھوں کو آپ کی آنکھوں سے بہت ہی لگاؤ رہتا ہے جس سے میں یہ کہتا ہوں کہ میری نظر مفت ہے لیکن قیمت میری آنکھیں آپ کی آنکھوں کو ادا کرتی ہیں۔ لیکن میں بہت ہی شرمسار ہوں کیونکہ میں نقد ادائیگی نہیں کرتا ہوں لیکن میرے جو چشمے ہیں وہ آپ کے چشموں کے خریدار ہیں اسی لئے اے معشوق میں آپ سے یہ تلقین کرتا ہوں کہ مجھے آنکھوں کے ذریعے ہی خریدار سمجھا جائے۔

اگرچہ پیغام بزم کے حوالے سے بحث کریں گے تو یہ وضاحت اسد اللہ خان اسدؔ نے اس غزل میں اچھے طریقے سے سمجھایا ہے۔ مطلب غزل کے مطلع میں صاف کہتا ہے کہ میرے چشمے آپ کے چشموں کے خریدار بن گئے ہیں لیکن میں خود جو دیکھتا ہوں وہ وصولیابی کے بغیر مطلب یہی کہ معشوق کو جب اسدؔ نے دیکھا تو معشوق کو دیکھ کر اسدؔ نے صرف آنکھوں سے ہی اپنا رجحان بطور معشوق اپنے آپ کو تصور کیا اور اسی تصور پر اپنے آپ کو کہنے لگا کہ میں اگر دیکھتا ہوں وہ وصولیابی کے بغیر مطلب پیسوں کے بغیر۔

جاں در ہوائے یک نگہہ گرم ہے اسدؔ!
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

اسداللہ خان اسد نے غزل کے اس مقطع پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر چہ میں آپ کی آنکھوں کا خریدار ہوں لیکن مجھے مفت خریدار سمجھنا چاہئے۔ اگر میں مفت خریدار بھی ہوں لیکن میری جان ہمیشہ آپ کے دروازے پر حاضر ہے۔ جب کئی آدمی یا کئی راستے پر چلنے والے آپ کے دروازے پر مجھے دیکھیں گے تو ان کا تصور اور ردعمل یہ ہوگا کہ ایک نیک شخص اس معشوق کے دروازے پر کیوں اپنی حاضری اور اپنا دل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب راستے میں چلنے والے تنگ آجائیں گے تو وہ یہی کہیں گے کہ دراصل معشوق کا پروانہ ہے ہم اسے پروانہ ہی تصور کرتے ہیں۔ لیکن جب زیادہ افواہ شہر میں پھیلے گی تو مجھے ڈانٹنے کیلئے کسی وکیل سے پوچھ کر جرح کرنے بیٹھے گی اور مجھے کہنے لگی کہ آپ کس قانون کے دائرے میں پروانہ بن کر اُن کے دروازے پر حاضری دے رہے ہو لیکن میں اس وقت یہی کہوں گا کہ میں ایک معشوق کی حیثیت سے آپ کے دروازے پر کھڑا ہوا ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ بہت دلی لگاؤ ہے لیکن اگر وکیل کے ذریعے بھی آپ مجھے دروازے سے باہر کرنا چاہتے ہو لیکن میں ہمیشہ اپنے دل اور آنکھوں سے آپ کے دروازے میں دل کے تصور سے حاضر رہوں گا۔

تاریخ داؤں کے لئے اس مصرعے میں ایک تاریخی دلیل بھی پڑھنے میں آتی ہے وہ یہ کہ ان دنوں بھی وکیل عدالتوں میں اس معاملے میں دخل اندازی دیتے تھے اور کسی غلط کام یا کسی غلط پیار کے اصولوں پر وکیل سے صلاح ومشورہ لے کے معاملے کو عدالت کے ذریعے رفع دفع کیا کرتے تھے۔ اب ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسدؔ نے وکیل کا لفظ استعمال کر کے مقطع میں ایک تاریخی دلیل تاریخ داں کے لئے موجود رکھی ہے۔

اگر چہ میں پیغام بزم کے حوالے سے اس مقطع پر بحث کروں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اسد نے معشوق کی محبت پر بہت صدمے اٹھائے ہوں گے کیونکہ لفظ وکیل سے یہ معلوم ہوتا

ہے کہ محبت کے شکوے عدالت میں بھی رجوع ہوئے ہوں گے یا ہم اس دلیل پر اس طرح بھی جرح کر سکتے ہیں کہ لفظ وکیل جو اسدؔ نے اس مقطع میں لکھا ہے وہ خطوط غالبؔ کے ساتھ مل سکتا ہے۔ مطلب اسدؔ کے بہت سے معاملے عدالت میں زیر سماعت رہے ہیں اور عدالت میں بہت سے معاملوں میں جج صاحب کے پاس حاضر رہے ہیں۔ اسی لئے ایسے خیالات ابھرنے سے لفظ وکیل کا استعمال بھی کیا ہوگا۔ کیونکہ اسدؔ کو بہت دفع وکیل کے ساتھ مشورہ لینا پڑتا تھا اسی لئے لفظ وکیل کو اسدؔ نے اپنی غزل کے مقطع میں استعمال کیا ہوگا۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

دے بطِ مے کو دل دوستِ شنا موجِ شراب

اسد اللہ خان اسدؔ کی اس غزل کے مطلع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسدؔ کے قلمی نام پر بھی لفظ شراب کا استعمال کیا ہے اور غالبؔ کے نام پر بھی زیادہ لفظ شراب کا استعمال کیا ہے۔ اگرچہ میں اس شعر کی تشبیہ کروں تو میں کہوں گا کہ مجھے بہت سے صدمے اور شکوے دیکھ کر شراب کی محفل میں حاضر ہونا پڑا۔ کیونکہ میرے بہت سے دوستوں نے نفرت اور شکوہ مجھ سے دور نہیں کیا۔ اسی لئے میں ایسے غموں کو ختم کرنے کیلئے موجِ شراب کا استعمال کرتا ہوں اور شراب پینے کے بعد مجھے وہ غم کئی گھنٹوں کے لئے ختم ہو جاتے ہیں لیکن پھر غموں کو یاد کرتا ہوں۔

اگر میں پیغام بزم کے حوالے سے اس قلمی نام پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ اسدؔ کو معشوق نے بہت ہی ستایا۔ بہت بار عدالتوں میں بھی حاضر رہنا پڑا اور بہت سے رشتے داروں کے ذریعہ تعزیت دی گئی۔ جس سے کہ اسدؔ بہت ہی بدنام شہر میں ہوا ان وجوہات کے بناء پر شراب کا استعمال مجبوراً کرنا پڑا۔

تاریخی ماخذ کے طور پر میں کہوں گا کہ ان دنوں بھی لوگ شراب کا استعمال کرتے تھے مانتے ہیں کہ لوگوں میں ان دِنوں غربت تھی لیکن غربت کا غم مٹانے کیلئے شراب کا استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ ایک تاریخی دلیل ہے۔

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ!

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

اسداللہ خان اسدؔ نے اس غزل کے مقطع پر صحیح لکھا ہے وہ یہ میں نے پہلے غالبؔ کے قلمی نام پر بہت سی غزلوں کو مقطع کے ساتھ جوڑا ہے۔ جس کو میں نے اس کتاب میں صاف لکھا ہے کہ غالب کے قلمی نام پر غزل اور مقطع کا ایک ہی بیان بازی پڑھنے میں آتی ہے۔ غزل کے مطلع کا مقطع بیان کر کے جرح کرتا ہے۔ اسی طرح سے اسدؔ کے قلمی نام پر اسد فرمارہے ہیں کہ اگرچہ میں نے شراب کا استعمال کیا وہ اسی لئے کیا کیونکہ مجھے معشوق کے ذریعے بہت غم برداشت کرنے پڑے۔ جن غموں کو کئی گھنٹوں کے لئے مسترد کرنے کیلئے شراب کا استعمال کیا ہے۔ اسی طرح سے غزل کے مقطع میں مطلع کا جوڑ کر کے بتارہے ہیں کہ میں نے شراب پی تو میرے ہوش وحواس اڑ گئے۔ لیکن ایک نیک آدمی ہونے کے ناطے میں نے پھول کا جلوہ ہی نہیں دیکھا مطلب میں نے معشوق پر نظر ہی نہیں ڈالی لیکن جب میں شراب پینے کے بعد حوش میں آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ موج شراب معشوق کے لئے اچھی نہیں ہے کیونکہ جب لوگ مجھے نیک آدمی تصور کریں گے تو اس وقت وہ مجھے نیک آدمی نہیں کہیں گے وہ یہ کہیں گے کہ ہم نے ان کو نشے کی حالت میں راستے میں دیکھا اور ایک شرابی کو کبھی بھی نیک لفظ سے نہیں پکارا جاتا ہے۔

تاریخ کے لئے ایک صحیح ثبوت ہے کہ ان دِنوں لوگ دن بھر شراب کا استعمال کیا کرتے تھے اور شرابی کی عزت واحترام نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی لئے ہم اس مقطع کو بھی اور غزل کے مقطع کو بھی تاریخی انداز کا بیان بطور ثبوت تسلیم کر سکتے ہیں۔

اگرچہ پیغام بزم کے حوالے سے اس کی تشبیہ کریں گے تو میں یہ کہوں گا کہ اسداللہ خان اسدؔ کو خود محسوس ہوا کہ شراب ایک بہت ہی بدترین چیز ہے اور ایک نیک آدمی کے لئے زہر کے برابر ہے۔ کیونکہ خود اسداللہ خان اسدؔ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی باغ میں بیٹھتا ہوں تو وہاں پر گل کا نظارہ کرتا ہوں۔ تو اس وقت دیکھنے والے مجھے یہ کہیں گے کہ انہوں نے شراب

پی رکھی تھی اب کیسے یہ جلوہ گل کا نظارہ کرسکتا ہے ۔شراب کے لفظ سے لوگوں میں میرے خلاف نفرت پیدا گی لیکن معشوق سے محبت کے بناپر میں غم اورصدمے الگ کرنے کے لئے شراب کا استعمال کرنا پڑا۔لیکن پھربھی ان غموں کوکئی منٹوں اورسیکنڈوں کے لئے دور کیا۔

افسوس! کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے

جن لوگوں کی تھی درخورِ عقد گہر، انگشت

اسداللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ جب میں اورکسی جگہ رزق کمانے کے لئے بیٹھتا ہوں تو مجھے بہت سے کام انجام دینے پڑتے ہیں اور محنت کرکے روزی روٹی کماتا ہوں۔لیکن افسوس ہے کہ جوبھی میرا کاروبار ہےاس میں تمام لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کاروبار اچھا ہے۔پھر جب میں زیادہ کما کرلوگوں کے سامنے سے گزرتا ہوں تو وہ انگلی دکھا کر یہ کہتے ہیں کہ اس نے دن بھرا اتنا کمایا۔لیکن اگرچہ میں غزل کے قانون کے دائرے میں اس کا مفہوم لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ اے معشوق مجھے بہت افسوس ہے کہ میں محبت کے رزق پرہی آپ سے پیار کرتا ہوں لیکن جب میں لوگوں کے سامنے چلتا پھرتا ہوں تو وہ اس وقت آپ کی محبت کا تصور بیان کرتے ہیں اور بیان کرتے ہوئے وہ کسی غیر کوانگلی سے محبوب اور معشوق کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی اسدؔ ہے جوکہ معشوق سے محبت کرتا ہے لیکن اتنا ہونے کے باوجود آپ مجھ سے الگ رہتی ہوحتی کہ لوگوں کوسب کچھ معلوم ہے وہ انگلیوں سے میری شناخت لوگوں کوکراتے ہیں۔

تاریخ کے حوالے سے اگر ہم بیان کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ ان دنوں بھی آج کی طرح لوگ انگلیوں سے کسی کی شناخت کراتے رہے ہیں۔

اگرچہ پیغام بزم کے حوالے سے اس غزل کے مقطع کو جوڑیں گے تو میں یہ کہوں گا کہ اسداللہ خان اسدؔ کسی بزم میں بیٹھے ہیں اورکوئی تازہ غزل سناتے ہیں۔سناتے ہوئے انگلیوں سے لوگ ایک دوسرے کودکھا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ یہی عاشق ہے معشوق کا۔اس کا مطلب وہ

میری معشوق کا محبوب انگلیوں سے دکھاتے ہیں اس کا مطلب انگلیوں سے ہی میری اور معشوق کی بدنامی ہوتی ہے۔ میں اس کے خلاف ہوں لیکن کیا کروں خدا کو یہی منظور تھا۔

لکھتا ہوں اسدؔ! سوزش دل سے سخن گرم

تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

اسد اللہ خان اسدؔ اس غزل کے مقطع میں فرما رہے ہیں کہ جب میں کسی بزم میں بیٹھ کر غزل سناتا ہوں اور کبھی غزل لکھتا بھی ہوں لیکن مجھے بہت سے سخن ور محفل میں کہہ رہے ہیں کہ آپ کی غزل بہت ہی اچھی اور بہترین تسلیم کی جاتی ہے۔ جب میں غزل سناتا ہوں تو میرے سننے سے بہت سے متاثر بھی رہتے ہیں۔ متاثر ہونے کے بعد کئی سننے والے انگلیوں سے مجھے داد دینے کے لئے کسی لفظ کا مطلب کہنے کیلئے کہتے ہیں لیکن میں لکھ کر ان کو اس لفظ کا مطلب سناتا ہوں مطلب میرے سننے پر بہت سے سخنور داد دیتے ہیں لیکن اے معشوق آپ میری محبت پر کچھ بھی داد نہ دے سکے حتی کہ انگلیوں سے لوگ میری شناخت کرتے ہیں لیکن آپ نے کبھی انگلیوں سے بھی کوئی اشارہ مجھے نہیں کیا ہے۔

تاریخ کے پس منظر میں ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ ان دنوں بھی شاعری کے محفل میں بہت سے سخنور مختلف شاعروں کے کلام پر داد دیا کرتے تھے۔ اسی لئے اسد اللہ خان اسدؔ نے اس مقطع میں تاریخی مناظر ان دنوں کے ادبی محفلوں کے بارے میں اس مقطع میں بیان کئے ہیں جو کہ تاریخ داؤں کے لئے ایک شہادت ہو سکتی ہے۔

اگر پیغام بزم کے حوالے سے مَیں اس مقطع کے بارے میں بتاؤں تو میں یہ بتاؤں گا کہ معشوق کو اگر اسدؔ کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں رہا ہے پھر بھی لوگوں کو معلوم ہے اسی لئے اس محبت کو بدنام کرنے کے لئے لوگ انگلیوں سے معشوق کو غیر لوگوں کو دکھا کر بدنام کر رہے ہیں۔

ممکن ہے کہ اسد اللہ خان اسدؔ نے لفظ ''انگشت'' کا استعمال اسی لئے کیا ہوگا کیونکہ خطوط غالب کو پڑھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بہت بار عدالت میں حاضر رہے۔ عدالت میں

بہت بار حاضر ہو کر انگلی دکھانے پر جج صاحب نے اعتراض کیا ہوگا تبھی تو غزل کے مقطع میں انگشت کا استعمال کیا ہے تا کہ پڑھنے والے کو یہ سمجھ آئے کہ عدالت میں جج صاحب کے سامنے انگلی نہیں دکھانی چاہئے لیکن ''سوزشِ دِل'' اور ''سخن گرم'' کے لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسدؔ نے پھر انگلی عدالت میں جج صاحب کے سامنے نہیں دکھائی ہوگی اسی لئے بحیثیتِ شاعر اس انگلی کو غزل اور مقطع میں ردیف اور کافیہ کے دائرے میں بیان کر کے کہا ہوگا۔

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی

گریباں چاک کا حق ہوگیا ہے میری گردن پر

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرمار ہے ہیں کہ وہ بہت ہی غصے میں یہ اظہار کرنے لگا کہ جب میں نے ننگا پن دیکھا تو دیکھ کر مجھے بہت ہی دکھ محسوس ہوا۔ مجھے جنون پیدا ہوا اور خدا سے رجوع ہو کر (دستگیری) کہنے لگا کہ اتنی عریانی دیکھ کر مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ میں نے دیکھ کر سوچا کہ میں ''گریباں چاک'' کروں۔ مطلب اپنے گریباں کو چاک چاک کر کے کوئی حادثہ کروں۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے اپنی گردن جھکانی پڑی۔ مطلب یہ کہ ہر ایک چیز پردے میں رہنی چاہئے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے معشوق کی عریانیت پسند نہیں ہے اگر میں معشوق کے عریانیت کو دیکھوں تو میں اپنی گردن کو جھکا کے ہی رکھوں گا کیونکہ یہ عزت کا معاملہ ہے۔

اگرچہ اس غزل کو غور سے پڑھ کر یہ کہیں کہ اسدؔ کو بہت غصہ آیا جب لوگوں نے معشوق کے بارے میں کچھ بتایا ہوگا مطلب ہر ایک راز کو چاک کیا پردہ فاش ہوا اور وہی پردہ فاش ہو کر اسدؔ کی گردن جھکنے لگی۔ مطلب معشوق کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تبھی تو اسدؔ فرمار ہے ہیں کہ میں کسی کے پردے کو چاک نہیں کرنا چاہتا۔ اگر کسی کے بارے میں کچھ بھی کہنا ہو اس کو کہنے کا حق ہے لیکن عریانیت نہیں ہونی چاہیے۔ بالکل کسی کو بدنام کرنا اچھا نہیں۔

تاریخ کے حوالے سے اگر میں یہ ذکر کروں کہ ان دِنوں بھی حق ہر ایک کو میسر تھے لیکن حق بھی محدود ہوا کرتا تھا۔ وہ یہ کہ کسی کو عریانیت کی وجہ سے بدنام کرنا بہت ہی غلط تسلیم کیا جاتا

ہے۔ ہر ایک کو کہنے کا حق تھا لیکن قانون کے دائرے میں ہی۔ اسی لئے اس غزل کو تاریخ داؤں کے لئے ایک شہادت کی حیثیت سے تسلیم کیا جائیگا۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں بات کروں تو میں یہ کہوں گا کہ اسد اللہ خان آسد نے معشوق کو یہ اچھی نصیحت دی ہے کہ اگر آپس میں پاک محبت ہے تو وہ بدنامی کے گھیرے میں نہیں ہونے چاہئیں ہمیں پاک محبت آپس میں اپنے ہی دلوں میں قائم و دائم رکھنی چاہیئے۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھنے کا بھی حق ہے لیکن یہ نہیں کہ چھیڑ خانی کرنے کا حق نہیں ہے۔

آسد! بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
کہ ''مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر''

اسد اللہ خان آسد غزل کے مقطع میں فرما رہے ہیں کہ میں نے پہلے یہ کہا کہ ننگا پن (عریانیت) برداشت نہیں ہوسکتا ہے کوئی کسی کو کچھ کہے اور آپسی باتیں کریں کسی کے خلاف وہ اچھا نہیں ہے۔ اسی لئے آسد فرما رہے ہیں کہ غزل کے مطلع میں میں نے صاف بیان کیا ہے کہ کسی کو ننگا نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اسی لئے مقطع میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر میں ایسا ننگا پن دیکھوں تو دکھانے والے کو میں قتل کرنے کے برابر تسلیم کروں گا۔ وہ یہ کہ اگر کوئی کسی کی خلاف ورزی یا چغلی کرے تو اسی وقت کہنے والے کو قاتل سمجھوں گا اور میں اس کے خون میں نازکی سی خوشبو نہیں محسوس کروں گا بلکہ میں اس کے خون میں دشمنی تصور کروں گا۔ اس کو اگر میں گردن جھکا کے بھی دیکھوں لیکن میں اس کی جھکی ہوئی گردن بھی تسلیم نہیں کروں گا کیونکہ کسی کے بارے میں کچھ کہنا یا سننا اچھا نہیں ہے۔ اچھا ہی سننا چاہیئے برا نہیں سننا چاہیئے۔

تاریخ کی بنیاد پر اگر میں اس مقطع کا جرح کروں تو میں یہ کہوں کہ اسد اللہ خان آسد نے صحیح کہا ہے کہ کسی کے بارے میں چغلی کرنا قتل کے برابر ہے۔ اس کا خون نازکی نہیں مانا جائے گا اور اسے دُنیا بھر میں تسلیم نہیں کیا جائے گے۔ اسی لئے تاریخ کے حوالے سے ہم یہ سکتے ہیں کہ ان دنوں بھی لوگ غلط باتیں کرنے والے کو قاتل کے برابر تسلیم کرتے تھے۔

اگر چہ میں پیغام بزم کے حوالے سے اس مقطع کو لکھوں تو میں یہ کہوں کہ اسد اللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں کہ اگر مجھے معشوق کے ساتھ قریبی واسطہ ہے تو میں کسی سے بھی نہ کہوں گا اور نہ کسی سے اس کے بارے میں کچھ سنوں گا۔ اس طریقے سے میں بالکل خاموش رہوں گا اور اگر میں سنوں بھی تو میں اس کو قاتل کے برابر تسلیم کروں گا۔ اگر چہ مجھے کوئی معشوق کے بارے میں یہ کہے کہ اس کا خون آپ کے ساتھ نہیں وابستہ رہتا ہے پھر بھی میں ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دے کر یہ کہوں گا کہ مجھے کسی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ اپنے اندر ہی پاک محبت کرتے ہوئے خاموشی اختیار کروں گا۔

نہ گل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں معشوق کو کہہ رہے ہیں کہ میرا تصور پھول نہیں سمجھنا چاہیئے، نہ میں کسی پھول سے اپنے کو تشبیہ دے سکتا ہوں۔ اور میں اگر گل بھی ہوں لیکن مجھے دیکھ کر کوئی نغمہ نہیں لکھتا نہ مجھ پر کوئی نغمہ لکھنے والا ہے۔ میں اگر کسی کو دیکھتا ہوں یا اگر مجھے کوئی دیکھتا ہے میں تمام تاثرات پردے میں ہی رکھتا ہوں۔ اگر کوئی بھی خدانخواستہ میری تعریف کرے لیکن میں اس کی تعریف سازوں کے ذریعہ سنوں گا اور وہ نغمہ پوشیدہ رکھ کے کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ اگر میں نے آج تک کسی کی آواز سنی یا کوئی نغمہ سنا تو وہ میرے ہار کے برابر ہے فتح کے برابر نہیں۔ جب مجھے گانا سننے اور سنانے سے کوئی فتحیابی حاصل نہیں ہوئی میری آواز پر اور میرے دیکھنے پر شکست تصور کی گئی۔ اسی لئے میں ایک ناکامیاب معشوق ہوں یہ سب کچھ معشوق کی وجہ سے ہی ہوا۔ اگر میں پھول کی طرح ان کے ساتھ وابستہ ہوا لیکن اس نے مجھے پھول بھی نہیں سمجھا اگر چہ میں نے کوئی ساز سنایا اس نے اس ساز کو ٹھکرایا اسی لئے مجھے معشوق کی پاک محبت میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر تاریخ کیچ والے سے میں اس غزل کے مطلع کو کہوں گا تو میں یہ کہوں گا کہ ان دنوں اسٹیج

پر ہی ساز سنا کرتے تھے اور ان دنوں کسی باغ میں گل کو دیکھ کر نغمہ لکھتے تھے۔ جب کسی کی آواز اچھی نہیں ہوتی تھی تو اسے لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے اسدؔ نے تو ریخ لکھنے والے کو یہ اشارہ دیا ہے کہ ان الفاظ سے گل، نغمہ، پردہ ساز، شکست، اور آواز کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ مل سکتا۔

اگر پیغام بزمِ کے حوالے سے میں اس غزل کے مطلع کو تحقیق کر کے لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ اسد اللہ خان اسد اس معشوق کے بارے میں پھر اشارہ دے رہا ہے وہ یہ کہ جب اس نے کسی بزم میں معشوق کا نغمہ سنایا اس کے نغمہ سننے پر لوگوں میں ہی دیکھا اسی پر اسد اللہ خان اسدؔ کہہ رہے ہیں کہ معشوق کی شکل گل کی طرح ہے۔ اور ان کو دیکھ کر بہت سے نغمہ لکھتے ہیں۔ لیکن اگر میں نغمہ لکھتا ہوں میں تو پردہ میں ہی لکھتا ہوں۔ اور پردے میں رہ کر اس میں کوئی آواز کی گنجائش نہیں ہے اسی لئے جب میری آواز معشوق تک نہیں پہنچتی ہے تبھی تو میں ایک شکست خور آدمی ہوں۔ میں چاہتا ہوں معشوق میرا نغمہ ساز کے ذریعہ سنائے تاکہ اس کی آواز سے لوگ مٹھاس حاصل کر سکیں۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا!

اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

اسد اللہ خان اسدؔ اپنی غزل کے مقطع میں مطلع کو وابستہ کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ جب میں ایک شکست خور معشوق ہوں تو مجھے تمامِ طریقوں سے ہارنا پڑتا ہے مطلب مجھے کوئی جیت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ تبھی اسد اللہ خان اسدؔ فرماتے ہیں کہ میں ہار کر ساقی کا احترام کرتا ہوں کیونکہ وہاں مجھے شراب پینے سے ہار محسوس نہیں ہوتی ہے۔ پینے کے بعد میں سوچتا ہوں کہ مجھے چند منٹوں کے لئے جیت ہوئی ہے۔ لیکن میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ یہاں رِند موجود ہے۔ وہ پھر مجھے ہار میں داخلہ دے کر شکست خور آدمی بنا سکتا ہے۔ اگر چہ میں ایک نیک آدمی ہوں لیکن نیک آدمی ہونے کے ناطے مجھے ہر طرف سے ہار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر میں اس مقطع کو معشوق کے حوالے سے بیان کروں میں یہ کہوں گا کہ شاعر نے

معشوق کو دیکھا ہے لیکن شاعر کو اس سے کوئی بھی واسطہ نہیں رہا ہے، مطلب آپس میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے معشوق کے بارے میں شاعر فرما رہے ہیں کہ میں ہر ایک طریقے سے آپ کے قریب آنے کے لئے ہار چکا ہوں۔ مجھے کوئی جیت ہی حاصل نہیں ہوئی اگر چہ آپ پردہ اٹھا کے لوگوں کے سامنے نغمہ سناتی ہو یا نغمہ لکھ کر کہتی ہو یا نغمہ کو سازوں کے ذریعہ سناتی ہو لیکن میں یہ سن کر بہت ہی متاثر رہتا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ میرے نغمے کو نہیں گا سکتی ہو کیونکہ میں آپ کے تصور پر بھی نغمہ لکھتا ہوں جب آپ کے ساتھ قریبی وابستگی رہتی تو ممکن ہے آپ میرے ان نغموں کو سازوں کے ذریعہ لوگوں کے کانوں تک پہنچاتی۔ لیکن یہ تمام نغمے میرے پردے میں ہی ہیں۔ مطلب میں ان نغموں کو نہیں سناتا ہوں۔

آہ کو چاہئے اک عمر، اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

اسد اللہ خان اسدؔ مطلع میں کہہ رہے ہیں کہ مجھے افسوس کرتے کرتے ایک عمر ہوگئی، مطلب بیس سال، تیس سال تک میں آہ وزاری کرتا رہا لیکن اس آہ وزاری کا اثر ہی کچھ نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اے معشوق جو بھی تیرے بالوں پر تعریف لکھتے ہیں کیا ان کو آپ کی جدائی پر کچھ اثر ہوتا ہے جیسے کہ مجھے آپ کے افسوس پر کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی میں آپ کو دل سے ہمیشہ پکارتا ہوں اور پکارتا رہوں گا کیا آپ کو میرے اس الگ زندگی بسر کرنے پر کوئی اثر دل میں موجود ہے۔ لیکن افسوس کرتے ہوئے میری عمر گزر گئی۔

پیغام بزم کے حوالے سے میں یہی کہوں گا کہ جب اسد اللہ خان اسدؔ معشوق سے روبرو ملاقات ہوئی نہیں تو عمر بھر افسوس کرتا رہا۔ لیکن ان کی زلفوں کو ہمیشہ یاد کرتے ہوئے بہت سے نغمے لکھتا رہا۔ لیکن پھر اسد اللہ خان اسدؔ کہتے ہیں کہ مجھے اگر ملاقات کرنے میں کوئی جیت نہیں ہوئی پھر بھی میں زلفوں کو اپنے سر کے تئیں رکھ کر گیت گنگناتا ہوں۔

غم ہستی کا اسد! کس سے ہو جز مرگ علاج؟

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مقطع میں مطلع کے مطابق یہ کہہ رہے ہیں کہ مانتا ہوں کہ مجھے افسوس کرتے ہوئے عمر گزر گئی پھر بھی پاک محبت میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا لیکن غم کو ترجیح دی۔ غم کو ترجیح دے کر شاعر فرما رہے ہیں کہ اس غم سے ایک ہستی میرے دل میں ابھر کر آ گئی۔ لیکن جب ایک ہستی میرے دل میں موجود رہی تو میں اسے شمع کی طرح جلا کر میں اسے دل میں رکھ کر شب کے وقت جدائی کے دوران یاد کرتا ہوں اور اسے ہمیشہ اس کا تصور کرتا ہوں۔ لیکن شب غم میں اسے اس طرح دل میں سنبھالتا ہوں اور اس وقت سوچتا ہوں کہ سحر ہونے تک میں اسے الگ انداز سے اپنے دل میں رکھوں۔ لیکن سحر آنے کے بعد میرے دل میں اس کا وجود ہی نہیں رہتا ہے۔ اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ شاید ان خیالات پر موت آئی ہے کیونکہ سحر آنے کے بعد کوئی بھی وجود اس خیال کا ہے ہی نہیں۔ ساتھ ہی شاعر فرماتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنے معشوق کو دل کے وجود میں شمع کی طرح رکھا تو ہمیں اسے موت کے تصور میں نہیں گننا چاہئے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے جب ہمیں بھی موت آ جائے گی تو اس وقت دل میں جو چراغ ہے وہ بھی اس کے ساتھ ہی موت کا شکار ہو سکتا ہے۔ اسی لئے شاعر فرماتے ہیں کہ اگرچہ معشوق میرے ساتھ جدائی کے دن گزارتی ہے پھر میں موت آنے تک اس کے وصل کو اپنے دل میں رکھ کر سنبھالتا ہوں جب موت آئے گی تو دونوں کو ایک ہی وقت موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پیغام بزم کے حوالے سے اسد اللہ خان اسدؔ کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ میں معشوق کو اپنے دل میں موت آنے تک رکھا ہے اور ہمیشہ وہ میرے دل میں شمع کی طرح بستی ہے لیکن جب سحر کا وقت ہوتا ہے تو اس وقت میں انہیں جدا نہیں کرتا۔ لیکن سمجھتا ہوں کہ میرے غموں کی ہستی جو دل میں وہ شب غم کا علاج بھی ہے لیکن سحر آنے سے وہ الگ ہونے سے میرے بھی دل کے وجود میں موجود ہے۔ جب بھی موت کا سامنا کروں تو دل کے وجود میں رہ کر معشوق

بھی موت کا شکار ہو سکتی ہے۔

دیوانگی سے دوش پہ زُنار بھی نہیں
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع پر پہلے کچھ مباحثہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اسدؔ نے اپنے دوست کو دیوانگی کے نام سے پکارا ہے اور دوستی اتنی گہری تھی کہ اس کے ساتھ لین دین بھی کافی ہوا۔ مطلب آپس میں پیسے خرچ کئے اور آپس میں اُدھار بھی لیتے تھے۔ ممکن ہے اسد اللہ خان اسدؔ کو کشمیری پنڈت کے ساتھ دوستی تھی اس کے محلے میں رہا کرتا تھا۔ کیونکہ اسدؔ نے زُنار کا لفظ استعمال کیا ہے۔ زُنار زیادہ تر کشمیری پنڈت ہی استعمال کرتے ہیں، مانتے ہیں کہ تمام کے تمام ہندو اسے استعمال کرتے ہیں لیکن زیادہ زُنار کا استعمال کشمیری پنڈت ہی کرتے ہیں اور وہ زُنار پہننے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرتے تھے ممکن ہے کشمیری پنڈت اسد اللہ خان اسدؔ کے محلے کے ارد گرد رہتے ہوں گے۔ تبھی تو زُنار کا استعمال کیا ہے ممکن ہے کہ اُس رسم میں اسدؔ کو شریک کیا ہوگا۔ اس لحاظ سے غزل کو تحریر کیا ہے۔ پہلے ہم مطلع کا مفہوم اسطرح سناتے ہیں:

اے دوستو آپ دیوانگی میں ہو آپ نے زُنار بھی نہیں پہنا ہے لیکن میں آپ کو کہتا ہوں کہ زُنار پہنو لیکن اس پر دوست نے بتایا ہوگا کہ میرے پاس پیسے کچھ بھی نہیں ہے اسی لئے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے زنار ہی پہنتا ہوں۔ مطلب میں کیسے زُنار کی رسم ادا کروں۔ اسی لئے میں دھاگہ ہی پہنتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پھر اسد اللہ خان اسد نے اس دوست کو کسی الگ جگہ میں آپس میں باتیں کرتے بحث کی ہوگا۔ وہ مقطع کے کہنے سے واضح ہوتا ہے۔

وہ یہ کہ جب دوست نے اسد اللہ خان اسدؔ کو بتایا کہ میں زُنار کی رسم ادا نہیں کر سکتا تو میں دھاگہ ہی پہنتا ہوں۔ تو پھر اُس پنڈت نے یا اس ہندو نے رسم ادا کی ہوگی۔ اس وقت اس

رسم میں اسد اللہ خان اسدؔ بھی شریک ہوا ہوگا تو اسی لئے اسی دوست نے اسد اللہ خان اسدؔ سے فرمایا کہ آپ ہمیشہ مجھ سے بار بار یہ کہتے ہو کہ آپ نے ہندو رسم کے مطابق جنیو نہیں پہنا اور مجھے بار بار تانے دے رہے ہو۔ اب مجھے آپ کے کہنے پر بیداری آئی اور دیوانگی کو الگ کیا تو میں نے اس رسم کو ادا کیا۔

تاریخ داؤں کے لئے مطلع اور مقطع ایک اہم تصور اسدؔ کا ہے وہ یہ کہ تاریخ داں اسدؔ کے محلے کے ارد گرد ان دنوں کشمیری پنڈت گھرانے کی بھی تحقیق کر سکتے ہیں۔ کیا ان دنوں کوئی کشمیر یپنڈت گھرانے اسد کے محلے کے ارد گرد رہا کرتے تھے۔ دوسری بات یہ بھی اس تصور سے مل سکتی ہے کہ اسدؔ کو ہندوؤں کے ساتھ بہت ہی دوستانہ تعلقات تھے جس پر اس نے ہندوؤں کو یہ کہا کہ دیوانگی میں اپنی زندگی مت بتلا کرو بلکہ ہندو رسم کے مطابق زُنار کا استعمال ضرور کرنا چاہئے۔

اسی لئے میں اسے غزل اور مقطع کی تشبیہ میں نہیں لکھ سکتا ہوں۔ اب محققوں پر ہی منحصر ہے کہ کیا وہ میرے خیالات سے مطمئن ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

نہیں ہے زخم کو بخیے کے در خور، مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشک یاس، رشتہ چشم سوزن میں

اسد اللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں کہ اگر مجھے پاک محبت میں، بہت سے لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو پاک محبت میں شکست ملی اور شکست کا سامنا کرنے پر آپ کو زخم حاصل ہوا۔ ایسی بیان بازی سن کر شاعر ہر ایک کو یہ کہہ رہا ہے کہم جھے کوئی زخم حاصل نہیں ہوا اور نہ کوئی زخم نمودار ہوا ہے، نہ میں غم پر روتا ہوں۔ لیکن لوگ اسی لئے مجھے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ میرے چشمِ سوزن دیکھتے ہیں۔ مطلب غمخوار آنکھیں میں خومار دیکھ کر یہی کہہ رہے ہیں کہ اسدؔ کو کوئی نہ کوئی غم ہے اور غم سے زخم نمودار ہوئے ہیں لیکن میں ان کا تاثر تتر بتر کر کے اپنے غم سے واقف نہیں کراتا میں صرف سنتا ہوں۔

پیغام بزم کے حوالے سے اس غزل کے مطلع کا مطلب یہی ہے کہ جب میں نے

معشوق کو نغمہ گاتے دیکھا تو مجھے ان سے تعارف کرنا تھا لیکن نہ کر سکا۔ تب سے آج تک وہ کسی بزم میں شریک نہیں ہوئی۔ تب سے میں غم میں مبتلا ہوں لیکن کسی سے غم کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔ اگرچہ میری آنکھوں کو دیکھ کر لوگ کہہ رہے ہیں کہ میں ان کا کہنا ٹالتا ہوں۔

اسد! زندانی تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خم دستِ نوازش ہوگیا ہے طوق گردن میں

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مقطع میں فرما رہے ہیں کہ میں زندہ ہوں، میں زندگی بھر الفت اپنے معشوق کے لحظہ کو سنبھالتا ہوں۔ میں کبھی ہائے کرنے والا نہیں ہوں۔ میں خوش آمدید کہنے والا ہوں اگرچہ میں نے معشوق کو دیکھا تو میں نے واہ واہ کے لفظوں سے ان کو اپنے دل میں جگہ دے دی اور واہ واہ کر کے میں نے ہائے کا استعمال نہیں کیا۔ اب میں ہائے کا استعمال اسی لئے کرتا ہوں کیونکہ مجھے الفت کا تصور سوچ کر ہائے کے الفاظ میں استعمال کرنا پڑتا ہے۔

پیغام بزم کے حوالے میں اس مقطع پر میں یہ کہوں کہ اسد اللہ خان اسدؔ نے معشوق کو کسی بزم میں جب دیکھا تو اس وقت واہ واہ کے نعروں سے بزم کو خوش آمدید کیا لیکن اسی واہ واہ کے الفاظ کو اب ہائے ہائے کہ الفاظ سے استعمال کرتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے الفت کا لفظ یاد آ کر ہائے کے الفاظ کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ الگ ہونے نے مجھے غم میں مبتلا کیا۔ جس سے کہ میں پھر پاک محبت کے دائرے میں رہ کر معشوق کو ہی ابھی تک دل میں رکھتا ہوں۔

مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خون جگر، سو جگر میں خاک نہیں

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر مزہ ایک بار لینا چاہئے اور اس دنیا میں دیکھنے سے بھی مزہ آہی جاتا ہے لیکن جب معشوق کو یاد کرتے ہیں تو ہمارے خون جگر میں سوزش پیدا ہوتی ہے تو ہم یہی کہتے ہیں کہ سوزش کیسے پیدا ہوگئی، پیدا ہونے پر ہمیں یہ کہنا چاہئے معشوق کو اگر وفائی کرنی چاہئے تھی تو یہ سوزش محسوس نہیں ہوتی اور

معشوق کو یہ بھی تصور کرنا چاہئے کہ آخر کار اس دُنیا میں خاک میں ہی سونا ہے اور یہ دُنیا خاک ہے۔ اگر وہ لفظ خاک کو یاد کرتی تو میرے دل کو ایسے حالات میں نہیں دیکھتا لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے دراصل سوزش کا تصور ہی نہیں محسوس کیا تبھی تو انہیں خاک یاد ہے ہی نہیں۔

پیغام بزم کے دائرے میں اسداللہ خان اسدؔ کہتے ہیں کہ معشوق کو بزم میں دیکھا اور اس کے بعد کسی بزم میں نے نہیں دیکھا اگر کسی ناساز گار حالت کی وجہ سے انہیں گھر والوں نے پابندی عائد کی ہے یا خود کسی اور بزم میں شریک نہیں ہوئی تو انہیں مجھ پر ہی ایسا گلہ کرنا تھا انہیں خاک کی یاد نہیں ہے آخر ہم دونوں کو مٹی میں ہی سونا ہے اور یہ دُنیا مٹی ہی مٹی ہے۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ!

کھلا کہ فائدہ عرض ہنر مَیں خاک نہیں

اسداللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع کے مطابق مقطع میں فرمار ہے ہیں کہ جب اس دنیا میں رہنا ہی نہیں ہے آخر کار مٹی میں ہی سونا ہے اور یہ دنیا خاک ہی خاک ہے۔ جو میں نے آج تک لکھا اور لوگوں نے پڑھا وہ میں نے معشوق کی جدائی پر ہی لکھا۔ اور دل سے گہری محبت دکھا کر پاک محبت کے اصول اپنائے۔ لیکن میں نے اپنی غزلوں میں محبت کے بارے میں بہت سی باتیں لکھیں لیکن یہ ایک ہنر ہے جو ہنر کئی آدمیوں اور فنکاروں اور کئی قلمکاروں کے پاس موجود ہے۔ پھر بھی یہ ہنر رہنے والا نہیں آخر ہمیں مٹی میں سونا ہے اور ہمیں خاک کو ہی یاد کرنا ہے۔

پیغام بزم کے حوالے سے اسداللہ خان اسدؔ فرمار ہے ہیں کہ میں نے معشوق کو پھر کبھی بھی کسی بزم میں حاضر نہیں دیکھا اور میں نے اس کے غیر حاضری پر بہت سی غزلیں تحریر کیں۔ اور یہ ہنر انہیں ایک لین دین ہے اور انہیں کے تصور پر اتنی شاعری ابھر کر آئی لیکن یہ ایک ہنر ہے اس ہنر کو بھی آخر سپرد خاک ہونا ہے مطلب معشوق کو اگر موت یا مٹی کی یاد آتی ہے یا یہ بھی محسوس ہوتا کہ آخر کار ہمیں خاک میں ہی دفن ہونا ہے اور یہ سوچ کر اسے پورا خیال آ ہی جاتا اور کسی بزم میں میرے دیکھنے کے لئے حاضر ہو ہی جاتی۔

وابستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو

کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

اسداللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرمارہے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگی پاک محبت میں ہی گزاری۔ میں نے اپنے معشوق سے کوئی بھی حسد نہیں کی اور نہ مجھے اس کے الگ ہونے سے یا الگ زندگی بسر کرنے سے کوئی عداوت محسوس ہو۔ ہاں میں وابستہ انہیں کے ساتھ ہمیشہ رہا۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں کہوں کہ تو اسداللہ خان اسدؔ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں نے زندگی بھر اپنی وابستگی معشوق کے ساتھ رکھی ہے لیکن اگر مجھے کوئی تناؤ معشوق کے نزدیک آنے پر پیدا ہوا پھر بھی مجھے عداوت کا رجحان دل میں نہیں پیدا ہوا۔ میں نے تا ابد اپنی پاک محبت معشوق کو پیش کی۔

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ!

اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

اسداللہ خان اسدؔ غزل کے مقطع میں فرمارہے ہیں کہ اگر غزل کے مطلع میں میں نے یہ بیان کیا ہے کہ مجھے جدائی کے دوران یا جدائی سے کوئی بھی ضد، حسد یا عداوت دل میں نہیں پیدا ہوتی، اس پر بہت لوگ مجھ پر فتنہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ حیران ہوتے ہیں کہ اتنی پاک محبت معشوق کے ساتھ ہے۔ یہ کبھی بھی اس بات پر فتنہ نہیں اٹھانا چاہتا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ فتنہ اگر پاک محبت کی وجہ سے ہے تو میں اس فتنے کو عمر بھر کے لئے ختم کرنا چاہتا ہوں کیوں نہ فتنے کو ختم کرنے کے لئے قیامت کا سامنا بھی کرنا پڑے۔ قیامت کا سامنا کرنا لیکن فتنے کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنا چاہئے۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں سوچوں گا تو میں یہی کہوں گا کہ اسدؔ کو معشوق کے ساتھ قریبی واسطہ ہے وہ یہ کہ اس کے غیر حاضر بزم میں رہنے پر اسدؔ نے بہت سی غزلیں تحریر کیں۔ انہوں نے پھر بھی معشوق کو کسی بزم میں حاضر نہیں دیکھا۔ اب اسدؔ سوچتے ہیں کہ کس

فتنے نے انہیں بزم میں آنے سے روکا ہے۔ اور وہ بزم میں شریک نہیں ہوتی ہے۔ میں ان خیالات کو اور اس فتنے کو نیست و نابود کرنا چاہتا ہوں۔ اگر چہ مجھے فتنے کو نیست و نابود کرنے پر قیامت کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے میں وہ بھی قبول کروں گا لیکن فتنہ کو ہمیشہ کے لئے دور رکھنا چاہتا ہوں تا کہ معشوق پھر سے بزم میں حاضر ہو جائے۔

سر گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ میں اس دنیا میں ایسی ہستی ہوں جس کو غموں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے میں اب یہ سوچتا ہوں کہ مجھے ان غموں کو نیست و نابود کرنے کے لئے کوئی بھی مشورہ نہیں دینے والا ہے تا کہ میں ان غموں کو ختم کروں۔ مجھے غم اس بات کا ہے کہ مجھے کوئی بھی تسکین نہیں دیتا کہ برداشتِ قوت رکھو۔ میں اب سوچتا ہوں کہ سب یہ کہتے ہوں گے کہ اسدؔ مر جائے یا اسدؔ خود سوچتا ہے کہ جب مجھے کوئی بھی حوصلہ معشوق کے الگ ہونے پر نہیں دلاتا ہے تو میں یہی چاہتا ہوں کہ اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔

پیغام بزم کے حوالے سے اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں یہ کہہ رہا ہے کہ معشوق کو جب بزم میں آنے کے لئے مشکلات پیدا کی گئیں تو اسے قید خانے میں رکھا جہاں وہ یہی سوچتی ہو گی کہ مجھے کسی ہستی سے ملنا تھا یا مجھے کوئی ہستی ڈھونڈتی ہے۔ باوجود اس کے مجھے جیل خانہ میں اپنی زندگی بسر کرنی پڑے۔ اسی لئے میں جیل خانے میں رہ کر تنگ آ چکی ہوں اور یہاں کوئی بھی بندہ دل کو تسکین نہیں دیتا ہے۔

ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ!
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اُداس ہے

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مقطع میں فرما رہے ہیں کہ میں نے غزل کے مطلع میں پہلے ہی یہ بیان کیا ہے کہ میرے معشوق کو میرے غم پر بالکل یقین نہیں آتا جس سے کہ مجھے انہیں کے

ذریعے کوئی سکون ملے۔اسی لئے میں اس دُنیا سے الگ ہی رہنا چاہتا ہوں۔اسی پر مقطع میں کہہ رہے ہیں کہ مکان کے اندر جب میں بیٹھتا ہوں ایک نیک آدمی کی حیثیت سے ہی بیٹھتا ہوں۔مجھے سوچتے ہوئے ہمیشہ مجنوں یاد آتی ہے لیکن لیلیٰ بن کر مجنوں کے لئے مرنا ہی چاہتا ہوں۔پھر بھی مجھے موت نہیں آتی ہے۔اب اتنا اداس ہوں میں کہ جنگل میں بیٹھنا چاہتا ہوں لیکن وہاں پر میں غموں میں مبتلا رہ سکتا ہوں۔اسی لئے ایک نیک آدمی ہونے کے ناطے مجھے بہت صدمے اس مکان میں اٹھانے پڑے۔

پیغام بزم کے حوالے سے میں یہ کہوں گا کہ میں نے پہلے ہی یہ بیان کیا ہے کہ معشوق کوکسی واقعہ پر گھر والوں نے گھر میں ہی قید خانے میں بند رکھا ہے۔اس بات کی وضاحت اسداللہ خان اسد کے مقطع سے پھر ملتی ہے وہ یہ کہ معشوق کومکان کے اندر ہی رکھا گیا ہے۔اور وہ جنگل میں بھی نہیں جاسکتی ہے وہ لیلیٰ کی طرح مرنا چاہتی ہے۔لیکن افسوس ہے کہ اسد کے لئے پاک محبت سے الگ ہونے پر مکان میں جیل کی طرح بند رکھا گیا ہے۔اسی لئے اسؔد مقطع میں فرما رہے ہیں کہ جنگل میں بھی معشوق نہیں جاسکتی ہے اور مجھ نیک آدمی کواس معشوق کیلئے بہت صدمے اٹھانے پڑے۔

اگرچہ میں یہ کہوں لفظ ''کہ مکان کو ہے، پھر مجنوں جوان'' دو الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ معشوق ایک بزم میں حاضر ہونے کے بعد دوسری بزم میں حاضر نہیں ہوسکی کیونکہ انہیں پابندی کا سامنا کرنا پڑا۔اوراسی لئے مکان میں جیل کی طرح رہنا پڑا۔دوسرا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو ہم لیلیٰ مجنوں کی داستاں پڑھتے ہیں جو کہ مختلف زبانوں میں بھی ترجمہ کی گئی ہے اس کا مطلب اسؔد کے دور سے پہلے لیلیٰ مجنون کی کہانی یا داستان لکھی گئی ہے۔

گر ماشی سے فائدہ اخفاے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اسداللہ خان اسؔد غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ میں کبھی بھی اپنی خوشی سے خوش نہیں

رہتا ہوں بلکہ میں خوشی محسوس ہونے کے باوجود بھی غم میں مبتلا رہتا ہوں۔ جیسے کہ جب سردی کا موسم ختم ہوتا ہے تو مئی کے مہینہ میں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ سردی کا موسم دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے اسی طرح سے اسد فرما رہے ہیں کہ مجھے ہر حال میں خوشی یا ہر ایک کام میں خوشی محسوس نہیں ہوتی۔ میں ہمیشہ سردی نہیں محسوس کرتا ہوں میں گرم مزاج میں ہی مبتلا رہتا ہوں۔ اب میں یہی سمجھتا ہوں کہ میں کبھی بھی کسی چیز پر محال نہیں ہوتا ہے اسی لئے یہ جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ میری معشوق سے روبرو ملاقات ہی نہیں ہوئی۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں یہ کہوں کہ جب معشوق کو بزم میں حاضر ہونے کے بعد اتنے غم دیکھنے پڑے تو اسی پر اسدؔ فرما رہے ہیں کہ وہ گھر کے ماحول یا جیل خانے سے محال نہیں ہو سکتی ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ!
عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے

اسد اللہ خان اسدؔ کی غزل کے مطلع کے مطابق مقطع میں فرما رہے ہیں کہ جب انہیں غموں سے گھیرا گیا ہے تو وہ خوشی کے لئے کوئی بھی ماحول نہیں دیکھ سکتا ہے اسی لئے خوشی نہ دیکھنے کی صورت میں مَیں یہی کہہ رہا ہوں کہ جب میں نے غم دیکھے اور غم دیکھنے سے میں ایک ہستی والا آدمی بنا۔ مجھے تب ہستی اپنے آپ کو محسوس ہوئی جب مجھے معشوق سے پاک محبت میں روبرو بات کرنے کے لئے وقت ہی نہیں ملا۔ تو دنیا بھر میں میرے خیالات ابھرے اور میں نے بہت سی غزلیں لکھیں اور میں غزلیں تحریر کرنے کے بعد یہ کہہ رہا ہوں کہ جدائی میں میں نے غزلیں لکھیں اور میں ایک ہستی بنا اور تمام دنیا میں میرا نام مشہور ہوا۔ یہ تب ہو سکا جب مجھے پاک محبت میں جدائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اسی جدائی پر میں نے غم کا اظہار کرتے یا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے غزلیں تحریر کیں۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں عالم میں ہستی کے نام سے وجود میں آیا۔

پیغام بزم کے دائرے میں اسدؔ خود کہہ رہے ہیں کہ معشوق خوشی کے ماحول میں ہے ہی نہیں وہ غم میں مبتلا ہے اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ معشوق سے ملوں۔ میں اسے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کی جدائی سے میں دنیا بھر کا مانا ہوا شاعر بنا۔ مجھے عالمی سطح پر ہستی کے نام سے جانتے ہیں اسی لئے آپ کی جدائی سے ہی مجھے ایک ہستی کے طور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں یہی چاہتا ہوں کہ اب میں آپ کے پاس آجاؤں اور یہ کہوں کہ بزم میں غیر حاضر ہونے کے بعد اور ایک ہی بار بزم میں دیکھنے کے بعد میں آپ کے جدائی پر عالمگیر ہستی میں شمار ہوا۔

عشق مجھ کو نہیں ، وحشت ہی سہی

میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرمارہے ہیں کہ اے معشوق مجھے اس عشق میں اگر غم وستم اٹھانے پڑے۔ اگر آپ نے بے وفائی کی لیکن اس بے وفائی پر آپ کو وحشت میں مبتلا ہونا پڑا اور میری وحشت سے آپ کو بھی صدموں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس سے کہ میں ایک شہرت یافتہ محبوب کی صورت میں آپ کے دل میں نمودار ہوا۔

پیغام بزم کے حوالے سے یہی کہوں کہ جب معشوق بزم میں حاضر ہونے کے بعد اسدؔ کو معشوق کے ساتھ محبت کے تعلقات ہونے لگے اور معشوق کے گانے پر یا گانے سننے پر یا گانے کہنے پر واہ واہ کا لہجہ لوگوں کے سامنے کہا تو اس کے بعد معشوق کسی بھی بزم میں حاضر نہیں ہوئی۔ اس پر اسد نے بہت سا مواد غزلوں کی صورت میں لکھا۔ اسی پر اسد فرمارہے ہیں کہ اگر مجھے آپ کے ساتھ عشق کے تعلقات ہوئے لیکن آپ نے اس عشق کو الگ کرنے کیلئے جدا رہے، کیونکہ آپ کو میرا ڈر محسوس ہوا اس ڈر سے آپ کو وحشت پیدا ہونے لگی، اسی لئے میں نے آپ کی جدائی کے دوران بہت سی غزلیں تحریر کیں اور آپ کو وحشت میں مبتلا کیا اور مجھے آپ کی وحشت سے شہرت ہوئی، شہرت اس بات کی ہوئی کہ میں نے بہت سی غزلیں آپ کے جدائی پر تحریر کی۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد!

گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع کے مقطع پر تذکرہ کر رہے ہیں کہ جب مجھے عشق میں جدائی ہوئی تو میں نے یہی کہا کہ اگر میں نے کوئی چھیڑ خانی کی ہوگی تو میں مشہور نہیں ہوتا اور حسرت میں ہی ڈوب جاتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے پاک محبت کی جس سے کہ میں ایک حسرت بھری کہانی یا غزل لکھ کر مشہور ہوا اور جس سے کہ میں یہ سبق سیکھتا ہوں کہ پاک محبت میں چھیڑ خانی کرنا ایک گناہ ہے صرف ہمیں تصویر کو دیکھنا ہے اور دیکھ کر اس کی تعریف تحریر کرنی ہے۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں یہ کہوں کہ اسد کو معشوق کے ساتھ جب کسی بزم میں ملاقات ہوئی ہی نہیں تو اسدؔ نے بہت سی غزلیں تحریر کیں جسکی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ جب اسدؔ کی اپنی قلم کی شہرت ہوئی تب معشوق کو یہ کہنے لگا کہ شکر اس خدا کا میں نے کوئی چھیڑ خانی نہیں کی صرف میں نے آپ کا جلوہ دیکھا اور آپ کا نغمہ یا نظم یا تحریری طور پر مواد بزم میں سنا۔ سن کر مجھے آپ سے محبت کے تعلقات ہوئے لیکن کوئی چھیڑ خانی نہیں ہوئی صرف میں نے واہ واہ کیا جس پر آپ اور سامعین حسرت میں رہے اور یہ کہنے لگے کہ اسدؔ معشوق سے کتنا خوش ہو رہا اور انہیں معشوق کے گانے پر یا گانے سننے پر یا گانا کہنے پر یا کوئی مواد سنانے پر خوشی محسوس ہوئی۔

رفتارِ عمر قطع رہِ اضطراب ہے

اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

اسد اللہ خان اسدؔ اپنے غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ آہستہ آہستہ اپنی عمر کم ہوتی جا رہی ہے اور بڑھاپے کے دور میں آ رہا ہوں۔ اسی لئے کہتا ہے کہ معشوق کی جدائی سے مجھے اپنی عمر کا تقاضا ہی نہیں۔ میں اپنی عمر کا حساب ہی نہیں رکھتا ہوں اور یہ بھی نہیں سوچتا ہوں کہ اس عشق میں مجھے کتنے سال معشوق سے دور رہا۔ یہ سوچتے اور لکھتے ہوئے میں نے اپنی عمر کا اندازہ ہی نہیں لگایا لیکن جس طرح صبح کے وقت آفتاب ہمیں برق رو سے تعارف کراتا ہے اسی طرح سے میں جدائی میں اپنی عمر گزار کر اپنی زندگی کے سال نہیں گنتا۔ صرف میں برق رَو

کا تصور کرتا رہا۔ مطلب میں معشوق کی جدائی پر اپنے تاثرات لکھتا رہا اور یہ نہیں اپنے دل میں تصور رکھا کہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔

پیغام بزم کے حوالے سے میں یہ کہوں گا کہ جب معشوق کو پابندی عائد کی گئی اور کسی بھی بزم میں حاضر نہیں ہوئی اس کے برعکس اسدؔ بہت بار بزم میں حاضر ہوتا رہا لیکن غیر حاضر معشوق کو پا کر اسدؔ فرما رہا ہے کہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر اب بہت گزری ہے مطلب میں بوڑھاپے میں داخل ہونے والا ہوں لیکن بوڑھاپے میں داخل ہوتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے معشوق کے ساتھ الگ زندگی گزاری اور میں نے برق روآفتاب کی طرح اپنی زندگی گزاری۔ مطلب شام کو سونا اور صبح اٹھ کر آفتاب کو دیکھنا صرف معشوق کی جدائی پر ہی سوچتا رہا۔ اس سوچ میں میں نے اپنی زندگی کا حساب ہی نہیں رکھا اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بڑھاپے کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ اتنے سال تک معشوق کو الگ رکھ کر جیل خانے میں اپنی زندگی بسر کرنے پڑی۔ اس کا حساب ہی نہیں کیونکہ کئی پابندیوں کے باوجود پھر بھی وہ میرا تصور برق روئے آفتاب کی طرح اپنے کمرے میں دیکھتی ہوگی اور مجھے اس وقت یاد کرتی ہوگی اور میرے دل کا تصور اس وقت اس کے دل میں ضرور حاضر رہتا ہوگا۔

گرزا اسدؔ! مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشک سوال وجواب ہے

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع کے مطابق مقطع میں فرما رہے ہیں کہ جب میں نے جدائی گزاری اور جدائی میں رہ کر مجھے عمر کا خیال ہی نہیں رہا مطلب میں اپنی عمر نہیں گنتا رہا مطلب عمر کا حساب ہی نہیں رکھا اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بوڑھاپے کے دور میں آرہا ہوں۔ اس سوچ پر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کوئی بھی شخص میرے پاس نہیں آتا تا کہ معشوق کے بارے میں کچھ اتہ پتہ ہی دے۔ جب میں نے ایک بار چٹھی رساں (قاصد) کو دیکھا مجھے رشک پیدا ہوا اور میں اس سے سوال وجواب کرنے لگا لیکن اس نے مجھے معشوق کا پیغام

سنایا اور میں نے پڑھا لیکن یہ پیغام پڑھ کر اور پیغام پکڑ کر میں نے قاصد کو کہا کہ بہت عرصے کے بعد خط پہنچا۔ اب یہ خط اس وقت پہنچا جبکہ میں بوڑھاپے کے دور میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں۔ خیر میں قاصد کا شکر یہ ادا کرنے لگا۔

تاریخ کے طور پر تاریخ داؤں کو اس سے یہ نصیحت حاصل ہوسکتی ہے کہ اسد کے دور میں بھی ڈاکیہ ڈاک لے کر مختلف گھروں میں چٹھیاں بانٹتے تھا لیکن یہ بھی اس مقطع سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان دنوں بھی چٹھی رساں چٹھیاں دیر سے گھر والوں کو پہنچاتے تھے ممکن ہے کہ اسدؔ نے مقطع کو اس خیال پر بھی لکھا ہوگا۔

پیغام بزم کے حوالے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسدؔ نے پیغام بزم کا خط بہت عرصہ کے بعد پڑھا ہوگا۔ کسی کے ذریعے اسد نے معشوق کو بات بتائی ہوگی اور اسی کے ذریعے معشوق نے اسدؔ کو خط بھیجا لیکن خط بھیجنے کے بعد اسدؔ نے معشوق پر شکوہ کیا ہوگا کہ یہ جو پیغام آپ کا پڑھا یا آپ کا خط پہنچا وہ بہت عرصے کے بعد پہنچا۔ اب وہ جوانی بھی نہیں ہے زندگی بوڑھاپے کے دور میں آگئی ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے!

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں جب مجھے معشوق کے ساتھ کوئی ملاقات نہیں ہوئی اب مجھے رشک محسوس ہو رہا ہے کہ کیونکہ مین اپنی قسمت آزماؤں اور آزماتے ہوئے میں اسے آنکھوں سے دیکھوں اور اگر اچھائی دیکھنے میں مجھے محسوس ہوتی ہے مجھے اچھا ہی کرنا چاہئے۔ مطلب شاعر فرماتے ہیں کہ میں کسی طریقے سے معشوق سے روبرو ملنا چاہتا ہوں اور اسے دیکھ کر میری اپنی قسمت کا فیصلہ ہوجائے گا۔

اگرچہ میں پیغام بزم کے حوالے سے اس مطلع کا مفہوم کہوں تو میں یہ کہوں گا کہ معشوق کے لئے شاعر نے اس مطلع میں فرمایا ہے کہ میں نے اسے بزم میں دیکھا۔ دیکھ کر معشوق کیا

کر رہی تھی وہ شاعر کو معلوم ہے لیکن شاعر نے معشوق کو گانا گاتے یا گانا سناتے یا گانا تحریر کرتے لوگوں کے سامنے دیکھا ہے لیکن دیکھ کر اس سے کوئی بات نہیں کی ہے صرف ان کے لفظوں پر شاعر نے واہ واہ کے الفاظ سے بزم کو آراستہ کیا۔ اسی لئے جب شاعر کو اس کے بعد کسی بزم میں پیغام بزم کے ساتھ ملاقات ہوئی ہی نہیں تبھی تو کہہ رہا ہے کہ میں اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں کہ وہ کسی نہ کسی بزم میں حاضر ہو جائے گی اور میں اسے آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کو دیکھے بغیر رشک محسوس ہوتا ہے یہ رشک کیسے مجھ سے دور ہوگا۔ یہ دور اس طریقے سے ہوسکتا ہے جب کہ میں معشوق کو کسی بزم میں حاضر ہو کر دیکھوں۔

سایہ میرا، مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد!

پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

اسد اللہ خان اسد غزل کے اس مقطع میں فرماتے ہیں کہ مجھے اگر دیدار ہی نہیں ہوا لیکن کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میرا رشک دور ہو جائے گا۔ میں سوچتا ہوں وہ میرے سائے سے بھی نزدیک ہے لیکن کیا کروں کیسے ان جذبات کو دور کرسکتا ہوں کیونکہ سوچنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ سے میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ وہ میرے پاس بیٹھی ہے۔ سوچتے ہوئے مجھے ایسا خیال آرہا ہے کہ مجھے اس کا سایہ دیکھنے سے نہ ہی آتش جیسی صورت حال محسوس ہوتی ہے اور اس آتش کو دیکھ کر مجھے آگ نمودار محسوس ہوتی ہے۔ اس آگ کو مثل دود کی طرح میں بجھانا چاہتا ہوں مطلب میں دھواں میں اس آگ کو دیکھتا ہوں دھواں ہی دھواں دیکھ کر مجھے آگ دیکھنے میں محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس آگ کو میں نے خود بجھایا۔ جس کی وجہ سے دھواں دیکھ رہا ہوں مطلب شاعر کا یہ ہے کہ میں نے اپنے جذبات سائے کی طرح ان کے روبرو خیالوں میں رکھے لیکن خیالات رکھ کر مجھے باریک دل میں محسوس ہونے لگا اب جب میرا باریک جیسا دل محسوس ہوا تو مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ جیسا آگ جلائی ہو میرے دل میں۔ اب اس آگ کو جلانے کے بعد مجھے پھر دھواں آنکھوں کے

سامنے محسوس ہوا اسی لئے ان حالات سے مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں پاک محبت میں الگ رہوں پھر بھی دھواں میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ نمودار رہے گا اسی لئے میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ آگ کیوں بجھائی اور مثل دود الگ نہیں کر سکا۔ مطلب دھواں کو بھی الگ نہیں کر سکا۔

اگر پیغام بزم کے اصولوں کے مطابق بحث کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ شاعر نے مقطع میں صاف فرمایا ہے کہ جب سے میں نے معشوق کو دیکھا اور اس بزم کے بعد میں نے کبھی اسے حاضر نہیں کسی بزم میں دیکھا۔ اسی لئے مجھے اس کی حاضری پر دھواں ہی دھواں محسوس ہو رہا ہے ۔ مطلب اس کی غیر حاضری میں جب بھی میں کسی محفل میں حاضر ہوتا ہوں تو مجھے دل میں سکون ہی نہیں محسوس ہوتا ہے۔ نہ میں اپنی غزل کو شاعروں کے سامنے اپنے دل کی گہرائیوں سے سناتا ہوں۔ مجھے اندر سے انہیں کا جذبہ محسوس ہوتا ہے اگر چہ کسی وقت مجھے جذبہ آتش کی صورت میں دل میں نمودار ہوتا ہے پھر میں اس آتش کو بجھا کے مثل دود کے طریقے سے سائے کی طرح دیکھتا ہوں اسی لئے مجھے یہی پریشانی ہے کہ کب میں معشوق کو بزم میں دیکھوں۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں اک ادا میں رضا مند کر گئی

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ معشوق کے لئے اپنی نگاہیں میرے جگر میں بدستور قائم اور دائم ہے۔ دونوں صورتوں میں میرا دل اس کے ساتھ ہے لیکن شاعر اپنی اس غزل کے مطلع سے یہ تصور بیان کرتے ہیں کہ میری معشوق کو بھی میرے دل کے بارے میں کوئی نہ کوئی نگاہ موجود ہے۔ لیکن ایک ہی فرق محسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ دونوں میں رضامندی ہے یا نہیں اس کے بارے میں شاعر فرماتے ہیں کہ میری اس سے رضامندی ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ میرے معشوق کو میرے بارے میں رضامندی ہے یا نہیں۔

اگر چہ اس غزل کے مطلع کو پیغام بزم کے حوالے سے میں بتاؤں تو صاف ظاہر ہے کہ شاعر نے معشوق کے بارے میں بات صاف بتائی ہے۔ جب سے میں نے ان کو اس بزم

میں دیکھا ہے تو میں نے واہ واہ کی لیکن اس وقت میرے واہ واہ کو معشوق نے سنا معلوم نہیں سن کر اس کو میری واہ واہ سے میری نگاہوں کا اثر ہوا ہے یا نہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اس کو میری واہ واہ کے کہنے سے میرا تصور دل میں رہا ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے رضا مندی کا۔ وہ رضا مندی اسی لئے معلوم نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ ایک ہی بزم میں حاضر ہونے کے بعد اس پر کئی پابندیاں رکھی گئیں جن سے کہ وہ باقی بزم میں نہیں آسکی۔ اسی لئے میں یہی کہہ رہا ہوں کہ واہ واہ لفظ سے ہی میرے دل میں اور اس کے دل میں رضا مندی برقرار ہے۔

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں! تمہیں

وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

اسد اللہ خان اسدؔ غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ میرا دل حاضر ہے اپنے معشوق کے لئے۔ میری نگاہیں بھی حاضر ہیں لیکن زمانے کے مطابق کئی وجوہات کی بناء پر اسے میرے دل کے تصور پر الگ رکھا گیا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنی جوانی ختم کی اور میں نے بھی اپنی جوانی اس کے لئے ختم کی۔ اب میں الگ ہونے کی وجہ سے یہی کہتا ہوں کہ زمانے کے خوف سے اس کا ولولہ اور میرا ولولہ ختم ہوا۔

اگر پیغام بزم کے مطابق اس مقطع کی میں تشبیہ لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ اسد اللہ خان اسدؔ فرما رہے ہیں جب سے مجھے پیغام نغمہ سے ملاقات ہوئی تو اس کے بعد اس پر کئی پابندیاں عائد کی گئیں جس پابندی کے تحت وہ کسی اور بزم میں حاضر نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ میں بہت بزموں میں حاضر ہوا لیکن اسے غیر حاضر پایا۔ جب میں نے انہیں غیر حاضر پایا تو میں نے سوچا معشوق کو زمانے کے مطابق کئی پابندیاں عائد کی گئی ہیں جس کی وجہ سے جوانی کا ولولہ ختم ہو گیا۔ ساتھ ہی میری جوانی کا بھی جذبہ محبت کے تئیں برباد ہو گیا۔ اسی لئے میں یہ سوچتا ہوں کہ زمانے کے مطابق مجھے معشوق سے ملاقات ہوئی ہی نہیں کیونکہ میں یہی سوچتا ہوں اس زمانے میں شرم و حیا کے مطابق سماج اپنا کام کرتا لیکن میرے مطابق اس زمانے میں پاک

محبت رکھنے والے کو حیا کس بات کی ہے۔ کیا میں نے کسی دوسرے سے محبت کی۔ میں ایک ہی محبت پر قائم رہا۔

اگر میں اس غزل کے مطلع اور مقطع کو غور سے پڑھوں تو میں یہ سوچوں گا کہ اسد اللہ خان اسدؔ نے غزل اور مقطع بہت ہی بہترین لکھا ہے اگر دوسرے شاعر یا میں اس غزل اور مقطع کو اس طریقے سے لکھوں پھر بھی اسد اللہ خان اسد کا خیال الگ ہوسکتا ہے۔ وہ یوں

آنکھوں سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں اک ادا میں اقرار مند کر گئی
مارا زمانے نے دلگیر کیا دلبر تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی، کدھر گئی؟

اگر چہ میں غزل کا مطلع اور مقطع پڑھوں تو میں اسی وقت یہ کہوں گا کہ کسی شاعر کا کلام کسی نے دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن اگر خود بھی ادیب تنقید نگار یا شاعر پڑھے تو وہ بھی بزم میں آفرین کا لفظ استعمال کرے گا۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ شاعر نے غزل کے مطلع اور مقطع کو وزن کے اعتبار سے غلط لکھا ہے وہ ایسی آنکھوں کا لفظ استعمال کرنے اور اقرار کا لفظ استعمال کرنے سے وزن الگ ہوتا ہے لیکن پھر بھی شاعری کی بزم میں شاعر واہ واہ کریں گے اور یہ نہیں سوچیں گے کہ یہ کسی شاعر کے نمونے کلام کا مطلع لکھا ہے۔ اگر مقطع پر بحث کریں گے تو ہم یہی کہیں گے کہ اسد اللہ خاں کے قلمی نام کو دوسرے قلمی نام سے لکھ کر پھر بھی وزن مکمل نہیں ہوا۔ دلگیر کیا دل بر کے لکھنے سے بھی وزن پورا نہیں اترتا ہے۔ کئی شاعر آج کل اس طریقے کا بھی مقطع غزلوں میں لکھتے ہیں لیکن میں نے کئی شاعروں کی غزلوں کو پڑھا جو کہ میں پرانے شاعروں کے مطلع اور مقطع کے مطابق پایا ہے۔ خیر وزن کے اعتبار سے اس شعر کو غزل اور مقطع کا کردار نہیں کہہ سکتے ہیں نہ ایسی شاعری کو میں شاعری کے اعتبار سے تسلیم کروں گا اگر چہ میں اسد اللہ خاں کے اس غزل کے مطلع اور مقطع پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا وزن

کے اور مطلب کے اعتبار سے شاعری بلند پایہ عالمی سطح پر تسلیم کی جاتی ہے۔

بے اعتدالیوں سے، سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہوگئے ، اُتنے ہی کم ہوئے

اسد اللہ خاں اسد غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں جتنی زیادہ تعداد میں لوگ رہتے ہیں اتنی ہی تعداد میں کئی دانشور بھی ہیں اور کئی نادان بھی ہیں لیکن ہم دونوں کے ساتھ واقفیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے رجحان کو دیکھ کر ہمیں خود معلوم ہوتا ہے کہ کس میں دانائی ہے اور کس میں نادانی ہے۔ ہم ان دونوں کی باتوں کو سن کر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سبق سیکھا ہے۔ سبق اس بات سے کہ نادان ہر ایک بات بتاتا ہے اور دانشور اپنی بات بتانے سے انکار کرتا ہے اور دانائی طریقے سے کوئی بھی بات ہاں یا نا میں کہنے والا نہیں ہے بلکہ ہر وقت دانا دانائی سے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔

پیغام بزم کے مطابق اگر میں اس غزل کے مطلع کا مطلب کہوں تو میں یہ کہوں گا کہ جب اسد اللہ خاں اسد نے کسی بزم میں معشوق کو دیکھا تو وہاں پر اسد اللہ خاں اسد نے واہ واہ سے محفل کو گرمایا مطلب واہ واہ کی آواز تمام لوگوں نے سنی سن کر لوگ حیران ہوگئے کہ کس بات پر زیادہ توجہ اس معشوق پر دے رہا ہے۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ اپنی پاک محبت کا تصور معشوق کو پیش کر رہا ہے۔ جتنے لوگ حاضر تھے زیادہ تر وہ نادانی میں اپنا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ اسد کو معشوق کا تصور کسی نغمے یا کسی چیز پر دل میں رہا لیکن جو دانا لوگ دیکھ رہے تھے وہ کم تعداد میں اپنا اظہار کریں گے انہوں نے کسی بھی جذبے پر نہ اقرار کیا نہ کوئی انکار کیا۔ اسی لئے اسد فرما رہے ہیں کہ جتنی تعداد میں لوگ پیغام بزم میں حاضر رہے اتنی ہی تعداد میں دانشور بہت ہی کم دیکھنے میں آئے حتیٰ کہ محفل دانشوروں کی تھی لیکن ان میں بھی بہت کم دانشور نظر آئے۔

چھوڑی اسد! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے ، تو عاشق اہل کرم ہوئے

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مقطع میں فرمارہا ہے کہ میں نے معشوق سے الگ ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی فقیری میں گزاری۔ اور اپنا دل بھی غربت میں رکھا۔ مطلب غربت ہونے کی وجہ سے کسی نے پاک محبت میں میرا ساتھ نہیں دیا اسی لئے میں ایک فقیر جیسا نیک آدمی ہوں اور اسی حالت میں بھیک مانگنے والا آدمی بھی ہوں۔ اور لوگ میرے اس تصور پر عاشق بن گئے ہیں۔ مطلب جب میں فقیری انداز میں بیٹھتا ہوں یا راستے میں چلتا ہوں تو لوگ میرا ایسا تصور دیکھ کر عاشق بن گئے اور وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ فقیر بھکاری ہے۔ اسی لئے مجھے دیکھ کر وہ اہل عاشق بن گئے ہیں۔

اگر پیغام بزم کے حوالے سے اس مقطع پر بحث کریں تو ہم یہی کہیں گے کہ جب معشوق کے ساتھ وابستگی شاعر کی کسی بزم میں ہوئی نہیں تب سے معشوق کی کسی بھی بزم میں شاعر نے حاضر نہیں دیکھی۔ مطلب وہ غیر رہی اب شاعر سوچتا ہے کہ کیوں نہ میں فقیر بن کر راستے میں چلوں اور مجھے تمام لوگ دیکھیں گے وہ مجھ پر عاشق ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ معشوق کو بھی کئی لوگ یہ کہیں گے کہ کوئی فقیر راستے میں دیکھنے میں آیا ہے وہ بھکاری جیسا ہے اور یہ سن کر معشوق ضرور مجھے دیکھے گی لیکن لوگ ہی دیکھیں گے وہ نہیں دیکھی گی کیونکہ اس پر کئی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

تاریخ کے پس منظر میں اگر میں ان چار مصرعوں پر بحث کروں تو میں یہ کہوں گا کہ شاعر نے اس دور کا بھی ذکر ایسا کیا ہے کہ ان دنوں کئی بہروپ بن کر بہت سے لوگوں کے ساتھ ملاقات کرتے تھے اور ان دنوں بہروپی بھی کوئی راز کسی قاتل کے دل سے نکالتے تھے۔ ممکن ہے کہ شاعر نے اس دور کی تاریخ کا حوالہ دیا ہوگا۔

اگرچہ شاعر کے مطلع اور مقطع پر بحث کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ شاعر نے زیادہ تر فارسی کا استعمال کیا ہے کیونکہ ہم اُردو کے الفاظ سے ان کے مقطع کو اس طرح لکھیں

چھوڑی اسد! نہ ہم نے فقیری میں دل لگی

بھکاری ہوئے ، تو عاشق اہل کرم ہوئے

لیکن جب میں نے اس مقطع کو تحریر کیا تو وزن کے اعتبار سے مقطع الگ رہا لیکن اُردو زبان کے لفظوں سے سجایا لیکن اس کے ساتھ ہی شاعر نے اُردو زبان کے دو لفظ فارسی میں لکھے ان سے ہی مقطع کا وزن برقرار رہتا ہے میرے ان دو لفظوں سے وزن الگ ہو سکتا ہے مطلب لفظ گدائی کے بجائے فقیری اور سائل کے بجائے بھکاری نہیں سج رہا ہے اسی لئے ممکن ہے شاعر نے مقطع میں وزن برقرار رکھنے کے لئے فارسی کے دو لفظ استعمال کئے ہیں۔

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

اسد اللہ خاں اسد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی اچھا کام انجام دیتا ہے تو پھر ہم اسے اچھے طریقے سے دل میں جگہ دیتے ہیں مطلب ہم اس کے لئے یہی کہتے ہیں کہ یہ نیک آدمی ہے۔ نیکی کرنے کے بعد تمام لوگ اس سے یہ کہتے ہیں کہ اس نیکی کا انعام آپ کو ملنا چاہئے۔ اور یہ بھی فرمائش کرتے ہیں کہ کونسا انعام آپ کو تسلیم ہے۔ اس وہ آدمی یہی جواب دیتا ہے کہ مجھے آپ کے لئے اچھا کام کرنا تھا وہ میں نے کیا پھر بھی لوگ اسے یاد دلاتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہمیں بتاؤ کہ ہم آپ کو اس نیک نیتی پر کوئی اعزاز پیش کریں۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں کہوں تو شاعر فرماتے ہیں کہ جب میں نے معشوق کو بزم میں دیکھا تو مجھے اس کے لہجے پر بہت ہی دل کا لگاؤ رہا۔ اس لگاؤ سے میں نے برائی نہیں کی میں نے اپنا دل اسے پیش کیا اگر چہ میں نے اپنا دل اسے پیش کیا تو پھر میں نے کونسا غلط کام کیا مجھے لوگ کیوں نفرت سے دیکھتے ہیں۔ اگر چہ میں نے اچھا کیا تو تمام لوگ مجھے نیک ہی کہیں۔ لیکن پاک محبت میں ایسے اصول نہیں تسلیم کئے جاتے۔ دراصل دل کی بربادی سے دل کو پاک محبت کے اصولوں پر نہیں تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاک محبت نہیں ہے بلکہ دل لگی یا ایک دوسرے کے دل کی بربادی ہے۔ اسی لئے اسد اس مطلع میں فرما رہے ہیں کہ مجھے بہتر انداز سے اچھائی کرنی ہے لوگ کچھ بھی کہیں لیکن مجھے اپنا کام کرنا ہے۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کی اسدؔ!
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

اسداللہ خاں اسدؔ غزل کے مقطع میں فرمار ہے ہیں کہ میں نے اپنے طریقے سے اچھا ہی کیا برانہیں کیا لیکن پھر بھی مجھ پر لوگ ناراض ہیں۔ وہ میری پاک محبت پر بہت گندے خیال رکھتے ہیں جس کی وجہ سے میں اپنے اچھے کاموں پر روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں نیک آدمی ہوں۔ میری نیک نیتی پر کیوں لوگ برا سوچتے ہیں اسی لئے میں خوب روتا ہوں لیکن ان کی نظر میں براہی آدمی ہوں۔

اگر میں پیغام بزم کے حوالے سے اس مقطع کے متعلق کچھ کہوں تو میں یہ کہوں گا کہ معشوق کے ساتھ وابستگی ہونے سے شاعر فرماتا ہے کہ اس نے بزم میں معشوق پر واہ واہ کہا اور اس واہ واہ پر شک وشبہہ پیدا ہونے لگے۔ جس شک کی وجہ سے لوگ مجھ سے نفرت کرر ہے ہیں لیکن اس نفرت پر میں روتا ہوں، اور روتے ہوئے یہ کہتا ہوں کیوں وہ مجھ پر ناراض ہے کیا میری اچھی صورت نہیں ہے کیا معشوق کی صورت اچھی نہیں ہے مجھے کیوں رُلاتے ہیں۔

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے، بیاباں مجھ سے

اسداللہ خاں اسدؔ اپنی غزل کے اس مطلع میں کہتے ہیں میں ہمیشہ اپنے پیروں کو نزدیک نہیں لاتا۔ میں اپنے پیروں کو دور رکھتا ہوں اور دور رکھ کر میں محبوب کے ساتھ اپنی رفتار برابر نہیں کرسکا۔ لیکن اگر چہ میں اس کی رفتار کے ساتھ نہیں پہنچ سکا پھر بھی میں کسی جنگل میں الگ بیٹھنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے معشوق کے ساتھ نزدیک کا واسطہ رہا ہی نہیں وہ تیز دوڑتے ہیں میں آہستہ آہستہ دوڑتا ہوں لیکن اس دوڑ کے باوجود بھی میں معشوق سے جیت نہیں سکا۔ معشوق ہی دوڑ میں جیت گئی میں ہار گیا۔ اسی لئے ہارنے کے بہانے میں الگ کسی بیاں بیاں میں بیٹھنا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنی ہار پر سوچوں اور سوچ کر یہ کہوں کہ میں اپنی دوڑ میں کیسے

جیت حاصل کرسکوں۔

اگر پیغام بزم کے حوالے سے یہ کہوں کہ اسدؔ نے بہت بار معشوق کو ملنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی بھی بزم میں حاضر نہیں ہوئی اور اگر چہ اسدؔ نے بہت بزموں میں حاضری اپنی دی پھر بھی معشوق کو غیر حاضر پایا۔ اسی پر اسدؔ فرما رہے ہیں کہ میں بہت دور تک معشوق کے ساتھ دوڑ لگائی۔ مطلب اگر چہ میں نے پاک محبت میں دوڑ لگائی لیکن میں دوڑ جیت نہ سکا، پھر بھی میں یہی کہہ رہا ہوں کہ میرے قدم اس تک نہیں پہنچے پھر بھی دور منزل سے دیکھ کر اپنی رفتار کو اس کی رفتار تک پہنچانا چاہتا ہوں لیکن اگر نہیں پہنچ سکا پھر میں ان خیالات پر سوچنے کے لئے کسی جنگل میں بیٹھوں گا وہاں پر میں جیت کے بارے میں سوچوں گا کیسے مجھے معشوق کے ساتھ دوڑ میں جیت حاصل ہوسکتی ہے۔

نگہ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ!

ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مقطع میں، کہہ رہے ہیں کہ میں معشوق کے ساتھ دوڑ میں جیت نہیں سکا لیکن میری آنکھیں ان کے لئے ٹپکتی ہیں اور ایسا دل ٹپکتا ہے جیسے کہ آگ نمودار ہو رہی ہو جس سے چراغاں محسوس ہوتا ہے۔ اگر ہم آگ کو دور سے اندھیرے میں دیکھیں گے تو ہم یہی کہیں گے کہ چراغاں ہے لیکن ہم یہ نہیں سوچیں گے کہ نقصان ہو رہا ہے کوئی گلستان میں غموں کے بوجھ کا مارا ہے۔ کسی کو آگ سے بربادی ہو رہی ہے یہ نہیں سوچیں گے۔ ہم صرف یہی سوچیں گے کہ چراغاں ہے اس چراغ سے نقصان نہیں سوچیں گے نقصان پر غور نہیں کریں گے۔ جب بھی گلستان میں کوئی آگ نمودار ہو مطلب اگر کسی وقت بدامنی ظاہر ہو تو ہمیں امن قائم کرنے کیلئے کچھ کرنا چاہئے تا کہ آگ نمودار نہ ہو مطلب بدامنی نہ پھیل سکے۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں اس مقطع پر بحث کروں تو میں یہی کہوں گا کہ جب سے اسد نے معشوق کو بزم میں نہیں دیکھا حتیٰ کہ اسدؔ نے بہت کوشش کی کہ میں معشوق کو

دیکھوں لیکن نہیں دیکھ سکا جب کبھی بھی اسدؔ کسی محفل میں حاضر ہوتا ہے وہاں پر اسدؔ کی نگاہیں آگ کی طرح ٹپکتی ہیں اور ایسی ٹپکتی ہیں جیسے گلستان میں آگ نمودار ہورہی ہو۔ مطلب معشوق سے اتنی گہری پاک محبت اسد کو ہے کہ وہ معشوق کو بزم میں حاضر دیکھنا چاہتی ہے۔

اگرچہ ہم اس دور کے ساتھ اس مقطع کو وابستہ کریں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ ان دنوں بھی ملک میں بدامنی کا ماحول نظر آیا اسی لئے اسد نے اس مقطع میں اس جذبے پر لوگوں کی توجہ مرکوز کی ہے کہ ملک میں بدامنی کے ماحول میں آگ نمودار ہوتی ہے اس آگ کو بجھانے کے لئے ہمیں ایسی کوشش کرنی چاہئے کہ آگ نہ پھیلے۔ آگ کی روک تھام کرنے کے لئے ہمیں ایسے دانشوروں سے صلاح ومشورہ طلب کرنا چاہئے جن سے کہ گلستان میں امن قائم ودائم رہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دنوں بھی ایسے حالات دیکھنے میں آئے ہیں اسی لئے اسدؔ نے اس مقطع میں ایسے جذبہ کا بھی اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسدؔ نے کوئی تحریک ان دنوں دیکھی ہوگی جس تحریک پر اسد نے مطلع اور مقطع لکھا ہے۔

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجالِ خواب تو دے

اسداللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ جب میں نے پاک محبت کی تو مجھے بہت سے صدمے برداشت کرنے پڑے۔ اُن کا مقابلہ بھی بدستور کرتا رہا وہ یہ کہ میں اپنے معشوق سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ملاقات ہوئی نہیں۔ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر محبوب مجھے خواب میں ہی ملے تو مجھے سکون محسوس ہوسکتا ہے۔ سکون سے مجھے خواب کی تاثیر سے تپش تھوڑی سی کم محسوس ہوجائے گی لیکن افسوس ہے کہ پھر بھی خواب میں مجھے معشوق سے کوئی بھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے مجھے تسکین اضطراب کیسے معشوق دے سکتا ہے۔ میں اسے اب خواب کا ہی تصور کرکے مجالِ خواب میں ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔

اگر پیغام بزم کے حوالے سے اس مطلع کا واسطہ معشوق کے ساتھ رکھیں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ معشوق مجھے تب سے ملی نہیں جب سے میں نے اسے ایک بزم میں دیکھا۔ میں نے اسکی آواز پر واہ واہ سے ہی استقبال کیا۔ لیکن میرے استقبال سے بھی میرے دل کی طرف اس کی توجہ مرکوز نہیں ہوئی۔ اسی لئے میں اب یہ بھی سوچتا ہوں کہ وہ مجھے کسی بزم میں نہیں ملتی ہے نہ میں اس سے ملتا ہوں۔ اب میری یہی خواہش ہے کہ وہ کسی طریقے سے مجھ سے خواب میں ہی ملے تا کہ مجھے تسکین اضطراب محسوس ہو جائے۔ اور میرے دل کی تپش دور ہو جائے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ مجال خواب میں مجھے کچھ نہ کچھ پاک محبت کا بھروسہ دلا سکتی ہے۔

اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہاں جو اس نے ''ذرا میرے پانو داب تو دے''

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ مجھے زندگی بھر خوشی محسوس نہیں ہوئی لیکن جب مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے تو میں میرے ہاتھ پاؤں پھول کی طرح خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ مطلب میں جب معشوق کو یاد کرتا ہوں تو مجھے ان کے ہاتھ پاؤں کا تصور دل اور آنکھوں میں آ کر خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن اس نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ پاؤں کو دباؤ۔ اس نے پاک محبت کے اصولوں میں ہی پردہ میں ہی محبت انجام دی۔ اسی لئے میں نے اس کے پاؤں کو کبھی نہیں دبایا اور نہ اس نے کبھی یہ فرمایا کہ آپ اپنے پاؤں انہیں دے دیں۔ مطلب ہر ایک چیز پردہ میں ہی رکھی۔

پیغام بزم کے حوالے سے اگر میں اس بات پر توجہ پھر مرکوز کروں کہ جب اسد اللہ خاں اسدؔ نے معشوق کو بزم میں پہلی بار دیکھا تو اس نے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے۔ اور اس طریقے سے دیکھے جب اس نے سامعین کے سامنے اپنا نغمہ پیش کیا۔ شاعر یہی فرماتا ہے کہ جب میں نے پاؤں اور ہاتھ دیکھے تو مجھے پھول کا تصور میرے دماغ میں رونما ہوا۔ میں نے سمجھا کہ یہ نازک پھول ہے اسے چھیڑ نہیں سکتے۔ جس طرح ہم ایک پھول کو محفوظ رکھتے ہیں اور اسے

توڑنے کیلئے منع کرتے ہیں اسی طرح سے معشوق کے پاؤں اور ہاتھ پھول کے مانند ہیں۔ دیکھ کر میں نے سوچا کہ میں اسے اپنے پاؤں پیش کروں لیکن افسوس ہے کہ نہ وہ اپنا پاؤں اور نہ میں اپنا پاؤں آپس میں پیش کر سکے لیکن میری واہ واہ سے اُس کو محسوس ہوا کہ شاعر کے پاؤں میرے پاس رہنے چاہئے۔اور میرے پاؤں بھی اس کے پاؤں سے وابسطہ ہونے چاہئے۔

اگر چہ ہم اس غزل کے مطلع اور مقطع پر بحث کریں گے تو ہمیں یہی محسوس ہوسکتا ہے کہ اسؔد اپنے دور میں غزل کے مطلع کو شاعری کے پہلے دور میں بہت کوششیں کر کے غزل کا مطلع اور مقطع لکھا ہے۔اگر ہم غور سے سوچیں گے تو یہی کہیں گے کہ اسد کی ابتدائی شاعری ہے۔دوسرے پہلو میں اگر ہم یہ سوچیں کہ اُس وقت کے دور میں ایسے شعر شاعروں کے نہیں گونجتے رہے جیسے کہ میر تقی میرؔ کے وقت اسدؔ کی عمر 13 سال کی تھی لیکن مومن خان مومنؔ اور ابراہم ذوقؔ جیسی شخصیتوں کے ساتھ اس غزل کے مطلع اور مقطع کو پڑھ کر اسدؔ کی قلم کو عزت فراہم نہیں ہوسکتی۔مطلب انہوں نے غزل مرتب کی ہے لیکن اس طرح کے سادہ طریقے سے نہیں لکھی ہے جس طرح ابتدائی شاعری میں اسدؔ نے غزل کا مطلع اور مقطع تحریر کیا ہے۔پھر بھی جوان عمر شاعر کا نمونہ تمام ادبی حلقوں میں بطور سنگ میل تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

روئے سے، اور عشق میں بیباک ہوگئے
دھوئے گئے ہم اتنے، کہ بس پاک ہوگئے

اسداللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ عشق میں بہت سے صدمے برداشت کر کے ان سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔اسی لئے اسدؔ فرماتے ہیں عشق میں مجھے کافی رونا پڑتا ہے۔لیکن روتے ہوئے آنسو بہتے ہیں ان آنسوؤں کے رونے سے محسوس ہوتا ہے کہ پاک محبت میں آنسو بہانے سے کچھ نہ کچھ پایا ہے۔اگر چہ ناکامیاب ہوئے ہیں لیکن کامیابی تب محسوس ہوتی ہے جب ہمارے دل میں معشوق کا تصور ہوا اور اسی تصور سے عشق ہوتا ہے اور عشق میں کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے آنسو بہاتے ہیں۔ان آنسوؤں کو دھونے کے بعد ہمیں

محسوس ہوتا ہے کہ عشق صحیح ہے اور پاک محبت میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اگر چہ پیغام بزم کے حوالے سے مَیں یہ بحث کروں کہ اسدؔ نے مطلع میں یہ بیان کیا ہے کہ میں نے معشوق کا نغمہ اس لئے سنا تا کہ مجھے ان کے ساتھ عشق رونما ہوا اور لیکن اب جدائی کا دوران آنسو بہا کر یاد کرتا ہوں۔ اِن آنسوؤں کو بہا کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جب میں اِن آنسوؤں سے اپنے عشق کو دھوتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ معشوق سے مجھے پاک محبت تا ابد موجود رہے گی اور کبھی بھی جدائی کے ماحول میں نہیں رہوں گا۔

اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش

دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مقطع میں فرما رہے ہیں کہ جب شاعر کو عشق میں رونا پڑا اور آنسو بھی عشق میں بہا کر دھونے پڑے یہ حال دیکھ کر شاعر کہہ رہا ہے کہ مجھے اس سے بہتر ہے مرنا۔ تا کہ میری نعش کو اٹھانے والے یہ کہیں کہ یہی شاعر پاک محبت میں اپنے معشوق کیلئے جدائی پر آنسو بہا رہا تھا اور آج اس کی نعش سپرد خاک ہو رہی ہے۔ اس وقت بہت لوگ میری میت کو دیکھ کر یہی کہیں گے کہ غمناک اور المناک واردات عشق کے بنا پر ہی ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ اگر کسی دشمن نے میرے معشوق کی محبت میں دراڑ پیدا کی ہوگی وہ بھی میری میت کو دیکھ کر افسوس کریگا۔ اور افسوس کرتے ہوئے وہ بھی یہ کہے گا کہ غمناک اور المناک واقعہ معشوق کو برداشت نہیں ہو سکتا ہے۔

اگر میں پیغام بزم کے حوالے سے اس مطلع کو وابستہ کروں تو میں یہ کہوں گا کہ اسدؔ اس مقطع میں معشوق کے بارے میں اپنا رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اب اسدؔ اتنا تنگ آچکا ہے کہ معشوق کو میری میت ہی دیکھنی چاہئے تا کہ اسے یقین آئے کہ مجھے کتنا عشق کا درد اس کے دل کے بارے میں ہے مطلب میں ان سے ملنا چاہتا ہوں لیکن جب میری میت کو وہ لوگ دیکھیں گے جنہوں نے معشوق کو میری ملاقات کے لئے بہت پابندیاں عائد کی ہیں۔ تب وہ بھی میرا

حال دیکھ کر کہیں گے کہ یہ معشوق کی وجہ سے غمناک، المناک واقعہ رونما ہوا۔

میں نے پہلے یہی کہا کہ اُن دِنوں کی شاعری کے اعتبار سے اسدؔ کا مطلع اور مقطع بلند پایہ نہیں تسلیم کیا جاتا کیونکہ ان دِنوں میر تقی میرؔ جیسے شاعر بزم میں حاضر ہوتے رہے اور میرؔ کے ماحول کے مطابق شاعری بزم میں کرتے رہے۔ اگرچہ میر اس دُنیا سے چلے گئے لیکن میرؔ کا اثر شاعروں میں رہا۔ اسی لئے اسدؔ کی یہ ابتدائی شاعری کا نمونہ تسلیم کم کیا جائے گا لیکن پھر بھی آج کل کے ادبی دور میں اس سے بلند پایہ شاعری کا قلم تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

اسد اللہ خاں اسدؔ اپنے غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ میرا جو کوئی بھی زخم دیکھتا ہے تو میں اسے اپنا راز نہیں کہتا۔ اسی طرح سے جب میرا زخم نمودار ہوئے یہ زخم کسی واقعہ پر نمودار ہو سکتا ہے اگرچہ چوٹ آئے یا گر جائیں تو ضرور زخم نمودار ہو سکتا ہے اسی طرح سے اے معشوق آپ کی دراڑ سے آپ کے رویہ سے میرے زخم نمودار ہوئے اور ان زخموں کی شکل دیکھنے میں آئی۔ اب ان زخموں کو جو بھی دیکھتا ہے وہ مجھے راستے میں باتیں کرتے ہوئے ان زخموں کے بارے میں بھی بتاتے ہیں اور میں ان سے ان زخموں کی وجہ آپ کی جدائی کے بارے میں نہیں کہتا ہوں۔ یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ مجھے پاک محبت میں ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے زخم نمودار ہوئے۔ میں راستے پر ہر ایک راہ گیر کو یہی کہتا ہوں کہ اچانک زخم نمودار ہوا ایسا آپ کی جدائی یا آپ کی بے وفائی پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔

اگرچہ پیغام بزم کے حوالے سے اس غزل کے مطلع کو وابستہ کریں گے تو میں یہی کہوں گا کہ معشوق کو دیکھ کر ہی اسدؔ نے شاعری کی ہے۔ جب بزم نغمہ کو دوسری بزم میں حاضر نہیں دیکھا گیا۔ اس غیر حاضری پر ہی اسدؔ کو زخم نمودار ہوئے اب ان زخموں کو بہت سے ادیب بزم میں دیکھتے ہیں اور وہ ادب نواز دوست اس سے ان زخموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ جس

پر اسد معشوق کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا رہا ہے۔اور اپنے دل میں ہی محبت کا تصور برقرار رکھ کر کسی راہگیر اور ادب نواز دوستوں تک کو راز سے واقف نہیں کرتا۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ!
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

اسد اللہ خاں اسد غزل کے مقطع میں فرما رہے ہیں کہ میں نے جب عشق کیا اور مجھے کسی بات پر معشوق سے عشق ہوا لیکن میں نے اس معاملے میں کوئی خرید و فروخت نہیں کی۔ مطلب محبت میں خرید و فروخت نہیں ہوتی ہے بلکہ دل کے تصور کو آپس میں بسا کر محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت کی جاتی ہے۔اس لحاظ سے حسن کو بھی فروخت نہیں کیا جا سکتا لیکن حسن کو دیکھ کر ہر ایک یہی بیان بازی کرتا رہتا ہے کہ حسن قدرت کی دین ہے۔ہم قدرت کو دعویٰ نہیں کر سکتے۔لیکن اس کے باوجود کسی بھی حسن پر کوئی عاشق دل کو قابو میں نہیں رکھ سکتا ہے وہ حسن کو دیکھ کر ہی اپنے دل میں پناہ دیتا ہے۔اسی طرح سے مجھے معشوق کا حسن خواہ وہ کیسا بھی ہو پسند آیا اور میں نے اپنا دل اسے پیش کیا۔اگر چہ اس نے میرے دل کو ٹھکرایا پھر بھی میں نے پاک محبت کے اصولوں میں اپنے دل کو پیش کیا ہے۔

اگر چہ پیغام بزم کے حوالے سے اس مقطع پر بحث کریں تو ہم یہی کہیں گے کہ جب معشوق کو اسد نے بزم میں دیکھا تو اس نے معشوق کو دور سے ہی دیکھا لیکن دور سے دیکھ کر بھی معشوق کے ساتھ اسد نے اپنا دل عمر بھر کے لئے پیش کیا اور اسی پیشکش کی وجہ سے اسد نے بہت سے دکھ برداشت کئے اور مرتے دَم تک پاک محبت میں اپنے دل کو معشوق کے دل کے ساتھ برقرار رکھ کر تا ابد پیش کیا۔

ادبی لحاظ سے اگر اس غزل کے مطلع پر بحث کریں گے تو ہم یہی کہیں گے کہ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کم پڑھنے میں آتے ہیں۔مانتے ہیں کہ اس میں لفظ راہ بھی ہے، سخن بھی ہے اور فروغ شمع کے الفاظ بھی ہیں لیکن پھر بھی اُردو کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔اسد نے

بہت سے شعر لفظ زخم پر ہی لکھے ہیں لیکن میں نے اولاً اس کتاب میں لفظ زخم کے بارے میں پڑھنے والے کو بتایا ہے کہ لفظ زخم کو کیوں شاعر نے استعمال کیا ہے۔ زیادہ تر الفاظ زخم اور بزم کو شاعر نے اپنی غزلوں میں استعمال کیوں کیا ہے۔ اسی لئے کہ اسے معشوق کا صدمہ عشق میں رونما ہوا ہے۔

مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے
موج شراب، یک مژۂ خواب ناک ہے

اسداللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ مجھے شراب خانے میں جانا پڑا۔ کیوں جانا پڑا۔ کیونکہ مجھے اپنے عشق میں کامیابی نہ ہوئی۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنی پاک محبت الگ کرنی پڑی۔ لیکن میں معشوق کو نہیں بھول سکتا ہوں اسی لئے میں اس کی یاد اپنے دل میں رکھ کر مستی میں رہتا ہوں۔ مستی میں اتنا رہا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ میں راستے میں کس طرف چلتا ہوں اور کس طرف سے مجھے چلنا ہے اتنی مستی میرے دماغ میں رونما ہوئی۔ اس مستی کو دور کرنے کے لئے مجھے ساقی نے گذارش کی کہ آپ کی مستی الگ ہو سکتی ہے جب آپ موج شراب کا استعمال کرو گے۔ اور اپنے معشوق کو دل سے دور رکھو گے۔ لیکن میں نے سوچا کیا ساقی نے یہ سچ بات کہی تو میں نے شراب استعمال کی اور میں چند لمحات کے لئے معشوق کی یاد سے دور رہا۔ لیکن مجھے ایسی بدعت ساقی نے دی جس سے میں دوسرے دن بھی ایسی مستی میں رہنے کیلئے ساقی کے پاس گیا اور موج شراب استعمال کی۔ مطلب مجھے پاک محبت میں اپنے محبوب کی یاد ہمیشہ دل میں رہتی اور اس برقراری کو چند لمحات کے لئے شراب پی کر ہی دور رکھتا ہوں ورنہ اگر ایسا خیال چوبیس گھنٹے برقرار دل میں رہے گا تو میں مستی سے نادان پن میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔

اگر چہ میں پیغام بزم کے دائرے میں اس مطلع کا بحث کروں تو میں یہی کہوں گا کہ شاعر نے معشوق کو کبھی نہیں اپنے دل سے دور کیا۔ ہاں جب اسے زیادہ یاد معشوق کی دل میں آئی تو

اس وقت پاگل پن جیسا محسوس ہونے لگا۔ اس پاگل پن کو دور کرنے کیلئے موج شراب استعمال کی ہے۔ مطلب اپنی محبت برقرار رکھنے کیلئے کیسے کیسے صدمے شاعر کو اٹھانے پڑے۔

جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ!

صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ مجھے ایسے صدمے پہنچنے پر معشوق کا اعتبار ہی نہیں رہا لیکن میں نے صدموں کو دل میں برقرار رکھا اور کبھی بھی معشوق کو اپنے دل سے باہر نہیں رکھا۔ اسی لئے مقطع میں اسد فرما رہے ہیں کہ مجھے پاک محبت میں اپنے معشوق کی یاد میں جنونی کیفیت ہوئی۔ مطلب میرا خون گرم محسوس ہونے لگا اور میں یہی چاہتا ہوں کہ میں اس وقت معشوق سے ملوں لیکن مل نہیں سکتا۔ اسی حال میں رہ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ایسی سوچ سے معشوق کی آنکھوں نے کوئی جادو تو نہیں کر دیا ہے۔ مجھے اس کی یاد سے جنون پیدا ہوتا ہے اور میں اسی وقت نادان پن میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیا ان کی آنکھوں نے مجھ پر کوئی جادو تو نہیں کیا ہے یہ سوچ کر اسدؔ فرما رہے ہیں کہ عشق کے معاملے میں اور عشق کے ماحول میں اُتار چڑھاؤ دیکھ کر معشوق یہی سوچتا ہے کہ محبوب نے میرے دل یا میری آنکھوں پر کوئی جادو کیا ہے۔ جس کی وجہ سے نادان پن محسوس کرتا ہوں۔

اگرچہ پیغام بزم کے حوالے سے میں یہ لکھوں کہ اسدؔ نے صاف بتایا ہے کہ جب میں نے معشوق کو کسی بزم میں دیکھا تو اسی وقت مجھ پر اس کی آنکھوں نے جادو کیا جس جادو کی وجہ سے مجھے اس کی یاد سے آنکھوں میں جوش وولولہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس جوش کو محسوس کر کے یہی سوچتا ہوں کہ معشوق نے مجھے دغا دی۔ پھر یہ سوچتا ہوں کہ اسے احساس ہونا چاہئے آخر ہمیں مٹی میں ہی دفن ہونا ہے۔ مطلب مشت خاک میں ہی اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔

اسدؔ نے اس غزل کے مطلع اور مقطع میں بیان کیا ہے کہ میں شراب پینے کے لائق نہیں ہوں لیکن کسی کمزوری کی وجہ سے میں شراب استعمال کرتا ہوں۔ یہ ایک تاریخی مصرعہ تصور کیا

جائے گا جس کے پڑھنے سے ہمیں یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ان دنوں لوگ شراب کے خلاف ہی مہم اٹھاتے رہے۔ لیکن پھر بھی شراب کا استعمال کیا کرتے تھے۔ دوسری بات ان دِنوں لوگوں میں پاک محبت کے اصول ہی دل میں برقرار رہے۔ اس کی وضاحت میں اس طریقے سے کرتا ہوں کہ جب معشوق کے ساتھ اسدؔ کا واسطہ رہا تو اس نے غزلوں میں ان کی تعریف لکھی ان کے حالات بیان کئے لیکن چھیڑ خانی نہیں کی۔ جس سے کہ ہم یہ کہیں گے کہ ان دنوں کے لوگوں میں پاک محبت کے اصول رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے چھیڑ خانی اور بدامنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

جس جا نسیم شانہ کش زُلفِ یار ہے
نافہ، دماغِ آہو دشتِ تتارے

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ ہر ایک چیز میں ہر ایک بات میں ہر ایک لہجہ میں قسمت کو دہرایا جاتا ہے۔ مطلب جس کسی کا بھی نصیب اچھا ہو یا برا ہو اس کو کسی محفل میں یا کسی جگہ یا کسی یار دوست کے پاس دہرایا جاتا ہے اور دہرا کے محفل میں بحث کیا کرتے ہیں۔ عام طور پر بحث میں یہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ سب یہی کہتے ہیں اپنا اپنا نصیب خدا کے رحم و کرم پر۔ اسی طرح سے شاعر فرماتا ہے کہ اگرچہ میرے معشوق کی زلفیں بہت ہی اچھی ہیں لیکن ان زلفوں کو دیکھ کر عاشق بہت ہی خوش رہتا ہے اس کا دل انہیں زلفوں پر قابو میں نہیں رہتا ہے اور محبوب کا عاشق تصور کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ معشوق اور محبوب یہ نہیں سوچتے کہ زلف دیکھنے سے ہی عشق ہے حسن ہے یہ غلط بات ہے۔ شاعر فرماتا ہے کہ ہمیں دماغ کا رجحان بھی دیکھنا چاہئے کہ محبوب اور معشوق کا دماغی رجحان کیا ہے۔ بول چال کیسی ہے یہ نہ سوچنا کہ زلفوں سے ہی عشق کیا جائیگا یہ غلط بات ہے۔ اسی لئے شاعر فرماتا ہے کہ کئی بار لوگ مجھے اپنے اپنے معشوق کا تصور کہتے ہیں وہ زلفوں کا ہی ذکر زیادہ بحث میں کیا کرتے ہیں لیکن میں زلفوں کا تصور ہی دل میں یا عشق میں نہیں رکھتا بلکہ میں دماغی توازن

اچھے خیالات معشوق کو دیکھ کر معشوق کو پرکھ کر محبوب کی صورت میں تسلیم کرتا ہوں۔ اسی لئے شاعر فرماتا ہے کہ اگر کوئی یہ فرمائے کہ محبوب کی زلفیں بہت ہی اچھی ہیں لیکن میں انہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زلفوں سے عشق کرنے میں توازن رکھنا چاہئے بلکہ اچھے ربط وضبط کے اصولوں پر عاشق بننا چاہئے۔ ہاں زلف ہے لیکن اگر میرے معشوق میں ایسی زلف نہیں میں اس وقت خدا سے رجوع ہو کر یہی کہتا ہوں کہ یہ قسمت کی بات ہے اس کی قسمت میں ایسی ہی زلفیں خدا نے بخشی ہیں۔

پیغام بزم کے حوالے سے میں اگر اس مطلع پر بحث کروں تو میں یہی کہوں گا کہ اسدؔ کو کئی لوگ معشوق سے نفرت کرنے کے لئے اور اسکی زلفوں کے بارے میں باتیں بتا رہے تھے مطلب ممکن ہے کہ معشوق کی زلفیں اچھی نہیں ہوں اور لوگ اسدؔ کو نفرت کرنے کے لئے یہی بتا رہے تھے کہ کس سے پیار کرتے ہو جبکہ اس کی اچھی زلفیں نہیں ہیں۔ لیکن اسدؔ ان کی باتیں سن کر یہ کہتا کہ مجھے زلفوں کا تصور دل میں نہیں رکھنا بلکہ مجھے معشوق کا لہجہ پسند آیا جسے دل میں رکھنا ہے۔ جس کی وجہ سے میں اس کا معشوق بن بیٹھا۔

ممکن ہے کہ معشوق کئی بیماریوں کا شکار بھی ہوئی ہوگی اسی لئے اس کے گھر والوں نے گانے بجانے یا گانا تحریر کرنے کے لئے دباؤ ڈالا ہوگا تاکہ وہ بیماریوں سے نجات پائے۔ اسی لئے اس غزل کے مطلع سے ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ان دنوں لوگوں نے اس کی بیماری کی وجہ سے اسدؔ سے نفرت کرنے کا رجحان بھی رکھا لیکن اسدؔ معشوق سے دور نہیں ہوا۔ وہ معشوق کی بیماری پر بھی عاشق بنا۔ جدائی کی وجہ سے بیماری میں مبتلا ہوئی۔

غفلت، کفیل عمر و اسدؔ ضامن نشاط
اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرمارہے ہیں کہ میری معشوق سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے زلفوں کا تصور ہی نہیں بلکہ مجھے معشوق کی دانائی کا تصود پاک محبت میں قائم ودائم

ہے۔زلف قدرت کا دین ہے،قدرت کس طرح کی زلفیں کس کو عطا کرے وہ قدرت کا ذمہ ہے۔لیکن میری معشوق سے کوئی بھی ملاقات نہیں ہوئی۔اب میری خوشی غم میں مبتلا ہو رہی ہے کیونکہ جب میں اپنی عمر کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بوڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔اسی لئے میں اب موت کے سائے میں بیٹھا ہوں۔اب اگر معشوق مجھ سے ملاقات بھی کرے تو کیا فائدہ ہے جب جوانی کے دور میں معشوق سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔اسی لئے اگر غفلتاً معشوق سے ملاقات ہو ہی جائے تو اس وقت میں یہی اظہار اپنے معشوق سے کروں گا آپ مجھے جوانی میں دکھائی ہی نہیں دیں اب بوڑھاپے میں بھی انتظار کرتا رہا لیکن میں نے پاک محبت برقرار رکھی۔آخر میں یہی کہوں گا کہ اب نشاط کو ویرانی میں دیکھتا ہوں۔اب موت کا انتظار ہے لیکن فائدہ کچھ بھی نہیں پھر بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ بوڑھاپے میں بھی ملاقات ہوئی مطلب میں اپنی محبت میں کامیاب رہا۔

اگرچہ غزل کے مقطع کو پیغام بزم کے حوالے سے بیان کروں تو میں یہی کہوں گا کہ جب اسدؔ کی معشوق سے ملاقات نہیں ہوئی بلکہ کسی بزم میں دیکھا۔بزم میں گانا گا رہی یا گا نا سنا رہی ہے وہ اسدؔ کو ہی معلوم ہے لیکن اتنے طویل وقت کے باوجود اسدؔ کو معشوق سے ملاقات ہوئی ہی نہیں۔تبھی تو فرماتے ہیں کہ غفلتاً اگر معشوق سے ملاقات ہو ہی جائے تو میں اس وقت انہیں یہ کہوں گا کہ اب جو نشاط ہے وہ برباد ہوا۔اب موت کے پنجے میں زندگی بسر کر رہا ہوں اور انتظار کرتے ہوئے بوڑھاپے کا دور آیا۔پھر بھی آخر میں معشوق کو شکریہ ادا کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ میں پاک محبت میں کامیاب ہوا ہوں۔

فیض سے تیرے ہے، اے شمع شبستان بہار
دل پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

اسداللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ اے معشوق مجھے کوئی بھی فائدہ اب نہیں ہے کیونکہ اب بہار کا موسم ختم ہوا اور جن دنوں آپ سے ملاقات ہونی چاہئے تھی ہوئی ہی

نہیں لیکن آپ کے انتظار میں اتنا غمگین رہا کہ میں نے شبستان بہار جیسی کتاب تحریر کی ہے۔
مطلب اب انتظار کرتے ہوئے مجھے بہار کے دنوں میں ملاقات ہوئی، ہی نہیں جن دنوں میرا
دل ایک شمع کی طرح دکھائی دے رہا تھا اور اس وقت جلتی ہوئے شمع پر پروانے کی طرح آپ
کو اس آگ کا مزہ چکھنا چاہیئے تھا چکھا ہی نہیں۔ شمع کی صورت میں نہیں بلکہ بلبل کا تصور
کرتے ہوئے آپ نے مجھ سے بہار میں ملاقات ہی نہیں کی۔ جن دِنوں میں ایک اچھا گانا
گاتا رہا اور میرے گانے سے سب لوگ عشق کیا کرتے تھے۔ اسی لئے جب ملاقات ہی نہیں
ہوئی تو فائدہ کیا ہے تیری اس روشنی کا اسی لئے میں آپ کی اس جدائی پر ''شبستان بہار'' جیسی
کتاب میں حالات بیان کرتا ہوں۔

اگر پیغام بزم میں میں اس مطلع کو لکھوں تو میں یہ صاف کہوں گا کہ اسدؔ نے معشوق کو
ایک بار حاضر دیکھا اور اسد بار بار کئی بزموں میں حاضر ہوکر معشوق کو غیر حاضر دیکھا۔ اسی لئے
اس کی محبت پر اسدؔ نے ''شبستان بہار'' کا مجموعہ لکھا جس میں اسدؔ فرماتا ہے کہ اب مجھے معشوق
کا فائدہ ہی نہیں کیونکہ میں عمر بھر ایک جلتی ہوئے شمع کی طرح انتظار کرتا رہا جس پر کئی پروانے
دیکھے، انہوں نے اپنے آپ کو جلتی ہوئے شمع پر زندہ جلایا۔ اگرچہ معشوق جلتی ہوئی شمع کا تصور
نہیں تسلیم کریں گے پھر بھی انہیں میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اسے بلبل کے تصور پر میری قربت کا
احساس ہونا چاہیئے کیا اس نے بلبل کا گانہ نہیں سنا، اگر اس نے بلبل کا گانا سنا ہوتا تو اس کے
دل میں ضرور کشش پیدا ہو جاتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اتنے طویل وقت کے بعد بھی ملاقات ہی
نہیں ہوئی۔ میں نے ان کی جدائی پر شبستان بہار کا مجموعہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ معشوق کو پڑھ
کر محسوس ہو جائے گا کہ کتنی غزلیں، کتنے نغمے معشوق کی جدائی پر تحریر کیئے ہیں۔

دیدہ تا دل اسدؔ! آئینہ یک پر تو شوق
فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرما رہے ہیں کہ میں نے اگرچہ دیدار معشوق کا نہیں

کیا ہے پھر بھی اپنا دل پیش کیا ہے میں نے اس کا دل ایک آئینہ جیسے اپنے دل میں سنبھال کر رکھا ہے میں صبح سویرے اپنا منھ اس آئینے کو دیکھ کر ہی دن گذارتا ہوں۔ مطلب مجھے اس کا دل اپنے دل میں برقرار ہے لیکن اب فائدہ ہی کچھ نہیں ہے جب معشوق سے ملاقات ہی نہیں، میں نے بہت سے خط قاصد کے ذریعے بھیجے لیکن قاصد نے خط معشوق کے حوالہ کیے ہیں معلوم نہیں۔ وہ بھی میرے خیال میں مستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ مطلب شاعر کا صاف کہنا ہے کہ مجھے اتنی محبت دکھانے کے باوجود معشوق کے ساتھ ملاقات ہوئی ہی نہیں اور نہ میں نے اس کا دیدار کیا ہے۔ اب فائدہ ہی نہیں کیونکہ قاصد کے ذریعے کوئی بھی خط وکتابت موصول نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے میں اس کی مستی میں کتنی دیر تک انتظار کروں۔

اگرچہ پیغام بزم میں غزل کے مطلع پر بحث کریں تو میں یہی کہوں گا کہ آسد کو جب معشوق سے ملاقات ہی نہیں ہوئی ان کے گھر والوں نے اس پر کئی پابندیاں عائد کیں اس کے باوجود آسد کسی نہ کسی طریقے سے معشوق سے ملنا چاہتا تھا لیکن نہیں مل سکا۔ جب وہ ملاقات کرنے میں ناکام ہوا تو اس نے جدائی پر بہت سے شعر ایک کتاب میں تحریر کئے اور اب اس کتاب کو معشوق کو پڑھنے کے لئے بھیجنا چاہتا ہوں۔ اور اس کتاب کا نام ''شبستان بہار'' رکھا ہے لیکن اب یہ سوچتا ہوں کہ یہ کتاب بھی اس کو نہیں پہنچ سکتی ہے۔ کیونکہ مجھے قاصد کے ذریعہ کوئی خط وکتاب موصول نہیں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا کیا فائدہ ہے۔

اگرچہ ادب کے حوالے میں لکھوں تو میں یہ کہوں گا کہ آسد نے شبستان بہار کتاب شعر میں نہیں لکھی ہے ''شبستانِ بہار'' کا مطلب یہ ہے کہ بہار موسم میں کسی سے ملاقات نہیں ہوئی اور جدائی میں رہ کر کتاب لکھی جو کہ سرائے میں بیٹھ کر بہار کے موسم میں لکھی اور اس زمانے میں بہت سے پھول اُگتے ہیں اسی لئے ''شبستانِ بہار'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگر میں یہ بھی کہوں کہ بہت سالوں پہلے تعلیمی اداروں میں ایک اُردو کتاب رائج کی گئی جس کتاب کا نام ''شبستان بہار'' تھا اور اس کتاب کو سب پڑھتے تھے۔ ممکن ہے کہ جس ادیب یا ادارے

نے اس کتاب کا نام تحریر کیا ہوگا اس نے اسؔد کے اسی مصرعے پر تحریر کیا ہوگا۔ اگر چہ اس کتاب میں اسؔد کی شاعری کے بارے میں کچھ بیان بازی نہیں ہے لیکن عنوان اسؔد کے اس مصرعے سے چنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اسؔد نے اپنے دور میں یہ بھی سوچا ہوگا کہ میں غزل کا مجموعہ عوام تک پہنچاؤں تو اس مجموعہ کا عنوان ''شبستان بہار'' رکھوں لیکن اقتصادی بدحالی کی وجہ سے نہیں چھپوا سکا ہوگا یا معشوق کی بدنامی پر اعتراض سرکاری طور پر کیا گیا ہوگا۔ لیکن میری سوچ میں اسؔد کو اپنا کلام شبستان بہار کے نام سے بھی چھپوانا تھا لیکن ممکن نہیں ہوسکا۔ کئی کہتے ہیں کہ اسؔد کے نام پر شاعری کا مجموعہ جل گیا ہے جو کہ دستیاب نہیں ادبی حلقوں میں ہے۔ میرے خیال میں اسی مجموعہ پر یہی عنوان اسد نے تحریر کیا تھا لیکن کئی ناسازگار حالات کی وجہ سے نہیں چھاپا گیا۔

مانتے ہیں شبستان بہار سرائے کو کہتے ہیں لیکن سرائے میں بیٹھ کر شاعر کو موسم بہار محسوس ہوتا ہے کیونکہ وہاں ٹھہرنے سے بہت آدمیوں سے ملاقات ہوتی ہے لیکن شاعر سرائے کا جوابِ دعویٰ کہہ رہا ہے کہ گلستان میں بیٹھ کر بھی بلبل کے نغموں سے دل فیضیاب ہوتا ہے۔ اگر گہرے انداز سے سوچا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ شاعر خود کہہ رہا ہے کہ مجھے سرائے میں بیٹھ کر موسم بہار محسوس ہوسکتا ہے کیونکہ میں نے بہت سارے بلبل کے نغمے گلستان میں سنے۔ میں گلزار کو دیکھ کر دل سے خوش نہیں رہا۔ اسی لئے شبستان بہار مطلب رات بھر سرائے میں ٹھہر کر موسم بہار کا تصور دل میں آسکتا ہے۔

اب میں دعویٰ سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسد کو معشوق کے تعلقات پر گھر میں بہت ہی ستایا جاتا تھا کیونکہ جو لفظ غزل کے مطلع میں شبستان بہار پڑھتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ گھر میں اسؔد سکون سے نہیں بیٹھتا ہے کیونکہ گھر والوں کو معلوم ہوا ہے کہ اسؔد نے معشوق کے ساتھ تعلقات رکھیں ہیں۔ اس پر گھر کے سب لوگ اسؔد پہ ناراض رہے اسی لئے اس شعر میں یہی کہتا ہے کہ اب کیا فائدہ ہے مجھے گھر میں بیٹھنے کا کیونکہ معشوق کے ساتھ تعلقات ہونے پر مجھ سے گھر والے ناراض ہیں۔ ہاں اگر میں سرائے میں رات کاٹوں وہاں شمع جلاؤں اور

اکیلے بیٹھ کر مجھے محسوس غم ہو جائے گا لیکن سرائے میں شمع جلا کر اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے ہوں گے۔ اسی لئے میں سرائے میں ہی ٹھہروں گا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہا ہے کہ میں وہاں پر بہار جیسا لطف اٹھاؤں گا کیونکہ میں نے آج تک بہت سے چراغاں دیکھے اور بلبل کا نغمہ بھی سنا۔ باغ میں بیٹھا لیکن معشوق کے تناؤ کی وجہ سے مجھے گھر میں بہت ہی ستایا گیا ہے اسی لئے میں سرائے میں بیٹھ کر موسم بہار میں مصروف رہوں گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسدؔ نے اسد کے نام پر کوئی کتاب چھپوانے کی کوشش کی تھی ممکن ہے کہ اسدؔ نے اپنے کلام چھپوانے کے وقت کلام کا عنوان 'شبستانِ بہار' رکھا ہوگا کیونکہ خود اسدؔ فرما رہا ہے کہ مجھے غم ہی غم محسوس ہوا ہے کیوں نہ میں اس غم کو دور کرنے کے لئے اپنے کلام کا مجموعہ چھپواؤں۔ جس مجموعہ کا عنوان 'شبستان بہار' رکھوں۔ ممکن ہے اسدؔ نے اسدؔ کے نام پر کلام اسی عنوان پر رکھا ہوگا۔ کیونکہ بہت سارا مواد اسدؔ کا ملتا ہی نہیں صرف دیوان غالب ہی واحد ایک کتاب ہے جو کہ عالم میں دستیاب ہے۔ میرے خیال کے مطابق اسدؔ کا ارادہ معشوق سے پاک محبت پر مجموعہ چھپوانے کا رہا جس مجموعہ کا عنوان 'شبستان بہار' رکھا ہوگا۔ باقی تاثرات مختلف محقق ہی بتا سکتے ہیں۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ ہمیں کوئی افسوس ہی نہیں ہے اگر چہ ہم مکمل طور پر آزاد نہیں ہیں لیکن ہم نفس کے اعتبار سے آزاد ہیں۔ مطلب ہم خود معیار کے مطابق خوراک کھا سکتے ہیں کھانے پینے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ مطلب نفس کو قابو میں رکھنا لیکن جب نفس قابو میں نہیں رہتا ہے تو ہماری صحت کو بیماری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جب کسی وقت ہم جلوہ دیکھتے ہیں اور جلوہ دیکھنے سے روشنی پیدا ہوتی ہے لیکن روشنی دیکھ کر ہی ہم کہتے ہیں کہ شمع جیسے دیکھ کر یا ایک بجلی کی روشنی دیکھ کر ہم حیران ہوتے ہیں۔ دیکھ کر ہم یہ تبصرہ

کرتے ہیں کہ ہم غمگین تھے ہمارے دل میں ماتم چھایا تھا لیکن جب جلوہ روشنی کا دیکھتے ہیں تو ہم ماتم کو ختم کرتے ہیں۔اسی طرح سے شاعر فرماتا ہے کہ اے معشوق جب ہم محبت میں نفس کو قابو میں رکھیں گے تو ہم ایسے جلوہ نہیں دیکھیں گے اور نہ ہم حیران ہوسکتے ہیں ہمیں اپنی صحت کو قابو میں رکھنا چاہئے۔اسی طرح سے ہمیں اپنی پاک محبت کو بھی قابو میں رکھنا چاہئے۔ یہ نہ کہ کوئی ایسا جلوہ دیکھنے میں آئے اور دیکھ کر لوگ تبصرہ کریں گے وہی تبصرہ ہمارے راز کو فاش کریگا۔اسی لئے اے معشوق جب بھی ہم جلوہ دیکھتے ہیں جلوہ دیکھ کر ہمارے دل کس سوچ میں ڈوبے ہوتے ہیں کئی ماتم کی سوچ میں کئی خوشی کی سوچ میں لیکن جلوہ دیکھ کر ہی ہم حیران ہوکر اپنے خیالات کو مرکوز کر کے اسی تبصرہ پر پانچ چھ منٹ گزارتے ہیں۔اسی لئے میں معشوق سے التماس کرتا ہوں کہ کبھی بھی غم میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے اور آزاد طریقے سے اپنا کام کرنا چاہئے۔نفس کو قابو میں رکھنا چاہئے۔

اگر چہ میں اس مطلع کو معشوق کے ساتھ وابستہ کروں تو میں یہ کہوں گا کہ شاعر معشوق کو نہ دیکھنے کی وجہ سے اور کسی بھی بزم میں غیر حاضر ہونے سے اسدؔ فرماتے ہیں کہ مجھے کوئی بھی غم محسوس نہیں ہوتا ہے۔میں بالکل دور غم کو رکھتا ہوں۔کیونکہ کسی نہ کسی وقت معشوق کسی بزم میں حاضر ہو جائے گی اس وقت میں برق سے کہوں گا کہ آپ کی روشنی شمع کی روشنی سے بھی اوپر ہے۔اسی لئے آپ کی روشنی سے میرے معشوق کا غم دور ہوا اور میرا دل آپ کی روشنی سے مرکوز ہوکر غم کو دور کر کے آپ کی ہی روشنی پر سوچ میں ڈوبا۔مطلب اسدؔ فرما رہے ہیں کہ معشوق کے حاضر ہونے سے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے میں غلامی میں رہنے کے خیالات نہیں رکھتا ہوں میں آزادوں کی طرح اپنے خیالات دل و دماغ میں برقرار رکھتا ہوں۔لیکن ماحول جو ہے وہ غمگین ہے ہر ایک ماتم خانہ سمجھ کر برق کی روشنی کو بھی شمع کی روشنی کی طرح نہیں تسلیم کرتا ہے اسی لئے اے معشوق اس دنیا میں اگر ہم آئے بھی ہیں لیکن آزادوں جیسا خیال موجود نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس غم کا سامان میسر ہے اسی لئے ہم غم کے خانے کو ماتم میں تبدیل کر کے

برق سے کہتے ہیں کہ روشنی آپ کی شمع کی طرح تصور نہیں کرنے والے ہیں۔

اگر ادبی لحاظ سے غزل کے مطلع پر بحث کریں تو ہم یہی کہیں گے کہ ان دنوں شخصی راج کا ماحول تھا شخصی راج ہونے کے ناطے ممکن ہے اسد نے آزادوں کا لفظ استعمال کیا ہوگا اور آزادوں کے لفظ سے ہی نفس کا استعمال کیا ہوگا۔ اسی طرح لفظ برق کا بھی استعمال کیا ہوگا۔ وہ یہ جب ان دنوں شاعر مختلف بزم میں حاضر رہے تو وہ حکومت کے خلاف کچھ نہیں بول سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اسدؔ نے یہ کہا ہوگا کسی شاعر سے کہ آپ کیوں اپنا مواد بزم میں کہنے سے ڈرتے ہو۔ اس میں کوئی غم نہیں کہ آپ کو آزادوں کے خیال کی طرح اپنی نظم یا غزل کو بزم میں کہنی چاہئے۔ ممکن ہے کہ اسدؔ نے آزادوں کا لفظ اسی لئے استعمال کیا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا ہوگا کہ ہمیں آزادوں کے خیال سے ہی ایسی روشنی دیکھنی ہے کہ وہ برق جیسی نہیں ہونی چاہئے وہ روشنی ماتم خانہ جیسی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اُس وقت کے دور میں اسدؔ نے شخصی راج کا حوالہ اسی طریقے سے بتایا ہوگا اور یہ بھی کہا ہوگا کہ یہ جو روشنی ہے یہ ہم آزادوں کے جذبات سے نہیں دیکھتی ہے بلکہ ماتم خوانی میں مرکوز کرتے ہیں۔ اسی لئے اسد نے اس شاعر کو بتایا ہوگا کہ آپ اپنا کلام آزادوں کے جذبات کی طرح ہی کہہ سکتے ہو اس میں کونسی روک تھام ہے۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ!

جانتے ہیں سینہ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

اسد اللہ خاں اسد غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ میں نے معشوق کو بتایا کہ شمع کی روشنی اصلی روشنی نہیں ہے اصلی روشنی دِن کی روشنی ہے، رات کو گزارنے کے لئے شمع جلانی پڑتی ہے اور اس روشنی میں کوئی کام کرتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں اس روشنی سے غم محسوس ہو کر آزادوں کے جذبات محسوس نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس روشنی سے ہم اپنے آپ کو غلام تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے اے معشوق مکمل طور پر ہمیں تمنا کے جذبات موجود رکھنے ہیں۔ اور تمنا کو پورا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی بہت ساری تمنائیں دل میں موجود رہتی ہیں لیکن ایک یا

کوئی بھی تمنا پوری نہیں ہوتی۔اسی لئے اسدؔ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بھی تمنا پوری نہیں ہوتی تو ہم کہتے ہیں کہ ان تمناؤں کو زندہ دفنانا چاہئے۔دفن کر کے ہمیں کسی تمنا کا جذبہ قائم ودائم نہیں رہے گا۔اب شاعر مطلع کے مطابق یہی کہہ رہا ہے کہ جب آزادوں کے خیال ہیں ہی نہیں تو تمنائیں کیسے پوری ہوسکتی ہیں کئی جذبات حکمرانوں کے ذریعہ مکمل ہونے چاہئیں۔جو کہ مکمل نہیں کرسکتے ہیں۔مطلب بہت ساری تمنائیں حکمرانوں کے ذریعہ بھی پوری ہوسکتی ہیں اسی لئے غلامی کے جذبے میں رہ کر اس شخصی راج میں ہم ان تمناؤں کو زندہ دفنا کر عمر بھر کے لئے دور رہیں گے اور آزادوں کے جذبات کے تحت زندگی گزاریں گے لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوجائے گا کہ شخصی راج میں تمنا حاکموں کے ذریعہ پوری نہیں ہوسکتی۔اب شاعر کا مطلب یہی ہے کہ اے معشوق میں کوئی ایسا کام نہیں کرسکتا ہوں جس سے کہ مجھے کوئی سزا مل سکتی ہے۔کیونکہ قانون میں رہ کر ہی مجھے آپ کے ساتھ پاک محبت کا راستہ اپنانا ہے۔

پیغام بزم میں اس مقطع پر یہی کہوں گا کہ معشوق کے ساتھ دراڑ ہونے کی وجہ سے اسدؔ کو بہت سے غم برداشت کرنے پڑے۔اب ہمیشہ کے لئے اس غم کو ختم کرنے کے لئے یہی کہہ رہا ہے کہ مجھے معشوق سے کوئی بھی ملاقات ہوئی ہی نہیں۔اسی لئے اس شخصی راج میں مجھے پاک محبت میں آزادوں کے جذبات کے تحت کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔مجھے ہر کام قانون کے تحت ہی کرنا ہے۔اسی لئے اسدؔ فرماتے ہیں کہ مجھے معشوق کے جذبات اور تمنا کو اپنے دل میں قائم ودائم رکھ کر ان کی ملاقات کا جذبہ ہمیشہ کے لئے الگ رکھنا چاہئے اور الگ رکھ کر ہی میں غم میں مبتلا رہوں گا لیکن اس غم کو دفن کر کے جذبات قانون کے تحت رکھوں گا۔

اگر میں یہ کہوں کہ لفظ دائم میں اسدؔ نے ہمیشہ کے لئے پاک محبت کا ذکر الگ کرنے کو چاہا لیکن دوسرے طریقے سے یہ بھی کہا ہے کہ مجھے معشوق کے جذبات کو قائم رکھنے ہیں اور میں ان جذبات کو قائم رکھوں گا دوسرے طریقے سے یہ بھی کہتا ہے کہ غم کو زندہ دفن کرنا چاہئے اس کا مطلب یہی ہے کہ شاعر اپنے جذبات مختلف طریقے سے بیان کر کے ایک ہی لہجہ میں

دل پر قلم کو اختیار نہیں دیا جاتا بلکہ شاعری کا جذبہ ابھارنے کیلئے کئی کئی فلسفی طرز کے شعر لکھتا ہے۔ اسی لئے بہت سے تنقید نگاروں اور محققین نے یہ کہا ہے کہ شاعر کے جذبات ایک ہی طریقے کے نہیں پڑھنے میں آئے۔ اسی لئے اسدؔ کا جذبہ بھی ایسا ہی میں کہہ سکتا ہوں۔

جز قیس، اور کوئی نہ آیا بروے کار
صحرا، مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں کہ آج تک میرا معشوق کسی کام اور کسی جذبات سے متاثر نہیں رہا مجھے ہی دیوانہ بنا کر جذبات ابھارنے کے لئے کہا۔ اس کے برعکس معشوق نے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کیا۔ بہت سے مسئلے جوں کے توں رہ کر پاک محبت میں دراڑ پیدا کی۔ اسی لئے میں ان جذبات کو ٹھیس پہنچانے پر یہی کہوں گا کہ کوئی ایسا فریق میرے معشوق کے ساتھ ملا ہوا ہوگا یا اس پر کوئی جادو کیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ میرے بہت سارے مقاصد پورے نہ کر سکا حتی کہ مجھے اپنی پاک محبت کے جذبات پر رونا آتا ہے۔ اس سے ہمیشہ صحرا کے طریقے سے یہی کہتے ہوں گے کہ اب محبوب کا خیال ہی الگ کرو۔ ان خیالات کو الگ کرنے کے لئے یہی کہو وہ معشوق تھا۔ تعریف کرو لیکن کیا میں یہ سن کر یہی کہوں کہ میں اس کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ میں نے بہت سی غزلیں لکھیں میں نے ان غزلوں کو اس طرح سے تحریر کیا کہ لوگ پڑھ کر یہی کہیں گے کہ معشوق ہے۔ وہ معشوق تھا کا جذبہ الگ کریں گے لیکن میرے معشوق کو مجھ سے الگ کرنے کا جذبہ تھا کا لفظ تسلیم کرنے کے لئے کہا کرتے ہیں لیکن ان جذبات کو ابھارنے کیلئے کسی نے جادو کیا ہوگا اور مجھے پورا یقین ہے کہ لفظ 'تھا' کو رد کر کے لفظ 'ہے' موجود رکھیں گے۔

اگرچہ پیغام بزم میں میں یہی کہوں کہ معشوق کے ساتھ وابستگی الگ اسدؔ کو دیکھنے میں آئی۔ اسی لئے شاعر نے لفظ 'تھا' کا استعمال کیا ہے اور یہی کہا ہے کہ جب میں کسی بھی وقت معشوق کو کسی جگہ دیکھوں میں اس وقت زمانے حال کا جذبہ، زمانہ فعل کے جذبے سے تسلیم

کروں گا۔ اگر چہ مجھے معشوق کے ساتھ راستے یا بزم میں ملاقات ہو ہی جائے گی تو میں اس وقت یہی کہوں گا کہ کوئی ایسا جادو کیا گیا جس سے معشوق کا جلوہ میرے دل کے بارے میں الگ کیا گیا۔ اور میں اس جدائی پر روتا ہوں۔ جدائی میں مجھے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ معشوق تھی کیا مجھے معشوق ہے کا لفظ نہیں کہنا ہے کیونکہ وہ کسی دوسرے معشوق کے ساتھ اپنے تعلقات قائم و دائم رکھتی ہوگی۔ اس کا مطلب اس کی کسی اور کے ساتھ شادی کی ہوگی۔

یا یہ بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ جب کئی جذبات میں معشوق کو کسی بزم میں حاضر ہونے کے لئے گھر والوں نے روک تھام کی تو وہ اپنے آپ یہی سوچتی ہوگی کہ مجھے شاعر کی پاک محبت پر گھر والوں نے پابندی عائد کی اور میں اس سے کسی بزم میں نہیں مل سکتی۔ اسی لئے میں الگ ہو کر یہی کہوں گا کہ پاک محبت کا اصول ہے لیکن بند کمرے میں اور قید خانے میں رہ کر اور کسی کے ساتھ تعلقات رکھنے پر مجھے اسے دل میں الگ رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دل میں بھی ان کا جذبہ قائم و دائم رکھنا ہے لیکن قانون میں رہ کر اور گھر کی پابندی میں مجھے ان جذبات کو تھامیں مرکوز کرنا ہے مطلب میں جب کسی وقت دوسرے محبوب کے ساتھ چلتی ہوں گی تو میں اس وقت اسدؔ کو دیکھوں گی تو میں اندر ہی اندر اسی جذبہ سے کہوں گا کہ پاک محبت تھی اور یہ بھی کہوں گا کہ دل کے جذبات ابھی تک اندر ہی اندر موجود ہیں اور موجود رہیں گے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سر گشتہ خمار رسوم و قیود تھا

اسد اللہ خاں اسدؔ غزل کے مقطع کے مطابق اسدؔ فرما رہے ہیں کہ جب پاک محبت میں تبدیل ہوئی یا وصل کے جذبات سے مکمل نہیں ہوا تو یہ پاک محبت کئی درد بھری کہانی میں مرکوز کی گئی۔ پاک محبت کی کہانی پڑھ کر لوگ یہی کہیں گے کہ اسدؔ کو کسی کے ساتھ محبت تھی لیکن اس محبت کے رشتے کیسے کیسے شاعر نے اپنائے لیکن وصل کے طریقے سے نہیں اپنا سکا۔ اسی لئے ان دونوں کے درمیان ایک دلیل ہی فیصلہ کرا سکتی ہے یا درد بھری کہانی بن گئی۔ اب جب

لوگ اس درد بھری کہانی کو پڑھتے ہیں تو اس وقت لوگوں کے جذبات سن کر بہت ہی غم محسوس کرتے ہیں۔ شاعر فرما رہے ہیں کہ میری محبت میں دراڑ پیدا ہوئی لیکن میں ان جذبات کو دیکھ کر پہاڑ کی کسی چوٹی پر بیٹھوں گا اور میں ایسی کہانی لوگوں کے ذریعے نہیں سنوں گا میں کوہکن میں جا کر اس دلیل کو الگ رکھوں گا اور لوگوں کے ذریعے نہیں سنوں گا۔ مجھے ابھی بھی جذبات معشوق کے اُبھر رہے ہیں اسی لئے میں کوہکن میں حاضر ہو کر اپنے غم کے جذبات کو لفظ 'تھا' میں نہیں تبدیل کروں گا بلکہ لفظ 'ہے' کے انداز میں مرتے دم تک بیان کروں گا۔ اسی لئے کوئی میرے چہرے کو نہ دیکھے۔ اپنا چہرہ چھپانے کے لئے میں کوہکن میں بیٹھ کر اپنی زندگی مرتے دم تک گزاروں گا۔

اگرچہ پیغام بزم میں بحث کریں گے تو میں یہی کہوں گا کہ اسدؔ کو پاک محبت میں ناکامیابی ہوئی اور اسی ناکامیابی کے جذبات پر وہ معشوق سے الگ نہیں رہنا چاہتا ہے۔ وہ مرتے دم تک اس کے جذبات اپنے دل میں قائم ودائم رکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اسدؔ فرما رہے ہیں کہ میں اپنی داستان لفظ 'تھا' میں تبدیل نہیں کروں گا بلکہ میں اپنی داستان لفظ 'ہے' میں قائم اور دائم رکھوں گا۔

اب اس غزل کے مطلع اور مقطع سے معلوم ہوا کہ اسدؔ کو صحیح طور پر معشوق سے محبت رہی کسی ناسازگار حالت کی وجہ سے محبت کے جذبات پورے نہیں ہوئے۔ میں نے بزم نغمہ فرضی بیان بازی کو اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بزم نغمہ فرضی نام ہے۔ میں نے معشوق اسی لئے کتاب میں لکھا ہے کہ کیونکہ اسد زیادہ تر مختلف بزموں میں حاضر ہوئے اور کسی خاص بزم میں بیٹھ کر اسے کسی گانے بجانے والی یا گانا تحریر کرنے والی کے ساتھ دل کا لگاؤ رہا۔ جس پر اسد نے مختلف جذبات کے ذریعے محبت کی داستان غزلوں میں بیان کی ہے۔ لیکن میں نے معشوق پیغام بزم میں فرضی نام رکھا ہے۔ میں نے اسدؔ کے قلمی نام اور غالبؔ کے قلمی نام پر زیادہ لفظ بزم کے ہی پڑھے اور غزلوں کے مختلف شعروں میں زیادہ تعداد

لفظ بزم کو ہی شاعر نے بیان کیا ہے اور اسی لئے میں نے یہی تحقیق کر کے پڑھنے والے کو اس کتاب میں یہی کہا کہ شاعر کو کسی گانے بجانے والی یا گانے تحریر کرنے والی لڑکی یا عورت کے ساتھ محبت کے جذبات ابھرے ہیں اور پھر بھی میں نے مختلف غالبؔ اور اسدؔ کے قلمی نام کے شعروں کے ساتھ وابستہ کیا جس وابستگی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسدؔ اور غالبؔ کے قلمی نام پر معشوق کے جذبات پر ہی شاعری ابھر کر شاعر کو آئی ہے اور پاک محبت میں کامیاب نہیں ہوا۔ مطلب اگر شاعر کو محبت ہوئی لیکن محبت میں کامیاب اسی لئے نہیں ہوا ہوگا کیونکہ لڑکی یا عورت کے گھر والوں نے نہیں تسلیم کیا ہوگا۔ انہیں وجوہات سے شاعر کو بہت سے غم دکھ دیکھنے پڑے ہیں۔

اسدؔ اور غالبؔ کے دو قلمی نام پر شک وشبہ محسوس ہوتا ہے

۱۔ ممکن ہے اُن دِنوں اسداللہ خاں اسدؔ کو کسی کے ساتھ محبت کے جذبات پر بہت سے صدمے برداشت کرنے پڑے ہوں گے اور پہلے اسدؔ کے نام پر اپنا تخلص رکھا۔ بہت سے ادبی مرکزوں میں شریک ہو کر مختلف غزلیں شاعروں کے سامنے سنائیں۔ ممکن ہے اس وقت کے قلمکار شاعروں نے یہ کلام پڑھا اور تحقیق کرکے یہ کہا ہوگا کسی لڑکی یا عورت کے جذبات پر کلام لکھا ہوا ہوگا کیونکہ اسدؔ کے قلمی نام پر بھی اور غالبؔ کے قلمی نام پر بھی عروج کی شاعری پڑھنے میں آتی ہے۔ ان شاعروں نے اِن غزلوں اور اس شاعر کو دبانے کے لئے کئی تہمتیں حکمرانوں کے سامنے رکھی ہونگی۔ جس کے تحت شاعروں نے یہ کہا ہوگا کہ یہ کسی لڑکی یا عورت کے بیان بازی پر شاعری لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ لڑکی یا عورت کسی بڑے خاندان سے تعلقات رکھتی ہوگی۔ اسی لئے ان شاعروں نے اس لڑکی یا عورت کے گھر والوں کے ذریعے شاعر پر پابندی عائد کی ہوگی جس کی وجہ سے ان کے گھر والوں نے اسدؔ اور غالبؔ کے نام پر بہت سی مشکلات پیش کی ہوں گی جن مشکلات کا مقابلہ شاعر نے کیا ہے۔ اُن دِنوں کے شاعروں نے اسدؔ اور غالبؔ کو دبانے کے لئے ایسا کام کیا جس کی وجہ سے دُو حصوں میں قلمی نام لکھا گیا۔

۲۔ ممکن ہے کہ اسدؔ کے قلمی نام پر لڑکی یا عورت کے گھر والوں نے اپنے اثر ورسوخ سے اسدؔ کے کلام کو جلانے کیلئے کہا ہوگا اور کلام کو جلایا ہوگا اور اس کلام میں کئی غزلیں موجود رہی ہوں گی اور ان غزلوں کو دیوانِ غالب میں چھپایا گیا ہے۔ یہ غزلیں اسدؔ کے قلمی

نام پر جلائی گئی ہوں گی۔ تا کہ ایسے جذبات موجود نہ رہے اور لڑکی یا عورت والوں کے گھر والوں کو کوئی یہ نہیں کہہ کے شاعر نے محبت کے بارے میں ایسی داستان لکھی ہے۔

۳۔ ممکن ہے اسدؔ کے قلمی نام پر شاعر نے کوئی کتاب بھی لکھی ہوگی جس کتاب کا عنوان 'شبستانِ بہار' رکھا ہوگا کیونکہ شاعر کی غزل کے مطلع اور مقطع سے اس بات کا جذبہ پڑھتے وقت مجھے معلوم ہوا اسی لئے اس کتاب کو جلانے کے لئے عورت یا لڑکی کے گھر والوں نے کام کیا ہوگا۔

۴۔ ممکن ہے اسی لئے پہلے شاعر نے اسد اللہ خاں اسدؔ قلمی نام رکھا ہے۔ جب ان جذبات ٹھنڈے ہوتے نظر آئے تو شاعر نے اپنا قلمی نام غالبؔ رکھا پھر دوسری غزلیں لکھنی شروع کیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسدؔ کے نام پر کلام کی پابندی حکمرانوں نے کی ہوگی لیکن تاریخ میں یا حکمرانوں کے ذریعے کوئی دستاویز مل نہیں سکتا۔ نہ حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ اسدؔ کا کلام تہس نہس کرنے کے لئے زبانی طور پر حکمرانوں نے اس کام کو انجام دیا ہوگا اور زبانی طور پر شاعر کو مختلف ادبی تنظیموں میں تعزیتیں دیکھنی پڑی ہونگی لیکن پھر بھی شاعری سے شاعر الگ نہیں رہا ہے۔

۵۔ اب میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اسدؔ کا قلمی نام جب کئی غزلوں میں پڑھتا ہوں تو ان کو پڑھ کر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر پہلے دور کی شاعری میں کوشش کر رہا ہے مطلب ابھی مکمل شاعر نہیں ہے حتیٰ کہ میرؔ اور باقی ان دنوں کے شاعروں نے غالبؔ کے قلمی نام کی بہت ہی تعریفیں لکھیں لیکن شاعر کا دل ہی محبت میں رہا۔ اس جذبات سے عورت یا لڑکی والوں نے شاعروں کے ذریعے ہی مختلف محفلوں میں تعزیتیں دی ہونگی۔ اسی لئے شاعری دبائی گئی لیکن پھر بھی شاعر دبا نہیں اور اپنی قلم کو قائم و دائم رکھ کر اپنے جذبات مختلف غزلوں میں تحریر کئے۔

۶۔ جب میں اسدؔ کے قلمی نام پر دیوانِ غالب میں غزلیں پڑھتا ہوں تو ان میں کئی ردیف

نہیں اور کوئی کافیہ نہیں، لیکن اسؔد کے قلمی نام پر بہت سارا کلام بہت ہی بلند پایہ کلام پڑھنے میں آتا ہے۔

۷۔ جب اتنے غم شاعر نے دیکھے ہوں گے تو پھر شاعر پر حکمرانوں نے زبانی طور پر پابندی اور تعزیتوں کا دور منسوخ کیا ہوگا جو کہ زبانی طور پر حکمرانوں نے شاعر پر عائد کی ہوں گی۔اسی لئے شاعر نے پھر اپنی شاعری کے جذبات کو سنانے کے لئے غالب کا قلمی نام رکھا ہوگا اور سرکاری طور پر زبانی یہ حکم دیا ہوگا کہ اسؔد کا قلمی نام غزلوں میں نہیں لکھنا چاہئے۔

۸۔ اب میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ جو میں نے معشوق کا لفظ پیغام بزم میں لکھا ہے وہ میں نے فرضی نام لکھا ہے تا کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ شاعر کو ایسی عورت یا لڑکی سے محبت رہی ہے جو کہ گانے بجانے والی یا گانا سنانے والی تھی۔

۹۔ شاعر نے اپنی شاعری میں بلا لحاظ مذہب وملت شعر غزلوں میں تحریر کئے ہیں۔جس سے میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ شاعر کو غیر مسلم کے ساتھ بھی پاک محبت کا اثر ہوگا مطلب غیر مسلم لڑکی یا عورت ہو سکتی ہے۔

۱۰۔ شاعر نے ایک ہندو رسم کے بارے میں اچھی بات اپنی غزلوں میں بتائی جو کہ لفظ زنار سے معلوم ہو سکتی ہے۔جس سے میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ شاعر کو مذاق کے طور پر اپنی صحبت میں غیر مسلموں نے یہ کہا ہوگا کہ آپ زنار کا استعمال کرو یا یہ بھی دعوت دی ہوگی کہ زنار کی رسم میں شریک ہونا۔اس پر اپنے تاثرات شاعری میں بیان کئے ہیں۔

۱۱۔ شاعر نے بہت ساری غزلوں میں زیادہ تر پاک محبت کی ہی دلیل اپنی غزلوں میں بیان کی ہے۔اس بیان بازی سے بھی تاریخ کے کئی مناظر پڑھنے میں آتے ہیں۔

۱۲۔ شاعر کے کلام سے محققین اور تاریخ داؤں کو یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دِنوں کے دور میں کس طریقے کا رجحان سرکاری اور غیر سرکاری طور پر رہا ہے۔

۱۳۔ میں نے دیوانِ غالب میں غزل کا مطلع اور مقطع پڑھا عام طور پر میں نے غزل کے مطلع کو مقطع کے ساتھ وابستہ کیا۔ آج کل غزل کا مطلع مقطع کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی لئے آج کل کے شاعر غالب جیسا مواد نہیں لکھ سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے پڑھ کر یہی تحقیق کی کہ غالب کے قلمی نام پر مطلع اور مقطع ایک ساتھ ملتا ہے۔ مطلب مطلع میں بات کہہ کر مقطع میں اس کا جواب دے کر غزل پر جرح کرتا ہے۔ جو کہ آج کل کی شاعری میں بہت ہی مشکل ہے۔

۱۴۔ اسدؔ کے قلمی نام پر ایسا ہنر ایسی قلم مجھے پڑھنے میں نہیں آیا جو کہ غالب کے قلمی نام پر پڑھنے میں آیا مثلاً غالب کی غزل کا مطلع اور مقطع آپسی بحث میں جوڑ سکتا ہے۔ لیکن اسدؔ کے قلمی نام پر غزل کا مطلع اور مقطع جوڑ نہیں سکتا۔ مانتا ہوں کسی کسی غزل میں اسد کے قلمی نام پر جوڑ ملتا ہے لیکن جوڑ غالب کے قلمی نام پر غزل کے مطلع اور مقطع میں پڑھنے میں آتا ہے۔

۱۵۔ ان دِنوں کے شاعروں کی غزل کے مطلع اور مقطع میں اتنا جوڑ نہیں جتنا کے میں نے غالبؔ کے قلمی نام پر پڑھا۔

خیر میں نے اپنی ہی سوچ پر اس کتاب کو تحریر کیا اور اپنی سوچ سے ہی کئی باتوں پر جرح کی لیکن غالب اور اسدؔ کے قلمی نام کی غزل کے ہنر پر میں نے یہ بھی پڑھا کہ اسدؔ اور غالبؔ کے قلمی نام پر ایسا نمونہ کلام بھی موجود ہے جو کہ کئی واقعات پر مشتمل ہے اور اسی لئے میں نے 'پیغام بزم' اس کتاب کا عنوان رکھا۔

میں نے اس کتاب میں غالب کے شعروں پر بہت سی کہانیاں، افسانے بیان کیئے۔ جس طریقے سے میں نے بیان کیئے اس طریقے سے آج تک کسی ادیب یا قلمکار نے بیان نہیں کیئے۔

مندرجہ ذیل اُردو زبان میں جو کتاب آج تک مصنف نے لکھی ہے وہ
آپ کو مدیر انگریزی ہفت روزہ اخبار ''ڈیمو'' کے دفتر سے مل سکتی ہے۔

ASSOCIATION OF INDIAN PUBLISHERS AND BOOKSELLERS
Membership. No. 84

₹.475/-

₹.220/-

₹ 219

₹.650/-
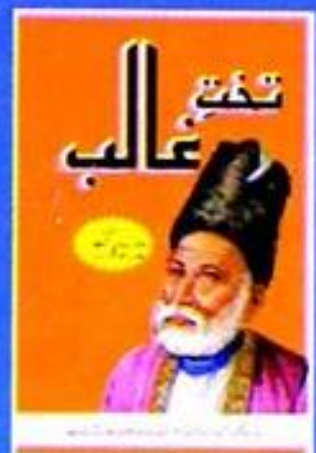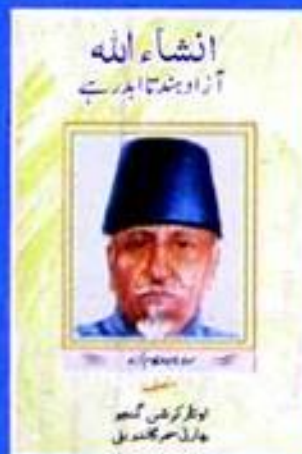
₹.390/-

مصنّف

اوتار کرشن گنجو، بھارتی سحر گاندربلی

₹.200/-

₹.250/-

₹.630/-

₹.990/-

ISBN : 978-81-930659-0-7

M/s Demo Weekly, Jammu (Tawi) J&K
Govt. Quarter No.2 Rollarshed Opp. St. Petter School, General Bus Stand
B.C. Rad Jammu (Tawi) Ph. 0191-2572860, Mob.9419422095